

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

دسمبر 2016



MONTHLY SHUAA Regd. No. SC-52 DECEMBER 2016

قیمت - 60 روپے

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

شعاع

بانی و مدیر اعلیٰ محمود ریاض

مدیر — رضیہ جمیل

مدیر تنظیم — ادر ریاض

مدیر قاری — امت الصبور

فہرشی — شاہین رشید

اشہادت — خجالد جیلانی



WWW.PAKSOCIETY.COM



216 نایاب جیلانی
72 مصباح علی



57 نعیمہ
67 غزالہ روشن
88 ہاجرہ ریحان
98 صائمہ اقبال
162 مہناز یوسف



262 قابل اجیری
262 جون ایلیا
263 محسن نقوی
263 وصی شاہ

قرآن سالانہ بیک کی عمر کی گنتری	
پاکستان (سالانہ)	700
ایشیا، افریقہ، یورپ	6000
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	7000

10 رضیہ جمیل
11 بشیر اعجاز
11 جگر مراد آبادی
12 ادارہ



275 نوال افضل گھس
17 شاہین رشید
276 پروین اسلم
279 گڈاپ
22 شاہین رشید
271 ادارہ



36 عفت سحر ظاہر
250 نبیلہ عزیز



112 کرن نعمان
172 مصباح نوین

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی فی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی ٹیلی ویژن سلسلہ اور فلم کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔



خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار، کراچی



رکن آل پاکستان نوز جیمز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نوز جیمز سوسائٹی

MEMBER
APNS
CPNE

285	امت الصبور	تاریخ کے جھوٹے	26	رضیہ جمیل	خط آپ کے
286	خالہ جیلانی	موسم کے پگوال	264	ادارہ	مُسکراہٹیں
290	ادارہ	خوبصورت بننے کا	282	واصفہ سہیل	ایٹینہ خالے میں
			266	شگفتہ جاہ	بالوں سے خوشبو لائے
			269	خالہ جیلانی	کھلتا کسی پہ

دسمبر 2016

جلد 31 نمبر 4

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے لوہن حسن پر ننگ پر لیس سے چھچھو لکر شائع کیا - مقام: ۱۰/۱۱ پی آر سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

WWW.PAKSOCIETY.COM



سالِ رواں کا آخری شمارہ دسمبر کا شعاع پیش خدمت ہے۔
 دیگر رواں کی طرح ہمارے پچھلے ماہ و سال اپنے دامن میں بے شمار خوشیاں اور فکے لیے ماضی کا حصہ بنے جا رہے ہیں۔ دنیا ہر آن ترقی کی جانب بڑھ رہی ہے۔ لیکن تمام تر ترقی کے باوجود انسان، انسانی ذلکوں اور المیوں کا کوئی مدا آج تک نہیں دھونڈ سکا۔ آج بھی مذہبی اور نسلی تعصب کے ہاتھوں انسانیت ایک بار ہے۔ کشر ہو، شام ہو یا برما، ہر جگہ مسلمانوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔
 سال 2016ء، کئی لحاظ سے پاکستان کے لیے خوش آئند رہا۔ دہشت گردی کے واقعات میں نمایاں کمی آئی۔ کراچی کو دو عشروں کے بعد امن و استحکام نصیب ہوا۔ سی پیک منصوبے کا افتتاح ہوا جس سے معاشی ترقی کے امکانات روشن ہوئے ہیں۔

25 دسمبر بے ریا، بلا اصول، دیانت و اذیت رہتا ہائی پاکستان قائد اعظم کی پیدائش ہے۔ ایک تاریخ ساز شخصیت جنہوں نے اپنے عزم اور حوصلے سے دنیا کے نقشے کو بدل دیا۔ امدان کی پر عزم قیادت میں برصغیر کے مسلمان اپنا علیحدہ وطن "پاکستان" حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

صائمہ اکرم چودھری کا ناول، شہر زادہ،

صائمہ اکرم کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ سیاہ مائیہ اور دیمک زدہ محبت کے بعد اب انہوں نے ایک طویل ناول "شہر زادہ" لکھا ہے جو نئے سال کے پہلے بیسے جنوری سے شامل اشاعت ہوگا۔ صائمہ اکرم کی ہر تحریر ان کی پہلی تحریر سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ ہمیں تو فتح ہے کہ قارئین ان کا یہ ناول ان کی پہلی تمام تحریروں سے بڑھ کر پائے گی۔

سالِ نو نمبر۔ سروے،

جنوری کا شمارہ سالِ نو نمبر ہوگا۔ اس میں حسب روایت قارئین سے سروے بھی شامل کیا جائے گا۔ سروے کے سوال یہ ہیں۔
 1۔ کہتے ہیں

- خدا شناس کہاں وہ، جو خود شناس نہ ہو
 آپ خود کو کتنا جانتی ہیں؟ اگر آپ سے کہا جائے کہ اپنی ذات و صفات کے حوالے سے ایک صفحہ لکھیں تو کیا لکھیں گی؟
 2۔ گزرے سال کی کوئی بیسی سی یاد یا کوئی خوش کن لمحہ جو ہمارے قارئین سے شیئر کرنا چاہیں۔
 3۔ کیا کوئی تحریر پڑھتے ہوئے آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ آپ اس کہانی کے کسی کردار جیسی ہوتیں؟ کہانی اور کردار کا نام لکھیں۔
 ان سوالات کے جوابات اس طرح جمعوائیں کہ 18 دسمبر تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

- مصباح نوشین کا مکمل ناول۔ کوئی چاند کبھ میرے ہاتھ پر، کرن نعمان کا مکمل ناول۔ میرے خیال کا پیکر
- مصباح علی احمد نایاب جیسٹانی کے ناول، "عفت سحر طائر اور ہیلڈ عزیز کے ناول،
- نعیمہ ناز، باجرہ ریسکان، صائمہ اقبال، مہنا زیوسف اور عزت الدین کے افسانے،
- مشہور ماڈل، اداکارہ نادرہ حسین سے ملاقات، معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- شعاع کے ساتھ ساتھ۔ قارئین سے سروے، جب تم سے ناتا جوڑا ہے خط آپ کے اور دیگر سلسلے شامل ہیں۔
- دسمبر کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔



تُو چراغوں کی تُو میں بھٹکتا دھواں
تُو یقین میں گماں تُو کہاں میں کہاں

تُو بہار آفریں خوشبوؤں کا جمن
میں خزاں ہی خزاں تُو کہاں میں کہاں

میں تجھے نقش پا کا ہوں اُڑتا غبار
تُو رواں کارواں تُو کہاں میں کہاں

میں ہوں بہتی ندی میں پڑا ایک سنگ
تُو ہے آب رواں تُو کہاں میں کہاں

میں سکوتِ سیرِ شام کی اک صدا
تُو سحر کی ازاں تُو کہاں میں کہاں

میں تُو صحرا کا اک ذرہ ریگ ہوں
تُو میرا سا بیاں تُو کہاں میں کہاں

میں ہوں اعجازِ اک رائدہ آستان
تُو شہِ دو جہاں تُو کہاں میں کہاں
بشیرِ اعجاز

ایک زندہ ہے اور مدحتِ سلطانِ مدینہ
ہاں کوئی نظیرِ رحمتِ سلطانِ مدینہ

دامانِ نظرِ تنگ ، فراوانیِ جلوہ
اے طلعتِ حق طلعتِ سلطانِ مدینہ

اے خاکِ مدینہ ، تری گلیوں کے تقدق
تُو غلہ ہے تُو جنتِ سلطانِ مدینہ

اس طرح کہ ہر سانس ہو مہرِ عبادت
دیکھوں میں در دولتِ سلطانِ مدینہ

اس امتِ عاصی سے نہ منہ پھیر دیا
نازک ہے بہتِ عزتِ سلطانِ مدینہ

کچھ ہم کو نہیں کام جگر اور کسی سے
کافی ہے بس اک نسبتِ سلطانِ مدینہ
بگڑ مراد آبادی

سائیکس پیکس کی روایت

ذمہ دار

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”تم سب ذمہ دار ہو اور تم سب سے اپنی رعیت (ماتحتوں) کے بارے میں پوچھا جائے گا (امام ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ آدمی اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی رعیت (مال خانہ) کی بابت سوال ہو گا۔ عورت اپنے خاوند کے گھر کی ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ خادم اپنے آقا کے مال کا ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا۔ تم میں سے ہر ایک (اپنے اپنے معاملات کا) ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی رعیت (معاملے) کے بارے میں پوچھا جائے گا۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : ارباب اختیار کی جو ذمہ داری باب مذکور کے عنوان میں بتلائی گئی ہے، اگر وہ اس میں کوتاہی کریں گے تو عند اللہ مجرم ہوں گے جس کی باز پرس روز قیامت ان سے ہوگی۔

رکھوالا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ۔

”اللہ تعالیٰ کسی رعیت کی رکھوالی جس آدمی کے سپرد کر دے اور وہ انہیں دھوکا دیتے ہوئے مرجائے تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی۔“ (بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے کہ ”اس نے خیر خواہی کے ساتھ ان کے حقوق کی حفاظت نہیں کی وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔“

مسلم کی ایک اور روایت میں ہے: ”جو حاکم بھی مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار بنے پھر وہ ان کے مسائل کے حل کے لیے بھرپور کوشش اور ان کی خیر خواہی نہ کرے تو وہ ان کے ساتھ جنت میں نہیں جائے گا۔“

فائدہ : اس میں حکمرانوں کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ بہت ہی اہم منصب ہے۔ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے مسائل و معاملات کے وہ ذمہ دار ہیں۔ اگر وہ پوری توجہ، ہمت اور خیر خواہی سے ان کے مسائل حل نہیں کریں گے تو اللہ کے ہاں وہ مجرم ہوں گے۔ ان کی رعایا تو اپنے ایمان و عمل کی بدولت جنت میں چلی جائے گی لیکن یہ اس سے محروم رہ جائیں گے۔ اس لیے حکمران اقتدار کے نشے میں بدست اور عوام کے معاملات سے غافل نہ ہوں بلکہ عند اللہ جواب دہی کے احساس سے سرشار ہو کر انہیں عدل و انصاف اور امن و سکون مہیا کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔

دعا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس گھر میں فرماتے ہوئے سنا۔

”اے اللہ! جو شخص بھی میری امت کے کسی معاملے کا ذمہ دار بنے پھر وہ انہیں مشقت میں ڈالے تو تو بھی سختی فرما۔ اور جو شخص میری امت کے کسی

فوائد و مسائل :

1- سیاست برکی چیز نہیں۔ اگر بری ہوتی تو انبیاء سیاست نہ کرتے۔ انبیاء کے سیاست کرنے کا مطلب ہے جہانباہی اور حکومتی معاملات بھی ان ہی کے سپرد ہوتے تھے۔ یعنی دین اور دنیا دونوں امور کے ذمہ دار انبیاء علیہ السلام ہوتے تھے۔ دین اور دنیا کے درمیان تفریق نہیں، یکجائی تھی، جیسے خلافت راشدہ اور اس کے کچھ عرصے بعد تک اسلام میں بھی یہ صورت رہی۔ اس لیے ایک نبی کی وفات کے بعد دو سرا نبی آجاتا اور اس کا جانشین بن جاتا، جیسے حکمرانی کے منصب میں ہوتا ہے۔ ایک کے بعد کوئی دو سرا حکمران بن جاتا ہے۔

2- اس میں ختم نبوت کا مسئلہ بھی واضح فرمادیا گیا ہے کہ اب میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، البتہ خلفاء ہوں گے اور دعویٰ داران خلافت زیادہ ہوں تو اس کا حل بھی بیان فرمادیا کہ پہلے خلیفہ کی بیعت پوری کرو۔ اس کی موجودگی میں کسی دوسرے مدعی خلافت کی طرف توجہ مت دو۔

3- حکمرانوں کی کوتاہیوں کا حل بھی تجویز فرمادیا اور وہ ان کے خلاف بغاوت اور احتجاجی مظاہرے نہیں بلکہ انتظامی معاملات میں ان کی اطاعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کی بارگاہ میں دعا کرنا ہے۔ افسوس ہے کہ اسلامی ملکوں میں جب سے مغرب کی ملعون جمہوریت آئی ہے، ان کا سارا استحکام ختم ہو گیا ہے کیونکہ امن و استحکام کے لیے ضروری ہے کہ نظم و مملکت انتشار و ابتری سے محفوظ رہے۔ اگر اللہ کے حکم کے مطابق خلافت کا نظام ہو تو مکمل امن و استحکام حاصل ہو سکتا ہے۔

حضرت عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ عبید اللہ بن زیاد کے پاس گئے اور ان سے کہا ”اے بیٹے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بدترین حاکم رعایا پر ظلم کرنے والے ہیں لہذا تو اس سے بچ کہ تو ان میں سے ہو۔“ (بخاری و مسلم)

معاملے کا ذمہ دار بنے، پھر وہ ان کے ساتھ نرمی کرے تو تو بھی اس کے ساتھ نرمی فرما۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل :

1- کتنا خوش نصیب ہے وہ حکمران جو عوام کو عدل و انصاف مہیا کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائے خاص کا مستحق بن جائے۔ اور اسی حساب سے کتنا بد نصیب ہے وہ حکمران جو عوام کے ساتھ نا انصافی کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعاؤں کا مستحق بنالے۔

2- اس میں عدل و انصاف سے حکمرانی کرنے کی ترغیب اور عوام پر ظلم و زیادتی سے اجتناب کرنے کی تاکید ہے۔

3- اس میں حکمرانوں کے ماتحت افسر بھی آجاتے ہیں کہ ان سے بھی اس کی باز پرس ہوگی، تیز ہر ذمہ دار جس کے ماتحت افراد ہوں، اسے ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا چاہیے۔

بیعت کو پورا کرو

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”بنی اسرائیل کی سیاست ان کے پیغمبر کرتے تھے۔ جب ایک پیغمبر فوت ہو جاتا تو اس کا جانشین دو سرا پیغمبر بن جاتا۔ اور (یاد رکھو!) میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں، میرے بعد خلفاء ہوں گے اور کثرت سے ہوں گے۔“

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔ ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! پس آپ ہمیں کیا حکم ارشاد فرماتے ہیں؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس سے پہلے بیعت کرو اسے پورا کرو، پھر اس کے بعد والے سے بیعت کرو، پھر انہیں ان کا حق دو اور تمہارے اپنے جو حقوق ہیں، ان کا سوال اللہ سے کرو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بابت، جن کا انہیں والی بنائے گا، خود ہی ان سے پوچھ لے گا۔“ (بخاری و مسلم)

انصاف کرنے والے حکمران کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”بے شک اللہ تعالیٰ عدل و انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔“ (النمل 90)
اور فرمایا: ”اور تم انصاف کرو یقیناً“ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔“ (الحجرات - 9)

سات آدمی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”سات آدمی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اس دن اپنے سائے میں جگہ دے گا جس دن اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا:
انصاف کرنے والا حکمران۔

وہ نوجوان جو اللہ کی عبادت میں پروان چڑھے۔
وہ آدمی جس کا دل مسجدوں میں اٹکا رہتا ہو۔ وہ دو آدمی جو اللہ کی رضا کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اسی کی وجہ سے باہم جمع ہوتے اور اسی پر ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔
وہ آدمی جسے معزز اور خوبرو عورت دعوت گناہ دے اور وہ کہہ دے ”میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں۔“
وہ آدمی جو اس طرح خفیہ صدقہ دے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی یہ علم نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے۔

وہ آدمی جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرے اور اس کی آنکھوں سے (اس کے خوف سے) آنسو رواں ہو جائیں۔“ (بخاری و مسلم)

انصاف کرنے والے

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”بے شک انصاف کرنے والے اللہ کے پاس نور

کے منبروں پر ہوں گے۔ (یعنی وہ لوگ جو اپنے حکم میں اپنے گھر والوں کے بارے میں اور ان کاموں میں جو ان کے سپرد ہیں انصاف کا اہتمام کرتے ہیں) (مسلم)
فائدہ: نور کے منبر کس طرح ہوں گے؟ اس کی اصل حقیقت سے گواہم واقف نہیں ہیں تاہم اس کی حقیقت پر ایمان رکھنا ضروری ہے اور یہ بھی کہ یہ لوگ یقیناً ”عرش یا رحمت الہی کے سائے تلے ہوں گے جبکہ لوگ سینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ اس میں عدل و انصاف کی فضیلت اور انصاف کرنے والوں کا مرتبہ بیان کیا گیا ہے۔

جنتی

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ۔

”تین قسم کے لوگ جنتی ہیں: ایک وہ حکمران جو انصاف کرنے والا اور اعمال خیر کی توفیق سے بہرہ ور ہو۔
دوسرا وہ آدمی جو ہر مسلمان اور رشتہ دار کے لیے مہربان اور نرم دل ہو۔
تیسرا مانگنے سے گریزاں اور وہ شخص جو عیال دار ہونے کے باوجود سوال سے بچنے والا ہو۔“ (مسلم)
فائدہ: یہ تینوں مذکورہ صفات اہل ایمان کی خاص صفات ہیں جو ایک مومن کو جنت میں لے جانے کا باعث ہیں۔ ہر مومن کو ان صفات حسنہ سے آراستہ ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔

جائز کاموں میں حکمرانوں کی اطاعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان کی جو تمہارے حکمران ہیں۔“ (النساء 59)

فائدہ

1۔ اللہ اور رسول دونوں کے ساتھ لفظ اطاعت کے ذکر سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ان

”تم اپنا وہ حق ادا کرنا جو تمہارے ذمے ہے اور جو تمہارے حقوق (حکمرانوں کے ذمے) ہیں ان کا سوال تم اللہ سے کرنا۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس میں جہاں ایک طرف عوام کو حکمرانوں کے ظلم و ستم ان کی اقریانوازی یا خود ہی تمام قومی وسائل کو اپنے لیے مختص کر لینے کو صبر کے ساتھ برداشت کر لینے کی تلقین ہے وہاں دوسری طرف بالواسطہ حکمرانوں کو بھی تنبیہ ہے۔

حکمران کی اطاعت

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”(حکمرانوں کی بات) سنو اور اطاعت کرو، اگرچہ تم پر کسی جبری غلام ہی کو حاکم مقرر کر دیا جائے گویا کہ اس کا سر انگور ہے“ (یعنی انگور کی طرح چھوٹا سا ہے جس سے انسان بڑا عجیب سا لگتا ہے۔) (بخاری)

فائدہ : غلام کو اور وہ بھی سیاہ فام اور چھوٹے سے سر کا ہو، کوئی بھی احترام کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ لیکن حدیث میں اس کی مثال دی گئی ہے جس سے مقصود اطاعت امیر کی تاکید ہے چاہے اس کا رنگ کیسا ہی ہو اور وہ کسی بھی جنس و نسل سے تعلق رکھتا ہو بشرطیکہ اس کا حکم قرآن و حدیث کے مخالف نہ ہو۔

مسجد میں کھانا کھانے کا بیان

حضرت عبداللہ بن حارث بن جزء زبیدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: ”ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں مسجد میں گوشت روٹی کھالیا کرتے تھے“

فوائد و مسائل :

1- مسجد میں کھانا پینا جائز ہے لیکن اسے عادت نہیں بنانا چاہیے۔ مسجد میں کھانا کھاتے وقت مسجد کی صفائی کا خیال رکھنا چاہیے۔ کھانے کی چیز فرش، چٹائی اور قالین وغیرہ پر نہ گرتے دی جائے۔

دونوں کی اطاعت مستقل بالذات ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرنا واجب ہے جبکہ مسلمان حکمرانوں کی اطاعت مستقل نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہے۔ اس لیے ان کا جو حکم قرآن و حدیث کے موافق ہوگا اس میں ان کی اطاعت لازم اور جو حکم ان کے مخالف ہوگا اس کی اطاعت لازم نہیں ہوگی۔

جائز بات ماننا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مسلمان مرد پر (اپنے مسلمان حکمران کی بات) سننا اور ماننا فرض ہے وہ بات اسے پسند ہو یا ناپسند مگر یہ کہ اسے گناہ کرنے کا حکم دیا جائے چنانچہ جب اسے اللہ کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر اس پر سننا اور ماننا فرض نہیں (بلکہ انکار کرنا ضروری ہے)۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس میں مسلمانوں کے لیے مسلم حکمرانوں کی اطاعت کی حدود واضح کر دی گئی ہیں۔ مسلم حکمرانوں کی عزت اسی میں ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات سے انحراف نہ کریں، ورنہ وہ اخروی عذاب کے علاوہ دنیوی ذلت سے بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔

خود غرض حکمرانی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میرے بعد خود غرض حکمرانی ہوگی (یعنی سارے مفادات خود ہی سمیٹ لینے کی ہوس۔ یا دوسرے معنی میں اپنوں کو ترجیح دینا) اور دیگر امور جنہیں تم برا سمجھو گے۔“

صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ اس شخص کی بابت کیا حکم فرماتے ہیں جو ہم میں سے یہ زمانہ پالے؟

آر۔ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

طاقت

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی بیعت کرتے تھے کہ ہم آپ کی بات سنیں گے اور مانیں گے تو آپ فرماتے تھے۔
”ان چیزوں میں جن کی تم طاقت رکھتے ہو۔“

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

- 1۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان حکمران کی اطاعت کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ اس کا حکم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے مخالف نہ ہو وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عوام کی طاقت سے بالائے ہو۔ اگر ایسا ہو گا تو اس کی اطاعت بھی ضروری نہیں ہوگی۔
- 2۔ اس میں حکمرانوں کو تنبیہ ہے کہ وہ عوام کو ایسی مشقت میں نہ ڈالیں کہ جس کا اٹھانا ان کے لیے مشکل ہو، جیسے فی زمانہ ناروا قسم کے ٹیکس اور بوجھ ڈالے جا رہے ہیں اور پابندیاں عائد کی جا رہی ہیں۔

اطاعت

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

”جس نے (حکمران کے جائز کاموں میں) اطاعت سے ہاتھ اٹھالیا تو وہ اللہ تعالیٰ سے قیامت کے روز اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی۔ اور جو شخص اس حال میں فوت ہوا کہ اس کی گردن میں کسی کی بیعت نہیں تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔“

(مسلم)

اور مسلم کی ایک اور روایت میں ہے: ”جس شخص کو اس حال میں موت آئی کہ وہ جماعت کو چھوڑے ہوئے تھا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔“

فوائد و مسائل :

- 1۔ اس حدیث میں بھی مسلمان حکمران کی اطاعت

کو لازم اور اس کی بیعت و اطاعت سے کریز و انحراف کو کفر و ضلال سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اسے جاہلیت کی موت اس لیے فرمایا کہ اسلام سے قبل ایک امیر کی اطاعت کا کوئی تصور نہیں تھا بلکہ اس میں وہ اپنی عار اور ذلت محسوس کرتے تھے۔ اسلام نے اس طوائف الحلو کی کا خاتمہ کر کے انہیں نظم و ضبط کا پابند بنایا اور اطاعت امیر کی تاکید کی۔

2۔ تاہم اس میں جس امیر کی بیعت اور اطاعت کو ضروری اور اس سے خروج و بغاوت کو جاہلیت قرار دیا گیا ہے اس سے صاحب امر و اختیار امیر، یعنی حکمران اور بادشاہ وقت مراد ہے۔ مسلمانوں کی محدود جماعتوں کے بے اختیار امیر مراد نہیں ہیں کیونکہ ان کی اطاعت سے ملکی استحکام وابستہ ہے، نہ ان کی عدم اطاعت سے نظم مملکت میں کوئی خلل واقع ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی بیعت و اطاعت سے انکار یا انحراف اتنا بڑا جرم نہیں کہ اسے کفر و ضلال قرار دیا جاسکے، جب کہ حدیث میں اسے کفر و ضلال ہی کہا گیا ہے جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ امیر سے مراد مسلمانوں کا بااختیار حاکم ہے نہ کہ تنظیمی معاملات کے امیر اور جماعت سے مراد مسلمانوں کی جماعت ہے نہ کہ مسلمانوں کا کوئی ایک گروہ یا دو گروہ۔

3۔ اپنے اپنے گروہ کے امیر یا صدر کی اطاعت بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر کسی گروہ میں نظم و ضبط قائم نہیں رہ سکتا، گو اس نظم جماعت سے خروج کفر نہیں، جیسا کہ جماعت المسلمین اور اس کے امیر سے خروج کفر ہے۔ نیز بعض لوگ کسی نہ کسی پیرو مرشد کی بیعت کرنا ضروری سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں۔



مشاپن رشید

کو آریٹھ۔ اور وقت کی پابند۔

مصرفیات ہیں۔“

لیے وقت کیسے نکال لیتی ہیں آپ؟“

6

شکر ہے کہ سب کچھ صحیح چل رہا ہے۔“

آج کل رنگ گورا کرنے کے لیے جو "کیمول" اور

”محکشن“ استعمال ہوتے ہیں وہ کتنے کارآمد ہوتے

نہیں نکلے، ہر کام میں ایک ٹائم لگتا ہے۔“

یہ چیزیں بالکل مواقف نہیں آئیں ایسا ہے؟

”مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اگر کسی کو انگیزہ

کر

ہو گئیں۔ کیا شاوی کی وجہ سے؟“

کہ میری اپنی پہچان بھی رہے اور مہاں کا فیملی رنیم بھی

آپ ہی ہیں۔ یا کوئی اور بھی ہے؟

”شوہر میں آمد کیسے ہوئی اور کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟“
 ”شوہر میں مجھے تقریباً سولہ سترہ سال ہو گئے ہیں“
 شادی سے پہلے ہی اس فیلڈ میں آگئی تھی اور میں نے
 اگرچہ بہت زیادہ ڈرامے نہیں کیے لیکن اچھے خاصے
 کیے ہیں۔ اور ٹیلی فلمز میں بھی کافی کام کیا ہے میں
 نے اس فیلڈ میں آنے کی کوئی بہت زیادہ چاہت اور
 لگن نہیں تھی جس اتفاق سے ایک پروگرام کو ہوسٹ
 کرنے کی آفر آئی۔ اور بس پھر اس کے بعد ہی سلسلہ
 شروع ہو گیا۔ مجھے بھی اس فیلڈ میں آکر اچھا لگا اور میں
 نے بھی سوچ لیا کہ اس فیلڈ میں نام کماتا ہے اور اس
 فیلڈ میں اپنی پہلی کمائی سے میں نے جوتے، جوڑے اور
 کچھ جیولری وغیرہ خریدی تھی۔“

”ماڈلنگ کے لیے کیا مبادیہ ہونا ضروری ہے؟“
 ”ضروری ہے۔ تاکہ آپ لوگوں کو دکھائی دیں۔
 اور آپ میں خود اعتمادی کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔
 آپ کی خود اعتمادی بھی نظر آتی چاہیے۔“
 ”آپ کے بچپن کے کیا خواب تھے؟ بڑے ہو کر کیا
 بننا ہے؟“

”میرا خواب تو یہی تھا کہ میں نے میڈیکل میں جانا
 ہے اور ڈاکٹر بننا ہے کیونکہ میرے والد کا تعلق بھی
 میڈیکل سے تھا تو ڈگری تو میں نے لے لی۔ ڈاکٹر بھی
 بن گئی مگر کام نہیں کیا۔ مطلب پریکٹس نہیں کی اور
 اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں شوہر میں آگئی
 تھی۔ پھر شادی ہو گئی اور بچے بھی تو میں نے سوچا کہ
 بچے تھوڑے بڑے ہو جائیں تو پھر پریکٹس شروع
 کروں گی۔ مگر ایسا ہو نہیں سکا۔“
 ”سارا دن کی تھکاوٹ کے بعد نیند تو بہت اچھی آتی
 ہوگی آپ کو؟“

”ارے کہاں۔ اگرچہ میں گھر اپنے ٹائم پر آجاتی
 ہوں مگر پھر بچوں میں، فیس بک پہ اور ادھر ادھر کے
 کاموں میں آرام سے دو سے ڈھائی بج ہی جاتے ہیں۔
 پھر اگر صبح بچوں کے اسکول ہوں تو جلدی اٹھنا پڑتا ہے
 اور اگر چھٹیاں ہوں تو تھوڑا آرام سے اٹھتی ہوں اور
 صبح اٹھ کر ایکسرسائز ضرور کرتی ہوں، کیونکہ یہ بہت



”نقد آور ہونا ہمارا خاندانی ہے۔ میری والدہ بھی
 بہت لمبی ہیں، میرے ماموں بھی بہت لمبے ہیں۔ نانا۔
 ان کے بھائی۔ ماشاء اللہ سارے ہی بہت لمبے ہیں۔
 مجھے میری والدہ کی طرف سے ہائیٹ ملی ہے۔“
 ”لمبی خواتین کے لیے عموماً ایک جملہ لوگ بے
 جھجک بولتے ہیں کہ آپ کی ہائیٹ تو مروانہ ہے۔ آپ
 کو بھی لوگ کہتے ہوں گے؟“
 ”بالکل! بہت کہتے ہیں سب۔ اسکول کالج میں
 لڑکے ہی میری ہائیٹ کے ہوتے تھے اور مجھے میرے
 دوست کہتے تھے۔ مگر مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا
 تھا۔“

”کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟“
 ”میں 11 جنوری کو لندن میں پیدا ہوئی۔ اور میرا
 اشار کیپری کورن ہے۔ اور بس میرا ایک ہی چھوٹا
 بھائی ہے۔ میں نے اولیول پھر اے لیول کیا۔ پھر میں
 نے لی ڈی ایس میں ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد میں
 نے کچھ کورسز کیے۔ میری شادی کو ماشاء اللہ سے گیارہ
 سال ہو گئے ہیں اور میرے چار بچے ہیں۔“



ضروری ہے میرے لیے اور تھکن کی بات کر رہی ہیں تو مجھ پر اللہ کا یہ بڑا کرم ہے کہ مجھے زیادہ تھکن نہیں ہوتی، خواہ میں سارا دن کتنا ہی کام کیوں نہ کروں۔ مثلاً میں صبح اٹھ کر اگر ایک سرسبز کرتی ہوں اور پھر ناشتے پر دوستوں کے ساتھ نکل بھی جاؤں اور بچوں کو لینے اسکول بھی چلی جاؤں۔ پھر رات کو گھر آ کر کسی کی شادی پر یا کسی اور ایکٹوٹی پر جانا ہو تو آسانی سے چلی جاتی ہوں۔ مجھے ایسی کوئی تھکن قبل نہیں ہوتی کہ میں کہوں کہ یہاں نہیں جانا۔ وہاں نہیں جانا۔

”بنتے ہوئے“ نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ غصہ تو ٹھیک ٹھاک آتا ہے، کوئی جھوٹ بول رہا ہو، غلط بیانی سے کام لے رہا ہو، اپنی غلطی کو مان نہ رہا ہو تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ اور غصہ نکال بھی دیتی ہوں۔ اگر چیخ کر بھی غصہ نکالنا ہو تو نکال دیتی ہوں۔

”تنی مصروفیات میں ہر وقت ہر لمحے ”ان ٹیج“ کس سے رہتی ہیں؟“

”ظاہر ہے۔ اپنے میاں سے اور اپنے بچوں سے۔ اور میری تو شاپنگ بھی بچوں۔ میاں اور گھروالوں کے لیے ہی ہوتی ہے۔“

”دنیا میں کچھ مفت لینے کا موقع ملے تو کیا لیں گی؟“

”مجھے آرٹ ورک، پینٹنگز کا بہت شوق ہے۔ میں تو یہی چیزیں لینا چاہوں گی۔“

”کوکنگ کرتی ہیں؟ اور کوکنگ چھینلو دیکھتی ہیں؟“

”باقاعدہ نہیں کرتی، کیونکہ ٹائم ہی نہیں ملتا۔ لیکن میں اٹالین کھانے زیادہ اچھے پکا لیتی ہوں۔ پاستا وغیرہ خاص طور پر۔ نہیں بالکل بھی نہیں دیکھتی کوکنگ چھینل، ٹائم ہی نہیں ملتا۔ اور ہمارے گھر میں بھی لگ ہے وہی پکاتا ہے۔“

”لوگ پہچان لیتے ہوں گے، لوگوں کے ارد گرد ہونے سے سوچتی نہیں کہ کاش میں مشہور نہ ہوتی؟ اور لگتا ہے کہ میری زندگی دوسروں سے مختلف ہے؟“

”نہیں ایسا تو خیر نہیں سوچتی کیونکہ شہرت سب کے نصیب میں تو نہیں ہوتی اور میری زندگی بالکل بھی

دوسروں سے مختلف نہیں ہے۔ کیونکہ میں تو عام خواتین کی طرح صبح اٹھتی ہوں اور عام خواتین کی طرح ہی کام بھی کرتی ہوں۔ گھر میں بھی وہی سسٹم چل رہا ہوتا ہے جو عام گھروں میں چل رہا ہوتا ہے۔ تو کوئی فرق نہیں ہے میری اور دیگر خواتین کی رو میں۔

”جذباتی ہیں آپ؟“

”نہیں میں جذباتی نہیں ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ اموشنل ہوتے ہیں مگر میں ایسی نہیں ہوں میری سوچ بہت پریکٹیکل ہے۔“

”شہرت مسئلہ بنتی ہے؟“

”ہاں۔ بالکل بنتی ہے۔ لائف بہت متاثر ہوتی ہے۔ سرعام کھلم کھلا کہیں جاسکتے۔ کوئی پرائیویٹ لائف نہیں رہتی۔ مگر پھر شکر بھی کرتی ہوں کہ اللہ نے یہ عزت دی ہے۔“

”کس رنگ کے کپڑے بہت پہنتی ہیں آپ؟“

”میں تھوڑے برائٹ کلر کے کپڑے زیادہ پہنتی ہوں۔ ڈل کلر مجھے پسند نہیں اور پھر یہ بھی دیکھتی ہوں کہ تقریب کون سی ہے تقریب کے لحاظ سے بھی کلر پہنتی ہوں اور کہیں نہ جانا ہو تو پھر کوئی بھی کلر پہن لیتی ہوں۔“

کہ آپ اسکرین سے بہت مختلف نظر آ رہی ہیں۔ میں لوگوں کو اسکرین کے بغیر زیادہ اچھی لگ رہی ہوتی ہوں اور فرمائش تو بس ایک ہی ہوتی ہے کہ تصویر بنوالیں۔“

”زوال سے ڈرتی ہیں؟“

”میں نے جب بڑھائی شروع کی، ڈاکٹر بنی یا اس فیلڈ میں آئی تو شہرت کے لیے نہیں آئی تھی اور نہ ہی میری ایسی کوئی سوچ تھی اور دیے بھی میں نے پوری زندگی نہ ریمپ پہ گزارنی ہے نہ میڈیا میں گزارنی ہے اس لیے میں نے اپنا بیوی سیلون کھولا کہ مجھے کوئی کام تو کرنا ہے اور پھر زندگی میں مصروف رہنے کے لیے میرے پاس کوئی ایک شعبہ تو ہے نہیں تو مجھے امید ہے کہ اللہ کی مہربانی میرے ساتھ رہے گی۔“

”میاں صاحب کیا کرتے ہیں؟ اور کیا وہ بھی آپ کی طرح لمبے ہیں۔“

”ان کا اپنا بزنس ہے۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں اور میں اپنے اوپر ہاں وہ بھی لمبے ہیں۔ 6+ ہیں اور ان ہی کی خواہش تھی کہ ان کی بیگم بھی ان ہی کی طرح اچھے قد کاٹھ کی ہو، سو میری صورت میں ان کی یہ خواہش پوری ہوئی۔“

”میاں بیوی گاڑی کے دوپہے ہیں۔ کیا ہر چیز مشترکہ ہونی چاہیے۔“

”دوسری چیزوں کا تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن اکاؤنٹ تو اپنا اپنا ہونا چاہیے۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ناویہ حسین سے اجازت چاہی۔ اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ٹائم دیا۔

سبوتاژ کی شخصیت

ماڈل _____ نایلم منیر

میک اپ _____ روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی _____ موی رضا



”پیسے کی آمد قسمت سے ہوتی ہے یا محنت سے؟“

”دونوں کا عمل دخل ہوتا ہے کہتے ہیں تاکہ دوا کے ساتھ دعا بھی ضروری ہے اور اس طرح آپ محنت کریں تو قسمت بھی آپ کا ساتھ دے گی۔“

”فریش کب ہوتی ہیں؟“

”پورا دن ہی ماشاء اللہ فریش رہتی ہوں۔ آپ کو میں نے بتایا تاکہ مجھے تھکن کا زیادہ احساس نہیں ہوتا۔ اس لیے فریش ہی رہتی ہوں۔ اور رات کو کہیں جانا ہو تو شاور لے کر ہلکا ہلکا میک اپ کر کے فریش ہو جاتی ہوں۔“

”آئینہ دیکھ کر اپنے لیے کیا نوٹ کرتی ہیں۔“

”میں تو جب بھی آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی ہوں یہ دیکھتی ہوں کہ چہرے پر کوئی دانہ تو نہیں نکل آیا۔ اسکن کیسی لگ رہی ہے۔ داغ دھبے تو نہیں آگئے اور آگئے ہیں تو کیا ٹرٹھمنٹ کرنی ہے۔“

”لوگ کس انداز میں ملتے ہیں اور کیا فرمائش کرتے ہیں آپ سے؟“

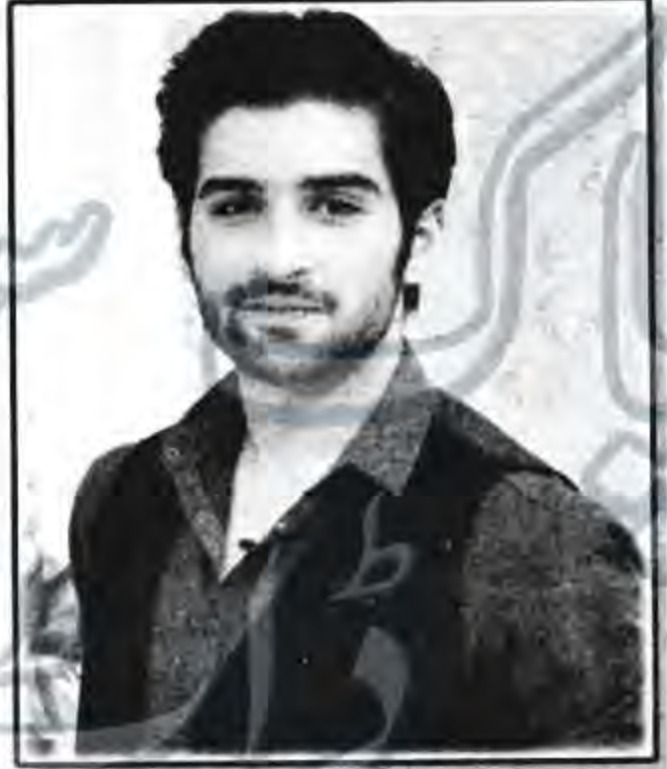
”لوگوں کا انداز محبت اور پیار کا ہی ہوتا ہے۔ تعریف کرتے ہیں میرے کام کی۔ اور یہ بھی کہتے ہیں

دستک دستک دستک

شایین رشید

”کے بعد سے تو مزید راستے ہموار ہوئے میرے لیے۔“
”کتنے پروجیکٹ مزید سائن کیے؟“
”ہنتے ہوئے۔“ ابھی نہیں بتاؤں گا۔ ابھی تو بات چیت چل رہی ہے۔

”چلیں خیر ہے۔ شوہر میں اگر مزہ آ رہا ہے۔“
”کیونکہ آپ تو ایک بزنس مین کے چشم و چراغ ہیں؟“
”جی بہت مزہ آ رہا ہے۔ بے شک میں بزنس مین کا بیٹا ہوں۔ مگر بزنس میں آنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ہمارا جو کام ہے وہ ایک بندہ بھی سنبھال سکتا ہے۔ تو پھر کیا ضرورت ہے۔ بزنس میں آنے کی۔ اور اداکاری میرا شوق میرا جنون ہے اس لیے میں اس طرف آیا۔ اور واقعی انجوائے کر رہا ہوں۔“
”شوہر کو کس طرح لیتے ہیں۔ کیا یہ محدود ہے یا لا محدود؟“



فیث بٹ

”ویسے تو یہ فیلڈ لا محدود ہے۔ مگر پھر بھی میرے لحاظ سے شوہر کی تین فیلڈز ہیں۔ ایک ماڈلنگ کی، ایک ڈراموں کی اور ایک فلم کی۔ اور حسن اتفاق سے میرا تعلق ان تینوں سے ہے۔ کیونکہ میں نے کمرشل ماڈلنگ بھی کی ہے اور دیگر بھی۔ اور ڈرامے تو آپ سب دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ اور فلم انڈسٹری سے بھی مجھے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔“

”کیا امیدیں وابستہ ہیں؟“
”یہی کہ بہت گروم کرے گی یہ انڈسٹری۔ کیونکہ کافی پڑھے لکھے لوگ اس انڈسٹری میں آگئے ہیں اور کافی حد تک انڈسٹری آرگنائزڈ ہو گئی ہے۔ اور اب تک جتنی بھی فلمیں بنی ہیں بہت ہٹ گئی ہیں۔ لوگوں

”کیا حال ہیں۔ جی؟“
”اللہ کا کرم ہے۔“
”آج کل آپ ایک اسکیٹل کی زد میں ہیں۔ کیا صداقت ہے؟“
”کوئی صداقت نہیں ہے۔ لوگوں کو اسکیٹلز بنانے کی عادت ہے۔“
”کیا ہو رہا ہے۔ آج کل۔“
”بس آپ کو بتا ہی ہے کہ اس فیلڈ میں ہیں تو کام ہی ہو گا۔“
”گنڈے ویسے ”خواب سرائے“ خوب ہٹ گیا“
”آپ کو کیا رسپانس ملا؟“
”بہت اچھا۔ سچ میں بہت پسند کیا گیا۔ اور اس

نے بہت گرم جوشی سے قلم کو ویلکم کیا ہے۔

”آپ کے کیا ارادے ہیں؟“

”ارادے تو نیک ہیں۔ اچھے اسکرپٹ کے آنے

کی دیر ہے پھر دیکھیے گا۔ کیا دھوم بچاتا ہوں میں۔“

”بہت خوب! بہت ترقی کریں۔ پیسے کی خاطر

آئے ہیں آپ انڈسٹری میں؟ سنا ہے پیسہ بہت ہے؟“

”نہیں میں پیسے کی خاطر نہیں آیا۔ اور اب واقعی

اس فیلڈ میں پیسہ ہے مجھے تو میرا شوق لے کر آیا۔

ورنہ پیسہ تو ہمارے بزنس میں بھی ماشاء اللہ کافی ہے۔“

”کام میں دیر سویر ہو تو کیا کیفیت ہوتی ہے؟ غصہ

آتا ہے یا کول کول رہتے ہیں؟“

”غصہ؟ یہی تو مسئلہ ہے کہ مرد ہونے کے باوجود مجھ

میں غصہ نہیں ہے۔ اور یہ کوئی زیادہ اچھی علامت

نہیں ہے۔ تھوڑا بہت غصہ ضرور ہونا چاہیے۔“

”اچھا! حیرت ہے؟“

”جی! آپ یقین کریں کہ جن باتوں پر چھوٹے

بچوں کو بھی غصہ آجاتا ہے مجھے اس پر بھی نہیں آتا۔

روڈ پر کوئی غلط کٹ کر دے کوئی غلط بات کر دے عموماً

لوگوں کو غصہ آجاتا ہے۔ مگر مجھے نہیں آتا۔“

”ضدی ہیں؟“

”ارے نہیں ضدی بھی نہیں ہوں بہت ڈاؤن تو

ارتھ ہوں میں۔“

”آپ جیسے لوگوں کے لیے کہا جاتا ہے کہ ان کا توہتا

نہیں ہے۔“

”تمہارے؟“

سجل

”کیا حال ہیں؟“

”جی اللہ کا شکر ہے۔“

”زندگی حسین ہے؟“

”تمہارے؟“ آپ بتائیں۔ آپ نے دیکھی میری

قلم؟“

”نی وی یہ جملکیاں دیکھیں۔ ایسا لگا کہ جیسے کسی



ڈرامے میں کام کر رہی ہوں۔ رومانس اور گانے نکال دو

تو ڈراما ہی ہے۔“

”تو اسی لیے تو ڈرامے اور فلم میں فرق ہوتا ہے۔

ڈرامے میں یہ سب کچھ کہاں ہوتا ہے۔ ہم نے تو

پہلے ہی کہا تھا کہ یہ فیملی ڈراما ٹائپ فلم ہے اور اسے

لوگ ضرور دیکھیں گے اور الحمد للہ لوگوں نے اسے

دیکھا اور پسند کیا۔ اور ثابت ہوا کہ زندگی واقعی بہت

حسین ہے۔“

”ہمارے یہاں اگر کوئی کپل تو اتر کے ساتھ کام

کر رہا ہوں تو لوگوں کی چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں۔

جو کبھی کبھی حقیقت کا روپ بھی دھار لیتی ہیں۔ ایسا

ہے؟“

”میں آپ کا مطلب سمجھ گئی ہوں۔ بس اتفاق

ہے کہ فیروز خان کے ساتھ میرا ”چپ رہو“ گل رعنا“

اور اب فلم بھی آگئی۔ تو بس لوگ شروع ہو گئے۔“

”گویا ان خبروں میں کوئی صداقت نہیں ہے۔“

”فی الحال تو نہیں ہے۔“

”آگے ہو سکتی ہے؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتی۔ یہ اوپر والے کے فیصلے

ہوتے ہیں وہ جو کرے گا بہتر کرے گا۔ فی الحال تو میں

”اس فیلڈ میں کیا خواہش لے کر آئی تھیں؟“
 ”صرف ایک ہی خواہش تھی کہ اپنی ”ماں“ کی خدمت کروں اور اللہ نے مجھے موقعہ فراہم کیا۔ اس فیلڈ میں آنے سے پہلے میں ایک جگہ ملازمت بھی کرتی تھی۔ اب تو یہی فیلڈ میرے لیے سب کچھ ہے۔“

”ماں“ تو بہت خوش ہوں گی؟
 ”ماؤں کے دل بہت بڑے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے تو کچھ نہ بھی کرو تو وہ اپنی اولاد سے خوش رہتی ہیں۔“

”تم گھر کی بڑی ہو۔ فیلڈ میں آنے سے تعلیم تو متاثر ہوئی ہوگی۔ اور دیگر بسن بھائی کی کیا مصروفیات ہیں؟“

”جی۔ متاثر تو بہت ہوئی۔ انٹر کے بعد پڑھائی چھوڑ دی، کیونکہ ذمہ داریاں جو سر پر آن پڑی تھیں۔ لاہور سے ہی میٹرک اور انٹر کیا۔ ویسے سچ پوچھیں تو پڑھائی کا اتنا زیادہ شوق نہیں تھا۔ اب پڑھائی کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے جلد ہی دوبارہ پڑھائی شروع کروں گی۔ اور ملک سے باہر جا کر تعلیم حاصل کروں گی۔ اور دیگر بسن بھائی کا آپ نے پوچھا۔ تو صبور نے میرے ساتھ ہی شوبز جوائن کیا تھا۔ مگر پھر پڑھائی کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ اب کچھ عرصے سے وہ اس فیلڈ میں آگئی ہے۔ اور چھوٹے بھائی کا ارادہ آسٹریلیا جا کر تعلیم حاصل کرنے کا ہے۔“

”اپنی زندگی سے خوش ہیں؟“
 ”بہت خوش اور میں سمجھتی ہوں کہ انسان جتنی جلدی میچور ہو کر اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے لگے اتنا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔“

”کم عمری میں کافی کام کیا۔ کوئی ایوارڈ ملا؟“
 ”مسکراتے ہوئے“ یہاں بندہ نامزد تو ہو جاتا ہے مگر ضروری نہیں کہ اسے ایوارڈ بھی ملے، میں لکس ایوارڈ میں تین بار نامزد ہوئی، ”ننھی“ ”سنانا“ کے لیے۔ مگر ایوارڈ حاصل نہ کر سکی۔ خیر کوئی بات

اور فیروز اچھے دوست ہیں۔“
 ”اس انڈسٹری میں خواہ ڈرامے ہوں یا فلم۔ شاید آپ سب سے کم عمر فنکارہ ہیں۔“
 ”اب تو نہیں۔ کیونکہ اب تو میں بڑی ہو گئی ہوں۔ البتہ جب میں اس فیلڈ میں آئی تھی تو بہت کم عمر تھی۔ یہی کوئی پندرہ سال کی یا سولہ سال کی۔ اور کردار مجھے اچھے اور میچور ملے۔ شروع سے ہی۔ اس لیے میری جگہ جلدی بن گئی۔“
 ”کیا وجہ تھی اتنی کم عمری میں اس فیلڈ میں آنے کی۔“

”کچھ فیصلے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے۔ بلکہ میں تو یہی کہوں گی کہ کوئی بھی فیصلہ اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ جو کچھ کرتا ہے اور والا کرتا ہے۔ بس اتفاقاً اور حادثاتی طور پر اس فیلڈ میں آگئی، شاید میرے رب نے میرے لیے یہی لکھا تھا۔“
 ”خوش ہیں؟“
 ”بہت خوش ہوں۔“

دوش بکس کا ادھر کرنا

Herbal

سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO

اس کے استعمال سے چندوں میں خشکی ختم ہے
 کرتے ہوئے بالوں کو دلتا ہے
 بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے

قیمت 90/- روپے

رجسٹری سے منگوانے پر ادھر مٹی آرڈر سے منگوانے والے

دو بکس 250/- روپے تین بکس 350/- روپے

اس میں ڈاک خرچ اور بیکنگ چارج شامل ہیں۔

بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ

پتہ: بکس 53، انڈسٹریل ایریا، جٹ روڈ، کراچی۔

دفعہ خریدنے کے لیے:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، مارہ پانڈر کراچی۔ فون نمبر 32218361



نہیں۔ کبھی نہ کبھی تو ملے گا ہی۔“
ثروت گیلانی

”کیا حال ہیں ثروت؟“
”اللہ کا شکر ہے۔ آپ سنا میں۔“
”الحمد للہ۔ بیٹا کیسا ہے؟“
”ماشاء اللہ بہت کیوٹ ہے۔“
”کس پر گیا ہے؟“

”آپا! ہم سب کا مکسچو ہے۔ ماشاء اللہ بہت پیارا ہے۔ اب تو چلنے بھی لگا ہے۔“
”ماشاء اللہ! آج کل کمرشلز میں اور مارننگ شوز میں دیکھ رہی ہوں۔ ڈراموں سے کنار کشی کر لی کیا؟“
”ارے نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ بیٹا ابھی چھوٹا ہے تو ڈراموں کی طرف توجہ نہیں دے پا رہی۔ کیونکہ ڈراموں کی شوٹ میں کافی ٹائم لگ جاتا ہے۔ جب کہ کمرشلز میں وقت کم لگتا ہے تو بس کمرشلز کی طرف ہی زیادہ توجہ ہے۔ مارننگ شوز میں بھی کم ہی جاتی ہوں۔“

چاہتا ہے کہ جب میں شام کو گھر آؤں تو مجھے میری بیوی تیار اور مسکراتی ہوئی ملے تاکہ میری دن بھر کی تھکن دور ہو جائے۔“

”اچھا۔ گف۔ تو کیا ایسا ہوتا ہے؟“
”جی۔ بالکل ہوتا ہے۔ میں رات دیر تک والا کوئی کام نہیں لیتی اور میری کوشش ہوتی ہے کہ فمد کے آنے سے پہلے میں گھر پر موجود ہوں۔“
”وقت کے ساتھ ساتھ محبت میں اضافہ ہو رہا ہے یا ایک ٹارمل لائف گزر رہی ہے؟“
”ٹارمل لائف تو گزر رہی ہے، مگر سچ پوچھیں تو ہماری محبت میں روز افزوں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔“
”ماشاء اللہ۔ شکر یہ ثروت۔ اب تمہارا کوئی نیا سیریل آئے گا تو زحمت دوں گی۔“
”جی ضرور۔“

”سنا ہے کہ آپ اب کامیڈی رول کرنا چاہتی ہیں؟“
”جی۔ جی۔ بالکل۔ میں نے سوچا کہ سنجیدہ رول تو بہت کر لیے اب ذرا کامیڈی بھی کر لی جائے۔ اس لیے جلد ہی کسی کامیڈی رول میں آپ کو نظر آؤں گی۔“
”عموماً ڈاکٹر۔ ڈاکٹر سے شادی کو ترجیح دیتے ہیں، مگر فمد نے ایک آرٹسٹ سے شادی کی۔ دونوں الگ۔ دونوں معروف؟“

”جی ایک تو فمد مجھے بہت زمانے سے پسند کرتے تھے، ہماری آپس میں بہت اچھی انڈراسٹینڈنگ بھی ہو گئی تھی۔ ویسے یہ بات کسی اور نے بھی پوچھی تھی تو فمد کا جواب تھا کہ ”ڈاکٹر سے شادی اس لیے نہیں کی کہ ڈاکٹر کی ڈیوٹی بہت سخت ہوتی ہے جب کہ میرا رول



والد کو اپنے پیاروں کی یاد میں غم زدہ ہی دیکھا۔ بڑی قربانیوں کے بعد یہ پاک سرزمین حاصل ہوئی ہے۔ اس کی قدر کرنی چاہیے۔ ہندوؤں نے اس وقت مسلمانوں کے ساتھ وفا نہیں کی۔ ساری عمر ساتھ رہنے والوں نے تقسیم ہند کے وقت اپنی آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ اس کہانی کا لفظ لفظ سچا ہے۔ میرے والد بھی نارنول کے بااثر زمین دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنی ساز و سامان سے بھری حوٹلی ایسے ہی چھوڑ کر آگئے تھے کہ جب حالات اچھے ہوں گے تب جا کر لے آئیں گے مگر پھر کبھی لوٹ کر نہ گئے۔ سادگی اور قناعت سے اپنی ساری عمر گزار دی۔ تقسیم ہند کے وقت سب ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ گلیوں میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ ہندوؤں نے پوری پوری پاکستان آنے والی ریل گاڑیاں کاٹ ڈالی تھیں۔ بہت ہی مشکل وقت تھا مگر ہم آج اپنے ملک کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں؟

”پہاں ساز“ کا اختتام پڑھ کر آنکھیں بھیگ گئیں۔ زل اور باسل کو ایک ہونا ہی تھا۔ جب اللہ ہماری بڑی سے بڑی خطا کو معاف فرما دیتا ہے تو ہم انسانوں کی کیا اوقات؟ ”خط آپ کے“ میری توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ کوثر خالد اور فوزیہ ثمر بٹ آپ لوگ تو اس سلسلے کی جان ہو اور قارئین کے شکوے بھرے خطوط پڑھ کر تو واقعی چکر سے آنے لگتے ہیں۔ نادیہ جمالیگر کا افسانہ ”چٹنی“ کچھ پسند نہ آیا۔

”شہر خطا“ نایاب جیلانی اس دفعہ کی قطعہ بست کلاس کی لگی۔ شروع میں تو سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا اب کہانی کھل کر سامنے آگئی ہے اور بہت دلچسپ بھی ہو گئی ہے۔ ”خواب شیشے کا“ اچھا جا رہا ہے۔ بالی سارے سلسلے بھی ٹھیک ہی لگے۔ ج : پیاری شینہ! ہم آپ کے دکھ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اپنے پیاروں کی جدائی کا غم سنا آسان نہیں ہوتا۔ وقت ان کی یادوں کو دھندلا ضرور دیتا ہے لیکن زخم مندمل نہیں ہوتے، ہر خوشی، غمی میں ان کی یاد آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے اور بہت ساری خوشیاں دکھائے۔ بیماری کے باوجود آپ نے ہمیں یاد رکھا اور بصرہ کیا اس کے لیے بہت شکریہ۔

صائمہ جاوید ملتان سے لکھتی ہیں

عمر سعید کے بارے میں پڑھ کر دلی رنج ہوا۔ اتنا عظیم



خط بچوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔

Email: shuaa@khawateendigest.com

کراچی سے شینہ اکرم شریک محفل ہیں، لکھا ہے عمر سعید کی ناگہانی وفات پر دل کی گہرائیوں سے دکھ ہوا۔ کچھ دل کے زخم ہرے ہوئے۔ 11 نومبر کو شہید معین اکرم کو ایصال ثواب پہنچایا تو عمر سعید اور محترمہ انور جہاں کے درجات کی بلندی اور مغفرت کے لیے خصوصی دعا کی۔ اپنی خرابی طبیعت کے باوجود آج میرے قلم اٹھانے کا محرک بنا مصباح علی کا ناول ”حاصل کشت و خون“۔ اس ناول کو پڑھ کر جتنا حیران ہوئی کم تھا۔ آج کے دور کی رائٹر نے تقسیم آزادی کی کس قدر رچی اور حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ مجھے بے اختیار اپنے ابا جی یاد آگئے جو اکثر و بیشتر ہمیں آزادی کی خاک و خون میں ڈوبی یہی داستان سنایا کرتے تھے۔ میرے ابا جی اس وقت نوجوان تھے اور وہ بھارت کے علاقے نارنول سے تعلق رکھتے تھے جہاں سب سے زیادہ مسلمانوں کا خون بہایا گیا تھا 1947ء میں میرے والد صاحب بھی اپنے خاندان کے سینکڑوں لوگوں کی شہادت کے بعد پاکستان بچ کر آنے والے واحد فرد تھے۔ ہر عید پر

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف ایڈفرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

The screenshot shows a Facebook post from Pak Society. The post has a blue background with white text. It includes a list of four steps to get notifications: 1. Open Paksociety Page, 2. Click Liked, 3. Select Get Notifications, and 4. Select See First. Below the list, it says 'All Done'. To the right of the text, there is a screenshot of the Facebook interface showing the 'Liked' button and the 'Get Notifications' dropdown menu. The 'Get Notifications' menu is open, showing options like 'Add to Interest Lists...', 'Unlike', 'IN YOUR NEWS FEED', 'See First' (which is selected), 'Default', and 'Unfollow'.

راسترو دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ عمر سعید کے درجات بلند فرمائے اور ان کی فیملی کو صبر جمیل دے۔
مستقل سلسلے سب ہی اچھے ہیں۔ کچھ عرصہ سے چلنے والا ”تجھ سے ناتا“ بہت اچھی کاوش ہے۔ بہت سی قارئین کو ڈھارس ملے گی کہ وہ اس ”محاذ“ پر تھما نہیں ہیں۔ بہت سی قارئین کو رہنمائی ملے گی اور کچھ کو یہ ”سہم بھرے قصے“ پڑھ کر شادی کے نام سے ہی خوف آنے لگے گا (بابا!)

”شعاع کے ساتھ ساتھ“ اگرچہ بہت پرانا سلسلہ ہے مگر بہت اچھا لگتا ہے، قارئین کی روداد پڑھ کے ”خواب شیشے کا“ اچھا جا رہا ہے مگر اب تو وہ حالات ہو چکے ہیں کہ بند لفظ سے خط کا متن جان لیتے ہیں (یہ الگ بات ہے کہ انجام تک تپ کا پتا لکھاری کے ہاتھ میں ہوتا ہے) موجد آندری کی اصلیت سامنے آنے کا انتظار ہے۔

ناولٹ بھی اچھے ہیں۔ ہاں قسط وار ناولٹ یا ناولٹس اب گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔

”کنیزاں کے نام“ بہت سحر کی تحریروں سے ہٹ کر نئی یوں جیسے 90 کی دہائی کی کوئی تحریر پڑھ رہی ہوں۔ موضوع پرانا تھا بلکہ آغاز و انجام سب ہی پہلے کئی مرتبہ پڑھے ہوئے لگے۔

باقی افسانے بھی اچھے رہے اور ہاں! نادیہ ڈیر چٹنی مجھے بہت پسند ہے۔ مگر آج کے بعد تو انکار کا سوال ہی نہیں۔ ”حاصل کشت و خون“ مکمل ناول کی فہرست میں بہت عمدہ تحریر پڑھنے کو ملی۔ خوب صورت منظر نگاری جالیوں سے جھانکنے کا نظارہ بہت اچھا لگا۔ پتا نہیں کیوں مجھے مٹی ٹیپ اور سادہ سے لوگ بہت بھاتے ہیں۔ موضوع بہت جان دار تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے تحریری انداز بہت اچھا ہو گیا ہے مصباح کا۔

”پیال ساز“ وہ تحریر ہے جس کی تعریف کے لیے میرے الفاظ ناقص و کمزور ہیں اعلیٰ بہت کاری اور منظر نگاری کہ ہر لفظ باندھ لیتا تھا۔ کردار تو اعلیٰ تھے ہی، میں تو الفاظ کی کرشمہ سازی سے مبہوت رہ جاتی تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے اور ایمل رضا آپ خوش قسمت ہیں۔ بہت مبارک ہو۔

سب ہی کردار ایک سے بڑھ کر ایک مگر مجھے گلناب عالم سے نانو کے قالب میں ڈھلتے کردار نے سب سے زیادہ متاثر کیا یہ وہ کردار تھا جو شعوری طور پر اپنے آپ کو مٹا

کے خدمت کے راستے اللہ کے آگے جھکا۔ باقی کردار وقت کے ہاتھوں مختلف رنگوں میں ڈھلتے ہمیں سزا اور جزا کے رمز سمجھاتے رہے۔ پہلی سطر سے ایسا لگتا جیسے یہ تمام منظر میرے ارد گرد آگ آئے ہوں اور میں ان کا حصہ ہوں۔ ایسی تحریر اگر قسط وار بھی آجائے تو انتظار بھلا ہی لگتا ہے۔
ج : پیاری صائمہ! ہماری خوش نصیبی ہے کہ بہترین لکھاریوں کے ساتھ ساتھ بہت ذہین قارئین کا ساتھ بھی ملا ہے۔ اتنے خوب صورت الفاظ میں جامع بصرہ آپ کی ذہانت کو ظاہر کرتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ہم شعاع کا معیار برقرار رکھ سکیں اور ہماری قارئین ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں۔

انعم توکل نے ننگانہ صاحب سے لکھا ہے

تقریباً دس بارہ سال پہلے کی بات ہے جب میں نے رسالہ پڑھنا شروع کیا تھا۔ اب میں خیر سے دو بچوں (بھیل اور دعا قاسم) کی ماما جانی بن گئی ہوں ابھی تک اس کا ساتھ جاری ہے۔ اب بات ہو جائے رسالے کی تو جناب پہلی شعاع سے لے کر خوب صورت بننے تک ہر لفظ موتیوں میں پرویا لگتا ہے۔ رقص بسکٹ بہت اچھا لیکن کم صفحات کی وجہ سے تقشقی سی رہ جاتی ہے۔ پیال ساز کا اختتام جیسا سوچا تھا ویسے ہی ہوا ہے۔ خواب شیشے کا بھی بہت اچھا جا رہا

ہے افسانوں میں چٹنی نادیہ جمائے بازی لے گئی۔

ج : پیاری انعم! پرچے کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کا اور ہمارا یہ ساتھ ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین

جویریہ افضل نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے

چند ورق پلٹتے ہی پہلی شعاع دیکھی لفظ گری اور ان کی تاثیر کا آپ نے ذکر کیا۔ شعاع میں آپ نے بہت بڑا انکشاف کیا۔ حیرت سے آنکھیں کھل گئیں اور پھر بھیگتی چلی گئیں۔ اتنے بڑے تخلیق کار اب ہم میں نہیں رہے۔ دکھ۔ بے حد دکھ۔ اس بات کا قلق ہو رہا ہے آخر اس قدر خوب صورت نام ہے ”عمر“ اپنے نام سے کیوں نہیں لکھا ”سفال گر“ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

”پیال ساز“ اور اس کے ساتھ ”حاصل کشت و خون“ دونوں ہی مکمل ناول اور نام چونکا دینے والے۔

لسٹ دیکھتے ہی بڑی آپا سے رجوع کرنا پڑا حاصل کشت و خون کا مطلب پوچھنے کے لیے پہلے تو انہوں نے غور سے

جان ہے اس میں۔ شرخطا یقیناً ”بہت ہٹ جانے والا ہے ہر ہر سطر سحر طاری کرنے والی ہوتی ہے۔ موضوع بہت اسٹرونک ہے۔ ویلڈن نایاب ایسے ہی اچھا اچھا لکھیں۔ مصباح علی کو میں نے جتنا بھی پڑھا بیٹھ اچھا ہی لگا مگر حاصل کشت و خون سب سے بڑھ کر لگا۔ ناول کے شروع کرتے ہی فکر مندی اور درمیان تک آتے آتے دل باقاعدہ دھک دھک کرتا رہا۔ بہت کچھ الگ سا پڑھنے کو ملا اور کئی جگہ پر آنکھیں نم ہو گئیں۔ صد شکر کہ بیان نے مبرا کو اپنا لیا ورنہ میں۔ رونے کے بعد کئی دن تک اداس رہنے والی تھی بہر حال دل جیت لیا مصباح آپ نے عمر بھائی (عمر سعید) کی وفات کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا، بے شک وہ ایک عظیم اور میرے فیورٹ رائٹر تھے امیر خالد نے بھی اچھا سبق دیا اور ثناء عمران کا انداز مزے کا لگا۔ بنت سحر کے لیے میرے پاس یہی الفاظ ہیں کہ ان کو جتنا بھی پڑھ لو مزید کی طلب رہتی ہے۔

ج: پیاری عروج! اللہ پاک آپ کی نانو کو صحت کلی عطا فرمائے آمین۔ پرچے کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ عروج آپ کے افسانے زیر غور ہیں۔ مطلب ریجیکٹ نہیں ہوئے بس کچھ خامیاں ہیں صحیح کر کے شائع ہو جائیں گے۔

منشاء قاسم لاہور سے لکھتی ہیں

سورق خاص متاثر نہیں کر سکا۔ سفال گر کے خالق کی

موت پر دل دکھ سے بھر گیا۔ سفال گر جیسی تحریریں صدیوں بعد وجود میں آتی ہیں۔ ”خواب شیشے کا“ عفت سحر کی ہلکی پھلکی تحریر ہے۔ ”رقص بگل“ نبیلہ جی کب ختم کریں گی یہ رقص؟ کوئی نیا ناول ہی شروع کر دیں۔ ”پیال ساز“ ایمل رضا آپ کی تعریف نہ کرنا تو زیادتی ہوگی جیسے شاندار آپ افسانے لکھتی ہیں اتنا شاندار جاندار ناول لکھا۔ گلزار عالم کا کردار پورے ناول پر چھایا رہا۔ ”حاصل کشت و خون“ مصباح بھڑکی تم نے سحر میں جکڑ لیا۔ شعاع میں تمہاری انٹری (مکمل ناول کی صورت) دھلکے دار ہے۔ سچ کہوں تو اس ناول نے مجھے فلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ سہتی اور امرت دونوں دل کے کھوٹے ایک نے سہیلی کا مان توڑا۔ دوسرے نے دوستی کا فخر مصباح دوبارہ جلدی آتا۔ ”کنیزاں کے نام“ بنت سحر تمہارا یہ افسانہ سب افسانوں سے بہترین رہا۔ مگر اب مکمل ناول لکھو کوئی۔ حیات

دیکھا پھر چند اور اناق بیچ بیچ سے پٹنے اور پھر آرام سے رسالے لے کر ایک جانب بیٹھ گئیں، ہمیں تو دس ہی نہ۔ سارا پڑھ کر بہت دیر گم صم رہیں پھر مجھے تھما کر کہا پڑھ لو سمجھ میں آجائے گا۔ تو واقعی مصباح صاحبہ پڑھتے ہوئے ہماری آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ لفظ، جملے، منظر اور اس قدر مختلف موضوع پڑھتے ہوئے اس ناول کی تعریف کے لیے حقیقتاً ”الفاظ کم پڑ گئے۔ اور سے ایسے دنوں میں لکھا گیا جب ملک دھرنوں اور لڑائی جھگڑوں میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ سہتی کے لفظ کاٹ کے رہ گئے ”ماسی ایہ آزادی کے نعرے لگانے والے ایک دن بھوک کے پیچھے اک دو بچے کو کاٹ کاٹ کھا میں گے۔“ ناولٹ میں تو نایاب جیلانی کا شرخطا بے حد زبردست۔ مجھے ان کی کہانی اور منظر نگاری اچھی لگی مگر کرداروں کے نام بہت مشکل رکھے۔ افسانوں میں ثناء عمران کا ”اک ذرا انتظار“ سب افسانوں پر بھاری تھا۔ واقعی کالے رنگ کو لوگ بُرا ضرور سمجھتے ہیں مگر اس میں جو کراماتی اور طلسمی طاقت ہوتی ہے۔ وہ ہر کوئی محسوس نہیں کر سکتا۔ شاباش ہمارے لیے لکھتی رہیں۔

ج: پیاری جویریہ بہت شکریہ! بہت عمدہ تبصرہ کیا آپ نے، ہم آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

عروج ملک سندر نگر ڈی جی خان سے شرکت کر رہی ہیں لکھا ہے

”پیال ساز“ کا اینڈ جتنا حسب توقع تھا۔ اتنا ہی زبردست۔ تھوڑی سی کمی محسوس ہوئی جانے کیوں۔ مگر ایمل نے ایک بہت پیارا ناول پیش کیا۔ شروع سے آخر تک میں پیال ساز کے حصار میں کچھ اس طرح رہی کہ آخری قسط کا سن کر ہی بے چینی سی ہوئی۔ ایمل آپ نے ہر کردار بہت محبت سے تخلیق کیا۔ خاص کر زل تو بہت سی پیاری لگی۔ بالکل موی گڑیا اور نانو مجھے ان سے بے حد محبت ہے کیونکہ ایسی ہی نانو اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی عطا کی ہے جو مجھ پر جان نچھاور کرتی ہیں چند ماہ سے ان پر کالے ریرقان نے حملہ کیا ہوا ہے۔ نایاب جیلانی کا ناول ”اف اف“ ڈیر آپلی آپ خود کتنی پیاری ہوں گی کہ اتنا خوب صورت ناول ہمارے لیے تحریر کر رہی ہیں۔ مجھے نایاب جیلانی کی منظر نگاری بہت بہت متاثر کرتی ہے اور میری

اللہ دو بچوں کی اماں جان بن چکی ہیں آپ نے ہمیں خط لکھا ہے۔ اتنی تاخیر کیوں؟ اور اتنا مختصر خط بس ایک ہی کہانی اور ایک ہی سلسلے پر بصرہ؟

ثوبیہ شمین باغ ایک سے تشریف لائی ہیں لکھا ہے "خواب شیشے کا" بہت خوب صورت تحریر موحّد، طلال اور مہیاہ پتا نہیں اس تکون کا اینڈ کیا لگتا ہے "پیاں ساز" کا اینڈ توقع کے مطابق تھا۔ خوب صورت الفاظ سے آراستہ یہ تحریر یاد رہے گی۔

نادیہ جمالتیر کی "چٹنی" نے بہت عمدہ سبق دیا۔ امبر خالد کی "یہی حیات نبض ہے" کے لیے الفاظ نہیں۔ بہت اعلیٰ۔ سدرہ حیات کی "خواہشوں کے موسم" نے پرائنڈ کے چکر سے نکالنے کا فریضہ بخوبی سرانجام دیا "رقص بزل" ایک بہت خوب صورت تحریر لیکن پلیز اس کے صفحات بڑھادیں۔

ج: پیاری ثوبیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی شرکت کرتی رہیں گی۔

عائشہ انصاری لکھتی ہیں

"پیری نبی کی کی پیاری باتیں" روح کو سرشار اور ایمان کو تازہ کر دیتی ہیں۔ سب سے پہلے "خواب شیشے کا" کی قسط پڑھی۔ ٹاپک عام سا ہے لیکن کہانی میں جان ہے۔ اس کے بعد دوڑی "پیاں ساز" کے اختتام کی جانب کہانی اچھی ہی نہیں بہت اچھی تھی "رقص بزل" تو اب ڈرانے لگی ہے "حاصل کشت و خون" مصباح علی! تحریر بہت ہی اعلیٰ پائے کی تھی "پس مرگ" کے لیے رائٹر سے

نبض "امبر خالد کے افسانے میں ہم لڑکیوں کے لیے بہت اچھا سبق وہاں لڑکوں کے لیے بھی نصیحت ساثرہ رضا سے سلسلے وار ناول لکھنے کی فرمائش کریں۔

ج: پیاری منشاء! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ساثرہ رضا سے سلسلے وار ناول کی فرمائش ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ فی الحال وہ معروف ہیں لیکن جلد ہی آپ کے لیے طویل سلسلے وار ناول لکھیں گی۔

حافظہ شزاوی نے شرق پور شریف سے لکھا ہے

نا مثل اچھا تھا۔ حمد و نعت اور احادیث بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ میں اسلامی ادارے کی طالبہ ہوں۔ ایمل رضا کا "پیاں ساز" اچھا لگا۔ میں نے کہانی بھیجی ہے۔ اس کے بارے میں بتادیں۔

ج: آپ کا خط پڑھنے کے بعد کہانی پڑھی۔ معذرت خواہ ہیں کہانی شائع نہیں ہو سکتی۔ فی الحال آپ صرف مطالعے پر توجہ دیں۔

جیلہ نور چشتی نے میاں چنوں سے شرکت کی ہے، جیلہ نور چشتی ہیں

آپ کے سب پرچے بہت اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں۔ پیاں ساز ایمل رضا کا بہت اچھا ناول ہے اور اس کا اینڈ بھی بہت اچھا ہوا۔ نانو کا کردار سب سے زیادہ پسند آیا۔ اس ماہ کی مسکراہٹیں بہت پسند آئیں خاص طور پر "لیش انت دو پاکستان"

ج: پیاری جیلہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید آپ پانچویں کلاس سے پڑھا پڑھ رہی ہیں اور اب جب ماشاء

ضروری وضاحت

نمبر کے شمارے میں صباحت عمران کا افسانہ "پس مرگ" شائع ہوا تھا۔ یہ ایک فرضی اور تخیل پر مبنی تحریر تھی۔ جس کا حقیقت سے دور دور کا واسطہ نہیں تھا۔

ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ اس کہانی میں عمر سعید سمیت ان سے منسلک کچھ لوگوں کو بلاوجہ ملوث کرنے اور انہیں تکلیف پہنچانے کی مذموم کوشش کی گئی ہے جبکہ عمر سعید خوش باش، مرنجان مرنج اور زندگی سے بھرپور شخصیت تھے۔ انہیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر ہر جگہ پذیرائی ملی اور ان کی تحریروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ عمر سعید کے اہل خانہ اور ان سے منسلک دیگر افراد کو اس تحریر کی وجہ سے جو تکلیف ہوئی اس کا ہمیں افسوس ہے اور ادارہ اس کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ عمر سعید اور ان سے منسلک لوگوں کا اس کہانی یا اس کے مندرجات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

زبردستی خط لکھوا رہے ہیں کہ شدت سے ساجدہ حبیب
بٹی یاد آ رہی ہیں، کبھی وہ اس طرح لکھا کرتی تھیں جیسے کوئی
دل کاغذ پر اتار رہا ہو، میں خود بھی حیران ہوں کہ آج سے
پہلے مصباح ہلکا پھلکا لکھتی رہیں، ان میں کہانی اور الفاظ کا
انتا تال میل پوشیدہ ہے بقول ابا انہیں بیان اور مبرا کی
راج نگر کی آخری ملاقات اور لاہور میں پہلی ملاقات۔
زہرہ کا رویہ بے تحاشا پسند آیا اور بھی جانے کیا کیا کہہ رہے
ہیں میں کیا کیا لکھوں۔

اور آپ کو ایک اور بات بتاؤں، امتل آج سے تقریباً
چھ سات سال پہلے جب ”سفال گر“ لگا تھا، ابا نے مجھ سے
شرط لگائی تھی کہ عمارہ لکھوا کر رکھ لو۔ یہ تحریر کسی لڑکی کی

ہو ہی نہیں سکتی اور اب جب شرط جیت گئے تو ان کی
آنکھیں نم تھیں ہمیں تب بتا چلا جب شاہکار دنیا ہی چھوڑ
گیا۔ میرے ابا کو شرط لگانے کی بہت عادت ہے۔ دو
تین رائیٹرز کے بارے میں اب بھی مجھ سے شرط لگا رہے
ہیں۔ اب بابا نامہ بہت ہو گیا۔ اب کچھ اپنی بات بھی لکھ
دوں، مجھے امیر خالد کا یہی حیات نبض ہے بہت اچھا لگا۔
آج کل کی لڑکیوں کو بطور خاص پڑھنا چاہیے، خواہشوں کا
موسم کچھ زیادہ دل پر نہ لگا۔ فاطمہ صفری قادر کا تجھ سے ناتا
جوڑا تو بالکل مجھے ایسا لگا جیسے ہمارے خاندان کا ذکر خیر ہو۔
بہت سی باتوں میں مماثلت ہے۔ اور ن، ق کا پڑھ کر دل کو
صدے نے آن گھیرا۔

ج : پیاری ام عمارہ! اپنے والد محترم کی خدمت میں
ہماری طرف سے سلام عرض کیجیے گا جنہوں نے
انتہائی بے ساختہ، دلچسپ اور شان دار تبصرہ آپ سے
لکھوایا۔ بخدا پڑھ کر مزہ آگیا۔ آپ کے ابا جان نے جو شرط
لگائی ہے، مزید رائیٹرز کی، ہمیں بھی لکھ بھیج دیتیں۔ ہماری
معلومات میں بھی اضافہ ہوتا۔ ان سے کہیے گا کہ وہ قیام
پاکستان کے واقعات ہمیں لکھ بھیجیں۔ انہیں کہانی کے
قالب میں ڈھالنا ہمارا کام ہے۔ اور ہاں ایک دفعہ پھر ان کا
شکریہ۔

سیرت امین میاں چنوں سے شریک محفل ہیں

سپر ہٹ رہا اس بار کا شمارہ بھی، سب سے پہلے آتے ہیں
ایمل رضا کے ناول کی طرف۔ اختتام ویسا نہیں ہوا جیسا
ہونا تھا۔ جلدی میں بننا دیا گیا اچھا نہیں لگا۔ شہر خطا کی یہ

صرف اتنا کہیں گی کہ آپ نے جیسے ”محفل لوٹ لی۔
بنت سحر!“ (کنیزاں کے نام) ایسی کہانیاں کثرت سے لکھی
جانی چاہئیں۔ ”چٹنی“ نادیہ جمناگیر! بڑے بولوں کا بھیانک
انجام! ”اک ذرا انتظار“ ہمارے معاشرے کا شرمناک
المیہ۔ ”تیری اک نظر“ سوسورہی۔ ”یہی حیات نبض ہے
“امیر خالد! لڑکیوں کو انتہائی اہم سبق دیا آپ نے۔ کول
میں مجھے اپنی جھلک نظر آئی شہر خطا پہ تبصرہ محفوظ رہا۔
”خواہشوں کا موسم“ بھی ٹھیک تھی۔ ”خط آپ کے“ کوثر
خالد صاحبہ! کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ ٹینے آلی کی طرح یہ
بھی واضح کر دیتیں کہ اپنے خط میں آپ نے کون سی عائشہ

کا ذکر کیا ہے۔

ج : پیاری عائشہ! آپ نے تمام تحریروں پر تبصرہ کیا، اچھا
لگا اور یہ شہر خطا پہ تبصرہ کیوں محفوظ کر لیا۔ آپ اندازہ
نہیں کر سکتیں۔ اتنی طویل تحریروں لکھنے والے جتنی بے
تابی اور بے چینی سے قارئین کی رائے کے منتظر ہوتے
ہیں۔

اور آپ اپنے شہر کا نام تو لکھتا بھول ہی گئیں۔ آئندہ
اپنے شہر کا نام ضرور لکھیے گا۔

ام عمارہ نے جھنگ سے لکھا ہے

میرے ابا جان جو چند گھنٹے چھوڑ کر رہتے ہیں۔ پرسوں
آئے، تقریباً آدھے صبح سے ہی پکارنے لگے۔ ”عمارہ
بیٹے! کہاں ہو تم۔ جلدی آؤ“ میں کمرے سے نکلی، ان کے
ہاتھ میں شعاع دیکھ کر کچھ خاص حیرانی نہیں ہوئی کیونکہ یہ
ڈیوٹی ابا ہی کی ہے اور میری شادی کے بعد بھی وہ اسے بخوبی
نہا رہے ہیں کیونکہ انہوں نے خود بھی پڑھنے ہوتے ہیں۔
پہلے خریدیں گے پھر پڑھیں گے پھر مجھے دے جاتے ہیں۔
لیکن اتنے بے قرار تب ہی لگتے ہیں جب کچھ خاص پڑھ
لیں تو بھی انہوں نے خاص پڑھ لیا۔ ”حاصل کشت و
خوں“ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ان کی بے پناہ تعریفی
جملوں میں سے کون سے لکھوں۔ کون سے چھوڑوں اگر
اس وقت کی منظر نگاری اور اپنا اور ابا کا مکالمہ لکھوں تو آپ
بھی جھوم ہی جائیں کیونکہ ان کی گردن الگ جھوم رہی
ہے اور آنکھیں الگ اور ایک ہی لفظ کی تکرار شاہکار ہے
بھئی کمال کر دیا مصباح بٹی نے، ”عرصہ یاد رہنے والا۔“
پرسوں کہہ رہے تھے ابھی کہ ابھی خط لکھوں۔ آج تو

امی کو ہمارا سلام پہنچادیں۔ ہماری اتنی دیرینہ قاری کے لیے ہمارے دل میں بہت احترام و محبت ہے۔ ہم ان کی فرمائش ضرور پوری کریں گے ویسے آپس کی بات ہے زیادہ مشکل مشکل کمائیاں ہمیں بھی اچھی نہیں لگتیں۔

فرحت اشرف گھمن نے سیروالا سے شرکت کی ہے

اس ماہ کا ٹائٹل نائٹ تھا۔ سیاہ حاشیہ میں عدینہ اور صالحہ کا آپس میں کیا رشتہ تھا۔ جس شمارے میں حقیقت کھلی تھی۔ اس ماہ کا شمارہ مجھ سے مس ہو گیا تھا اور یک ماہیر کے نام کا کیا مطلب ہے۔

جب مجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ فاطمہ شکر ہے آپ کو اتنا اچھا سسرال ملا۔ ن! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کے شوہر کے دل میں آپ کے لیے محبت پیدا کرے۔ مجھے تو سسرال نام سے ہی ڈر لگتا ہے۔ ناول ”رقص بکسل“ اتنا کم کیوں آتا ہے ”خواب شیشے کا“ آئی تھنک زرنگار نے آجانا ہے۔ مکمل ناول ”پیال ساز“ ایمل رضانے بہت اچھا اینڈ کیا۔

ج : پیاری فرحت! اور ید اور ماہیر کے نام کا کیا مطلب ہے۔ یہ تو صائمہ ہی بتا سکتی ہیں۔

عدینہ اور صالحہ آپا کے درمیان ماں بیٹی کا رشتہ تھا اور یہ بات تو شروع سے ہی واضح تھی۔ رقص بکسل کے صفحات کم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ نبیلہ عزیز کے کچھ ذاتی مسائل ہیں۔ آپ ان کے لیے دعا کریں۔ وہ اپنے مسائل سے نجات پائیں اور ہمارے لیے زیادہ سے زیادہ لکھیں۔ بلاشبہ وہ بہت باصلاحیت مصنفہ ہیں۔

شعاع اور خواتین آپ کو ایک پیکٹ میں بھجوائے جا سکتے ہیں اور آپ چاہیں تو غلطیہ بھی مل سکتا ہے۔ یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔

اقصی ماہ نور ہراج نے داؤد والہ قلمیہ سے لکھا ہے

قسط زبردست رہی۔ کردار واضح ہو گئے ہیں۔ افسانے سب ہی اچھے تھے۔

سب سے اچھا گلابی دنیا لگا، باقی تمام ناول اچھے تھے خواہشوں کا موسم! سدرہ حیات ویل ڈن۔۔۔ حاصل کشت و خون اپنے عنوان پر پورا اترا بہت میجیور تحریر۔۔۔ قلم سے مکمل انصاف کیا مصباح علی نے۔ خواب شیشے کا اور رقص بکسل بھی کامیابی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ میری دعائیں نبیلہ عزیز اور غفت سحر صاحبہ کے ساتھ ہیں اور تمام سلسلے بہت اچھے رہے خاص طور پر پیارے نبی کی پیاری باتیں اور موسم کے پکوان۔ سب سے آخر میں ذرا تفصیل سے بات کروں گی ”پس مرگ“ یہ۔۔۔ یہ افسانہ نہیں تھا۔ یہ تھا جو بہ صفحات۔ بلکہ آنسو تھے جو قطرہ قطرہ۔۔۔ در سطر کا مزن رہے۔ بارہا غم صفحات سے ٹکرا کے یوں پلٹا۔ جیسے کسی برقی دیوار سے یاد ٹکرا کے تڑپ کے پلٹا کرتی ہے۔ بہت خوب لکھا لکھنے والے نے۔ صباحت عمران کو اس تحریر پر خراج تحسین پیش کرتی ہوں۔

ج : پیاری سیرت! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔

ناظمہ زیدی نے چوک اعظم سے لکھا ہے

میں نے کچھ دن ہی ہوئے ہیں گرلز اکیڈمی کی بنیاد رکھی ہے۔ میں نے یہ پہلا قدم اٹھایا ہے۔ دن رات محنت کر رہی ہوں آپ کی دعاؤں کی منتظر ہوں۔

امی! آپ کو سلام کہہ رہی ہیں۔ آپ کے تمام سلسلے امی کو بہت پسند ہیں۔ مگر انہیں آپ سے بس یہ شکایت ہے کہ ”شعاع میں پہلے جیسی کہانیاں شائع کریں جیسے شادی بیاہ“ ہندی روٹھنا منانا وغیرہ اب آپ لوگ مشکل عجیب سی کہانیاں دیتی ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی۔ ”امی اور آپ کا ساتھ بہت پرانا ہے تقریباً 1980ء سے امی پڑھ رہی ہیں۔

ج : پیاری ناظمہ! آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں اپنی

اعتذار

نومبر 2016ء کے شعاع میں جو حمد شائع ہوئی تھی اس کے شاعر جناب نصیر الدین نصیر (گولڑہ شریف) تھے مگر سہواً شاعر کا نام نصیر الدین ترابی شائع ہو گیا تھا۔ ادارہ اس سہو کے لیے معذرت خواہ ہے۔

آئے۔

ج۔ پیاری یا سمیں! جامع تبصرے کے لیے شکریہ۔
ملتان سے آسیہ فرید نے لکھا ہے

اس ماہ کا سرورق بہت اچھا لگا پیاری باتیں پڑھ کر بہت اچھا لگا سب سے پہلے ایمل رضاحی کا ”پیال ساز“ پڑھا بیسی اینڈنگ نہایت خوب صورت اختتام ویلڈن ایمل جی اس کے بعد ٹایاب جی کے شہر خطا کی طرف بڑھے اناد یہ جیسے لوگوں سے اللہ پناہ دے۔ رقص بکسل میں شکر تیمور کا رویہ مادرا کے ساتھ بہتر ہوا۔ اس کے بعد عفت جی کا خوب صورت ناول بھی خوب صورتی سے رواں دواں ہے افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ اسماء طاہر اور بنت سحر کا افسانہ اچھا لگا۔ سدرہ حیات کی تحریر بھی اچھی لگی۔ نومبر کا سارا شمارہ ہی بہترین لگا۔

ج۔ پیاری آسیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی شرکت کرتی رہیں گی۔
فوزیہ شموٹ، پانیہ عمران اور آمنہ رئیس گجرات سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

سرورق بس سو سو ہی تھا۔ سب سے پہلے اپنے پیارے شہر کی پیاری سی مصنفہ عفت جی کو پڑھا۔ اس ماہ کی قسط خاصی دلچسپ رہی۔ ”پیال ساز“ کا اینڈ بھی اچھا تھا۔ ایک غلطی کی سزا میں پوری زندگی برباد کر دی۔ سچ ہے ابن آدم بنت حوا کی ذرا سی غلطی کو معاف نہیں کرتا۔ شہر خطا دلچسپ مگر اوکھی کہانی کبھی ماضی کبھی حال۔ اور پھر ناموں کی بھی الجھن خیر اس سے دستبردار تو اس کے اینڈ تک نہیں ہو سکتے یہ ساری کیفیت تحریر کے ساتھ ساتھ ہی رہے

گی۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آ رہی یہ ”عنایہ کون ہے“ حاصل کشت و خون بہت اچھی تحریر تھی ہم سب پاکستانیوں کا ایمان تازہ کرنے والی خواہشوں کا موسم بھی ایک سبق آموز تحریر تھی۔ افسانے بھی سب ہی اچھے تھے ہر رائٹر کوئی نہ کوئی اچھا میسج دے رہی تھی۔ کنیزاں کے نام بہت سحر اس بار کی تحریر تھوڑی ہلکی لگی تمہاری تحریریں تو بریانی کا مزہ دیتی ہیں۔ اس بار مصالحو ذرا کم لگا۔ گلابی دنیا گلابی گلابی ہی لگی۔ انٹرویوز میں نوین وقار اچھی لگی۔ نیپو شریف کا انٹرویو کریں۔ سنگ مرمر کے شرین کے بھائی کا۔ خط آپ کے شعاع کا خوب صورت سلسلہ اور پیاری

حمد و نعت سے مستفید ہو کر عفت سحر کے ناول ”خواب شیشے کا“ کی طرف بڑھے۔ بڑا زبردست ناول ہے۔ نمیلہ جی اسے ختم کریں اور درد دل جیسا کوئی ناول لا میں اس کے بعد مکمل ناول پڑھا۔ مصباح علی نے وطن کے بارے میں اچھا لکھا۔ سدرہ حیات کا درمیان میں ہی چھوڑ دیا۔ اچھا ہی نہیں لگا۔ خط آپ کے میں تمام قارئین نے زبردست تبصرہ کیا۔

ج۔ پیاری اقصی! شعاع آپ کو پسند آیا یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ رقص بکسل اب اختتام کے مراحل میں ہے۔ آپ کے چاچا کی صحت کے لیے دعا گو ہیں۔

یا سمیں خفی مسراب گوٹھ کراچی سے لکھتی ہیں

بست زبردست اینڈ ہوا (پیال ساز) کا۔ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ کسی کردار کے ساتھ نا انصافی نہیں ہوئی۔ ہر ایک اپنی جگہ پر پرفیکٹ۔ مدتوں یاد رہنے والی تحریر۔ اللہ تعالیٰ عمر سعید کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ ان کی وفات بہت بڑا نقصان ہے ادب کا۔ مصباح علی کا مکمل ناول بھی زبردست تھا ”خواب شیشے کا“ عفت سحر طاہر۔ لائٹ سی کہانی لائٹ سے موڈ کے ساتھ کسی سسپنس کے بغیر آگے بڑھ رہی ہے ”شہر خطا“ ٹایاب جیلانی نے شاید تعویذ یا جادو ٹوٹا کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے تین اقساط میں تو یہی سمجھ میں آیا ہے۔ خیر ہمیں رائٹر کی صلاحیتوں پر کوئی شک نہیں۔ کہانی آگے دلچسپ ہی ہوگی۔ خواہشوں کا موسم ”سدرہ حیات“ نیا نام ہے شاید۔ کہانی اچھی تھی بس۔ افسانوں میں اناد یہ جہاں تیر کا ”چٹنی“ شروع سے ہی لگ رہا تھا کہ ناکلہ کو آخر میں چٹنی دنیا کی ہر نعمت سے زیادہ اچھی لگے گی۔ ”کنیزاں کے نام“ بہت سحر کا افسانہ گاؤں کی گوریوں کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہوا اور شہر کے لوگوں کے جذبات کی بالکل بھی نہ پرواہ کرتا ہوا لگا۔ ”تیری اک نظر“ پہلا سمیں بالکل انڈین ڈراموں کی طرح کا تھا۔ ادھر ہیرو نے پوچھا۔ بتایاں دیکھیں؟ ادھر کیمرے نے ہر اینگل سے دلہن کو کور کیا خیر (کیا کریں) ہمیں تو ایسا ہی لگا) اینڈ میں انگریزی اخبار میں کالم بھی لکھوایا۔ واہ۔۔۔ ”پس مرگ“ آنکھ والوں کے لیے یقیناً ایک اچھی تحریر (ارے بھی وہ والی آنکھ جس سے علامہ اقبال نے پاکستان کا خواب دیکھا تھا سمجھ گئے نا؟) ”گلابی دنیا“ نورین غوری کا افسانہ پڑھ کر ہم بھی کچھ دیر کے لیے گلابی دنیا کی سیر کر

شائع کر رہے ہیں اور چشمے پر دل پہ ہاتھ رکھنے والی کیا بات ہے۔ ہم تو چشمہ کو ایک نعمت سمجھتے ہیں۔ آپ سوچیں، چشمے نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ جن کی نظر کمزور ہوئی۔ وہ تو کسی کام کے ہی نہیں رہتے اور چشمہ لگا کے کوئی مائی نہیں لگتا۔ خوب صورت سے ڈیزائن کا چشمہ لیں۔ آج کل تو بہت اچھے ڈیزائن کے چشمے مل جاتے ہیں۔ نظر کی کمزوری کے لیے شعلے کو الزام نہ دیں۔ نظر کی کمزوری تو عام بات ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ خالص پنڈ کے لوگوں کو یہ عارضہ کم لاحق ہوتا ہے کیونکہ انہیں خالص غذا اور ماحول میسر ہوتا ہے۔

مہران ایوب نے قعبو سندھ سے لکھا ہے

پہلی شعلے نے دل چھو لیا۔ ”پیارے نبی کی پیاری باتوں“ سے فیض یاب ہوئے۔ اگست میں، میں نے اپنا افسانہ ”خواب اور امید“ شعلے میں بھیجا تھا۔ آپ کے ادارے کے لیے گئے فون نمبرز پر متعدد بار کال کی۔ پہلے تو کوئی فون اٹھاتا نہیں ہے۔ ایک دفعہ کال ریسیو ہوئی لیکن کوئی ریسپانس نہ ملا۔

ج : پیاری مہران! شعلے کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کا افسانہ ابھی پڑھا نہیں ہے۔

جیا چوہدری ملتان سے شریک محفل ہیں

ٹائٹل بہت زیادہ متاثر کن نہیں لگا۔ اس کے بعد حمد و نعمت اور نبی کی باتوں نے دل کو عقیدت سے بھر دیا۔ ناول میں رقصِ بک کی قسط پسند آئی۔ ”خواب شیشے کا“ کی کہانی بھی ٹھیک چل رہی ہے۔ ناولٹ میں نایاب جیلانی کچھ بہت زیادہ متاثر نہیں کر پائے ہیں پتا نہیں کیوں شاید ان کا انداز تحریر یکسانیت کا شکار ہو گیا ہے۔

مصباح علی کا ناول پسند آیا۔ ویل ڈن۔ افسانے کچھ

خاص نہ لگے۔ بنت سحر کے افسانوں میں کہانی کے علاوہ سب کچھ ہوتا ہے۔ پتا نہیں کیوں اس بار شعلے بہت زیادہ دل کو نہیں بھایا۔ کچھ کمی سی لگی۔ اصل میں یوں لگنے لگا ہے جیسے شعلے اور خواتین بہت زیادہ قلیل موضوع یا مشکل زبان والوں کے لیے چھپنے لگا ہے۔ چند ایک افسانے برائے انداز کے ہوتے ہیں۔ وہ پیار محبت بھرے قصے، چٹخارے دار ساس بہو کے جھگڑے، چھوٹی چھوٹی سبق آموز کہانیاں آسان موضوع پر لکھنا کیوں بھول گئے ہیں۔

قارئین کے پیارے جوابات۔ اس بار سب کو آپ نے تسلی بخش جواب دیے۔ خوب ہنسی آئی۔ سچی کبھی کبھی تو آپ بھی میٹھی چھری ہی لگتی ہیں۔

کوثر آئی کو ہماری طرف سے نعت کے مجموعے کی بہت بہت مبارکاں قبول ہو۔ پہلے مزد کا جٹھانی کا سروے میرے خیال میں ایک جمع کا بھی تو ہونا چاہیے۔ آپ کی تسلی اور حوصلہ دھیروں خون بڑھا گیا۔ اتنی سی زندگی ہے اتنی سی رہ گئی ہے بس دل بھرا ہوا تھا۔ سو لکھ ڈالا ڈھیروں دکھ، تھوڑے سے سکھ کے ساتھ گزر ہی جائے گی۔ جو کاتب تقدیر کی رضا پس خواہ انتظار ہے زندگی۔

ج : پیاری فوزیہ! ہم تو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ خوشیاں بانٹنے سے زیادہ اور دکھ بانٹنے سے کم ہو جاتے ہیں اور اللہ پاک سے زیادہ اچھا دوست کون ہے۔ اور یہ تو بہت غلط سوچ ہے۔ ڈھیروں دکھ اور تھوڑے سے سکھ؟ کبھی سوچیں صرف آنکھیں ہی اتنی بڑی نعمت اور سکھ ہیں کہ ساری زندگی بھی شکر کے لیے کم ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ڈھیر ساری خوشیاں دے۔ ہماری دعا میں آپ کے ساتھ ہیں۔ اور ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین ہے کہ آپ کو اپنے حصے کی خوشیاں ضرور ملیں گی ان شاء اللہ۔ بیہ دیا کی سوتیلی بہن ہے اور عنایا دیا کی بیٹی ہے۔

اقراء اسماء طیبہ اور کوئل نے خانوال سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

یہ خط ہم پنجاب کے خنڈ سے لکھ رہے ہیں، ہمارا پنڈ خالص والا پنڈ ہے وہ اس لیے کہ ہمارے پنڈ کے لوگ بہت سادہ ہیں۔ میری سسٹرز اور کزن میرے پاس بیٹھی ہوئی ہیں۔ ان کا کہنا ہے بلکہ یقین ہے ان کو کہ اول تو میرا خط

آپ تک پہنچے گا ہی نہیں اگر پہنچ ہی گیا تو آپ شائع ہی نہیں کریں گی اور میرا یقین بالکل کامل ہے۔ آپ جی ایک بہت دکھ والی بات ہے ذرا اپنے دل پہ ہاتھ رکھ لیجیے، بات یہ ہے، اہم اہم اہم شعلے کو پڑھ پڑھ کے میری آنکھوں پہ ایک موٹا کالا چشمہ لگ گیا اور اب چشمے کی وجہ سے لوگ مجھے بڑھی مائی کہنے لگ پڑے ہیں حالانکہ میں مائی اودھ سوری لڑکی ایف اے کی سٹوڈنٹ ہوں۔

ج : اقراء اسماء طیبہ اور کوئل! آپ چاروں نے یہ خط مل کر لکھا ہے۔ اب پتا نہیں کس کا یقین کامل تھا کہ ہم یہ خط

جمیلہ شاہ کھگس نے ملتان سے لکھا ہے

پہلی شعاع میں عمر سعید کا بڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ کہانیوں میں رقص بکسل اور خواہشوں کا موسم بہت اچھے تھے۔ خط لکھنے کی اصل وجہ سائرہ رضا ہیں ان کا ناول جب وہ ملے اکتوبر میں ماموں کی اچانک وفات کی وجہ سے نہ بڑھ سکی۔ کچھ دن پہلے کہانی پڑھی تو سوچا تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ اف بہت ہی خوب صورت ناول۔ سائرہ آپ تو مزاج بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ خط آپ کے میں سب کے خط بہت اچھے تھے۔ آئینہ خانے میں واصفہ سہیل اف میں ہنس ہنس کر پاگل ہو گئی ان الفاظ ”دوپٹہ سر پر لے کر سونے والے اور سوئٹنگ پول میں کودنے والی پڑ گمشدہ رائٹرز پلیز واپس آجائیں“ فائزہ افتخار حصار محبت اور مہندی جوڑی اور آنچل جیسا کوئی ناول لکھیں۔ جوادی شبلی کو دیکھے ایک مدت بیت گئی۔

ج : پیاری جمیلہ گمشدہ رائٹرز تک آپ کی آواز پہنچا رہے ہیں اور اس میں ہماری آواز بھی شامل ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ثوبیہ ارشد شہباز نے مہاں چٹوں سے شرکت کی ہے‘ لکھتی ہیں

مجھے آج جس چیز نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا تو وہ ہے حاصل کشت و خون (مصباح علی) مکمل ناول ”فتا شک“ زبردست بہت پیارا تھا اس کے علاوہ پیال ساز‘ ناولٹ میں شر خطا‘ خواہشوں کا موسم زبردست تھے افسانوں میں چٹنی بہت سبق آموز کہانی تھی‘ آپ جی پلیز سر دیوں کے لیے ٹوٹے ضرور شائع کریں۔

ج : پیاری ثوبیہ! آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ اس ماہ یا جنوری کے شمارے میں سر دی پر مضمون دیں گے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔



سب جانے سب کہاں کھو گئے۔ جیسے اقبال بانو‘ عالیہ بخاری‘ فائزہ افتخار ان رائٹرز کی کہانیاں ہمارے گھروں میں سے نکلتی تھیں۔ نئے لکھنے والوں میں قرۃ العین خرم ہاشمی‘ صدف آصف اور حنا سمین بھی اس انداز میں لکھتی ہیں۔ ان کو ہم زیادہ مس کر رہے ہیں۔

ج : پیاری دوست! اول تو آپ کا نام سمجھ میں نہیں آیا جیسا چودھری لکھا ہے یا جیسا چودھری اور ہمیں تنقید بالکل بری نہیں لگتی۔ آپ سب کھل کے اپنی رائے دیا کریں۔ ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ ہر چاہ آپ کے ذوق کے مطابق ہو۔ رہی بات ثقیل اور مشکل الفاظ کی تو واقعی ہماری بہت سی رائٹرز کا انداز تحریر اب کچھ ایسا ہی ہے۔ کتنی ہی دفعہ ان سطور کے ذریعے ان تک بات پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اب ایک بار پھر ان سے گزارش ہے کہ ہمارے قارئین کی فرمائشوں کو مد نظر رکھیں۔ بس خوش؟ اور نایاب نے تو یہ تحریر اپنے انداز سے ہٹ کر اور بہت دلچسپ لکھی ہے۔ آپ کو یکسانیت کیوں کر نظر آئی۔

کراچی سے عائشہ وحید لکھتی ہیں

شعاع ہاتھ میں آتے ہی ”پیال ساز“ کی طرف دوڑ لگائی۔ ”زبردست بھتی۔ خوب لکھا آپ نے ایمل رضا۔ یہ ہم سب یقیناً“ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ عفت سحر جی میں تو بڑھ کے آپ کے سحر میں مقید ہو کر رہ جاتی ہوں ”شر خطا“ میں لگی گر ہیں اب آہستہ آہستہ کھل رہی ہیں۔ ”حاصل کشت و خون“ مصباح علی نے کیا خوب لکھا۔ ”خواہشوں کا موسم“ سبق آموز بھی۔ افسانے سب ہی بہترین تھے۔ خاص کر بنت، سحر کا ”کنیزوں کا نام“ اور نادیہ جہانگیر کا ”چٹنی“۔ دستک میں اگر مصنفین کے انٹرویو شائع کریں ان کی تصویروں کے ساتھ تو بہت ہی اچھا ہو۔ کیوں بہنو؟ کیا خیال ہے بندھن میں فہد مصطفیٰ اور ان کی وائف کو بھی شامل کریں۔

ج : پیاری عائشہ! آپ کا افسانہ ابھی پڑھا نہیں۔ اچھا ہوا تو ضرور شائع ہوگا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے ممنون ہیں۔

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی فی وی جیٹل یا ڈراما ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

خواب کی عفت

تیز برستی بارش اور ساعتوں میں کسی کے تیز چبھتے جملے، یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا جو اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اس نے کسی سے ان سب کی بربادی کا وعدہ کیا تھا۔

آفندی ہاؤس میں اصول پسند آغا جان اپنے دو بیٹوں مبین آفندی اور سہیل آفندی ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں اپنا پوتا نہ ہونے کا بہت دکھ ہے پوتیاں ان کی اس بات سے بہت چڑتی ہیں۔

وقار آفندی کو ایک گانے والی زرنگار سے محبت ہو جاتی ہے۔ وقار آفندی زرنگار کو نکاح کی آفر دیتا ہے تو وہ غائب ہو جاتی ہے۔

طلال اور مہراہ یونیورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ تلال کے گھر والے مہراہ کا رشتہ لے کر آتے ہیں جو قبول کر لیا جاتا ہے۔

مبین آفندی آغا جان سے بات کرتے ہیں کہ فاران آفندی کو معاف کر دیا جائے اور اسے اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ آفندی ہاؤس بلا لیا جائے۔ فاران آفندی کو چھوٹے بھائی وقار آفندی کی حمایت اور آغا جان کی مخالفت کی وجہ سے گھر بدر کر دیا گیا تھا۔ پوتے کی خاطر آغا جان مان جاتے ہیں، تالی جان مبین آفندی کی بیوی اس بات پر بہت ناراض ہوتی ہیں۔

فاران آفندی پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں ان کی بیوی مہراہ اور بیٹا موحّد بہت ناراض ہوتے ہیں۔ وقار آفندی آخر کار زرنگار کو تلاش کر لیتا ہے۔ اور اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان میں متعارف کرائے گا۔

نویں قسط

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM



”سومیہ۔۔ تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔“ اس کی روم میٹ ذرا سا دروازہ کھول کر اسے اطلاع پہنچا کر واپس گم ہو گئی تھی۔ وہ جو بہت بے زاری بستر پر نیمہذا سے واپس شارجہ جانے کا سوچ رہی تھی، بری طرح چوکی۔ ”مجھ سے ملنے؟“

الجھن بھرے انداز میں اس نے دہرایا پھر اٹھ کر چیلوں میں پاؤں ڈالے اور ہاتھوں سے ہی قمیص کی شکنیں دور کرتی کمرے سے نکل آئی۔ اس کی کلاس فیلو ہما کتابوں کا انبار لیے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اسے دیکھ کر زار دیر کو رکی۔

”بڑا ڈھنگ ملا قاتی ہے سومیہ تمہارا۔“

وہ بڑے متاثر ہونے والے انداز بولی تو سومیہ کے ذہن میں کچھ کلک سا ہوا۔ رسمی سی مسکراہٹ ہما کی طرف اچھال کر وہ تیز قدموں سے وٹنگ روم کی طرف بڑھی اور دروازہ کھولتے ہی دلیز پر ہی ٹھک گئی۔ دونوں ہاتھ اپنے پلوں پر جمائے کھڑا وہ سامنے دیوار پر لگے کیلنڈر پر غور و خوض کر رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر پلٹا تو سومیہ کو سامنے مسکرا دیا۔ وہ دروازہ چھوڑ کر سنجیدہ سی اندر آئی۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔ کیسی ہو؟“ وہ ویسی ہی خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔

”مجھ سے مت پوچھا کرو۔ مجھ سے تمہارا رویہ بتا دیتا ہے کہ میں کیسی ہوں۔“ اس کی خود ترسی عود کر آئی تھی۔ انداز حد درجہ تلخ تھا۔ موحد نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا۔ پھر نارمل سے انداز میں بولا۔

”ماما! اس ہو رہی ہیں تمہارے لیے۔ انہوں نے بھیجا ہے مجھے۔“

”وضاحتیں مت دو۔ تمہیں دیکھ کر میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوتی۔“ سومیہ کا انداز ہنوز ناراضی لیے ہوئے تھا۔

”کم آن یار۔ صبح اٹھتے ہی شیشے میں اپنی شکل تو نہیں دیکھ لی۔“ موحد نے اسے خفیف سا گھور کر دیکھا۔

وہ سینے پر بازو لپیٹے ویسے ہی شیلے انداز میں کھڑی رہی۔ جواب نہیں دیا۔

”یونیورسٹی میں اسٹرائیک چل رہی ہے۔ چھٹیاں ہو گئی ہیں تو گھر آ جاؤ۔ تم تو ہاسٹل سے چمٹ کر رہ گئی ہو۔“

”مرنے والے اسے گھر کا تھا۔“

”تین تو چھٹیاں ہیں۔ گزرتے ہوئے پتا بھی نہیں چلے گا۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔“ سومیہ نے خفگی سے کہا تو وہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”تو یہ سب جا کر ماما سے کہہ دوں؟“ اس نے اسے گھور کر پوچھا۔

سومیہ نے ذرا سی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”اگر تم خود سے مجھے لینے آتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی کہ میرے دوست کو بھی میری فکر ہے۔ پھپھو تو مجھے یاد کرتی ہی رہتی ہیں۔“ اس نے نروٹھے پن سے کہا تو موحد کو ہسی آگئی۔

”اللہ معاف کرے سوئی۔ کتنی مشکل سائیگی ہوتی ہے تم لڑکیوں کی۔ اللہ کی بندی، فکر تھی تب ہی آیا ہوں لینے ورنہ ماما سے کتنا چھوڑیں برے۔ آتا ہو گا تو آ جائے گی۔“ وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

سومیہ نے منہ پھلایا اور پلٹ گئی۔

”پھر موحد آندھی کے لیے کیا حکم ہے؟“ موحد نے پیچھے سے ہانک دلائی۔

دروازے سے نکلتے ہوئے چہرہ موڑ کر وہ غرائی۔ ”بیٹھے رہو آرام سے۔ خبردار ہاں سے ہلے بھی آ رہی ہوں میں۔“

وہ سینے پہ دھانہا تھا رکھ کر اٹھا ”ذرا سا جھکا اور بڑی فرمانبرداری سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ سومیہ اپنی مسکراہٹ



وہ شمو کے سینے سے لگی تو اندر تک ایک طمانیت اتر گئی۔
 ”اب تو بڑی محبت اور لاڈ آرہے ہیں پھوپھو پر اور وہاں سے محترمہ کا دل نہیں کر رہا تھا گھر آنے کو۔“ موحد نے سامنے بیٹھتے ہوئے دلچسپ نظروں سے سومیہ کو دیکھ کر شکایت لگائی تو شمو ہنسنے لگیں۔
 ”تمہارے پاس تو ناٹم ہوتا نہیں کسی کو لفٹ کروانے کا۔“ سومیہ نے اسے گھورا تھا۔
 ”ارے یہ کیا بات کہہ دی۔ ماما سے پوچھو۔ ادھر انہوں نے آرڈر کیا تمہیں لانے کا“ ادھر میں نے تعمیل کر دی۔
 ”وہ فی الفور بولا ساتھ ہی ان کی گواہی بھی ڈال دی تو شمو مسکرا دیں۔
 ہنسی اور باتوں کی آواز سن کر بچن کی طرف جاتی مہواہ تجسس کے مارے لاؤنج میں آئی تو پہلی نظر ہی سامنے بیٹھے بڑے فریش موڈ میں کوئی قصہ سناتے موحد پر پڑی اور شمو کے ساتھ جڑ کر بیٹھی سومیہ۔ وہ فوراً پلٹنا چاہتی تھی مگر اسی اثناء میں وہ تینوں اسے دیکھ چکے تھے تو اسے سلام کرنا ہی پڑا۔
 ”جاؤ۔ جا کر پہلے کولڈ ڈرنک پیو اور پھر جائے کا انتظام کرو۔“
 مہواہ کو جھٹکا سا لگا۔ یہ آرڈر موحد کی طرف سے جاری ہوا تھا۔ اس نے بے اختیار موحد کو دیکھا۔ وہ سیریس تھا۔ مہواہ کو سبکی کا احساس ہوا۔
 ابھی دو دن پہلے ہی تو اس نے بازو سے پکڑ کر اسے کمرے سے باہر نکالا تھا اور آج یہ ملازمہ جیسا برتاؤ۔ وہ لب بھینچے پلٹ گئی۔ دل تو بے اختیار چاہا کہ اسے منہ توڑ جواب دے۔ لیکن فی الحال وہ غصہ دبا گئی تھی۔ سومیہ نے موحد کے لبوں پر پھیلتی محفوظ کن مسکراہٹ کو غور سے دیکھا تھا۔



مبین آفندی با ادب سے آغا جان کے کمرے میں کرسی پر بیٹھے تھے۔ تکیے سے ٹیک لگائے، سینے پر کتاب اوندھی رکھے، آغا جان اپنے بستر پر نیم دراز تھے۔
 ”آغا جان! آپ نے بہت بڑا فیصلہ کیا ہے اکاؤنٹس کا شعبہ موحد کے حوالے کر کے۔“ وہ بے لفظوں میں بولے تو آغا جان نے تا دہی نظروں سے انہیں دیکھا۔
 ”بیوقوف نہیں ہے وہ اور نہ ہی بچہ ہے۔ دیکھا نہیں کیسے باپ کی سیٹ سنبھالی ہے اس نے بلکہ تم لوگوں کا آدھا بوجھ بھی بانٹ لیا ہے۔“
 ”وہ تو ٹھیک ہے آغا جان، مگر اکاؤنٹس کا شعبہ تو ہمیشہ سے آپ کے زیر نگرانی رہا ہے۔“ مبین آفندی مطمئن نہیں تھے۔ اب بھلا وہ اپنے سے دو گنا چھوٹے۔ کل کے بچے کی میز پر چیک بھیج کر اپر وول کا انتظار کیا کریں گے؟
 ”مجھے موحد پر پورا بھروسہ ہے مبین۔ اور ویسے بھی اب میرے آرام کے دن ہیں۔ میرا پوتا میرا ایک اور بازو مل گیا ہے مجھے۔“ وہ تقاضا آمیز انداز میں بولے تو مبین آفندی نے مزید بحث بیکار جانی اور بات ہی بدل دی۔
 ”طلال کی والدہ شادی کی تاریخ لینے آنا چاہتی ہیں۔ طلال نے اب کاروبار میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ اپنا بزنس ہے۔“ آہستہ آہستہ ان شاء اللہ سیٹ ہو جائے گا۔
 ”ہوں۔“ آغا جان نے پرسوج انداز میں ہنکارا بھرا۔ ”موحد گھر کا ہی بچہ ہے۔ اس کے بارے میں سوچ لیتے مبین۔“

وہ آغا جان کی بات بہت اچھی طرح سمجھے۔

”بالکل آغا جان، گھر میں دوسری بچیاں بھی ہیں۔ جو جس کے نصیب میں ہوا۔ پھر میں طلال کے گھر والوں کو آنے کا کہہ دوں؟ تاریخ آپ بتادیں۔“ انہوں نے بڑی خوب صورتی سے بات لیٹنی تھی۔ آغا جان سے تفصیلی بات چیت کے بعد وہ کمرے میں آئے تو صدیقہ منتظر تھیں۔

”اللہ رحم کرے۔“ انہوں نے ساری بات سن کر آغا جان کا موجد اور مہواہ کے متعلق موقف سناتو بے ساختہ کہہ اٹھیں۔

”اللہ خیر خیریت کے ساتھ یہ وقت گزارے۔ سب نے نظری رکھ لی ہے میری بچی پر۔“ وہ ناگواری سے بولیں۔

”ایسی بات نہیں ہے صدیقہ۔ آغا جان نے موجد کو صحیح معنوں میں وارث مان لیا ہے۔ اس لیے ان کا خیال ہے کہ گھر کی کوئی بچی ہی اس سے بیاہی جائے تاکہ جائیداد کا مسئلہ نہ بنے۔“

”خیر، موجد سے کسی کی شادی ہو یا نہ ہو۔ مگر میری بچیوں کا تو حصہ ہے اس زمین و جائیداد میں۔“ انہوں نے تنک کر کہا تھا۔ پھر انہیں ہلکا سا گھور کر دیکھا۔ ”اور تمہو کے بیٹے کو تو میں مگر بھی داماد نہ بناؤں۔ ہنہ، پہلے ہی ان ماں بیٹے کے مزاج ساتویں آسمان پر پہنچے ہوئے ہیں۔ وہ تو ہمارے سروں پہ چڑھ کے ناچیں گے پھر۔“

”اب ایسی بھی بات نہیں۔ موجد کے طور اطوار میں پہلے سے کافی تبدیلی آئی ہے۔ پہلے جیسا شدت آمیز رویہ نہیں ہے اب اس کا۔“ مبین صاحب نے اعتراف کیا۔

”میٹھے نہیں بنیں گے ماں بیٹا تو میٹھا میٹھا ہپ ہپ کیسے کریں گے؟“ وہ چمک کر بولیں۔ مبین صاحب نے تحیر سے انہیں دیکھا۔ پھر بات سمجھ کر بولے۔

”سلام ہے تم عورتوں کی سوچ کی گہرائی کو۔ بھی یہ سب تو ویسے بھی اسی کا ہے اس کو حاصل کرنے کے لیے اسے اپنی شخصیت پر پردے ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ صدیقہ، کسی پر اعتبار بھی کر لیا کرتے ہیں۔“ انہوں نے تادیبی انداز اپنایا تو وہ سخت سے سر جھٹک کر رہ گئیں۔

ان کا تمہو سے روابط بدھانے کا قطعاً ”کوئی ارادہ نہ تھا بیشک وہ کتنی بھی اچھی بن جاتیں۔ بہر حال خوشی کی خبر یہ تھی کہ آغا جان نے مہواہ اور طلال کی شادی کی تاریخ طے کرنے کا عندیہ دے دیا تھا۔ ان کے دل میں سکون کی لہری دوڑ گئی۔



وہ ناشتا بنا رہی تھی جب موجد اور سومیہ کچن میں داخل ہوئے۔

”میں ناشتا لاتی رہی تھی بس۔“ مہو نے مسکرا کر سومیہ کو دیکھا۔

”کس کا ناشتا؟“ موجد نے بھنویں اچکا کر استفسار کیا۔

”تمہارے اور سومیہ کے لیے۔ باقی سب تو کر چکے۔“

مہواہ کو مجبوراً اس سے بات کرنا پڑی۔ ورنہ تو جس دن سے اس نے کمرے سے باہر نکالا تھا وہ اپنی تمام تر وجاہت سمیت زہر لگنے لگا تھا۔

”مہروانی محترمہ، تم اپنے یہ تجربات طلال صاحب پر کرنا۔ مجھے لیبارٹری بننے کا شوق نہیں ہے۔ چلو سوی، میرا ناشتا تم تیار کرو گی۔“

وہ اس قدر صاف گوئی بلکہ منہ پھٹ ہونے کا مظاہرہ کرے گا، مہواہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کل ہی طلال کے گھر والے ٹھیک ڈیڑھ ماہ بعد کی شادی کی تاریخ مقرر کر گئے تھے اور اسی وجہ سے مائی جان نے کچن کی آدمی ذمہ داری گویا مہواہ پر ہی ڈال دی تھی۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ مہو کو کچھ پکانا نہیں آتا

تھا۔

دل چاہا ہاتھ میں تھامی دو فرائی انڈوں والی پلیٹ موحد کے سر پہ دے مارے۔ (ابھی کل تو کولڈ ڈرنکس لانے کا آرڈر دے رہا تھا۔)

”افوہ“ میں نے تو خود ساری عمر ہاسٹلز میں گزار دی ہے موحد! مجھے کیا پتا کیسے ناشتا کھانا بنتا ہے۔ ”سومیہ ڈھٹائی سے ہنس کر بولی تو موحد نے اسے ہلکا سا گھورا پھر مہواہ کے ہاتھ میں تھامی پلیٹ کو دیکھا۔

”اسی لیے کہتے ہیں کہ بندہ منہ سے بات نکالنے سے پہلے ایک دفعہ سوچ ضرور لے۔“ مہواہ نے تلخی سے کہہ کر پلیٹ کاؤنٹر پر پٹختے والے انداز میں رکھی تھی۔

”آٹم سوری مہواہ! اس کی تو عادت ہے فضول باتیں کرنے کی۔ میں تو یہی ناشتا کروں گی ڈونٹ سوری۔“ سومیہ کا دل فوراً ”سچ گیا۔“

”ویری گڈ۔ کیونکہ جو بریڈ اور انڈے تھے میں نے بنا دیے۔ اب کھانا ہے تو یہی کھانا ہے اور اگر نہیں کھانا تو بھی یہی کھانا ہے۔“ وہ حتمی انداز میں کہتی سلگ کر باہر نکل گئی۔

”افف۔“ سومیہ نے حیرت سے موحد کو دیکھا۔ ”میں تو سمجھ رہی تھی کہ صرف تم ہی ہو جو جانے کس پر پڑے ہو۔ مگر تمہارا تو سارا دھیال ہی ماشاء اللہ ہے۔“

موحد نے بے اختیار ہتھ لگایا تھا۔ پھر وہ ناشتے کا جائزہ لینے لگا۔

”چلو جلدی سے لے کر باہر۔ شکل سے تو مزید ارگ رہا ہے۔“

”بہت بد تمیز ہو موحد۔ اس بیچاری کا خون کیوں جلایا پھر۔“

”اچھا ہے۔ شادی ہے کچھ دنوں میں اس کی۔ اتنا خون بنا کر موٹاپا لانے کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

سومیہ ہنستے ہوئے ناشتا ٹرے میں رکھنے لگی۔



گلنار کا فون تھا۔ واش روم سے نکلتے کبیر نے لپک کر موبائل اٹھایا۔

”السلام علیکم لالہ کیسے ہو؟“

”ٹھیک ٹھاک تم سناؤ پلو شہ اور بی بی گل کیسی ہیں؟“ اس نے مسکراتے ہوئے باقی دونوں بہنوں کا پوچھا تھا۔

”ہم سب تو ٹھیک ٹھاک ہیں لالہ۔ تم ہی شوہر جا کر بھولے ہوئے ہو ہم کو۔“

گلنار اس سے ایک سال بڑی تھی پھر پلو شہ بھی اور ان سب سے بڑی گل افشاں۔ جسے وہ سب بی بی گل کہتے تھے۔ گلناز بڑی ہونے کے باوجود اکلوتے بھائی کو پیار سے لالہ کہہ کر بلاتی تھی۔

”کیسے بھول سکتا ہوں بچی۔ اور ہے ہی کون اب دنیا میں میرا۔“ وہ آزرہ ہونے لگا۔

”آغا جان سے بات کی تم نے لالہ؟“

”بات کرنے سے کچھ نہیں بننے والا گلناز۔ یہاں ہر کسی کو اپنا حق چھیننا پڑتا ہے۔“ اس کے چہرے سے سرخی جھلکنے لگی۔ انداز سلگتا ہوا سا تھا۔

”تم ایک بار بات کر کے تو دیکھو۔“ گلناز نے اصرار کیا۔

”کہہ کے دیکھ چکا ہوں گلناز۔ مگر تین نسلوں سے انہوں نے غلامی کی جن زنجیروں میں ہمیں جکڑا ہوا ہے نا ان زنجیروں پہ لگے تالوں کی چابی تو جیسے یہ گم ہی کر چکے ہیں۔“ وہ عجیب سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”تو پھر لالہ! عجیب کے گھر والے تو میرا جینا مشکل کر دیں گے۔ میں تو انہیں ہی آس دلا رہی ہوں کہ جلد ہی لالہ

کوئی حل نکال لے گا۔" وہ بے بسی سے روہاںسی ہونے لگی۔

"ہو جائے گا کچھ نہ کچھ۔ تم پریشان مت ہو۔" کبیر نے اسے تسلی دلائی تھی۔

فون بند کر کے وہ کھڑکی میں کھڑا ہوا تو سخت کبیدہ خاطر تھا۔ آغا جان نے تین نسلوں کی وفاداری کو بھی کسی کھاتے میں نہیں رکھا تھا۔ اور اگرچہ کبیر۔۔۔ کو انہوں نے اپنا دست راست بنا رکھا تھا مگر غلاموں کو آزاد کرنا ان کی سرشت میں شامل نہ تھا۔

وہ نسوانی قمقموں کی آواز سے چونکا۔

اس کے کمرے کی کھڑکی سے لان کا ایک حصہ دکھائی دیتا تھا۔ لان میں ملاحہ اور فرزین محلے کے بچوں کو جمع کیے کرکٹ کھیل رہی تھیں اور یہ لڑکی اس نے بیٹھ ہاتھ میں تھا بے باری کے لیے فرزین سے لڑتی ملاحہ کو نگاہ بھر کے بھی نہ دیکھا اور پلٹ گیا۔

یہ شہزادیوں کی سی آن بان والی اس سے خفا اور لڑتی جھگڑتی کیا اسی قابل تھی کہ اسے مہو بنایا جاتا؟ وہ نفی میں سر ہلاتا دل سے اٹھتی آوازوں کو سختی سے رو کر رہا تھا۔



گھر میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری و ساری تھیں۔ تائی جان اور چچی جان کا ارادہ نہ صرف بازار جانے کا تھا بلکہ راستے میں طلال کے گھر بھی چکر لگانے کا تھا۔

"میں بھی ساتھ چلوں گی۔ میری تو ابھی ساری ہی شاپنگ رہتی ہے۔" تزئین جو اتنی دنوں سے مریض سی پڑی تھی ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔

"شکرے تمہیں بھی ہوش آیا۔" سارہ چچی نے اسے گھورا۔ پھر تائی جان کو یاد دلایا۔

"بھابی! نگے ہاتھوں طلال سے شیروانی بھی چیک کرالیں۔ بین کا تھوڑا سا فرق تھا ناپ میں۔"

"ہاں اسی لیے راستے میں ادھر سے ہوتے جا میں گے۔" وہ بولیں۔

"طلال کو ان لوگوں کے آنے کی خبر تھی۔ اسی لیے وہ گھر پر ہی تھا۔"

"میں بلاتی ہوں اسے۔ کسی دوست کا فون آیا تھا وہی سنتے ہوئے کمرے میں چلا گیا۔" طلال کی بھابی نے کہا۔

تائی جان تو طلال کی ماما سے محو گفتگو تھیں۔

"میں جاتی ہوں۔ ذرا سر پرانز دوں محترم کو۔" تزئین مسکراتے ہوئے اٹھی تو بھابی وہیں خواتین کے ساتھ بیٹھ گئیں۔

وہ دروازہ کھٹکھٹا کر لمحہ بھر طلال کی اجازت کے انتظار میں کھڑی رہی۔

"کم ان۔۔۔" وہ مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

وہ جیکٹ پہنتا شاید باہر آنے کے لیے ہی تیار ہو رہا تھا۔ غیر متوقع طور پر تزئین کو سامنے دیکھ کر حیران ہوا۔

"واٹ آسر پرانز۔"

"ہاں میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ آج آکر تمہیں سر پرانز ہی دوں۔" تزئین مسکرائی۔

وہ پلٹ کر بال برش کرنے لگا۔

"وہیے اگر ساتھ مہو کو بھی لے آئیں تو سر پرانز کا مزہ دو بھالا ہو جاتا۔" وہ آئینے میں تزئین کو دیکھتا شرارت سے بولا تو تزئین مسکرا بھی نہ سکی۔ خود پر فوم چھڑکنا وہ تزئین کی خاموشی پر بھی غور کر رہا تھا پھر اس کی طرف پلٹا۔

”کیا بات ہے۔ تم کیوں او اس ہو رہی ہو؟“ وہ قدرے حیران تھا۔

”ترین کا دل بھر آنے لگا۔“ تم نے مہو کو کیوں پسند کیا طلال؟“

اس کا انداز عجیب تھا تو سوال عجیب تر۔ مگر طلال بنا سمجھے مسکرا دیا۔

”پہلی بار اسے میں نے کیمسٹری لیب کے باہر دیکھا تھا۔“ اس کی سرخوشی کے لیے آج کل محض مہوا کا نام ہی کافی تھا۔

”تم بتاؤ۔ کیا وہ اس قابل ہے کہ اسے پسند نہ کیا جائے؟“ وہ بہت دل پسند مسکراہٹ کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔

”ترین کے دل میں بہت کچھ جلا اور بہت کچھ ٹوٹا۔ اور یہ جلن اور ٹوٹ پھوٹ ہی تھی جو اسے اس بے اختیاری پر مجبور کر رہی تھی۔“

”کیوں طلال۔ تمہیں کیمسٹری لیب کے باہر کھڑی مہوا آندی دکھائی دی تو ساتھ کھڑی ترین آندی کیوں نظر نہ آئی؟“ وہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولی تو اب کی بار طلال اس کی بات اور کیفیت کو نظر انداز نہیں کر پایا۔

”کیا ہو گیا ہے ترین۔ ہم اچھے دوست ہیں۔“ وہ کہے بنا رہ نہ سکا تھا۔

”وہ“ اچھی ہے اور میں صرف دوست؟“ ترین کے منہ سے لفظ نکلے تھے یا اس نے پکھلا ہوا ایسا اس کے کانوں میں اٹھایا تھا۔ وہ سناٹے میں رہ گیا۔

”ترین۔“ وہ حد درجہ بے یقینی میں گھرا محض اتنا ہی کہہ سکا۔

ضبط سے گلابی پڑتی آنکھوں میں نمی کی چمک اسے وہ سب بتا گئی جو وہ ترین کے لفظوں سے بھی نہیں سمجھ پایا تھا۔

”مہوا بہت لمبی ہے۔ اسے ہمیشہ سے سب کی توجہ ملی یا شاید اسے طریقہ آتا ہے سب کی توجہ حاصل کرنے کا۔“

وہ آغا جان ہوں تم ہو یا مہو آندی۔“ وہ دلگرفتی سے کہہ رہی تھی۔

طلال نے ناگواری سے اسے ٹوکا۔ ”فضول باتیں مت کرو۔“

”ہنہ۔“ وہ پلک کی نوک پر اٹکے آنسو کو انگلی اور انگلیوں سے جھٹکتے ہوئے تلخی سے ہنسی۔ پھر طلال کی طرف دیکھا اور چیلنجنگ انداز میں بولی۔

”یہ فضول باتیں نہیں تلخ حقیقت ہے اور تم بھی جانتے ہو۔ یہ الگ بات ہے تم اس حقیقت کو اپناؤ ہم سمجھ کر ٹالنے پر مجبور ہو۔“

”وہ میرا وہم ہی تھا ترین۔ تم مجھے برکانے کی کوشش مت کرو۔“ طلال نے قطعی مگر سرد لہجے میں کہا۔

”تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا طلال۔“ ترین نے حیرت اور قدرے دکھ سے اسے دیکھا۔

ابھی چند لمحوں پہلے ہی جذباتیت میں گھر کر وہ اپنے جذبات طلال پر آشکار کر چکی تھی۔ ایسے میں وہ اب جو بھی کہتی وہ طلال کو جھوٹ اور من گھڑت ہی لگتا۔

”تم زیادہ ہی جذباتی ہو رہی ہو ترین۔ مجھے واقعی ان سب فضول باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب چلیں۔“

میرے خیال میں سب باہر انتظار کر رہے ہوں گے۔“ وہ سنجیدگی سے کہتے کہتے دروازے کی طرف بڑھا۔

”طلال۔“ ترین نے بے چین ہو کر اسے آواز دی۔

”آئی میری بارات کی شہروانی لے کر آئی ہیں ترین۔ اگلے ماہ میری شادی ہو رہی ہے مہو کے ساتھ۔ میرے

خیال میں اتنا سب تمہاری یادداشت واپس لانے کے لیے کافی ہونا چاہیے۔“ وہ چبھتے اور تلخ لہجے میں کہہ کرنا رکے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔

ترین وہیں کھڑی اپنا ضبط آزما کر رہ گئی۔ درحقیقت اس کا کھل کر اپنے عظیم نقصان پر رونے کوئی چاہ رہا تھا۔



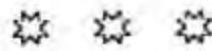
اس کی ماں ٹھوکر کھا کر سڑک پر گری۔ اس کی پیشانی خون آلود تھی۔
 ”امی۔۔۔“ اس سرور رات میں سڑک پر چودہ سالہ نمیر و قار آفندی بلک بلک کر بڑھتا تھا۔ مگر سیاہ خاموش رات اور
 گہرے بادلوں کے سوا اس کی آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔
 وہ کسمسا کر ایک دم سے جاگا تو تنفس تیز تر تھا۔
 چند ثانیہ جیت لیتا وہ اس خواب کو دہراتا رہا۔ پچھلے کئی سالوں سے یہ خواب پہلے مسلسل اور اب وقفے وقفے
 سے اسے دکھائی دیتا تھا اور نمیر کو پوری جزئیات سمیت یاد تھا۔
 وہ اٹھ بیٹھا۔

یہ صدیقہ ہی تھیں جنہوں نے اسے گناہوں کی پوٹلی اور ”نجانے کس کس کی اولاد“ کہا تھا۔ انہوں نے آغا
 جان کا دھیان ایک بار بھی نمیر آفندی کے معصوم چہرے کی طرف نہیں کرایا تھا۔ ایک ماں ہو کر وہ دوسری ماں کا
 ساتھ دینے کی بجائے مخالف کیمپ میں کھڑی زرنگار پر تابڑ توڑ حملے کرتی رہیں۔
 بعض اوقات ہم انسان کو اپنے رویے، اپنے الفاظ سے ہی مار دیتے ہیں اور یہ موت عموماً ”روحانی ہوا کرتی
 ہے۔“

ان کے غلیظ الفاظ نمیر آفندی کے کانوں ہی نہیں دماغ میں بھی اترے اور نقش ہو گئے تھے۔
 وہ پانی کا گلاس حلق میں اندیل کر اٹھا اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
 باہر چلتی سرور ہوا سے درختوں کے پتے لہرا رہے تھے۔

انسان کے بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی صورت اس کی راہ میں آکھڑے ہوتے ہیں۔ پھر ان سے
 پہلو تہی ممکن ہی نہیں ہوتی۔ مجبوراً ”ان گناہوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ تب اپنی بہت
 بھیانک شکل نظر آتی ہے انسان کو۔ وہ ایک ٹک اندھیرے میں گھور رہا تھا۔ اور ذہن میں بہت سی گنڈ آوازیں اور
 چہرے گھومتے تھے۔

ظالم اور پر تنفر آغا جان اور صدیقہ بیگم۔
 جو شاید اپنے علاوہ کسی اور کو انسان سمجھتے ہی نہ تھے۔ سچ تو یہ تھا کہ اس گھر میں سے سوائے فاران آفندی کے
 کسی نے ان کا ساتھ دیا ہی نہیں تھا۔ اور اب وہ سب لوٹانے کا وقت آگیا ہے۔ وہ سب جوان ہی لوگوں نے مجھے
 دیا ہے۔
 وہ خود سے کیا عہد دہرا رہا تھا۔



وہ ابھی سو میہ کو چھوڑ کر آیا تھا اور آکر بیٹھا ہی تھا کہ دندناقی ہوئی مہواہ اس کے سر پر پہنچ گئی۔
 ”یہ کیا بد تمیزی ہے موحد! تم اس طرح کارویہ اختیار کر کے مجھ پر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟“
 وہ جو صوفے کی پشت پر سر نکائے آنکھیں موند کر ڈرا سیونگ کی تھکاوٹ اتارنے کا سوچ ہی رہا تھا۔ بے اختیار
 سیدھا ہوا۔ وہ غصے میں تھی۔
 ”یہی کہ میں نے تمہارا موبائل واپس کر کے غلطی کی ہے۔ اور اس کی سزا اب تم مجھے ایسے دو گے۔“ اس نے
 اضافہ کیا۔

”میرے اس رویے کا سہیل سامطلب تھہرماہ اور وہ یہ کہ میں ایسا ہی ہوں۔“ وہ بالکل سنجیدہ تھا۔

مہواہ تلملائی۔ ”مائی فٹ۔ تم جیسے بھی ہو۔ مگر ہر کسی کے سامنے تمہیں میری انسلٹ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

”اکیلے میں اجازت ہے کیا؟“ وہ معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔ مہواہ تپ اٹھی۔ ”ذرا سی فوری کیا دے لی۔ تم تو سر چڑھتے جا رہے ہو۔ معذرت کر لی تھی میں نے صاف لفظوں میں بتا دیا کہ طلال ان باتوں کو پسند نہیں کرنا اور آٹم سوری ٹوے۔ تمہیں بھی وہ کوئی خاص پسند نہیں کرتا ہے۔“ وہ بڑی صاف گوئی سے کہہ رہی تھی۔

”کبھی اسے بھی بتا دینا کہ میں اسے کیا سمجھتا ہوں۔“ موحد نے عام سے انداز میں کہا تو اس کے تلوں لگی سر پہ جا بھگی۔

”ٹٹ اپ۔ تمہارے سمجھنے نہ سمجھنے سے کیا فرق پڑتا ہے اسے وہ جانتا ہے کہ میں اسے کیا سمجھتی ہوں۔“

اسے جھاڑتے ہوئے وہ ”میں“ پر زور دے کر بولی تھی۔

”اللہ رکے۔ یہ انداز شعلہ بیان۔“

گویا مہواہ آفندی کا کسی کو خاص سمجھ لینا کوئی کمال ہی ہو۔ جو طلال نے حاصل کر لیا ہو۔

”تم چاہو تو میں تمہاری اس بات کی تالیاں بجا کر داد دے سکتا ہوں۔“ وہ محل سے کہہ رہا تھا۔ مگر مذاق اڑاتا تو مہواہ نے محسوس کیا تھا۔

”تم برائے مہربانی صرف اتنا کرو کہ دوستی نہیں نبھاسکے تو دشمنی بھی مت نبھاؤ۔ اس قدر انسلٹنگ رویہ رکھو گے تو میں بھی کم نہیں کروں گی۔“ وہ دانت پیس کر بولی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے اس سے پتا نہیں کتنی عاجز آچکی ہو۔

”دوستی تم نے ختم کی ہے مہواہ آفندی۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھا اور اس کے مقابل آیا تھا۔ ”اور جہاں دوستی نہ ہو وہاں پھر دشمنی ہی ہوا کرتی ہے۔“

”مگر میں دشمن بھی دیکھ بھال کرنا ناپسند کرتی ہوں۔ رشتے دار تو اللہ کی دین ہوتے ہیں کم از کم دشمن تو بندہ جن کر بنائے۔“ وہ تڑخ کر بولی۔ لاؤنج میں داخل ہوتی ثمرہ بڑی طرح ہنسنیں۔

”مہواہ۔ ذرا اپنی زبان کو لگام دینا بھی سیکھو۔ بہت تھوڑی دن رہ گئے ہیں تمہاری شادی میں۔ سسرال میں لڑکیوں کی اتنی تیز زبان برداشت نہیں کی جاتی۔“ ثمرہ نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے چبھتے لہجے میں کہا تو وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔

مگر جواب نہ دینے کی پابندی تو مہواہ پر تھی۔ صدیقہ تو اس پابندی سے مستثنیٰ تھیں۔ کچن سے گویا اڑتی ہوئی باہر آئیں۔

”واقعی۔ اپنی چچی کی مثال اس کے سامنے ہے۔ تمہارا بھی تو یہی قصور تھا۔ اونچی آواز میں بولنا اور زبان چلانا۔ یونہی تو چودہ سال کا بن باس نہیں کا تا تم لوگوں نے۔“

موحد نے آگے بڑھ کر غصے سے لال پڑتی ثمرہ کے شانوں پر فوراً ”بازو پھیلا یا اور انہیں لیے ان کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ مگر یوں کہ اس کی آواز صدیقہ بیگم اور مہواہ کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔

”کول ڈاؤن ماما! آپ جانتی تو ہیں آفندی ہاؤس والوں کی زبانیں کسے زہرا گلا کرتی تھیں۔ چودہ سالوں میں ہمارا بن باس ختم ہوا ہے تو ضروری نہیں کہ ان کا زہر بھی ختم ہوا ہو۔ سو ریلیکس ہو جائیں۔“

”اف۔۔۔ مہواہ تلملائی۔“

”دیکھ لیا۔ اسی دن کے لیے منع کرتی تھی اسے منہ لگانے کو۔ جیسی ماں منہ پھٹ۔ ویسا ہی بیٹا بھی۔“ صدیقہ بیگم تنفر سے بولی تھیں۔

”اب سوچ لیا ہے امی! زندگی بھر اس شخص کو منہ نہیں لگاؤں گی۔“ مہواہ تنک کر بولی۔
 بہت سی باتیں ہم یوں ہی منہ سے نکال دیا کرتے ہیں۔ مگر یہی باتیں کبھی کبھار قسمت سے میل کھا جاتی ہیں۔
 اسی لیے پہلے سوچو، سمجھو اور پھر بولو۔



”مہواہ کی شادی ہو رہی ہے نمیر۔“ سومیہ نے جھجکتے ہوئے اسے اطلاع دی تھی۔
 لمحہ بھر کو وہ خاموش ہوا۔ پھر سرد مہری سے بولا۔ ”جانتا ہوں میں۔ تم نے کیا یہی خبر دینے کے لیے کال کی تھی؟“
 ”میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اب تم بھی اپنا دل اور ذہن بدل لو۔ کیا موحد آفندی کے ساتھ بھی یہی سب نہیں ہوا۔ اگر وہ اپنا آپ اپنا انداز بدل سکتا ہے تو نمیر آفندی کیوں نہیں؟“ وہ جذباتی ہونے لگی۔
 ”موحد آفندی کا بدلنا بنتا ہے سومیہ۔ ہو سکتا ہے وہ ان کی جھوٹی محبتوں سے ہی پکھل جائے، مگر نمیر وقار آفندی! اسے ان لوگوں نے میڈل سے نوازا رکھا ہے، ناجائز اولاد کے میڈل سے۔ گندگی کی پوش پتا نہیں کس کا گناہ۔“ وہ تلخ تھا۔ زہریلا ہونے کی حد تک تلخ۔
 ”اللہ کا واسطہ بس کرو نمیر!“ سومیہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔

”یہ تو کچھ نہیں ہے سومیہ۔ اس رات جو کچھ میں نے اور میری ماں نے ان بھیڑیے نما انسانوں کے سامنے کھڑے ہو کر سنا، وہ سب کسی پتھر سے کہا جاتا تو ان کی سخت دلی کے آگے وہ پاش پاش ہو جاتا، کسی جنگل میں وہ آگ لگتی تو سارا جنگل جل کر راکھ ہو جاتا۔ سومیہ! انہوں نے تو وہ سارا زہر وہ ساری سنگ دلی اور وہ ساری آگ ایک بے بس بیوہ، مجبور و مسکین ماں اور اس کے معصوم چودہ سال کے بچے پر انڈیل دی۔ وہ جل کر راکھ ہو گیا۔ مگر اس کا دل پتھر بن گیا ہے۔“

”ہمارا دین معاف کرنا سکتا ہے نمیر۔“
 ”آکھ گے بدلے آکھ اور ہاتھ گے بدلے ہاتھ بھی ہمارے دین ہی کا سبق ہے۔“ وہ مطمئن تھا۔ مگر لہجہ سلگتا ہوا تھا۔

”معاف کرنے والے کا درجہ اس سے بھی بلند ہوتا ہے نمیر۔“ وہ یوں ہی کبھی نرمی سے، کبھی پسپا ہو کر اور کبھی بے بسی سے اس کا ذہن صاف کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔
 ”تو وہ لوگ حاصل کر لیتے یہ بلند درجہ میں تو بس اب یہ سارے القابات ان لوگوں کو لوٹانا چاہتا ہوں۔“ وہ عجیب سے سرخوشی بھرے انداز میں بولا جیسے سب کچھ طے کر لیا ہو۔
 سومیہ تھرا کر رہ گئی۔

”نمیر پلیز! مت کرو ایسا کچھ۔ اگر موحد اپنا دل صاف کر سکتا ہے تو تم کیوں نہیں؟“
 ”اس کے اپنے مفادات ہیں سومیہ۔ موحد آفندی کا بدلنا اس کی مجبوری ہے۔ اس کی ماں ہے اس کے ساتھ اور نمیر وقار آفندی! یتیم، مسکین، اپنوں کا ٹھکرایا ہوا۔ اپنے وجود کی نفی لے کر پھرنے والا انسان۔ اور اس دنیا میں سب سے بڑی تکلیف یہی ہے سومیہ! کسی جیتے جاگتے انسان کے وجود کی نفی کرنا۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اسے کچھ نہ سمجھنا۔“

”تم آغا جان سے رابطہ تو کرو نمیر۔ ہو سکتا ہے ان کا دل پلٹ جائے۔“ وہ بڑی آس سے کہہ رہی تھی۔
 ”ان کا دل موحد آفندی کے لیے بدل سکتا تھا، کیونکہ وہ فاران آفندی کا بیٹا ہے۔ مگر مجھے وہ میری ماں کے نام سے جانتے ہیں سومیہ۔ اس قدر ظالم ہیں یہ لوگ ایک چودہ سال کے بچے کے کانوں میں یہ پکھلا ہوا ایسہ ڈالنے والے“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



www.paksociety.com

یہی لوگ ہیں کہ اس کی ماں ایک طوائف ہے۔ میں ان سب کو کبھی معاف نہیں کر سکتا کبھی بھی نہیں۔“

اس کے لب و لہجے میں شعلے بھڑک رہے تھے۔
 ”ان کے دیے گئے زخموں کے نشان بہت گہرے ہیں سومیہ۔ تم نہیں جان سکتیں۔ چودہ سال ہو گئے۔ ان زخموں سے ابھی بھی خون رستا ہے اور ٹھنسیں اٹھتی ہیں۔ میں پوری نیند سو نہیں پاتا کبھی کبھی۔“ وہ دکھ کے گہرے غار میں اترا بول رہا تھا اور سومیہ پکھلا دل لیے یہ سب بڑے حوصلے سے سن رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح۔



ترنمین کا دل تو جیسے مر ہی گیا تھا۔ اس نے قسم کھالی تھی گویا مہواہ کی شادی کی شاپنگ نہیں کرے گی۔
 ”تم جیسی ہوتی ہیں بے وقوف لڑکیاں۔ جن کے ہاتھ آخر میں کچھ بھی نہیں آتا۔ اس مو کو دیکھو شکل سے کیسی بے وقوف لگتی ہے۔ مگر اتنا اچھا رشتہ ڈھونڈ لیا اپنے لیے اس نے۔“ سائرہ چچی دانت پیس پیس کر سارا غصہ ترنمین پر نکال رہی تھیں۔ ”اور ایک تم ہو۔ اللہ نے جسے آنکھیں ہی نہیں دیں تمہیں۔ اس طلال سے لاکھ درجہ اچھا ہے اپنا موجد۔ مگر تمہاری تو دور نزدیک دونوں نظریں کمزور ہیں گویا۔“
 ”افوف۔“ ترنمین نے بے قرار ہو کر تکیے سے منہ نکالا۔ ”آج کی تقریر میں موجد کہاں سے آگیا اور میان میں؟“
 ”آغا جان نے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا ہے اسے۔“ وہ پر جوش سی ہو کر اس کے قریب کھکیں اور راز دارانہ سرگوشی میں بولیں۔ ”ذرا سی ہمت کرو تو یہ بازی ہم جیت سکتے ہیں ترنمین! مہو سے ہزار گنا اچھی قسمت ہو سکتی ہے تمہاری۔“ ان کا چہرہ تمہارا تھا۔
 ترنمین کی آنکھیں بچھ سے گئیں۔

(اور جسے قسمت ہی مہو جیسی چاہیے ہو وہ کیا کرے؟)
 ”مجھے نہیں اچھا لگتا موجد آفندی۔“ وہ بے زار لہجے میں بولی تو چچی کی آنکھیں ابلیس گویا۔
 ”خدا کی مارت۔ تو واقعی اندھی ہو گئی ہے ترنمین۔ اپنے چچا دقار پر پڑا ہے وہ ہو سوا اور دقار آفندی میری ساس کا سب سے خوب صورت بیٹا تھا۔“ سائرہ چچی جلیبلا کر بولیں۔
 دل تو چاہا بیٹی کو دو ہتھ بھی لگا دیں (سربر) تاکہ ذرا یادداشت کے ساتھ نظر بھی لوٹ آئے۔
 ”افوفہ امی۔ اتنا خوب صورت شوہر کیا کرنا ہے میں نے۔ طلال جیسا بھی چلے گا۔“ وہ جھنجلا کے حسرت سے بولی۔

وہ گہری سانس لے کر رہ گئیں۔ اب اللہ نے اولاد ہی بے وقوف دی تھی تو وہ جتنا مرضی سرکھپا۔ لیتیں۔ آہ بھر کے اٹھ گئیں۔
 ”اٹھو مہو۔ شاپنگ تو کر آؤ شادی کے لیے یا یہی سڑی بٹی صورت لے کر شریک ہوگی۔“
 ”کون سا میری شادی ہے جو میں لاکھوں لٹائی پھروں شاپنگ پر۔“ وہ نروٹھے لہجے میں بولی تو سائرہ چچی بے اختیار بولیں۔

”ہو سکتا ہے ہو ہی جائے۔“
 مگر وہ پھر سے تکیے میں منہ چھپا کر لیٹ گئی۔ فی الحال تو وہ ماتم منانے میں مصروف تھی۔ ابھی تو سیاہ کے علاوہ اور کوئی رنگ ہی ذہن میں نہ آتا تھا۔ سو فی الحال اس کا شاپنگ کرنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہ تھا۔
 ”جلدی کرو۔ آغا جان نے کہا ہے اسی پھیرے اپنی شاپنگ ختم کرو سب۔ کیر بے چارہ بھی گھن چکر بنا ہوا ہے گھر اور مارکیٹ کے چکروں میں۔“

”بھی تو کافی ٹائم ہے۔ میں آخر میں اطمینان سے شاپنگ کر لوں گی۔ ابھی میرا بالکل بھی موڈ نہیں۔“ وہ تکیے میں منہ دیے بولی تو وہ اسے گھورتی بڑبڑاتی چلی گئیں۔
تزمین کی آنکھوں کے کونے خواہ مخواہ ہی بھینکنے لگے۔



گھر میں ڈھولک رکھ لی گئی تھی۔ ایویں شوق ہی شوق میں۔ بجانی چاہے کسی کو نہ آتی ہو۔ مگر ملاحہ اور فرزین اپنی دوستوں کو سرشام ہی جمع کر لیتیں۔ اور پہلے شادی کے گیت اور اس کے بعد اٹے سیدھے اوٹ پٹانگ گانے پٹا کر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوا جاتا۔

مہواہ کے دل کی بستی تو ان دنوں گلاب اگا رہی تھی اور وہ خود بھی گویا ایک کھلتا ہوا گلاب ہی بنی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں نیند بھرا خمیر اور ہونٹوں پر کلیوں جیسی چمکتی مسکراہٹ۔ اور یہ مسکراہٹ تو ان دنوں اس کے چہرے کا مستقل حصہ بن گئی تھی۔

من چاہے ہم سفر کا ساتھ ملنا تو نصیب کی بات ہوا کرتی ہے۔ ان دنوں موحّد کو دیکھ کر تو وہ ”ہونہہ“ کہہ کر منہ پھیر لیا کرتی تھی۔ شکر کرتی یہاں سے جا کر۔ اس لڑاکا بد تمیز سے تو پیچھا چھوٹتا۔

”کیا شور مچا رہا ہے گھر میں۔ ہر وقت کی دھماچو کڑی اور یہ فضول سا ڈھول۔ ہر وقت پیٹتی رہتی ہیں اس کو۔ سر میں درد رہنے لگا ہے میرے۔“ وہ اونچی آواز میں بڑبڑاتا ہوا پچن میں داخل ہوا۔ سب کے لیے چائے بنانی مہواہ کو برا سزا آیا۔

”دوسروں کی خوشیوں میں خوش ہونے والوں کے سر میں درد نہیں ہوا کرتا۔“ وہ مگ میں چائے اٹھاتے ہوئے اسی کے انداز میں گویا بڑبڑاتی تو وہ ٹھنک کر اسے دیکھنے لگا۔
”مہمان ہو چار دنوں کی اس گھر میں۔ اس لیے اتنی عزت کر رہا ہوں۔ چائے دو مجھے۔ تمہاری ڈھولک نے ہی سر میں درد کیا ہے۔“

”مگر میں پھر بھی تمہاری اتنی عزت نہیں کروں گی۔ یہ چائے مہمانوں کے لیے ہے۔ جن کے سر میں درد ہے وہ خود سے بنا لیں۔“ وہ صفا چٹ کہہ کر دو سرے مگ میں چائے ڈالنے لگی۔
”اما ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ سسرال والوں کو بہت تنگ کرے گی تمہاری زبان۔“ اسے گھورتے ہوئے موحّد نے کہا تو وہ اپنا کام کرتے ہوئے پرسکون انداز میں بولی۔

”اللہ کا شکر ہے نہ تم میرے سسرالیوں میں شامل ہو اور نہ ہی چچی جان۔ تم لوگ بچ جاؤ گے میری زبان سے۔“ موحّد کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
”کیا پتا۔“ وہ ٹکے سے کہہ کر چائے کا مگ اٹھانے لگا۔

مہواہ نے اسے مگ اٹھانے سے روکا نہیں تھا۔ ٹرے اٹھا کر لاؤنج میں جانے کو تیار ہوئی تو ایک نظر کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑے موحّد کو چائے کا گھونٹ بھرتے دیکھا۔ اس کی بڑبڑاہٹ اچھے سے سنی تھی۔
”مگر مجھے پتا ہے موحّد آفندی! اس دنیا میں آخری شخص ہوتے تم جسے میں اپنے لیے پسند کرتی ہوں۔“ وہ سلگ کر کہتی، ٹھک ٹھک کرتی پچن سے نکل گئی تھی۔

موحّد کی مسکراہٹ سمٹ گئی اور آنکھوں میں سرد مہری سی اترنے لگی۔ اس نے آگے بڑھ کر مہواہ کی بنائی چائے سنک میں انڈیلی اور پانی کا ٹل کھول دیا۔

اور مہواہ آفندی نہیں جانتی تھی کہ بڑے بول بولنے والے کیسے اپنے ہی لفظوں کے جال میں پھنس جایا کرتے ہیں۔ اسی لیے تو خاموشی کو کلام سے بہتر کہا گیا ہے۔
تو کوئی ہے جو سوچے سمجھے؟



”خان۔ تمہارے ہاں شادیاں کیسے ہوتی ہیں؟“

وہ شاپنگ کر کے ابھی گاڑی میں ہی بیٹھی تھی۔ پاؤں دکھنے لگے تھے چل چل کر۔ تو باقی کی شاپنگ اگلے چکر کے لیے چھوڑ دی۔ مگر صدیقہ بیگم زیورات کی دکان پر تھی اور فرزین اور سائرہ چچی اپنے جوتے دیکھ رہی تھیں۔ ایسے میں ملاحہ نے کبیر کا انٹرویو لینا شروع کر دیا۔

”انسانوں کی ہی ہوتی ہیں بی بی۔“

ملاحہ نے اسے ہلکا سا گھور کے دیکھا اور حیرت کر لی۔ ”تو میں نے کب چڑیا اور کوئل کی شادی کے بارے میں پوچھا ہے۔ انسانوں کی ہی شادی کا کہہ رہی ہوں کہ کیسے ہوتی ہیں؟“

”آپ لوگوں کے جیسی ہی ہوتی ہیں۔“

وہ گردن گھما کر اس طرف دیکھ رہا تھا جدھر سے تائی جان اور چچی جان کی واپسی کی توقع تھی۔ انداز ملاحہ کو ٹرخانے والا تھا۔ وہ خوب سمجھی۔

”ویسے کبیر۔ تمہارے ہاں سارے مرد تمہاری طرح سڑیل اور چپ گھنے سے ہوتے ہیں یا کچھ بہتر بھی ہیں؟“

”تپ کر پوچھا تو کبیر نے بے ساختہ ہنس کر بیک یو مرر میں خفا خفا سی ملاحہ کو ایک نظر دیکھا۔

”زیادہ تر تو آپ کی طرح ہی ہیں باتونی۔“

”چلو شکر ہے۔ تم ہنستے تو ہو۔ ورنہ تو بالکل مشینی آوی لگتے ہو۔ جی بی بی جی بی بی کرتے ہوئے۔“

ملاحہ کا مزاج تھوڑا بہتر ہوا تھا۔ ”ویسے مجھے بہت شوق ہے تمہارا گھر تمہارا گاؤں دیکھنے کا۔“

لوجی۔ کبیر کے ہونٹ سکڑے۔ (ہنسنے کا اتنا بڑا تاوان؟)

”آپ آغا جان کے ساتھ آئیے نا۔ آپ لوگوں کی تو بہت ساری زمینیں ہیں وہاں۔ فارم ہاؤس ہے۔“

”میں تمہارے گاؤں اور تمہارے گھر کی بات کر رہی ہوں۔“ ملاحہ نے زور دے کر اس پر گویا اس کی اہمیت واضح کی تھی۔ وہ چپ سا ہو کر ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگا۔

اس کی آنکھوں میں یاسیت اور آرزو کی گے سارے ہی رنگ اترنے لگے تو سامنے شیشے میں اس کو دیکھتی ملاحہ آرزو ہو گئی۔

”ہم غریبوں کے گھر کہاں ہوا کرتے ہیں ملاحہ بی بی۔ بس چار دیواری ہے اور چند مرلہ زمین وہ بھی۔“ وہ آرزو کی سے کہتے کہتے لب بھینچ گیا تھا۔ جیسے اگلی بات کہنے سے خود کو تختی سے روکا ہو۔

”وہ بھی کیا؟“ وہ بے چینی سے پوچھنے لگی۔ اتنی لالباہی نہیں تھی جتنی کہ لگتی تھی۔

”کچھ نہیں۔ یوں ہی کہا۔“ وہ فی الفور حواس میں لوٹا۔

”بے وقوف مت بنایا کرو کبیر خان۔“ وہ بگڑی۔

”مجھے بنانے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔“ وہ سادگی سے بولا تو ملاحہ بل کھا کر رہ گئی۔

”تمہارا مطلب ہے کہ میں بنی بنائی بے وقوف ہوں؟“ غرا کر پوچھا۔ تو وہ گھبرا سا گیا۔

”یہ میں نے کب کہا؟“

”اس سے کم بھی نہیں کہا کچھ۔ بے وقوف نہیں ہوں میں۔ فائنل ایر ہے گریجویشن کا۔“
وہ بگڑ کر بولی تو کبیر کا دل چاہا کانوں کو ہاتھ لگانے لے۔ مگر پھر مزید بات بگڑنے کا اندیشہ تھا۔ سو اس ”چاہت“ کو کسی اور وقت کے لیے ٹال ہی دیا۔

کبیر نے بہ آواز بلند شکراوا کیا جب فرزین، تائی جان اور چچی جان شاپنگ سنٹر سے لڑی ہوئی آتی دکھائی دیں تو وہ جلدی سے سامان ان کے ہاتھوں سے لے کر گاڑی میں رکھنے لگا۔ ملاحہ اپنی جگہ تھملا کر رہ گئی۔
”اف تو بہ تھک گئے آج تو۔“ تائی جان اور چچی جان کا مشترکہ تبصرہ تھا۔ جس سے فرزین کو سخت اختلاف ہوا۔
”لو۔ شاپنگ سے بندہ تھکنا ہے یا خوش ہوتا ہے الفف۔ مجھے اپنے سی گرین سوٹ کے ساتھ جو تامل گیا۔“
”آٹھ بج چکی ہیں۔“

”تمہیں کیا ہوا؟“ اس نے بے زار بیٹھی ملاحہ کی پسلی میں ٹوکا دیا تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔
”اس کو سوٹ کے میچنگ بندے جو پسند نہیں آئے اسی لیے منہ بنا ہو گا۔“ اگلی سیٹ پر سے تائی جان کا تبصرہ نشر ہوا تھا۔

”تو یہ کون سی چھوٹی بات ہے۔“
ملاحہ آزرہ سی باہر دیکھنے لگی۔ اس کے دل کا موسم ایسے ہی تھا۔ خزاں زدہ اور اس سا اندر ہی اندر کڑھتے ہوئے سوچا۔ اکثر دل ان ہی کے پیچھے بھاگتا ہے جو آپ کی ذرا بھی قدر نہیں جانتے۔
”لڑکیوں کو تو عادت ہوتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پہ دل ٹوٹ جاتا ہے ان کا۔“ چچی جان مسکرائیں۔
”نازک دل ذرا ذرا سی بات پر ہی ٹوٹا کرتے ہیں امی حضور۔ بڑی بڑی باتیں تو حوصلے سے برداشت ہو جاتی ہیں۔“ فرزین نے بڑے پتے کی بات کی تھی۔
ملاحہ نے بے اختیار نظریں اٹھا کر سامنے شیشے میں دیکھا تو کبیر سے نگاہ مل گئی۔ وہ نظر چرا کروڑا اسکرین کے پار دیکھنے لگا۔
ان کے مابین ”ان کہی“ کا جو ”حجاب“ تھا۔ وہ اسے برقرار ہی رکھنا چاہتا تھا۔ تب ہی وہ ملاحہ کی بے ساختگی اور کچھ کہتی بولتی آنکھوں سے نظریں چرائے رہتا تھا۔



”پارلر سے اپائنٹمنٹ لے لی ہے میں نے۔ دو ہفتے پہلے سیشن شروع ہو گا۔“ مہواہ انہیں مطلع کر رہی تھی۔
ترین نے پورا منہ رسالے میں گھیر لیا جیسے اس کا کسی بھی بات سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔
”دو ہفتے ہی تو رہ گئے ہیں آئی۔“ ملاحہ نے بے ساختہ کہا۔
”وہی تو۔ کل سے جانا شروع کروں گی۔ تب ہی شادی کے دن تک کچھ رونق آئے گی چہرے پر۔“ مہواہ شرارت سے مسکرائی۔
”اوہو۔ ابھی طلال بھائی کا نام لے لو آپ کے سامنے تو اچھی خاصی رونق آ جاتی ہے آپ کے منہ پر۔“
فرزین نے اسے چھیڑا تو واقعی وہ سبج ہو گئی۔
”ماشاء اللہ۔ ویسے ہی بڑی رونق ہے میری بیٹی کے چہرے پر۔“ تائی جان آج کل مہواہ پر خصوصی لاڈ لٹا رہی تھیں۔
ترین نے ایک جھٹکے سے رسالہ بند کر کے میز پر رکھا اور اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ سب نے فطری حیرت سے ایک پل کے لیے رک کر اسے دیکھا۔

”ہنس۔“ تابی جان نے سر جھٹک کر مہواہ کو دیکھا جیسے نظروں سے اشارہ کیا تھا۔
اور مہواہ تو کافی عرصے سے طلال کے لیے تزمین کی پسندیدگی سے واقف تھی۔ محض افسردہ ہو کر رہ گئی۔



”کیا بات ہے۔ تم کیوں صبح سے منہ بنا کر پھر رہی ہو۔“ رات لان میں ٹہلتے ہوئے فرزین نے ملاحہ کو پکڑ ہی لیا تھا۔

”کیا وجہ ہو سکتی ہے بھلا۔“ وہ افسردہ تھی۔

فرزین سنجیدگی سے بولی۔ ”تم بے وقوف ہو۔ تم نے دل لگایا ہی غلط جگہ پر ہے۔“
”محبت سوچ سمجھ کر کرنے والے چیز نہیں ہے فرزین۔ یہ تو خود بخود ہو جانے والا کام ہے۔“ ملاحہ نے آہ بھری تھی۔

”آغا جان کے بارے میں سوچا ہوتا تو یہ کام خود بخود نہ ہوتا۔“ فرزین نے چڑ کر کہا۔

”مانا کہ بندہ بہت ہینڈ سم ہے۔ مگر بے تو ملازم ہی نا۔“

”وہ ملازم نہیں ہے فری۔ آغا جان کے دوست کا پوتا ہے۔ کبھی وہ وقت بھی تھا کہ ان کے پاس بھی ایکڑوں زمین تھی۔ حالات انہیں اس سب پر لے آئے کہ انہیں آغا جان کے پاس نوکری کرنا پڑی اور کبیر کو آغا جان بڑی اہمیت دیتے ہیں۔“

پتا نہیں وہ خود کو تسلی دے رہی تھی یا اسے۔

”صرف اہمیت ہی دیتے ہیں۔ داماد والا مقام تو نہیں دے سکتے نا۔“ فرزین حقیقت پسند تھی۔

محبت نہ کرنے والے حقیقت پسند ہی ہوا کرتے ہیں۔ پر وہ تو ان کی عقل پر پڑتا ہے جو محبت میں غوطہ زن ہوتے ہیں۔

”تم نے سوچا نہیں کہ آگے کیا ہوگا؟“ فرزین کو اس کی بے بس سی کیفیت پر ترس آتا تھا۔ ”کبیر تک تو جانتا نہیں ہے کہ تم کس راستے پر تنہا چلتی جا رہی ہو۔“

”جانتا ہے فری۔ سب جانتا ہے۔ تب ہی تو میری آنکھوں میں دیکھتا نہیں ہے۔“ ملاحہ نے تیقن سے کہا۔

”ہاں۔ شریف تو بہت ہے۔“ فرزین مسکرائی۔

”کیا فائدہ ایسی شرافت کا۔ جو آپ کو محبت کا اعتراف نہ کرنے دے۔“

ملاحہ سلکی۔ فرزین نے سوچتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”پھر بھی ملاحہ کچھ تو سوچا ہی ہوگا۔ بالفرض کبیر کو بھی تم سے محبت ہو جاتی ہے تو پھر کیا کرو گے تم لوگ۔ آغا جان کو کیسے مناؤ گے؟“

”اف۔“ ملاحہ نے جیسے فرض کر کے ہی مڑا لیا۔ بچوں کی طرح مٹھیاں بھینچیں۔

”پہلے مجھے اس بات کی خوشی تو محسوس کر لینے دو کہ اسے بھی مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔“

فرزین نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ”پاگل ہو بالکل۔ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اس کے سائڈ الیکٹریکھے جاتے ہیں۔“

”مگر محبت میں صرف پازنڈ الیکٹریکس دیکھے جاتے ہیں۔“ وہ مطمئن تھی۔

”کبیر بے وقوف نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے تم جن راہوں پر چل رہی ہو۔ مگر وہ اپنے مقام سے بھی واقف ہے

اچھی طرح۔“ فرزین نے حقیقت بتائی۔ جو واقعی سچ تھی۔

”وہ کنی کمین نہیں ہے فری۔ آغا جان کے دوست کا پوتا ہے۔“ وہ زور دے کر بولی۔
 ”مگر آغا جان اسے ملازم ہی سمجھتے ہیں ملاح۔ تم آغا جان کی نیچرے اچھی طرح واقف ہو۔“
 ”کوئی نہیں۔ پورے گھر میں دس سال سے دندنا تا پھر رہا ہے۔ آغا جان نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ ہی ہے کہ انہیں کبیر پر مکمل بھروسہ ہے۔“
 فرزین چلتی ہوئی اس کے آگے کھڑی ہوئی تو ملاح کو رکنا پڑا۔
 ”تمہارا نہیں خیال کہ کبیر اس بھروسے کو ٹوٹنے نہیں دے گا؟“
 ”جب محبت ہو جائے تو سو دو زیاں نہیں دیکھا کرتے فری۔ جو ہو گا وہ کھا جائے گا۔“
 وہ مطمئن تھی۔ فرزین گہری سانس بھرتی پھر سے اس کے ساتھ چلنے لگی۔ دونوں ہم قدم تھیں مگر دونوں کی سوچیں الگ الگ سمتوں میں محور واز تھیں۔



اس نے پارلر کے سامنے اتر کر کبیر کو واپسی کا ٹائم دیا اور پارلر میں چلی گئی۔ کبیر گاڑی ریورس کر رہا تھا جب اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے دیکھا موجد کی کال تھی۔ وہ گاڑی روک کر کال اٹینڈ کرنے لگا۔
 ”کہاں ہو تم؟“

”میں ابھی مہربانی کو پارلر لے کر آیا تھا۔“
 ”چھوڑ دیا اسے تو ذرا آفس کا چکر لگا لو۔ آج سامان کی لوڈنگ ہو رہی ہے۔ میں آؤٹ آف شے ہوں تو تم ذرا جہاں زیب صاحب کے ساتھ مل کر دیکھ لینا اور بکنگ نوٹ کر لینا۔“ موجد نے کہا۔ وہ کچھ عرصے سے یہ کام کبیر سے لے رہا تھا۔

”ایک گھنٹے بعد مہربانی کو پارلر سے لینا بھی ہے مجھے۔“ کبیر نے اسے بتایا۔
 ”بس اتنی ہی دیر کا کام ہے۔ تم بہ آسانی پہنچ جاؤ گے۔“ موجد نے اسے تسلی دی۔
 ”چلیں ٹھیک ہے۔ میں فیکٹری پہنچتا ہوں۔“ کبیر نے آمادگی ظاہر کرتے ہوئے ریورس کر کے گاڑی پارکنگ سے نکالی اور فیکٹری کے راستے پر ڈال دی۔

عین اس وقت جب کبیر کی گاڑی سڑک کا موڑ مڑی اسی سبک و ماڈل کی گاڑی پارلر کے سامنے آکر پارکنگ میں رک گئی۔ مگر اس میں ڈرائیور کبیر نہیں تھا۔ وہ لمبا ترنگا سا شخص خوش شکل بھی تھا اور خوش لباس بھی۔ وہ موبائل کی اسکرین پر ٹائم دیکھنے کے بعد سیٹ پر مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔ جیسے کسی کے انتظار میں ہو۔
 پارلر کے باہر انتظار؟

کبیر جیسی گاڑی کے ڈرائیور کے ہر انداز سے بہت سکون اور طمانیت جھلکتی تھی جیسے وہ اپنے ہر منصوبے کے بارے میں پر یقین ہو۔

مہواہ دیے ہوئے ٹائم پر پارلر سے باہر نکلی تو سامنے ہی پارکنگ میں گاڑی دکھائی دے گئی۔ شام کے سائے ڈھلنے لگے تھے۔ اس نے موبائل واپس بیگ میں ڈالا جو کبیر کو کال کرنے کے لیے نکالا تھا۔ وہ دس پندرہ منٹ پہلے ہی فارغ ہو گئی تھی۔ خیال ہی تھا کہ شاید کبیر ابھی نہ پہنچا ہو۔

بعض اوقات انسان کو کیسے صحیح خیال آتے ہیں۔ جیسے کوئی الہامی کیفیت۔
 مگر شام کے گہرے پڑتے سائے میں بھی اس نے پہلی ہی نظر میں گاڑی کو دیکھ لیا تھا اور تیز قدموں سے گاڑی کی طرف بڑھی، چہرہ ہلکے سے نقاب کی زد میں کر لیا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی کی اندرونی لائٹ

وقتی طور پر جل کر دروازہ بند کرتے ہی بجھ گئی۔ گاڑی مین روڈ پر آگئی تھی۔ مہواہ نے سیٹ سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ تو پچھم سے طلال کا سرابا بند پلکوں کے پیچھے اتر آیا۔

دو ہفتے۔ محض دو ہفتے رہ گئے تھے اسے طلال کی زندگی میں شامل ہونے کے لیے۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی کہ اچانک گاڑی کو لگنے والے جھکوں نے اسے ڈسٹرب کیا۔

”گاڑی دھیان سے چلاؤ کبیر۔ روڈ خراب ہے شاید۔“ اس نے اونچی آواز میں کہا۔ کبیر کچھ نہیں بولا تھا۔ مگر جھٹکے بدستور جاری رہے۔ مہواہ کو خیال آیا ”آتے ہوئے تو کوئی سڑک ایسی نہیں تھی جہاں سے وہ گزرے ہوں اور ایسے جھٹکے لگے ہوں۔“

اس کی آنکھیں پٹ سے کھلیں۔ اسی وقت گاڑی رک گئی تھی۔

”کیا ہوا کبیر۔؟“ مہواہ نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی کی اندرونی لائٹ آن کی۔ اسی وقت پچھلا دروازہ کھول کر کوئی اندر بیٹھا تو مہواہ کی بے اختیار چیخ نکل گئی۔

وہ مضبوط تن و توش کی کوئی عورت تھی۔ جس نے اسے کچھ سمجھنے کا موقع دیے بغیر ہاتھ میں پکڑا بے ہوشی کی دوا میں ڈوبا رو مال اس کے منہ پر رکھ دیا تو ذرا سی مزاحمت کے بعد ہی مہواہ کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

”کام ہو گیا ہے صاحب۔“ اس عورت نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے آدمی کو بتایا تو اس کے ہونٹوں پر مطمئن سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے گاڑی دوبارہ سے اشارت کرتے ہوئے گاڑی کی اندرونی لائٹ پھر سے آف کر دی۔ مہواہ آفتندی اپنی زندگی۔ اپنے محور سے نکل گئی تھی۔



اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھوں کو کمر کے پیچھے مضبوطی سے ٹیپ کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ ہوش میں آتے ہی وہ خوف زدہ سی چیخنے لگی اور تب خاموش ہوئی جب دروازہ کھلنے اور چٹ کی آواز کے ساتھ لائٹ جلانے جانے کا احساس ہوا۔

”کون ہے؟“ اس کے اعصاب جاگے۔

کسی نے اس کی آنکھوں پر بندھی پٹی کھولی اور اتار دی۔ تیز روشنی اس کی آنکھوں پر پڑی تو اس نے آنکھیں میچ لیں۔ پھر ایک دم سے آنکھیں کھول کر دیکھا تو لرزی گئی۔ بے اختیار سمٹ کر پیچھے کو ہٹی اور دیوار کے ساتھ لگ گئی۔

لبا ترنگا، خوش شکل سا آدمی، مہواہ کو دیکھا بھالا سا لگا۔ مگر فوری طور پر یاد نہیں آیا کہ اسے کہاں دیکھا ہے۔

”تم۔ کون ہو۔ مجھے کون لایا ہے یہاں۔؟“ اس نے سوکھے حلق کے ساتھ پوچھا۔

وہ اس کی طرف تھوڑا سا جھکا تو مہواہ کے منہ سے بے اختیار ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”نمیر و قار آفتندی۔ نام تو سنایا ہو گا؟“ مہواہ کے سر پر جیسے کسی نے پہاڑ توڑ دیا ہو۔ وہ پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ دماغ یکجہت ہی گھوم کر رہ گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



اتنے سال اپنے بھائی کو بھی نہ دیکھ سکی وہ دنیا سے گزر گئے۔ کچھ دن کے لیے تم ہی آ جاؤ۔
ان کے محبت اور جذبات سے بھرے خطوط سے میری ممائی پسچ گئیں۔ انہوں نے مجھے مشرقی پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔
”بے چاری بوڑھی ہیں۔ بیمار ہیں تمہارے سوا ان کا دنیا میں ہے ہی کون تم کچھ دنوں کے لیے ہو آؤ۔“

مجھے مغربی پاکستان سے آئے ہوئے تقریباً ایک سال ہو گیا تھا مگر یہاں تو جیسے زمین نے اور لوگوں نے میرے پیر جکڑ لیے تھے، حالانکہ میں آیا تو چند ماہ کے لیے تھا اپنی پھوپھی امی کے پاس وہ بہت بیمار تھیں! ابا کے انتقال کے بعد تو اتر سے ان کے خطوط میرے پاس آنے لگے ہر بار بس یہی تقاضا کہ ایک بار آ کر مجھ سے مل لو اپنی صورت دکھا جاؤ، زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔



Downloaded From
Paksociety.com

انہوں نے بڑے پیار سے مجھ سے کہا تھا اُمی کا انتقال میرے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ ممانی نے اپنی محبت اور شفقت کی آغوش میں مجھے سمیٹ لیا تھا ابانے دوسری شادی نہیں کی وہ تمہاری پسند اور کم گو ہو گئے تھے ان کا بس ایک ہی خواب تھا کہ میں پڑھ لکھ کر کسی قابل ہو جاؤں میں پڑھائی میں اچھا تھا ان کا خواب پورا کیا اور ڈاکٹر بن گیا مگر ان کی یہ خواہش پوری ہوئی تو وہ زیادہ عرصہ نہیں جیسے ایک روز چپ چاپ خالق حقیقی سے جا ملے نہ بیماری نہ کچھ اور بس بیٹھے بیٹھے دل کی دھڑکن بند ہو گئی۔ پھوپھی اماں کو بذریعہ خط اس سانحہ کی اطلاع دی گئی پھر تو ان کے خطوط کا تانتا بندھ گیا بالآخر میں نے مشرقی پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا۔

”حالات ٹھیک نظر نہیں آرہے دیکھ بھال کے جاؤ۔“ ماموں نے دلی زبان میں مشورہ دیا۔

”کیوں حالات کو کیا ہوا؟“ میں نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

نہ 1969ء چل رہا تھا ابھی 70ء کے الیکشن میں تقریباً ایک سال باقی تھا۔ پھر میرا مزاج ایسا تھا کہ میں سیاست اور سیاسی حالات میں ذرا کم ہی دلچسپی رکھتا تھا اور ماموں اتنے ہی سیاست کے شوقین اخبارات کا

مطالعہ ریڈیو سے رابطہ (بقول ممانی) روزانہ بی بی سی نے بغیر حلقے سے نوالہ نیچے نہیں اترتا تھا اور پوربی پاکستان اور پچھی پاکستان کی خبریں سے بغیر انہیں نیند نہیں آتی تھی۔

”کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا مگر ہواؤں کا رخ بدلنے کو ہے۔“ وہ ایسے ہی پسلیاں بچھانے لگے۔

”ارے ماموں! یہ سیاست دان اپنی سیاست چمکانے کے لیے لوگوں کو یوں ہی ڈراتے ہیں اچھے بھلے حالات ہیں آخر ہوا کیا ہے بھلا؟“ میں نے ان کی بات کو چٹکیوں میں اڑایا اور جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

پاسپورٹ کا کوئی کھراک نہیں تھا فقط ٹکٹ ہی لینا تھا۔

میں نے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی میں

اچانک پہنچ کر پھوپھی اماں کو سر پر اترنا چاہتا تھا اور جب میں ضلع میمن سنگھ گاؤں ننگارو چاند پور پہنچ کر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا تو انہیں اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا کہ ہزاروں میل دور سے میں آگیا ہوں اور جب یقین آیا تو وہ مجھے گلے لگا کر فقط روتی ہی رہیں یہ آنسو پھڑنے والوں کی یاد میں بھی تھے اور جیسے سے ملنے کی خوشی کے بھی تھے وہ بہت ضعیف ہو چکی تھیں مگر اس وقت تو ان میں ایسا جوش اور توانائی اچانک کہیں سے آگئی تھی وہ کھانا پکانے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں اور ان کی مدد کے لیے پورے محلے کی خواتین جمع تھیں جو مجھے دیکھنے اور ملنے کے شوق میں آئی تھیں۔ گاؤں بھر کے لوگ آ رہے تھے ہزاروں میل دور پوربی پاکستان سے رحمن بوا کا بھتیجا آیا ہے اور جب ان کو علم ہوا کہ میں ڈاکٹر ہوں تو وہ اتنی عقیدت اور محبت کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کرتے جیسے میں کوئی بہت اونچی شے ہوں۔

دستر خوان بچھا، چھلی کا سالن، بطخ کا گوشت، دال، ابلے ہوئے چاول (لہنتا بھات) اور کھیر کھانے کے بعد ریلے انٹاس کی قاشیں اور کھیل پتا نہیں مجھے ہی بہت زوروں کی بھوک لگی ہوئی تھی اس وقت یا واقعی وہ کھانا اتنا مزے دار تھا کہ اس کا ذائقہ میں آج تک

نہیں بھول سکا (بھولنے کو تو خیر میں کچھ بھی نہیں بھولا) کھانے کے بعد ایسا خمار چڑھا اور کچھ سفر کی تھکن میں جو سویا تو پھر علی الصبح ٹؤذن کی آواز پر ہی میری آنکھ کھلی۔ مجھے شروع سے ہی صبح سویرے اٹھنے کی عادت تھی دور طالب علمی میں صبح فجر کی نماز کے بعد میں پڑھائی کیا کرتا تھا، جاگنے کی وہ عادت اب بھی برقرار تھی۔

میں اٹھ بیٹھا اور اپنی آنکھیں ملنے لگا۔ نیم تاریکی میں کمرے کے خدو خال کچھ زیادہ واضح نہیں تھے مگر پھر بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بڑا سا کمرہ مٹی کی بنی پتلی دیواروں اور پھونس کے چھپر کا تھا فرش بھی کچا مگر صاف ستھرا لپا ہوا تھا۔ جس اونچے سے تخت پر میں سویا تھا وہاں سے ٹانگیں نیچے لٹکا میں اور اتر آیا۔

”اٹھ گئے بیٹا؟“ پھوپھی اماں بھی اسی کمرے کے دوسرے کونے میں بچھے تخت پر لیٹی تھیں۔ ”جی پھوپھی“ میں نے کھڑے ہو کر دو چار انگڑائیاں لیں اور کمرے سے باہر آ گیا۔ اتنا بڑا صحن، میں نے صبح کی ٹھنڈی ہوا اور دھیرے دھیرے پھیلتے ٹھنڈے بیٹھے اجالے میں ایک بار پھر دو چار زبردست انگڑائیاں لے کر خود کو وارم اپ کیا پھر میں نماز پڑھنے مسجد چلا گیا کل آتے ہوئے یہ مسجد میرے راستے میں پڑی تھی۔

پھر روزانہ میں وہاں کی سیر کرتا اور روزانہ وہاں کا جادو مجھ پہ چڑھتا جاتا دریا کے کنارے میں گھنٹوں بیٹھا رہتا آتی جانی کشتیاں دیکھتا رہتا سبزہ، کھیت ہریالی، ایک ایک چپ، ایک ایک منظر قابل دید، پھوپھی اماں بے اولاد تھیں پھوپھی کے انتقال کے بعد ان کے ایک رشتے کے بھتیجے کھیتوں اور فصلوں کی نگہبانی کر رہے تھے۔ شریف اور ایماندار تھے، پھوپھی اماں ان کی محنت سے بڑھ کر ان کو معاوضہ دیتی تھیں۔ وہ پھوپھی کے ساتھ ہی رہتے تھے سب لوگ انہیں عبدل چاچا کہتے تھے۔ میں نے بھی یہی کہنا شروع کر دیا۔ ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا ایک بیٹا تھا سیف الاسلام جس طرح کماتوں کے جادوگر کی جان طوطے میں ہوتی ہے اسی طرح عبدل چاچا کی جان اپنے اکلوتے بیٹے سیف الاسلام میں تھی۔ سولہ سترہ برس کا وہ سانولا سالز کا بڑا پرکشش تھا۔ اپنے باپ کی طرح شریف اور سیدھا سادہ۔

مجھے کچھ ہی دنوں میں عبدل چاچا سے خاصا لگاؤ ہو گیا تھا انہوں نے مجھے نہ صرف پورا لگاؤں گھمایا، دریا کی سیر کروائی بلکہ متعدد نئے ذائقوں اور چیزوں سے بھی روشناس کرایا۔ ایسے بیٹھے ریلے اور موٹے موٹے لال گنے میں نے کراچی میں کبھی نہیں کھائے تھے، کشل، انناس، اتنا کھانا، اتنا کھانا کہ پیٹ اور نیت دونوں بھر جاتے۔ آم پھوپھی اماں اور عبدل چاچا تو کمرے بھر بھر کر میرے سامنے رکھ دیتے آم کے آگے بھلا کس کافر کا ہاتھ رکتا ہے۔

”آپ مجھے بھولو پہلوان بنا کر واپس بھیجیں گی“ میں

ان سے لاڈ کرتا اس وقت میں بہت دیلا پتلا تھا وہ ہنستی رہتیں اور مجھے کھلانے پر اصرار کرتی رہتیں لگاؤں کے کئی لوگوں سے اچھی واقفیت ہو گئی تھی میری پھوپھی اماں اور عبدل چاچا کو ٹوٹی پھوٹی اردو آتی تھی اور مجھے ٹوٹی پھوٹی بنگالی یوں ہمارا کام چل رہا تھا۔ ہاسٹل کے زمانے سے میرے تین بنگالی دوست تھے ان ہی سے میں نے بنگلہ زبان سیکھی تھی جواب کام آ رہی تھی۔

کبھی شام میں عبدل چاچا کے ساتھ کشتی کی سیر پر نکل جاتا اور ہم دنیا جہاں کی باتیں کرتے رہتے۔ آج کل دریا جڑھا ہوا تھا۔ سول پھلی اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے بڑی تعداد میں دریا میں نظر آ رہے تھے۔ شام کا سنا سنا، فرحت بخش ہوا، کناروں پہ آنکھوں کو تراوٹ بخشی ہریالی اور دریا کی چلتی لہروں پہ ڈولتی کشتی وہ میری زندگی کے خوب صورت ترین لمحات تھے قریب سے ایک کشتی گزری اس میں کئی لوگوں کے ساتھ یوسف چاچا بھی بیٹھے تھے، ہمیں دیکھ کر ان کے بوڑھے چہرے پہ مسکراہٹ آ گئی۔ انہوں نے دور سے ہاتھ ہلایا ہم نے بھی مسکرا کر جوابی ہاتھ ہلا دیے۔

”بے چارہ یوسف، بہوت برے حال میں ہے۔“

عبدل چاچا نے ایک آہ بھری۔

”بے چارے کو بھات بھی نہیں ملتا، روٹی کھاتا ہے۔ بہوت گوریب (غریب) ہو گیا ہے۔“ وہ دوبارہ

بولے تو میں بے ساختہ مسکرا اٹھا۔

”روٹی کھانے والے غریب ہوتے ہیں؟“

”ہاں، یہاں گوریب (غریب) لوگ روٹی کھاتا ہے۔“

”پھر تو کراچی میں بہت غروت ہے، وہاں تو سب لوگ روٹی ہی کھاتے ہیں، چاول نہیں۔“ میں نے مذاقاً ان سے کہا۔

”ہم نے تو سنا ہے وہاں بہت دولت ہے، بہت پیسہ ہے پوری پاکستان میں، سونے کی سڑکیں اور چاندی کے فٹ پاتھ، کسی کے بھاشن میں سنا تھا۔“

”نہیں چاہا! ایسی کوئی بات نہیں، غریب وہاں بھی ہے، غریب وہاں بھی ہیں۔ امیر غریب تو ہر جگہ ہوتے ہیں نا۔“

”ہاں ٹھیک کہا تم نے۔“ انہوں نے سر ملاتے ہوئے میری بات سے اتفاق کیا۔

مجھے آئے ہوئے تقریباً چار ماہ ہو چکے تھے ماموں کا خط آیا تھا کراچی سے انہوں نے واپسی کے بارے میں پوچھا تھا میرا ابھی دل تو نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی میں نے انہیں لکھ دیا کہ میں ایک دو ماہ میں واپس آ رہا ہوں مگر اس سے پہلے ہی شمس النساء مجھ سے فکر اگئی۔

بنگلہ کے جادو کی جیتی جاگتی تصویر، ریلے ہونٹوں، کلیمے غنیوں اور روایتی بے حد حسین زلف بنگال رکھنے والی شمس النساء جس کی سانولی رنگت میں ایسا نمک گھلا تھا کہ اس پر سے نظریں ہٹائے نہیں ہتی تھیں۔ وہ میرے پھوپھا کے سگے بھائی کی بیٹی تھی وہ لوگ ڈھاکہ میں رہتے تھے اس کے والد وہاں اسکول ٹیچر تھے اور وہ خود کالج میں فاسٹل ایر کی طالبہ تھی۔

پھوپھی کی علالت کی خبر پر کروہ دونوں باپ بیٹی کچھ دنوں کے لیے وہاں آئے تھے مجھے عبدالمنعم صاحب سے مل کر بھی بہت اچھا لگا۔ تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے دل و دماغ کے مالک، نور الاسلام اور ٹیگور کے مداح اور اقبال کے عقیدت مند، دہلی کے پڑھے ہوئے تھے، بنگلہ تو بھی ہی ان کی مادری زبان اردو، فارسی اور انگریزی پر بھی عبور حاصل تھا، ان کی علمی گفتگو کے آگے میں خود کو

بونا خیال کرتا، میں ڈاکٹر ہی تو تھا اور بس، ان کی طرح ادب، شاعری اور فلسفے کے متعلق میری معلومات اور دلچسپی ذرا کم ہی تھی، مگر اسلام مسلمان اور پاکستان کے حوالے سے گفتگو کرتے تو میں اچھا خاصا بول لیتا تھا۔ وہ لوگ دو ہفتے کے لیے آئے تھے اور یہ دو ہفتے جیسے پر لگا کر گزر گئے۔

کبھی شمس النساء بھی ہماری گفتگو میں شریک ہو جاتی، میں پہلے اس سے متاثر ہوا پھر مجھے اس سے محبت ہو گئی۔ شاید کبھی محبت یوں بھی ہو جاتی ہے، فقط

تھوڑے سے دنوں میں مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اس کو بہت دنوں سے بہت پہلے سے جانتا ہوں، جیسے وہ کبھی اجنبی تھی ہی نہیں میرے لیے، جیسے وہ ہمیشہ سے میرے دل کے اتنی قریب میرے لیے اتنی خاص تھی۔ ان دنوں میں ایک ڈاکٹر سے ایک شاعر بن گیا تھا۔ میرے دماغ میں اس کے لیے ایسی ایسی شاعرانہ تشبیہات آئیں کہ میں خود بھی حیران ہو جاتا، یہ محبت انسان کو پاگل اور دیوانہ بنانے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی بنا دیتی ہے۔ ان کی واپسی کا وقت قریب آ رہا تھا اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے جسم سے جان نکلتی جا رہی ہے، ان کے جانے سے دو دن پہلے میں پھوپھی اماں سے حال دل کہہ بیٹھا، ان کے علاوہ کوئی نہیں تھا جو میری مدد کر سکتا، میری بات سن کر وہ اپنے پوٹے منہ سے مسکرا دیں اور دیر تک مسکراتی رہیں۔

”میں بات کرتی ہوں عبدالمنعم سے۔“ انہوں نے مسکراتے مسکراتے ہاں بھر لی۔

بعد کے مراحل میری توقع سے زیادہ آسان ثابت ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنے گھر والوں سے مشاورت کر کے جواب دیں گے، ان کے جانے کے کچھ دنوں بعد ان کا خط آیا تھا، انہوں نے اثبات میں جواب دیا تھا اور مزید کہا کہ چھ ماہ بعد شمس النساء کے فاسٹل ایر کے بعد وہ نکاح کر کے رخصت کر دیں گے۔ اس سے پہلے انہوں نے ماموں سے بھی خط و کتابت کی تھی اور مطمئن ہونے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا، بیٹی کے دور جانے کا قلق تھا مگر بہت زیادہ نہیں، ان کا ایک بیٹا کراچی میں رہتا تھا وہ کالج میں لیکچرار تھا۔ شادی شدہ بال بچوں والا، عبدالمنعم کا سال میں ایک آدھ چکر وہاں کا لگ ہی جاتا تھا۔

میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ میرے ہاتھ تو جیسے ہفت اقلیم کی دولت لگ گئی تھی، میں ابھی مزید آٹھ دس ماہ بیٹھتا تھا، سارا دن فارغ رہ رہ کر رہنے لگا تو اس بوریٹ کا حل بھی نکال لیا۔ گاؤں میں ڈپنٹری تھی مگر ڈاکٹر کوئی نہیں تھا ایک کمپاؤنڈر تھا وہ بھی کچھ

بڑا تفصیلی خط آیا تھا جس کا لب لباب یہی تھا کہ الیکشن کے بعد حالات خراب ہونے کی توقع ہے، تم روزانہ بی بی سی سن کر حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کرو، اگر زیادہ کچھ گزری ہوئی تو وہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا۔ ”یہ ماموں بھی بس۔۔۔“ میں ان کا خط پڑھ کر مسکرا دیا۔

”بھلا الیکشن کا حالات سے کیا تعلق، انتخابات ہو جائیں گے، جو جیت جائے گا کرسی پر بیٹھ جائے گا اللہ اللہ خیر صلا، باقی رہے سیاسی معاملات تو ان کی گرامری تو سال ہا سال ہی چلتی رہتی ہے۔“ میں نے بڑے آرام سے سوچا تھا، مگر یہ تو بعد میں پتا چلا کہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا کہ ہم سوچتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ جو جیتے گا وہ اقتدار کی مسند پر فائز ہو جائے گا اور بس، مگر میں نے تو معاملہ سارا شروع ہوا یا پھر شاید بہت کچھ پہلے سے بگڑ چکا تھا اس معاملے نے جلتی بریل کا سا کام کیا الیکشن ہو گیا۔ محیب الرحمن کی عوامی لیگ اکثریت میں آئی، مگر اقتدار کی مسند پر فائز نہ ہوئی، میں اب ریڈیو یا قاعدگی سے سن رہا تھا۔ حالات پید سے بدتر ہوتے جا رہے تھے، جب بھی کوئی بری خبر آتی خاص طور پر ڈھاکہ کی طرف سے میرا دل دھل جاتا، شمس النساء ہیں تو تھی۔

انہی دنوں عبدال چچا کو ملیا نے جکڑ لیا، بیماری اتنی بڑھی کہ ان کا جانیر ہونا بظاہر مشکل نظر آ رہا تھا مگر میں پوری تندہی کے ساتھ ان کے علاج میں مصروف ہو گیا کئی کئی بار شہر جا کر مطلوبہ دوائیاں لاتا، علاج پر ہیز میں نے دن رات ایک کر دیا تھا، ان کی زندگی ابھی باقی تھی سو وہ دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آئے، سیف

الاسلام بھی اپنے باپ سے والہانہ محبت کرتا تھا، باپ کو دوبارہ اپنے پیروں پہ کھڑا دیکھ کر وہ میرا ایسا عقیدت مند ہو گیا تھا کہ بقول شخصے پاؤں دھو دھو کے پیتا، عبدال چچا ٹھیک ہوئے تو میں بیمار پڑ گیا اس دن مجھے 102 بخار تھا میں میڈیسن کھا کر کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹا تھا کہ باہر سے شور شرابے اور آہ و بکا کی آواز سنائی دی

عرصہ پہلے چلا گیا تھا۔ میں نے وہاں کی صفائی سٹھرائی کروائی، عشر سے ڈپنری کے لیے مطلوبہ سامان اور میڈیسن وغیرہ لایا اور صبح سے شام تک وہاں بیٹھنے لگا۔ گاؤں کے لوگ بہت خوش تھے۔

وہاں ڈاکٹر تو کیا کوئی حکیم بھی نہ تھا، علاج کے لیے گنگار جانا پڑتا تھا۔ اب سب کی یہ مشکل تو آسان ہو گئی تھی میرا وقت بھی کچھ آسانی سے کٹنے لگا تھا، مگر انہی دنوں ایک سانحہ ہو گیا پھوپھی اماں معمولی علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔ ان کے بعد عبدال چچا نے مجھے کھیتوں اور فصلوں کا کچھ حساب کتاب بتانے کی کوشش کی مگر مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”چاچا یہ سب حساب کتاب آپ اپنے پاس رکھیں اور جو مناسب سمجھیں وہ کریں۔“ میں نے نرمی سے ان سے کہا۔

”مگر بیٹے یہ سب آپ کا ہے۔“ انہوں نے پھوپھی اماں کی وصیت کا حوالہ دیا۔

”جس زمین پر دن رات آپ نے محنت کی ہے، موسم کی سختیاں برداشت کی ہیں، وہ زمین میری کیسے ہو سکتی ہے، یہ سب آپ کا ہے میں اپنی مرضی اور خوشی سے آپ کو دے رہا ہوں۔“

وہ حیران شدہ میری شکل دیکھ رہے تھے، پھر یکایک ان کے ہونٹ کپکپائے اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”بہت بڑا احسان۔۔۔“ انہوں نے میرے آگے ہاتھ جوڑے۔

”چچا یہ کیا کر رہے ہیں۔“ میں نے ان کے بندھے

ہوئے ہاتھ کھولے، ”بھتیجا ہوں آخر چچا کتنا ہی نہیں سمجھتا بھی ہوں۔“

مجھے زمین کا یا دولت کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ میری محبت، میری دولت شمس النساء تھی، وہ مجھے مل رہی تھی، مجھے بھلا اور کیا چاہیے تھا۔ پھر الیکشن کا شور و غوغا ہونے لگا، یہاں گاؤں میں تو خیر اتنا شور شرابا یا جوش و خروش نہیں تھا، تھوڑا بہت تھا، مگر کراچی سے ماموں کا

کچھ دیر تو میں یونہی سنتا رہا پھر ہر نکل آیا۔

”کیا بات ہے؟“ گھر کے صحن میں عبدل چچا اور سیف الاسلام کے ہمراہ ایک اجنبی مرد اور عورت کھڑے ہوئے تھے مرد کے بازوؤں میں ایک چارپانچ سال کا بچہ تھا آنکھیں بند چہرہ زرد اور کم لایا ہوا۔

”شوب‘ شوب (صاحب‘ صاحب)۔“ وہ دونوں بیک وقت بنگلہ میں شروع ہو گئے وہ بیک وقت رو بھی رہے تھے اور بول بھی رہے تھے میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا بخار سے خود میرا سر بھی چکرا رہا تھا۔ زیادہ دیر کھڑا ہونا بھی محال تھا۔

”یہ لوگ بولتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت بیمار ہے، کئی روز سے بخار نہیں اتر رہا ہے دوسرے گاؤں سے آئے ہیں علاج کروانے“ عبدل چچا نے آگے بڑھ کر ان کی ترجمانی کی۔

میں نے ان سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب خود بیمار ہیں، دوائی کھا کر سو رہے ہیں تھوڑی دیر یہیں بیٹھ کر انتظار کر لو، تو شور مچانے لگے، رونے لگے، انہوں نے مزید بتایا۔

میں نے آگے بڑھ کر بچے کا ماتھا چھوا، نبض چیک کی، بخار بہت تیز تھا بچے کا نازک بدن اور چہرہ جیسے جل جھن رہا تھا۔

”سیف السلام! ڈپنسری کا تالا کھولو، ان لوگوں کو لے کر چلو، میں آ رہا ہوں۔“ میں نے سیف السلام سے کہا ڈپنسری کی صفائی، کھولنا بند کرنا اور چھوٹے موٹے دوسرے کام وہی کرتا تھا۔

”مگر آپ کو تو بہت تیز بخار (بخار) ہے۔“ عبدل چچا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”ہاں چچا مگر بچے کا بخار مجھ سے بھی زیادہ تیز ہے۔“

میں نے لباس تبدیل کیا اور ڈپنسری چلا گیا۔ بچے کو چیک کر کے فوری طور پر کچھ ضروری میڈیسنز دیں، والدین کو کچھ ہدایات دیں اور اگلے روز آنے کو کہا۔ ”کیا ضرورت تھی پھر بلانے کی، دوا دارو کر دیا، بہوت ہے۔“ ان کے جانے کے بعد عبدل چچا

بڑھائے

”جب تک بچہ ٹھیک نہیں ہو گا بار بار بلانا تو پڑے گا۔“

”چھوڑو ان کے حال پہ ہندو ہے سالا، نظر نہیں آ رہا تھا کیا۔“ وہ نہ جانے کیوں برہم ہو رہے تھے۔

”وہ پہلے انسان ہے، پھر کچھ اور، ہم ڈاکٹر بن کر حلف اٹھاتے ہیں کہ انسان کی خدمت کریں گے نہ کہ صرف مسلمان کی۔“ میں نے نرمی سے انہیں سمجھایا۔

”آپ نہیں جانتا ان لوگوں کو، ہم جانتا ہے، یہ کیسے رکھتے ہیں اپنے من میں رکھتے دو، ہم تو نہیں رکھتے ناں۔“ میں نے بات ہی ختم کر دی۔

میرا بخار تو اگلے دن ٹھیک ہو گیا تھا مگر اس بچے کو صحت یاب ہونے میں دو تین ہفتے لگ گئے۔ بچے کو صحت یاب پا کر دونوں میاں بیوی ہاتھ جوڑ جوڑ کر میرا شکریہ ادا کرتے رہے، اولاد بھی کیا شے ہے، ان کے جانے کے بعد میں نے سوچا۔

اولاد کی خوشی، سکھ اور آرام کی خاطر انسان کیا کیا جتن کرتا ہے۔ اپنی سدھ بدھ اپنے آپ کو کھو بیٹھتا ہے، میرے خیالات کی رو عبدل چچا کی طرف مڑ گئی۔

جیسے عبدل چچا، وہ تو جیسے سیف الاسلام کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے، آج کل وہ اس کا رشتہ طے کرنے کی باتیں کر رہے تھے، اس کی شادی کا ذکر کرتے وقت وہ اتنے پر جوش، اتنے خوش ہوتے کہ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ بیٹے کا بیاہ، اس کی دلہن پھر پوتے پوتیاں، وہ بھی میری ہی طرح خواب دیکھنے کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ میرے خوابوں میں تو وہ ساحرہ تھی جو اپنی فسوں گر آنکھوں سے وہ منتر پھونک کر گئی تھی کہ میں اس تصور سے اس خیال سے آزاد ہی نہیں ہوتا تھا۔

ایکایک ماموں کے لگاتار خطوط آنے لگے، تشویش اور فکرات سے بھرے، جتنی جلدی ممکن ہو سکے واپس آ جاؤ حالات بد سے بد تر ہوتے جا رہے ہیں مکتی باہنی چن چن کر قتل عام کر رہی ہے جو لوگ پاکستانی ہیں یا پاکستان کے حق میں ہیں، جیسے بھی بن پڑے تم وہاں

سائیں چل رہی ہیں ابانے یہ خط لکھوایا ہے اور کہا ہے کہ وہ جیسے ہی صحت یاب ہو کر سفر کے قابل ہوئے تو مجھے لے کر چاند پور آئیں گے آپ ہرگز ہرگز یہاں آنے کی کوشش مت کیجئے گا یہ التجا ابابا کی طرف سے بھی ہے اور میری طرف سے بھی۔“

شمس النساء کا خط میں نے اتنی بار پڑھا، اتنی بار پڑھا کہ مجھے حفظ ہو گیا۔ میں روزانہ صبح فجر کے بعد گنگا کنارے گھاٹ پر پہنچ جاتا اور جانے کیا کیا سوچتا رہتا۔

دیریا کی لہروں میں وہ روائی اور مستی نہیں تھی جو پہلے تھی۔ ہواؤں کی شوخ اٹھکھیلیاں بھی جیسے ماند پڑ گئی تھیں، کھیتوں میں کھڑی فصلیں اب سرمستی میں ویسے نہیں جھومتی تھی جیسے کبھی جھوما کرتی تھیں شاید حالات صرف انسانوں پر ہی اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ ہر شے پہ اثر انداز ہوتے ہیں چاہے وہ چھماتے پرندے ہوں، مسکراتی ندیاں اور گنگناتے دریا ہوں، جھومتی فصلیں اور لہراتے پیڑ پودے ہوں، تبھی کچھ جیسے مرجھا رہا تھا، کھلا رہا تھا، حالات کشیدہ ہوتے جا رہے تھے، جو آگ پورے مشرقی پاکستان میں پھیل رہی تھی اس کی تپش اب اس گاؤں میں بھی محسوس ہونے لگی تھی، گاؤں کے لوگ اچھے تھے، بے چارے سیدھے ساوے امن پسند، محبت کرنے والے مگر شریںدوں کا ٹولہ ہر جگہ پہنچنے لگا تھا، عبدل چچا اور سیف السلام دونوں ہی میرے لیے بہت فکر مند تھے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم تینوں ہی ایک دوسرے کے لیے بہت فکر مند تھے۔

عبدل چچا اپنے بیٹے کو اپنی نگاہوں سے ایک منٹ کے لیے بھی اوجھل نہیں کرنا چاہتے تھے سیف الاسلام نوجوان تھا جذباتی تھا، وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھا مگر باشعور تھا، محب وطن تھا، ہندو ہمیں استعمال کر رہے ہیں، وہ مسلمانوں سے پاکستان کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ 1947ء کا بدلہ، آزادی کا بدلہ، وہ ایسی ہی بہت سی

باتیں کھلے عام کرتا تھا، میں اور عبدل چچا اسے سمجھاتے تھے، منع کرتے تھے کہ جوش سے نہیں ہوش

”حالات بہت خراب ہیں، عبدل کریم بھائی کا بیٹا ڈھاکہ سے واپس آگیا ہے، بہت لوگوں کو مار دیا ہے، تم تو ویسے بھی پورے پاکستان کے ہو، منہ کھولتے ہی پکڑے جاؤ گے۔“ انہوں نے مجھے ڈرایا مگر میں اور بے چین ہو گیا، شمس النساء بھی تو اسی شہر آشوب میں مقیم تھی، میں جیسے اس کی طرف سے فکر مند نہ ہوتا۔ میرا دل مجھے وہیں کھینچ رہا تھا۔ بالآخر میں نے ڈھاکہ جانے کا فیصلہ کر لیا مگر اس سے پہلے اچانک ایک خط میرے لیے آیا، شمس النساء کا خط تھا۔

”سمجھ میں نہیں آتا بات کہاں سے شروع کروں۔ حالات اتنی تیزی سے اور اک دم سے یوں تبدیل ہوں گے میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ وہ باتیں، وہ خدشات جنہیں ابابا کے منہ سے سن کر میں سوچتی تھی کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ مگر وہ سب بدترین خدشات، بد قسمتی سے حقیقت کا روپ دھار رہے ہیں، بنگلہ دیش کی تحریک زور پکڑتی جا رہی ہے، میں نے کالج جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔“

ہندو اساتذہ اپنی زہریلی زبانوں سے نوجوان ذہنوں کو زہر آلود کر رہے ہیں، مغربی پاکستان اور فوج کے خلاف زہریلا مواد پھیلا یا جا رہا ہے اسی معاملے پر ابابا کی کئی بار اسکول کے ہندو اساتذہ سے بحث ہو چکی ہے۔

ایک روز عشا کی نماز کے بعد کچھ لوگوں نے ابابا کو پکڑ کر بہت بری طرح مارا پینا اس جرم میں کہ وہ علیحدگی کی مخالفت کیوں کرتے ہیں پاکستان کی حمایت کیوں کرتے ہیں، ابابا کا جسم لہو لہو ہو گیا۔ جان تو بچ گئی مگر ایسی کہ بس

سے کام لو اور پھر سچ تو یہ ہے کہ میں بہت غیر جانبدار ہو کر سوچتا تو سارا قصور غیروں کا ہی نظر نہیں آ رہا تھا جس کا جو حق تھا اسے دے دیا جاتا تو شاید یہ سلگتی ہوئی جنگاری یوں اک دم شعلہ نہ بنتی، اغیار کو موقع ملا اس شعلے کو مزید بھڑکانے اور آگ پھیلانے کا۔

کراچی سے میرا رابطہ بالکل ختم تھا، مجھے یقین تھا کہ ماموں جان نے خطوط بھیجے ہوں گے مگر یہاں تک نہیں پہنچے، ڈھاکہ سے بھی کوئی خبر نہیں تھی۔

”ممتی باہنی کے لوگ یہاں تک پھیل گئے ہیں۔ سب کو خبر ہے کہ آپ پاکستانی ہے۔ مغربی پاکستان سے آیا ہے، آپ احتیاط سے کام لیں۔“ عبدل میرے لیے بہت فکر مند تھے۔

”پاکستانی تو آپ بھی ہو عبدل چچا بلکہ اس خطے کا ہر شخص پاکستانی ہے۔ آخر یہ بھی تو مشرقی پاکستان ہے نا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا، مگر میں یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہو گیا تھا کہ کتنی عجیب بات ہے مغربی پاکستان میں رہنے والے لوگوں کو ہم پاکستانی پکارتے ہیں اور مشرقی پاکستان کے باشندوں کو بنگالی کہہ کر پکارتے تھے۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں، گاؤں میں رات ویسے بھی جلدی ہو جاتی ہے اور سردیوں میں تو سرشام ہی سب کچھ سنسان ہو جاتا تھا اس دن ڈپنسری میں حسب معمول سیف الاسلام نے لائین روشن کی اور میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔

”اب تو شاید ہی کوئی آئے گھر چلیں؟“ سوٹر پہنے سر پہ ٹوپا گلے میں مفلر لیٹے وہ پھر بھی بغلوں میں ہاتھ دے کر بیٹھا تھا ہوا بھی تو غضب کی تھی بے حد سرد جسم کو کاٹ دینے والی (آہ) اس وقت یہ خیال تو بالکل ہی نہیں آیا کہ سچ مچ ہی جسم کٹ جائے گا۔

”چلتے ہیں پارڈر اور رک جاؤ۔“ میں یونہی بیٹھا تھا پاؤں پھیلانے اندر اک آگ سی دھک رہی تھی۔ سردی کا احساس تک نہیں تھا مجھے دریاؤں کی سرزمین پر اتنی تیزی اور شدت کی آگ پھیل رہی تھی کہ اتنے دریاؤں کا پانی بھی اس آگ کو بجھانے میں ناکام تھا۔

مجھے اس پھیلتی ہوئی آگ کی اور آگ کی بھی فکر تھی اور یہ بھی کہ کہیں شمس النساء اس آگ کی لپیٹ میں نہ آجائے، میں کل سے سوچ رہا تھا اور میں نے محکم ارادہ کر لیا تھا کہ بس ایک دو روز میں عبدل چچا کو بتائے بغیر یہاں سے خاموشی کے ساتھ ڈھاکہ روانہ ہو جاؤں گا اگر ان کو ذرا سی بھی بھٹک بڑ جاتی تو دونوں باپ بیٹا کبھی بھی مجھے یہاں سے نکلنے نہیں دیتے، میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔

”ایسا کرو یا ر، تم گھر چلو، میں ابھی آتا ہوں۔“ میں اکثر اسے پہلے گھر بھیج دیا کرتا تھا۔

”آپ؟“ وہ ہچکچایا۔

”میں بس ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“ میں کچھ دیر اکیلے اپنے آپ کے ساتھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ وہ چلا گیا میں اپنے خیالوں کے ساتھ جانے کتنی دیر اکیلا بیٹھا رہا۔

عبدل چچا میری وجہ سے جاگ رہے ہوں گے۔ میں نے سوچا تو اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گھر پہنچا تو حسب معمول وہ میرے انتظار میں جاگ رہے تھے۔

”سیف الاسلام کہاں ہے؟“ انہوں نے مجھے اکیلے دیکھا تو مضطرب ہو کر سوال کیا۔

”اسے تو میں سمجرت دیر پہلے بھیج دیا تھا۔“ میں نے بے اختیار جواب دیا۔

یہ سنتے ہی ان کا چہرہ یکایک زرد پڑ گیا۔

”وہ تو یہاں نہیں پہنچا۔“ وہ متوحش ہو کر بولے۔

”نہیں پہنچا؟ تو پھر کہاں گیا۔“ میں لائین لے کر تیزی سے باہر نکلا اسی راستے پہ جس پر سے ہم روزانہ ڈپنسری سے گھر آتے تھے پورے گاؤں میں سناٹا اور ہو کا عالم تھا سوائے کتوں کے بھونکنے اور گیدڑوں کی آوازوں کے جو رات کے سناٹے کو دور دور تک چیر کر رکھ دیتیں، اس سرد اور اندھیری رات میں وہ پانگلوں کی طرح ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھ رہے تھے، کھیتوں، کھلیانوں کو ٹٹول رہے تھے صبح ہو گئی مگر سیف الاسلام کا سراغ نہ ملنا تھا۔

آج اتنے سالوں بعد جب زندگی کا سفر اختتام کی طرف گامزن ہے میں یہی سوچتا ہوں کہ شاید ہمارے نصیب میں ایک دوسرے کا ملن لکھا ہی نہیں تھا۔ کیوں کہ اس تاریک دن کے بعد — ہماری تاریخ کا سیاہ ترین باب لکھا گیا۔

مؤرخ بیان کرتے رہیں گے، ہم جیسے لوگ تو شاید صرف ماتم کرنے کے لیے ہوتے ہیں، کبھی جدا ہونے والے وطن کے حصے پر کبھی اپنے پیاروں پر۔

سقوط ڈھاکہ کے بعد میں ڈھاکہ گیا۔ شمس النساء کے گھر وہاں تالا تھا پڑوس سے سلام ہوا کہ عبد العنعم چچا کے انتقال کے بعد شمس النساء خالہ کے ساتھ کھانا چلی گئی تھی۔

کھانا میں کہاں؟ میں نے پورے محلے میں ایک ایک سے پوچھا مگر کسی کو کچھ معلوم نہ تھا، میں وہاں سے مایوس واپس آگیا، واپس اسی جگہ جہاں پہلی بار وہ ساحرہ مجھے ملی تھی اور ویسے بھی فی الوقت میرا پاکستان جانا بہت ہی مشکل تھا جب آیا تھا تو اپنے ہی وطن کے ایک حصے میں آیا تھا، مگر اب واپسی کا سفر بہت کٹھن ہی نہیں بہت کریناک بھی تھا، دو سال تک میں انتظار کرتا رہا مگر شمس النساء کا نہ کوئی خط آیا اور نہ کوئی خبر۔ دو سال بعد میں نے واپسی کے سفر کی ٹھانی اور جن

مشکلات اور صعوبتوں سے گزر کر میں واپس آیا، وہ ایک الگ داستان ہے ماموں جان کے پاس پہنچا تو ان پر جیسے شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔

اتنے سالوں سے ان سے کوئی رابطہ نہیں تھا، اپنے تئیں سب نے مجھے مردہ سمجھ لیا تھا کراچی پہنچ کر میں سب سے پہلے شمس النساء کے بھائی کے پاس گیا ماکہ اس کی کوئی خبر نہ مل سکے مگر ناکامی نے یہاں بھی میرا منہ چڑا دیا۔

وہ لوگ یہاں سے جا چکے تھے، واپس بنگلہ دیش یا کہیں اور کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا، بے نیل و مرام میں واپس لوٹ آیا۔

گزرے چالیس، پچاس سالوں میں اتنے بڑے

نہ ملا۔ اگلے دن شام میں اس کا خون آلود مفلر اور ٹوپی چند لڑکوں کو ملی انہوں نے لا کر ہمیں دکھائی۔

”ہاں یہ اسی کی ہیں۔“ عبدل چچا نے ان کے ہاتھوں سے وہ مفلر اور ٹوپی جھپٹ لیا۔

”میرا سیف الاسلام۔“ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے، پچھلے چھتیس گھنٹوں سے وہ مسلسل جاگ رہے تھے، رو رہے تھے، بوڑھے اور کمزور انسان کی طاقت کب تک ساتھ دیتی، بالآخر جواب دے گئی۔

”مکتی باہنی والے لے گئے ہیں اٹھا کر۔“ گاؤں کے ایک لڑکے نے آہستہ سے مجھے اطلاع دی میرا دل غم اور صدمے کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔

عبدل چچا ہوش میں آگئے مگر ان کی نظریں ہر وقت دروازے پر لگی رہتی تھیں جیسے کوئی معجزہ ہو جائے گا اور سیف الاسلام معمول کے مطابق مسکراتا ہوا اندر داخل ہوگا، میں زبردستی کچھ کھلا دیتا تو تھوڑا سا کھا لیتے ورنہ لیٹے لیٹے جانے کیا بیڑا تے رہتے چار دنوں میں ہی ان کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے صدیوں کے بیمار میں اپنے طور پر گاؤں کے لڑکوں کی مدد سے سیف الاسلام کا پتا لگانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ہر کوشش بے سود اور ناکام، سب کا کہنا یہی تھا کہ مشکل ہی ہے کہ وہ اب زندہ ہو، اس کی لاش بھی مل جائے تو بہت ہے۔

عبدل چچا کو بھی دھیرے دھیرے کچھ احساس ہونے لگا تھا۔

”اس کی لاش ہی مل جائے، میں جنازہ پڑھ کر اپنے ہاتھوں سے دفن تو دوں شاید کچھ صبر آجائے۔“ وہ ضبط کی کڑی منزلوں سے گزر کر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

”اللہ سے خیر کی دعا کرو چچا، وہ بہتر کرے گا۔“ میں نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

میں نے ڈھاکہ جانے کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔

عبدل چچا کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں انہیں اکیلا چھوڑ کر کہیں جاسکتا۔

اور اگر زندگی ربی اور نصیب میں ہو تو شاید کبھی کسی میوڑ پر ہم مل جائیں میں نے اپنے کراتے ہوئے

دل کو تسلی دیتے ہوئے سنا۔

نے بنگلہ دیش تسلیم نہیں کیا جو آج بھی پاکستان کا سبز پرچم اپنے گھروں پہ لہراتے ہیں اور اسی جرم کی پاداش میں وہاں کی حکومت انہیں قبول کرنے سے انکاری ہے اور یہاں کی حکومت، کس کے پاس فرصت ہے ایسے بے کار اور فالتو معاملات پہ توجہ دینے کی۔

اور میں آج بھی سوچتا ہوں تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

وہ عبدل چچا بھی تو محب وطن تھے جن کے اکلوتے بیٹے کی اطلاع سترہ دسمبر کے دن ملی تھی گاؤں کے لڑکے خبر لے کر آئے تھے۔

سیف الاسلام کی لاش دو ٹکڑے کر کے وہ لوگ پھینک گئے تھے۔

عبدل چچا نے بڑے حوصلے سے اندوہناک خبر سنی تھی اور اتنے ہی حوصلے سے انہوں نے کہا تھا۔
”اس کو وہیں دفنا دو۔“

میں سن کر ششدر رہ گیا تھا۔ کہاں تو وہ نیمپاگل سے ہو گئے تھے کہ کسی طرح اس کی لاش کا ہی سراغ مل جائے تو وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی بیوی کی قبر کے برابر میں دفنا دیں تاکہ انہیں صبر تو آجائے، مردوں پہ صبر آجاتا ہے کھوئے ہوؤں پہ، پچھڑے ہوؤں پر نہیں آتا۔

میں نے ان سے کہا تو وہ خاموش ہو گئے بہت دیر تک خاموش رہے پھر بولے تو ان کے لہجے کا کرب اور آواز کا درد میں آج تک نہیں بھول سکا۔

انہوں نے مجھ سے کہا۔
”جب دیش ہی دو ٹکڑے ہو گیا تو بیٹے کے دو ٹکڑے لے کر کیا کروں گا۔“



سانچے پر احساس زبیاں کی شدت وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتی گئی ہے۔ آج کی نسل کی اکثریت شاید ٹھیک سے واقف بھی نہ ہو کہ سولہ دسمبر انیس سو اکتتر کو کیا ہوا تھا کیوں ہوا تھا؟ کیسے ہوا تھا اور قصور اس نسل کا بھی نہیں ہے، پچھلی نسل نے اپنی غلطیوں کو واقعی غلطی سمجھ کر سبق سیکھا ہوتا تو نئی نسل کو بھی سکھایا ہوتا، احساس زبیاں کی تلخی کو شدت کے ساتھ سوچا ہوتا تو اپنی اگلی نسل تک کچھ تلانی پہنچائی ہوتی، شاید ہم خود بھی اپنے فرائض سے غافل رہے، کسی کو کیا دوش دیں۔

آج کل کے ٹی وی پروگرام میں سقوط ڈھاکہ کو ڈسکس کرتے ہوئے سنتا ہوں اور مواقع کی طرح سولہ دسمبر بھی ایک ایونٹ بن گیا ہے۔ اس دن کی مناسبت سے بحث و مباحثے کے پروگرامز پیش کیے جاتے ہیں جس میں کئی بقراط اپنی زبان دانی کے جوہر دکھاتے ہیں ان میں کچھ بقراط ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک قیام پاکستان ہی سراسر غلط تھا، جو لوگ گاندھی کو مہاتما گاندھی اور قائد اعظم کو جناح صاحب کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ایسا ہی کوئی بقراط کسی پروگرام میں سقوط ڈھاکہ کی ساری ذمہ داری صرف اور صرف بنگالیوں پر ڈال رہا تھا اور یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا کہ بنگالی محب وطن تھے ہی نہیں وہ

تعصب رکھتے تھے اور شروع سے ہی ان کی پلاننگ تھی ایک علیحدہ ملک بنانے کی۔

میں یہ سب بکواس سنتا رہا اور سوچتا رہا کیا واقعی؟ کیا واقعی وہ لوگ محب وطن نہیں تھے؟ میں سب کی بات نہیں کرتا نہ کر سکتا ہوں، مگر کیا وہ بنگالی محب وطن نہیں تھے جنہوں نے مجھے بنگلہ کے بجائے پاکستان زندہ باد کا نعروں لگایا اور پھر مجھے بنگلہ کا نعوان کے سینوں پر خنجر کی نوک سے لکھا گیا۔ وہ بنگالی جنہوں نے علیحدگی کی مخالفت کی اور اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے اور وہ محصورین جو اپنی دوسری تیسری نسل کے ساتھ آج بھی کیسپوں میں بدترین زندگی گزار رہے ہیں مجنہوں



Downloaded From
Paksociety.com

الارم کی تیز آواز پر سمرین ہڑبڑا کر اٹھی، ادھر ادھر ہاتھ مار کر سیل فون ڈھونڈا، تاکہ الارم بند کر سکے۔ سارے دیوار گیر گھڑی ساڑھے سات بج رہی تھی۔ عمر پہلے ہی اٹھ چکا تھا اور شاید نہا رہا تھا۔ سمرین کسٹمنڈی سے واپس بستر پر لیٹ گئی۔ رات کو ہونے والی دعوت کے باعث وہ بے انتہا تھکی ہوئی تھی اور ابھی بھی اس کا بستر چھوڑنے کا قطعاً "دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بچوں کی تو چٹیاں تھیں اور وہ یہ چٹیاں منانے ثانی کے گھر گئے ہوئے تھے، سو اس طرف سے تو راوی چین ہی چین لکھتا تھا، مگر عمر کو تو آفس جانا تھا۔ سو اس کو ناشتا بنا کر دینا تھا۔ ہاتھ روم سے پانی کرنے کی آواز آنا اب بند ہو چکی تھی۔

سمرین نے مندی مندی آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر منہ دھونے چل دی کہ عمر اگر ہاتھ روم سے باہر آکر اسے یونہی لیٹا دیکھتا تو اس کو تھکا ہوا جان کر ناشتا بنانے سے منع کر دیتا اور ایسے ہی آفس چلا جاتا اور یہ سمرین کو گوارا نہ تھا۔ عمر بہت خیال کرنے والا محبت کرنے والا شوہر تھا اور سمرین نے بھی اس نری و محبت کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔

وہ عمر اور عمر سے منسلک رشتوں کو پورا احترام دیتی تھی۔ کل بھی اس کی نندان سے ملنے آئی تھی، تو سمرین نے پوری دعوت ہی کر ڈالی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنی نندوں کو یہ احساس دلانا چاہتی تھی کہ ماں باپ کے نہ ہونے کے باوجود بھی ان کا مہکمہ برقرار ہے اور اس میں کامیاب بھی تھی۔ منہ دھو کر جب وہ کچن میں آئی تو سنک میں پڑے برتنوں کے ڈھیر کو دیکھ کر اسے کوفت نے آگھیرا۔

"اف! یہ تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ کل رات برتن نہیں دھوئے تھے اور شفیع بھائی نے چائے مانگی تھی تو چائے بنا کر دینے کے بعد چائے کی پتیلی بھی یونہی چھوڑ دی تھی اف! اس کو تو اس ڈھیر میں ڈھونڈنا اور پھر دھونا ایک عذاب ہی ہے۔ چلو کسی اور پتیلی میں چائے بنا لیتی ہوں۔"

کیبنٹ کھولا تو ایک بڑی پتیلی کے علاوہ سب چھوٹی

پتیلیاں نثار تھیں۔

"اف! اب اتنی بڑی پتیلی میں ہی چائے بنانی پڑے گی۔" چائے چڑھا کر تو انکا لاشکر تھا کہ وہ گندا نہیں تھا۔ اس پر جلدی جلدی تافان کے دو ٹکڑے گرم کئے، کھیر نکالی، رات کا بچا سالن گرم کرنے کے لیے فرائنگ پین دستیاب نہ تھا، سو اس کو بھی تو بے پر ہی ڈال کر کام چلایا۔ عمر کچن میں آیا تو حیران ہو کر بولا۔

"ارے یہ تم اتنی صبح اتنی بڑی پتیلی میں کیا پکا رہی

کی رحمت گردانتی تھیں اور اس کی خاطر کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتی تھیں۔ حد تو یہ تھی کہ محلے کی عورتیں بھی اگر آجائیں تو چائے یا شربت کے ساتھ ان کے آگے بھی ایک دو لوازمات رکھے جاتے تھے۔ اب ظاہر ہے اتنی آؤ بھگت ہوگی تو پھر لازمی ملنے ملانے والوں کا تانا تو بندھا ہی رہے گا۔ لہذا سارا دن ہی تقریباً "آنا جانا لگا رہتا تھا۔

عمر کے علاوہ سمرین کی ساس کی دو بیٹیاں اور تھیں اور جوان کے حسن اخلاق اور رکھ رکھاؤ کے باعث بہت ہی اعلا اور معزز گھرانوں میں بیاہی گئی تھیں اور خود سمرین کے گھر والوں نے بھی اسی بنیاد پر رشتہ قبول کیا تھا کہ کھانا پیتا وضع دار اور فراخ دل گھرانہ آج کل کہاں نصیب ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ گھر میں بس ایک ساس اور دونوں میاں بیوی ہی ہوتے کوئی لمبی چوڑی سسرال کا بھی جھنجٹ نہیں تھا۔

اب یہ الگ بات تھی کہ گھر میں رہنے والوں کے تو کام اتنے نہ تھے جتنے کے باہر سے آنے والوں کی خاطر داریوں کا بھاری کام۔ ہر وقت کچن میں لوازمات تیار ہو رہے ہوتے تھے سب کچن کر رہا ہوتا تھا، ہوتی اور پھر نچے ہوئے لوازمات کو ٹھکانے لگانا اور برتن دھونا اور سمرین دنیا کا ہر کام بخوشی کرنے کو تیار ہوتی تھی، مگر برتن دھونے سے اس کی جان جاتی تھی۔ برتن دھونا اسے دنیا کا ہر ترین کام لگتا تھا۔

وہ چار بہنیں تھیں اور وہ سب سے چھوٹی تو عموماً ہوتا یہی تھا کہ کھانا پکانے کا کام بڑی باجیاں کرتیں اور اس کو برتن صاف کرنے، دھونے کا کام دے دیا جاتا۔ شروع میں تو وہ یہ کام بھی شوق سے کرتی تھی۔ مگر

آہستہ آہستہ اسے احساس ہوا کہ تعریفیں تو صرف پکانے والی کی ہوتی ہیں۔ صاف ستھرے برتن کہاں سے آئے اور پھر واپس کس نے صاف کر کے رکھے یہ کون دیکھتا ہے۔ سو رفتہ رفتہ اس کو برتن دھونے سے چڑھنے لگی۔

اب بڑی بہنیں یا امی اس کو برتن دھونے کا کہتیں

سمرین کچھ شرمندہ ہو گئی، پھر رک کر بولی۔ "وہ عمو! کل رات بہت تھک گئی تھی تو برتن بونہی چھوڑ دیے تھے ابھی چائے بنانے کے لیے یہی پہلی مل سکی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ تم نے رات میں کچھ زیادہ ہی اہتمام بھی تو کر ڈالا تھا اور یہ ابھی بھی اتنا کچھ کیوں نکال دیا۔ ناشتے پر مجھے بس چائے دے دو۔ ابھی تو رات کا کھانا ہی ہضم نہیں ہوا ہے یا۔"

سمرین نے جلدی سے چائے کپوں میں نکالی، اس کے اصرار کے باوجود عمر نے مافان کے ایک دو لواٹے ہی کھائے اور آفس چلا گیا۔

اسے رخصت کر کے سمرین اندر آئی تو پہلے اس نے سوچا کہ وہ دوبارہ سوچائے، مگر جب بکھرا ہوا کچن اور برتنوں کا ڈھیر یاد آیا تو کمر کس کے کچن میں کھس گئی۔ "اف۔ کہاں سے شروع کروں۔ برتنوں کا ایک ڈھیر ہے یہ تو، چلو پہلے سنک تو خالی کروں برتن دھو کر، تاکہ پتیلیاں رگڑنے کی جگہ تو ہو۔"

سمرین کو سسرال گیا تو اس نے آہستہ آہستہ برتن دھونے شروع کیے۔ شیشے کا ڈنر سیٹ، گلاس، جگ وہ سب احتیاط سے دھو دھو کر رکھتی گئی۔ پھر پتیلیاں مانجھیں، برتنوں کو اسٹینڈ پر خشک ہونے کے لیے رکھا۔ سلیب صاف کی اور جب سب کچھ سمیٹ کر وہ باہر آئی تو گھڑی گیارہ بج رہی تھی۔ صفائی کے لیے آنے والی ماسی کے آنے میں ابھی کچھ وقت تھا، سو جلدی جلدی بکھری چیزیں سمیٹ کر رکھیں، تاکہ صفائی ٹھیک سے ہو سکے۔ پھر اپنے لیے ناشتا بنا کر وہ آرام سے لی وی

کھول کر کے بیٹھ گئی۔

آج اسے کھانا پکانے کی فکر نہ تھی کہ رات کا بہت کچھ بچا ہوا رکھا تھا۔ عمر اور سمرین دونوں ہی بہت فراخ دل تھے کسی بھی آئے گئے کو محض چائے یا شربت پر رُخا دینا ان کے گھر بے انتہا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ سمرین جب بیاہ کر آئی تو اس نے اپنی ساس سے یہ سارے طور طریقے سیکھے۔ اس کی ساس مہمان کو اللہ

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	رخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	ام مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

بھی تو وہ ان سنی کر جاتی تھی۔ کالج پہنچی تو ایک اور بہانہ
 سیکھ لیا کہ ”برائی دھونے سے میرے ہاتھ خراب
 ہو جاتے ہیں۔“ کچھ یہ کہ اس کے ہاتھ واقعی تھے بھی
 بہت خوب صورت، دودھیا گلابی رنگ لیے ہوئے،
 مخروطی انگلیوں والے لڑکیوں کی دیکھا دیکھی لیے
 ناخن بھی رکھنے شروع کر دیے اور پھر ان پر رنگ برنگی
 نیل پالش لگانا بھی شروع کر دیا تو انو چار چاند ہی لگ
 گئے۔

بہر حال یہ چونچلے اس وقت تک ہی رہے جب تک
 بڑی بہنوں کی شادیاں نہیں ہو گئیں، ان کی شادی کے
 بعد گھر لا محالہ سمرین کو ہی سنبھالنا پڑا۔ امی کو معلوم تھا
 کہ وہ برتن دھونے سے کتنا چڑتی ہے تو اکثر برتن وہ خود
 ہی دھو دیتیں، مگر اب سمرین کو خود شرم آتی تھی کہ وہ
 ماں سے کام کر دے، تو یہ بے زاری بھی کہیں پس منظر
 میں ہی چلی گئی، جب بہنیں آئیں تو وہ یہ کام سنبھال لیا
 کرتی تھیں بقول ان کے۔

”ہمیں تو برتن دھونا آسان لگتا ہے، بہ نسبت یہ
 بڑی بڑی دیکھیں چڑھانے کے۔“ اور سمرین ہنس دیتی
 تھی۔

جب اس کا رشتہ طے ہوا تو اس کی بڑی بہنوں نے
 اس کو یہی کہہ کر چھیڑا تھا کہ۔

”تو بھی تمہارے لیے رشتہ ہی ایسا آیا ہے کہ جہاں
 کام کا زیادہ بوجھ ہی نہ ہو گا۔ گھر میں لوگ ہی کتنے ہیں۔
 لگتا ہے برتن نہ دھونے کی بڑی صدق دل سے دعائیں
 کی تھیں۔“

مگر ہائے کسی کو کیا پتا تھا کہ تقدیر نے سمرین کے لیے
 کیا منتخب کر کے رکھا ہوا ہے۔ امی کے گھر تو دو چار برتن
 دھونے میں بھی جان جاتی تھی اور سہاں کچن میں دو چار

برتنوں کے علاوہ سب ہی برتن دھلنے کے لیے ہر وقت
 سنک میں موجود رہتے تھے۔ ساس کھانے سے زیادہ
 کھلانے کی شوقین تھیں، سو جو پکنا پٹیلی بھر کر پکنا اور
 اسی حساب سے بیٹا بھی اور کھلایا بھی جاتا۔ غریبوں کے
 ہاں بھی برتن بھر کر بھیجا جاتا کہ بقول ساس کے۔

”ان کی بھی عزت نفس ہے، کھلی میں ڈال کر دیا تو

لگے گا، انو کسی جانور کو کھانا ڈال رہے ہیں۔“
 محلے کے اکثر لوگ برتن دھو کر واپس بھیجنے کو بدھگونی
 مانتے تھے کہ اس طرح دوستی اور محبت ختم ہو جاتی ہے،
 تو وہ برتن بھی سمرین کو ہی دھونے پڑتے تھے۔ محلے
 داری کی مہمان داری کے علاوہ جب بھی اس کی مندیں
 آتی تھیں تو لانا ”دعوت شیراز کا ہی اہتمام ہوتا تھا۔“

کھانا بنانے سے لے کر کھلانے تک مندیں پوری
 طرح سمرین کا ہاتھ بٹاتی تھیں، مگر جیسے ہی کھانا ختم ہوتا
 تھا، مندیوں کے شوہر گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑے
 ہوتے تھے اور پھر وہی بات کہ سارا صفائی کا کام سمرین
 ہی کرتی تھی۔ یہ ہرگز نہ تھا کہ سمرین کی سسرال کوئی
 گری پڑی، بخیل ذہنیت رکھنے والی سسرال تھی یا کوئی
 ایسی سسرال جہاں بہو کو نوکرائی سمجھ لیا جاتا ہے۔ گھر
 میں کام کرنے کے لیے جزوقتی ملازم بھی موجود تھے،
 جن میں ایک لڑکا باہر سے سودا سلف لانے اور دیگر
 چھوٹے موٹے کام نبھانے کے لیے تھا، صفائی کے لیے
 بھی ماسی آتی تھی جو کپڑے بھی دھویا کرتی تھی۔ اب
 اتنی سہولیات میسر ہونے پر بھی اگر کوئی یہ رونا روئے
 کہ اس کو برتن نہیں دھونے، تو اس کو انتہا درجے کی
 تعیش پرستی ہی کہا جائے گا، سو سمرین بھی تمام تر کوفت
 اور چڑنے کے باوجود کچن کا تمام کام خاموشی سے
 سنبھالتی تھی، کیونکہ بقول اس کی ساس۔

”گھر کے باورچی خانے کو جس صفائی ستھرائی اور
 سلیقے سے گھر کی عورت سنبھال سکتی ہے کوئی نوکرائی
 نہیں سنبھال سکتی۔ خدا جانے کہاں کہاں، کس کس
 کے گھر کیا کیا کام کر کے آئی ہو، ہاتھ بھی صاف ہوں یا
 نہ ہوں اور اسی طرح ہمارے لیے کھانا پکا دے، برتن
 دھو دے، نہ بھی۔“

جب تک ساس حیات رہیں سمرین کا پورا ہاتھ بٹاتی
 رہیں، مگر اب جب دو سال پہلے وہ فوت ہو گئیں تو
 سمرین کو کچن کا کام بالخصوص برتن دھونا کچھ زیادہ ہی
 کھلنے لگا تھا۔ مہمان داری گو کہ کم ہو گئی تھی، مگر ختم
 نہیں ہوئی تھی اور مندیں جب جب آتی تھیں تو وہ خود
 کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھی۔ نہ جانے اور کتنی دیر وہ
 انہیں سوچوں میں ڈوبی رہتی، اگر کام والی ماسی کے

ساتھ پڑوس میں رہنے والی زنیو کی بھی آمد نہ ہو جاتی۔
 ”ارے یہ تم ایسے ملجے حلیے میں کیوں بیٹھی ہو
 بھئی، طبیعت تو ٹھیک ہے؟ ٹھکی ٹھکی سی لگ رہی
 ہو۔“

خوب صورت لان کے سوٹ میں ملبوس، ہم رنگ
 جیولری اور خوشبوؤں میں بسی زنیو نے اس پر سوالوں
 کی بوچھاڑ ہی کر ڈالی۔ سرین نے ایک نظر اپنے حلیے
 پر ڈالی اور کچھ شرمندہ ہو کر بولی۔

”بس یار! کل دعوت تھی نا تو صبح کچن سمیٹتے سمیٹتے
 اور برتن دھوتے دھوتے یہ حالت ہو گئی۔ بس میں ابھی
 نہانے ہی جا رہی تھی۔“

”ارے یار تم برتن اور کچن کے لیے بھی کام والی
 رکھو نا۔ تمہیں تو ویسے ہی چڑ ہے برتن دھونے سے اور
 اب تو تمہاری ساس بھی نہیں ہیں، جان چھڑاؤ اس
 مصیبت سے یار۔ آج کل کون کرتا ہے یہ جھاٹو
 برتن۔“ زنیو نخوت سے بولی۔

”نہیں میں جھاٹو تو نہیں لگاتی، مگر کچن میں میری
 ساس کو نوکرانیوں سے کام کروانا پسند نہیں تھا اور عمر
 بھی اس کے حق میں نہیں ہیں۔“ سرین خفیف
 ہو گئی۔

”ٹھیک ہے بھئی، تم مت رکھو کچن کے لیے
 نوکرانی، مگر برتن دھونے کے لیے تو رکھو، حال دیکھو
 اپنا۔ ابھی تک کپڑے کیلے ہو رہے ہیں تمہارے اور
 اپنے ہاتھ دیکھو، کتنے رف ہو رہے ہیں اور ناخن تو میں
 نے تمہارے لیے کبھی دیکھے ہی نہیں ہیں۔ بھئی ہم
 اب اس عمر میں اپنی کیئر نہیں کریں گے تو کب کریں
 گے۔ تم نوکرانی کو ڈیوٹل میں ڈبی لکوا کر برتن دھلوا لیا
 کرنا، بس تم اب ڈھونڈو کوئی کچن کے کام کے لیے۔“
 زنیو ہنستے ہوئے بولی۔

”اچھا بھئی، اب مجھے چھوٹا یہ بتاؤ کیسے آتا ہوا؟“
 سرین خود پر قابو پاتے ہنستے ہوئے بولی تو زنیو نے
 بھی موضوع بدل دیا اور سرین نے ٹھان لی کہ آج تو وہ
 عمر سے بات کر کے ہی رہے گی۔

”یہ تمہیں اچانک برتن دھونے کے لیے ماسی
 رکھنے کی سوجھی کیا؟ تمہیں پتا ہے نا امی کو
 پسند نہیں تھا یہ اور تم پر بس یہ ایک ہی توفہ داری
 ہے۔“ عمر حیران تھا۔

”دیکھیں عمر! میں جانتی ہوں کہ امی کو پسند نہیں تھا
 اور میں نے ان کی پسند نا پسند اور خواہش کا ہمیشہ احترام
 کیا اور امی نے بھی ساس نہیں ماں بن کر ہی میرا خیال
 رکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک امی تھیں۔ ساری ذمہ
 داریاں تو انہوں نے ہی اٹھائی ہوئی تھیں۔ گھر چلانا،
 آئے گئے کو دیکھنا، ملنا ملانا، دینا دلانا، بچوں کو بھی زیادہ تر
 وہی سنبھالتی تھیں، میں تو بس ان کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ ان
 کے جانے کے بعد ایک دم یہ ساری ذمہ داری مجھ پر
 آ گئی ہے۔ پہلے پہل تو مجھے احساس نہیں ہوا، مگر اب
 میں ان کی کمی بہت زیادہ محسوس کرتی ہوں، بڑے بھی
 کسی سایہ دار درخت سے کم نہیں ہوتے ہمیشہ زندگی
 کی کڑی دھوپ سے بچاتے ہیں۔“

سرین کی آواز بھیگ گئی۔ اس نے جو کہا تھا، اس
 میں کوئی جھوٹ نہیں تھا۔ عمر کی ماں نے اسے بھی بس
 ماں ہی کی طرح اپنے گھر میں رکھا تھا۔

”پھر عمر! اب بچے بھی بڑے ہو رہے ہیں۔ ان کی
 پڑھائی بھی مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ اگر اتنا زیادہ آنا جانا
 نہیں ہوتا تو میں شاید کہتی بھی نہ یہ آپ سے، مگر اب
 مجھے کچن میں پہلو چاہیے اور پھر یہ کہ مجھے برتن
 دھونے ویسے بھی نہیں پسند۔ آج زنیو نے بھی مجھے
 اتنی باتیں سنائی ہیں۔“

”لوہ، اچھا تو یہ جوش زنیو صاحبہ نے دلایا ہے آپ
 کو۔“ عمر ہنستے ہوئے بولا۔ ”چلو بھئی، جو تم چاہو مگر قابل
 اعتبار ملازمہ رکھنا۔“

سرین تو خوشی سے جھوم ہی اٹھی۔ عمر کی اجازت
 کے بعد اب اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اگلے ہی دن
 اس نے زنیو کو ہی ملازمہ کے بارے میں کہہ دیا تھا اور
 زنیو نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اگلے ہی دن
 ایک تیو، چودہ سالہ بچی کو بھیج دیا تھا۔

شیم عرف شمس سانبلی رنگت، تیکھے نقوش اور

صاف ستھرے لباس میں لمبوس تھی۔ سرین نے اسے کام سمجھایا تو اس نے جس پھرتی اور صفائی سے سارا کچن سمیٹا۔ وہ اش اش کرا بھی اور یوں شمو نے کچن اور برتنوں کی ذمہ داری اٹھالی سرین بہت خوش تھی۔ شمیم نہ صرف برتنوں اور کچن کی صفائی کرتی تھی۔

بلکہ وہ انتہائی پھرتی اور مستعدی سے کئی دوسرے چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی اس کا ہاتھ بٹا جاتی تھی۔ سرین کو اکثر اس پر ہنسی بھی آتی تھی۔ جب وہ اونچی آواز میں گلے گلے لیزی کے ساتھ برتن دھوتی جاتی تھی ایسا لگتا تھا اس کے اندر کوئی بجلی بھر گئی ہے۔ اتنی اچھی ملازمہ پا کر اب سرین کو نہ آئے گئے

مہمانوں کی خاطر دریاں بری لگتی تھیں نہ ہی آئے دن کی دعوتیں کہ اب برتنوں کا ڈھیر کھول میں دھل دھلا کر مخصوص جگہ پر پہنچ جاتا تھا۔ انہی دنوں سرین کے ایک کزن کی شادی ہوئی تو اس کے گھر والوں سمیت سرین نے اسے دعوت دے ڈالی۔ دعوت بے انتہا شان دار رہی، کئی کھانے گھر پر تیار ہوئے، کئی باہر سے منگوائے گئے۔

شان دار ضیافت کے بعد جب سب رخصت ہو گئے اور سرین سب کچھ سمیٹ کر کمرے میں آئی تو بڑی بر سکون تھی۔ آج برتنوں کا ڈھیر کچن میں پڑا تھا، مگر اسے نہیں دھونا تھا وہ بڑی گہری نیند سوئی۔



”تم اتنے برتن دھو کر چھکتی نہیں ہو؟ بے زاری نہیں ہوئی کہ گھر کے برتن بھی دھو پھر یا ہر والوں کے بھی؟ اور تمہارا تو کنبہ بھی بڑا ہے تو برتن بھی زیادہ ہوتے ہوں گے؟“

سرین ظہر کی نماز کے لیے وضو کر کے پانی مینے کچن میں آئی تو لہک لہک کر گاتی اور برتن دھوتی شمیم سے سوال کر ہی ڈالا جو کئی دن سے اس کے دلغ میں تھا۔

”طیس باجی جی! ہمارے ہاں برتن کا کیا سوال۔ برتن ان کے گندے ہوتے ہیں جن کے ہاں قسم قسم کے کھانے بنتے ہوں۔ ہم تو جی روتی پر چھتی یا سالن رکھ

کر کھا لیتے ہیں۔ ہمیں تو پوری روتی نہیں نصیب ہوتی کبھی جی! آدمی پونی روتی کے لیے برتن بھانڈوں کا کیا سوال۔ کبھی کبھی کوئی کھلی میں ڈال کر کھانا بھیج دیتا ہے تو میرے جو دس بہن بھائی ہیں نا ایسے جتاووں کی طرح جھپٹتے ہیں کہ زمین سے ہی اٹھا کر کھانا پڑتا ہے۔ لو باجی جی۔ آپ دی مٹھول کروے او۔“

شمو آگے بھی جانے کیا کیا بولے جا رہی تھی مگر سرین کے ذہن میں تو ایک ہی جملے کی بازگشت تھی کہ۔

”برتن ان کے گندے ہوتے ہیں جن کے ہاں قسم قسم کے کھانے بنتے ہوں، آدمی پونی روتی کے لیے برتن بھانڈوں کا کیا سوال۔“ وہ لرزئی۔

”میرے اللہ! میں ساری عمر اس چیز سے چرتی رہی کہ برتن گندے کیوں ہوتے ہیں، مجھے دھونے کیوں پڑتے ہیں؟ میں نے یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں کہ میرے گھر رزق ہے تو برتن جھونے ہو رہے ہیں۔ مجھے برتنوں سے بھرے سب سے نفرت ہوتی تھی، میں ان برتنوں میں کھائے گئے رزق کی شکر گزار نہیں ہوتی تھی۔ اگر مجھے رزق ملنا بند ہو جائے تو یہ برتن تو پھر صاف ہی رہیں گے۔ اللہ مجھے معاف کر دے۔“

اس نے چاروں طرف نظر گھمائی، بریانی، تورے اور کئی دوسری پکوانوں کی پتیلیاں رکھی ہوئی تھیں، کچھ بھری ہوئی، کچھ خالی، جنہیں شمو بڑی محنت سے صاف کر رہی تھی۔ عطا ہی عطا، رزق ہی رزق، کشادگی ہی کشادگی، فراوانی ہی فراوانی، آج اسے یہ برتن برے نہیں لگ رہے تھے، بلکہ نعمت لگ رہے تھے۔ سرین نے فریج کھولا۔ دو بڑے ڈونگلوں میں کھانا بھرا اور شمیم سے کہا۔

”شمیم! یہ کھانا تم لے جانا اور برتنوں میں ڈال کر کھانا اور یہ ڈونگے دھو کر مت لانا۔“

اور حیران کھڑی شمیم کو کچن میں چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ ابھی اسے ظہر کی نماز کے ساتھ شکرانے کے نوافل بھی پڑھنے تھے۔





رنگ تو پسانہ ہوا، مگر جب وہ نہانے لگی۔ سر پر شیمو ملا، آدھا بدن گھبرا، آدھا سوکھا اور جناب منگی میں پانی ختم ہوا اور بتی چلی گئی۔ اس نے بہتیرا دروازہ پیٹا، چینی چلائی ”خدا کے واسطے کچھ کرو۔“ مگر بھابھی کے کان پر جوں نہ رہن سہی اور جوں رہتی بھی کیسے ان کا دل تو لڈیاں ڈال رہا تھا۔

”لے لے نہانے کے مزے۔“

کچھ دیر بعد دروازے سے منہ جوڑ کر کہا۔ ”تو کس نے کہا تھا روز روز لپا پوتی کر کے غوطے کھانے کو اب بیٹھی رہ آرام سے، جب لائٹ آئے گی موٹر چلا دوں گی۔“

”ہائے بھابھی، اتنا ظلم!“ وہ کر لائی۔ آنکھیں شیمو نے لال کر دیں اور جسم پر صابن کی چیونٹیاں کاٹنے لگیں۔ وہ اپنی حالت پر رو دینے والی تھی۔ اماں کو گھر پر چین نہ تھا۔ سارے محلے میں پھر کی کی طرح گھومتی تھیں۔ محلے کے بچوں نے تو نام ہی ”پھر کی اماں“ رکھ دیا تھا۔ اس وقت بھی اپنے روزمرہ دورے پر تھیں۔ اگر گھر میں ہوتیں تو کچھ کرتیں۔ بہت دیر بعد بھابھی کو ترس آہی گیا اور عین چولہے کے پاس بھری رکھی چند بوتلیں اٹھائیں بالٹی میں انڈیل، دروازے کی اوٹ

صبح کے چھ بجے تھے۔ بھابھی فوزیہ نے حسب معمول بریدراتے ہوئے، کونے کھدروں سے میلے کپڑے سمیٹ، ایک ڈھیر جمع کر اور واشنگ مشین لگائی۔ بمشکل ایک کھینچ لی۔ ٹب میں تل کھول دیا اور باقی کپڑے مشین میں ڈالے۔ جیسے ہی چکر چلا گھوں کی دو آوازوں کے ساتھ ہی پٹک۔ یعنی بتی چلی گئی۔

”اوہ! ستیاناس جائے واہ! والو۔ سارا پاکستان

سستا، کامارا ہوا ہے۔ سوائے ان بد بخت واہ! والوں کے کیا منکر نکیر کا حساب درست ہو گا جو ان منحوسوں کا ہے، مجال ہے جو سوئی آگے پیچھے ہو جائے۔“ ماتھے پر تیوریاں سجا کر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتیں۔

واش مشین پر دانت ماتھتی روما کو دیکھ کر لفظ اندر ہی اندر مکابازی کرنے لگے۔ غالباً ”وہ زور سے ہاتھ پر ہاتھ مار ہنستی ہوئی دہری ہو رہی تھی۔ سفید جھاگ کے چند قطرے منہ سے ٹپک گئے۔ مجال ہے جو شرمندہ ہو، بس انگوٹھے نجار ہی تھی۔ بھابھی فوزیہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ چہرہ سرخ، آنکھیں خونخوار، جی چاہا اس کڑوی مولی کو دانتوں سے چل کر تھوک دیں۔

”اللہ کرے اس پیٹ سے تیرے دانت جھڑ جائیں، بڑی ہنسی آرہی ہے میری بے بسی پر۔“

ناولٹ

اس کی ہنسی قمقمے میں بدل گئی۔ غالباً ”اس کا کئی دن کا پرانا ادھار بھابھی کی طرف نکلتا تھا اور وہ منتظر تھی۔ دکاش بھابھی بھی میری طرح بے بس ہوں اور میں دل کھول کر مذاق بناؤں۔“

اس دن وہ کئی گھنٹوں سے منہ اور سر پر ایلویرا کا پیلا چمچا ماسک لگائے کئی گھنٹے بیٹھی رہی۔ آج کل اسے جلد چمکانے کا خط تھا اور اسی وجہ سے بھابھی اندر اندر نکس رہی تھیں کتنی بار دل میں سوچا۔

”اللہ کرے ایسا ہی رنگ ہو جائے تیرا، دنیا دیکھ دیکھ خوف کھائے۔“



سے اندر گھسیٹیں۔ چلو کچھ پانی بہا کر کپڑے پہننے کے قابل تو ہو۔ بندہ اللہ واسطے بھی کچھ کر رہی دیتا ہے۔

”ہائے! بھابھی یہ تو بہت گرم ہے۔“

”تو میں کیا کروں؟ پھونکیں مار مار کر نہالے اچھا ہے اسٹیم کا کام بھی ہو جائے گا۔“

حالانکہ روم نمپر بچہ کی چند بوتلیں بھی رکھیں تھیں مگر اس نند بھانج کے جلائے کا کیا کرتیں۔ اندر ہی اندر خوب خوش ہوئیں۔ ”چل بچو پانی سے زیادہ آج پسینے سے غسل کر۔“

روما جیسے پیسے خیر یا ہر آہی گئی اور دل میں پکا ارادہ تھا کوئی ایسا موقع ملے۔ بھابھی نے تو گرم پانی دیا تھا۔ وہ باقاعدہ اہل کروے گی۔ وائے ری قسمت! ایسا موقع تو نہ ملا مگر مذاق اڑانے کا یہ بھی موقع اچھا تھا۔ سارا دن گیلے کپڑوں کا پھیلاوا سیمتی رہیں۔

وہ کلی کر کے اترا کر بولی۔ ”لگتا ہے بھابھی“ ٹرانسفارمر سڑ گیا، کچھ دیر پہلے پٹاخے کی آواز آئی تھی۔“

”جادو ہو کلموہی، تیری زبان سڑے، منہ میں خاک۔“

”منہ میں تو برش ہے۔ اور اب کلیاں کر کے سارا پانی ختم کروں گی۔“ اس کی پیٹ کھلی آواز پر بھابھی نے گھور کر دیکھا پھر گردن جھٹک اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔



”یہ پڑھائیں گے دشمن کے بچوں کو۔ کم بختوں کو خود تو پڑھنے میں موت آتی ہے۔“ انہوں نے زور سے کہتے ہوئے سوائے بچوں پر سے چادریں کھینچیں۔

”اٹھ جاؤ ڈھبٹوں! اسکول کھل گئے تمہارے۔“ چھٹیاں ختم ہونے کی خبر بچوں کے لیے ناگہانی آفت سے کم نہ تھی۔ کسمسائے آنکھیں ملتے جمائیاں روکتے ریں ریں کرتے روٹ ایک ایک جھانپڑ کھا کر بیٹھی قل ہو گئی، صرف پیس سے تنیں منٹ لگے تھے انہیں بستر سے نکال، منہ دھو دھلا، تیار ہو کر وین

تک جانے میں۔

”بچ اپنا ہی کھانا، دوسروں کا مت ٹھونس لینا۔“

فوزیہ بھابھی کی یہ روزانہ ہانک ہوتی تھی۔ ایسے نذیرے بچے تھے اپنا بچہ تو راستے میں ہی ہڑپ کر جاتے پھر دوسرے بچوں کا صاف کرتے۔ کسی کا چوری چھپے، کسی کا مانگ کر، کسی کے ترلے ڈال کر کھا جاتے۔ روزانہ شکایت آتی تھی، آج حسن کا لچ کھالیا۔ آج علیشاہ کا اڑالیا۔ آج نیچرز میس میں گھس گئے۔ خدا جانے افریقی جنگلوں سے چھٹے تھے یا جنات کی گھٹی تھی۔ پیٹ میں مرغی کے معدے فٹ تھے ہر لکڑ پتھر ہضم۔ خیر یہ ایک معمول کا مسئلہ تھا۔

قسمت بھابھی پر مہربان ہوئی۔ بجلی جلدی آگئی۔ مشین کا چکر چلا، بچوں کو بھیج بھابھی کمرے میں آگئیں۔ بھائی جان کچھ دیر پہلے اٹھے تھے ورکنی ٹی وی ٹرالی پر نکا کے نظریں اسکرین پر جمائے ”بھابھی تو پارلی شروع ہوئی ہے۔“ کے میوٹ والیم پر تھرکتے بدن للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بند وائیم کا بھی فائدہ نہ ہوا۔ چھاپہ مار ٹیم نے یک لخت دھاوا بول دیا۔

”یہ کیا دیکھ رہے ہیں؟“

سوکھے سے بھیا ایک دم ہی اچھل گئے۔ ”وہ۔ وہ۔ میں رہ میوٹ ڈھونڈ رہا تھا۔“

”کیوں؟ بھابھی ہاتھ نچا کر بولیں۔“ اس نے کہیں چھپا لیا ہے، جو نظریں اس کے لباس کو چھید رہی ہیں۔“

بھائی جان اتنے کھیانے ہوئے نگاہ اوپر اٹھتی ہی نہ تھی۔ ابھی تو بھابھی نے اور عزت افزائی کرنی تھی کہ روماد تنگ دے کر اندر آگئی۔

”بھابھی ذرا جلدی فارغ ہو جانا، مجھے بازار جانا ہے۔“

”بھیا کی جان خلاصی کر مان کی ایکسرے سے تیز نگاہ میں تمام تر تجسس سمٹ آیا۔ اپنی پہلے سے چھوٹی آنکھوں کو مزید چھوٹی کر کے بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ کئی دن سے اس کی سرگرمیاں خاصی مشکوک

وسیم سے ملے ہو گئی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے تک خط کارڈ سے تحائف کا سلسلہ جاری رہا۔ وسیم کی موجودگی میں وہ کھلکھلاتی پھرتی اور وہ پروانہ بنامنڈلاتا جھومتا اور فوزیہ دانت کچکا کر رہ جاتی۔ اور اماں کی آؤ بھگت ہی الگ ہوتی۔

”وسیم بیٹیا یہ کھالے وہ بی لے۔“

اور تب تک فوزیہ کے خرے بھی خوب برداشت ہوتے رہے۔ ہوتے ہوتے تیارچ سال گزر گئے تھے۔ پھر اماں اکثر ہی پوچھنے لگیں۔ ”تمہاری ماں کب آرہی ہے تاریخ طے کرنے۔“

وہ مناسب بہانہ ڈھونڈ کر ٹال دیتی مگر دل میں ٹھان رکھی تھی۔ ان کی شادی کروائی ہے میری جوتی۔۔۔ نند بن کر سینے پر مونگ دل رہی ہے، بھانج بن کر تو بھائی کو بھی لے اڑے گی۔ جب تک بالوں میں چاندی کے تار نہیں نکلیں گے تب تک تو سوچیں بھی نا۔

مگر پچھلے ہفتوں میں کچھ تبدیلی سی آگئی تھی۔ نہ اماں وسیم کی آمد پر کچھ جانتیں نہ روم کے پچکے گالوں سے دواچ کی بیسی باہر جھانکتی۔ بلکہ اس کے آنے پر

کمرے میں گھس جاتی اور کانوں میں بہرے ہونے کی علامت ٹوٹیاں (ایئر فون) لگا لیتی۔ نہ آواز آئے نہ شرمندگی ہو۔ بھابھی خاموشی سے یہ سب برداشت کر رہی تھیں۔ لیکن وہ کوئی عام خاتون نہیں تھیں کہ سامنے کی بات دیر سے سمجھ آئے۔ وہ اڑتے پرندے کو دیکھ کر بتا دیتی تھیں میل ہے یا فی میل۔ ایک بار ہمسائی کی بکری کو دیکھ کر کہہ دیا۔

”خالہ فکر نہ کرو۔ اس عید پر بکرا مفت آنے والا ہے۔“

”مشیت الہی مہینے بعد بکرا تشریف لے بھی آیا“ خالہ تو مرید بن گئیں۔ اپنی چھوٹی بہو کو بھی ہمراہ لے آئیں۔ خیر سے امید سے تھی۔ اب کیا ڈاکٹروں کے پاس الٹرساؤنڈ پر پیسے لگانے مفت کے۔ پرہی موجود ہے۔ آنکھوں کے اشارے سے پوچھا۔

ہوتی جا رہی تھیں۔ سانولی جلد پر اتنی ہلچلی گئی کہ رواں گولڈن کے بجائے سفید ہو گیا! برو بے حد باریک تر چمے، رنگے بال بال بال بھٹنے کی بھوری دم یا سو گھے گھاس پھوس سے مشابہہ، فیشل کر، کر جلد شارب سے بھی پتلی کر لی تھی جس پھٹنے کی کسر رہ گئی تھی۔ انہوں نے اسے سر سے پاؤں تک گھورا اور طنزیہ بھنوائیں نچاتی تھیں۔

”کیا بات ہے۔۔۔ کس چکر میں۔۔۔؟ بھابھی بخشنے والی کہاں تھیں۔ جہاں تک انہیں یاد تھا کچھ عرصہ پہلے تک تو وہ بل کر پانی نہ پیتی سارا دن چار پانی توڑتی رہتی تھی۔ کوئی کام بتا دو تو ملک الموت گھینٹا نظر آتا تھا اور آج کل یوگا کر کے سارا بدن اکڑا لیا تھا، جلد کی دشمن الگ اور پر سے یہ بازار کی پھیریاں۔؟

بھبھی ڈرنے والی نہیں تھی۔ لبوترے منہ کو مزید لٹکا کر بولی۔ ”کس چکر میں کیا۔۔۔ موسم بدل رہا ہے“ شاپنگ کرنی ہے۔“

”کیوں تیری زندگی میں پہلی بار بدل رہا ہے۔ یا آخری بار۔“ آخری جملہ انہوں نے دل میں مگر بہت دل سے کہا تھا۔

”بھابھی! آپ یہ بتائیں میں آپ کا ویٹ کروں۔ یا جاؤں۔“

”اوہ بھائی۔“ بھابھی سے پہلے بھیا بول پڑے۔ ”کیوں ویٹ مشین سے دشمنی ہے، لڑائی تمہاری، جنازہ اس کا نکلے۔“

اس سے پہلے کہ بھابھی کا غصہ بھیا پر نکلے انہوں نے اپنی بائیک کی چابیاں اٹھا کر بھاگنے میں عافیت جانی۔ بھابھی نے تیج و تاب کھا کر روم کو گھورا۔ وہ بھی پھس پھس کرتی باہر نکل گئی۔

فوزیہ کی شادی اپنے ماموں کے گھر ہوئی تھی۔ قسمت کی دھنی سارے گھر پر راج کر رہی تھی۔ ایک تو خود زبان دراز اور سے میاں دیو۔ ان ہی کی شادی پر ہلکے پھلکے معاشقے کے بعد روم کی بات ان کے بھائی

”اس کے کیا؟“

اس نے خوب پھیل کر کہا تھا۔ ”پہلے پھلوں کا ٹوکرا، مٹھائی کھلاؤ۔“

”تو بتاؤ! اگر ڈاکٹر نے کہہ ہی دیا چار دن کی خوراک ہے تو کیا مان بھی لوں۔ پہلے چار دن کیسپول کھاؤں گی، دو دن آرام۔ اگلے چار دن سیرپ۔ ہو گئے دس دن پورے۔“

اسے کس چکر میں اتنی رقم تھادی۔ انہوں نے اپنی سوچوں کی لگائیں تھامیں اور گھوڑے دوڑا دیے آخر منزل تک پہنچ ہی گئیں۔

”تو یہ بات ہے۔“



انہوں نے صبح اٹھتے ہی پہلا کام اپنی اماں کو فون کیا تھا۔ سلام دعا، خیر خیریت تو بعد میں پوچھنی بھی یاد رہی یا نہیں بس چھوٹے ہی پوچھا تھا۔

”وسیم کہاں ہے۔؟“

”کہاں جاتا ہے اس نے۔ وہی نوکری کی تلاش میں تھوڑے (ٹھوکریں) کھا رہا ہوگا۔ بہتیرا پیتی تھی اچھا پڑھ لے، اگر چار نمبر زیادہ آجاتے تو ہاتھوں ہاتھ نوکری ملتی۔ برتاں جی، میری یہاں سنتا ہی کون ہے۔ یہ اپنے بچپلوں کا لڑکا۔ اسے مل بھی گئی فیکٹری میں اور وہ جو ہے اپنا اندر اس کے بہنوئی کے۔“

”اماں بس بھی کرو۔“ ”فوزیہ، اماں کی دہائیوں سے چڑجاتی تھی۔ ذرا سی بات پوچھو، مین ڈال ڈال سارے محلے کی خبریں نشر کر دیتی تھیں ماسوائے اصل بات کے۔“

”کر لیا ہے اس کے لیے نوکری کا بندوبست۔ میں نے۔“

”اس۔“ اماں نے حیرت سے فون کو دیکھا۔ ”تو نے کر لیا۔ تیرے سے لکر کا ڈھکن نہ کھلے، دفتر کہاں سے کھول لیا۔ یاد ہے ناں سامنے والوں کا لکر کھولنے کے چکر میں تو نے پھاڑ دیا تھا۔ اور وہ۔“

”اف میرے خدا یا!“

اسے شدید کوفت ہوئی بنا ہی کچ کے بڑھتی کال۔ وہ زور دے کر بولی۔ ”اماں میری بات غور سے سنو، اسے لنڈے سے دو چار اچھی سی پیسٹ شرنیں دلو اگر ہر روز

غریب خالہ نے جیسے تیسے کر کے فرمائش پوری کی۔ پہلے ہی بے چاری کی تین پوتیاں تھیں۔ اب خوش خبری نے بدن میں توانائی بھری۔ لیکن چند ماہ بعد وہی توانائی خالہ بھابھی پر نکال کر گئی تھیں۔ پھل، مٹھائی واپس لی سولی مفت میں پھنسا اٹاگل بھی بدل گئی تھیں۔ لیکن بھابھی کی فیس آرافطرت ایٹھوی نہیں تھی۔ فوراً ”تکے لگائیں اور تہ تک پہنچ ہی جاتی تھیں۔ رونا تو پھر ان کی نند اور مستقبل کی بھانج تھی۔ عقدہ کھلنے میں دیر نہ لگی۔“



وہ دن ڈھلتے ہی بازار کے لیے نکلی تھیں۔ رونا ہر گلی کی سیل میں گھسی۔ پھنسی پھنسی ٹائٹس گونچی اونچی کھلی شرتس، میچنگ کچھو، پونیاں، نیل پالش، لپ اسٹک، پرس لیکن جب جوتوں کی سیل پر رکی اور لونگ بوٹ پسند کرتے دیکھا تو بھابھی سے رہا نہ گیا۔ دونوں بھنویں سکیڈر کر تفتیشی انداز میں پوچھا۔

”اتنی گرمی میں تو فوجی بوٹ پہنے گی، دماغ چل گیا تیرا۔“

”بھابھی فیشن بھی کسی بلا کا نام ہے کہ نہیں۔“ وہ لیدر کے بوٹ کی زپ کھول کر اس میں پاؤں پھنسا رہی تھی جب بھابھی نے جواب دیا۔ ”تو کسی بلا سے کم ہے، جو ایک اور تجھ پر چڑھ دوڑنے کو تیار ہے۔“

اس نے ان کی بات قطعاً ”دل پر نہ لی بلکہ بارہ سوکی جوتی کا بھاؤ تاؤ کروانے لگی۔“

اماں نے پورے پانچ ہزار دیے تھے اور گھر واپسی تک برس میں پانچ روپے بھی نہ بچے تھے۔ آخر یک دم فیشن کی کیا سوچھی۔ اور مای، جان دے دیں پیسے نہ دیں۔ اپنی چار دن کی دوا پورے دس دن یہ کہہ کر چلائی تھیں۔

برابر کمرے سے پرانے زمانے کی ہالی ووڈ ہیروئن مکمل تیار ہو کر سامنے آگئی تھی۔ آج ذرا نگاہوں میں نہ بچ رہی تھی بلکہ دونوں ہی ایک دوسرے کو اندر تک کھٹک رہے تھے ایک دوسرے کی کھینچی لالچی فطرت دل میں ابال اٹھا رہی تھی۔ چہرے کی مصنوعی مسکراہٹ ابھٹے ابال پر پانی کے چھینے کی طرح پڑتی۔ غالباً "آج رفق چچا اپنی بیوی اور دو عدد بچوں کے ساتھ عرصہ دراز بعد کینڈا سے واپس آرہے تھے۔ انہوں نے فون پر بتایا تھا کہ وہ اپنے بچوں کے سلسلے میں بہت پریشان ہیں۔"

یقیناً "رشتوں کی پریشانی ہوگی یہ ان سب کا قیاس تھا" اب ایسی صورت حال میں رشتے اپنے دیس میں ہی تلاش کیے جاتے ہیں اور دیسی بدیسی بننے کے لیے سر کے بل تیار ہو گئے تھے۔ جس دن سے اماں نے دیور کی آمد کا سنا۔ روم کے کاتوں میں یہ صور پھونکا کہ "چچہ چھوڑے و سیم سے منگنی جائے بھاڑ میں گرین کارڈ پکڑو۔" وہ اسی دن سے اپنی جلد کی خود ہی دشمن بن گئی۔

صبح شام فیشل، ہلیج، ایشن پیٹ کم کرنے کی ورزشیں کر کے پیچھے اڑ گئے۔ گردن نہ ہلتی۔ پہلے ورزش کر کے جسم اکڑایا پھر اماں سے تیل کی مالش کا

رگڑا، اوپر سے گوبھی، کدو کے سوپ الگ مگر شوق کا کوئی مول نہیں۔ ہمہ وقت سوتے جاگتے خود کو کینڈا میں دیکھتی اپنی شکل میں مکمل انگریزین دکھائی دینے لگی تھی خیالوں کی رو تو اس قدر بھلی کہ اپنی ساری نسل انگریز نما چلتی پھرتی دکھائی دیتی اس نے خاصی کوشش سے انگریزی جھاڑا سیکھ لی تھی۔

سب مرحلے بخیر و خوبی انجام پارہے تھے۔ بس پہلا مرحلہ بہت مشکل تھا یعنی چچا، چچی وہ خیر جا میں جنم میں ان کے بیٹے جون (جنید جس کا نام اس نے خود خیالوں میں بگاڑ لیا تھا) کو پسند آجائے وہ مرٹھے اس پر۔ یہ سب کرنے کے لیے وہ سرتوڑ بلکہ منہ پھوڑ کوششیں کر رہی تھی۔ نہ صرف بھوری ہونے کی بلکہ انگلش بولنے

میری طرف بھیج دیا کرو۔ اور ہاں وہ جو ملنگھوں کی طرح اس نے بال رکھے ہوئے ہیں نا انہیں کسی ناکی سے رنگوا کر کنٹنل ڈلوالے۔ پیسے میں دے دوں گی۔ اور ہاتھوں میں وہ جو آج کل لڑکے تسبیح حل ڈال رہے ہیں بلکہ تم اپنی ہی بل دے کر ڈال دینا۔ بڑا فیشن ہے ذرا ہیروئن کر آئے۔"

"تو قلم ہٹانے لگی ہے کیا۔!! تیرے سے تو ہانڈی میں مسالا پورا نہیں ڈالتا قلم میں کہاں سے ڈالے گی؟" "اماں بس بھی کرو۔"

"بس کیوں کروں۔ اب پوچھوں بھی نا آخر چکر کیا ہے۔ اے کہیں تو میرے بچے کو ملنگ بنا کر دربار پر تو نہیں بٹھائے گی منگوانے کے لیے۔ نا بابا نا۔ بھیک منگے سے میرا بے روزگار لندورانی بھلا۔"

"آئے ہائے اماں۔" اس نے ماتھا پیٹا۔ "سب بتا دوں گی تمہیں یوں سمجھ لو لائری ٹکنے والی ہے اس کی قسمت کھل جائے گی۔ ڈالروں میں کھیلے گا ڈالروں میں عیش کے دن آجائیں گے۔" وہ ایک سانس میں بول رہی تھی "جب دوسرے فائدے کا سوچ رہے ہیں۔ تو ہم کیوں پیچھے رہیں۔" اب اسے لمبی ہوتی کلنگی بھی فکر نہیں تھی۔

غالباً "بہت جلد بھائی ڈالرز کی برسات کرنے والا تھا اور اماں کو ہمیشہ سے ہی فوزیہ کی صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔ آخر زور دے کر بلا رہی ہے کچھ تو بھلا ہو گا۔ اگلے دن ہی سارا بازار چھان بیٹے کے لیے شاپنگ کی اور بیٹی کی طرف روانہ کیا۔ بدرنگی سی نیلی پینٹ پر ڈبل شرٹ، دھوپ کا سیاہ چشمہ، گلے میں زنجیر نما چین، ہیرو نما سے بھائی پر فوزیہ صدقے قواری جاری تھی۔

پھر کندھے پر دھب لگائی۔ "مجھے کہا تھا بال رنگوا کر کنٹنل ڈلوالے۔ تو کٹوا کر آگیا۔"

"اگر نہ کٹواتا ناں تو آتے جاتے لوگوں نے چندہ دے دینا تھا۔"

"ہائے ہائے اللہ نہ کرے۔" بہن کے دل پر ہاتھ پڑا تھا۔ یار کرتی اندر لے گئی۔

اچھی بوٹیاں نکال کر کھا گئے تھے اور ساتھ کھیر کے ڈونگلوں کی بادامی ہوائیاں بھی۔ اب دہری مصیبت ٹھہری تھی۔ ایک تو مہمانوں کے لیے بجا کھچا کھانا بچا تھا دو سرافریج میں گوشت ختم، کچھ دیر تو بھابھی نے اپنی قسمت کو کوسا کیوں اس منحوس کے منہ لگی تھی۔ آئندہ اس چڑیل سے کلام تک نہیں کروں گی پھر اپنی تازی تازی کھائی قسم پر خود ہی لعنت بھیجی۔

”جیل سے بند رہا ہے تو اپنے لیے مجھے کیا۔“

کڑوا سامنہ بنا کر قدرے بدلے لے جانے میں پکارا تھا۔
 ”اؤ۔ مس یونیورس! ادھر آکر لسن پیا ز چھیل
 دے۔ میں ذرا چوک سے مرغی لے آؤں۔“ عام
 حالات میں تو رونا کبھی بھی نہ اٹھتی جتنی کچھ دیر پہلے ان
 کی ٹھنی تھی۔ مگر اس وقت معاملہ اپنی عزت کا بھی
 تھا۔ بچا کھچا کھانا جو بی کے سامنے بے عزت کروا سکتا تھا
 اور کیفیڈا کا خواب، خواب ہی رہ جاتا۔ وہ منہ کے
 زاویے بگاڑتی فوراً ”اٹھی، بچن میں آگئی۔ ہاتھوں پر
 شاپر چڑھا، لسن پیا ز چھیلنا شروع کر دی۔

وسیم اسی وقت گھر میں داخل ہوا تھا۔ غالباً ان کی گولہ باری کے پہلے مرحلے میں ہی وہ وہاں سے کھسک گیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا اب یہ جلدی تھمنے والی تو ہے نہیں مبادا توپوں کا سرخ میری طرف ہی ہو جائے۔ جب آپا کو چوک لگی جانب بڑھتے دیکھا تو کالر جھاڑ خود

اندرو داخل ہو گیا۔ اسے کچن میں مصروف دیکھ کر وہ ادھر ہی آ گیا تھا۔

گلا کھنکھار کر کچھ دیر کھڑا رہا مگر اس نے توجہ نہ دی پھر آگے بڑھ 'شلف' پر رکھی پیالی سے باوام اٹھا کر چھری سے کترنے لگا۔ اور کن اکھیوں سے اسے بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ کئی دن سے اس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر موقع نہ ملتا تھا۔ آج گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

”آہم“ کر کے شروع ہوا۔

”ہم اگر مجبوری بند ریا بننے کی کوشش نہ بھی کروں تب بھی خوب صورت ہو اور مجھے پسند بھی۔ مگر کیا کروں یار، یہاں تو کوئی کام مل نہیں رہا پھر گرین کارڈ کی اٹریکشن کم بخت ہر جذبے پر غالب آجاتی ہے، مجبوری

38 2016

ہے معاف کروینا۔
 ”بھوری بندریا۔“ پر اس نے نتھنے پھلائے تھے
 اور غرائی تھی۔
 ”مجھے بھی کسی وقت یہ سوکھے چھوہارے جیسا
 مگیتر دل جان سے قبول تھا۔ مگر کینیڈین پارک اور
 سڑکیں پکار رہی ہیں مجھے۔ اس لیے معذرت۔“
 ”تم۔ وہاں جا کر سڑکیں دھوؤ گی۔! وسیم کو تعجب
 ہوا۔

”دھوؤں گی نہیں بلکہ ان پر گاڑی دوڑاؤں گی۔ اور
 تم وہ گاڑی دھویا کرو گے۔ ہونہ۔“
 ”خیر یہ تو وقت فیصلہ کرے گا کون وہاں کیا کرتا
 ہے۔“

وسیم نے مطلب کی بات کی اور ان کے بیچ یہ طے
 ہوا تم میرے معاملے میں ٹانگ اڑانا نہ ہی میں
 تمہارے میں اڑاؤں گا۔ بلکہ اک دو بجے کی راہ ہموار
 کریں گے۔ ہاں البتہ مستقبل میں سوچا جاسکتا ہے کہ
 وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔ بھی ایک شادی دماغ سے اور
 ایک دل سے بھی ہو سکتی ہے۔ وہ خاموشی سے وسیم کی
 پلاننگ سنتی رہی پھر قدرے حقیقی سے بولی۔
 ”ضروری نہیں ہے کینیڈا جا کر بھی میری ترجیحات
 میں کوئی شامل ہو۔“

”او میڈم۔“ اس نے چھری شیاف پر پٹنی اور چڑ
 کر بولا۔ ”مجھے بھی وہاں چھپکیاں پالنے کی ہرگز خواہش
 نہیں ہوگی۔“

”یہ چھپکی کسے کہا ہے؟“ ہانڈی چھوڑ وہ لڑاکا
 عورتوں کی طرح تنی کھڑی تھی۔ جواباً اس نے صاف
 گوئی سے کام لیا۔
 ”تمہیں اور کسے۔“

”اپنا آپ دیکھا ہے تارکول جیسا۔ تمہارے
 جیسے کو تو میں گیٹ کیپر بھی نہ رکھوں۔“
 ”میں تو جیسے تمہیں ماسی بنانے کے لیے مراجارہا
 ہوں۔“

”منہ دھور کھو۔“
 ”تم بھی دھور کھو۔“

لوچی کل ہی مک گئی۔ دونوں نے اپنے اپنے حسن
 کی قسم کھائی کہ اگر جونی موہنی کو متاثر نہ کر دیا تو اپنے
 نام بدل لیں گے۔ بھلے دل سے دونوں اس نئے بننے
 والے رشتے پر قطعاً راضی نہ تھے مگر ضد اور پھر کینیڈا
 کا خواب دونوں نے دل میں اٹھتی ٹیسوں پر بالکل کلن نہ
 دھرے۔



رفیق چچا بڑی سی ٹیکسی میں اپنی فیملی سمیت اترے
 تھے۔ بھیا انہیں ایئر پورٹ پر لینے گئے تھے اور اب
 سب گھر والے پھولوں کی بارش میں ان کا استقبال
 کر رہے تھے۔ سب کے چروں پر مسکراہٹ تھی۔ خود
 غرضی کی بھی کسی حد تک اپنائیت کی بھی۔ البتہ روما
 اور وسیم اس میں بھی قاصر ہی رہے۔ انہوں نے بہت
 مسکرانے کی کوشش کی لیکن کلیجہ اچھل اچھل منہ کو
 آتا۔ فوزیہ بھی دھک سے رہ گئی جب ان کے برقیانی
 گینڈے نما بچے جنید اور منیبہ کو دیکھا۔

خون خشک آنکھیں ابل پڑیں۔ اتنے بھاری
 بھر کم۔ کم از کم تین تین من گے تو ہوں گے ہی۔ باہر
 سے سب کے ہاں اچھے بھلے انسان نما مہمان آتے ہیں
 اور ان کے ہاں سر کس نما کہ چھپاؤ بھی تو نہ چھپیں۔
 یک لخت اوس سی پڑ گئی۔ گرین کارڈ سکنل نے پھر سے
 جوش مارا۔

”بھاڑ میں جائے کم بختوں کا وزن اپنے ہی پیروں پر
 اٹھاتے ہیں۔“

اور لگ گئے سب خدمتوں میں۔ وسیم اور روما کو
 بھی ان کی اماؤں نے کسی نہ کسی طرح راضی کر ہی لیا
 تھا۔ اماں الگ خوش مزاجی کے مظاہرے کرتیں
 بھابھی الگ اور وہ دونوں بیچارے بھی نہ چاہتے ہوئے
 بچھ بچھ جاتے۔

رفیق چچا کو آئے کئی دن گزر گئے تھے۔ ان سے
 ملنے آنے والے رشتے داروں کی آمد کا تانا بھی اب
 خاصا تھم چکا تھا۔ اب گھر میں صرف گھر والے تھے یا
 پھر ان کی اکلوتی بڑی بہن فوزیہ کی امی۔ انہوں نے پہلے
 دن ہی اعلان کر دیا تھا۔

آکے پیچھے منڈلانے کی خاص ہدایات تھیں۔ اماں نے تو یہاں تک آرڈر دیا تھا۔

”جونہی کے سارے کام آج سے تم کرو گی۔“
”آئے ہائے اماں۔۔۔!!!“ وہ سٹپٹا گئی۔ ”سب کام؟“

”کم بخت! سب نہیں اس کے سونے جا گئے، کھانے پینے، کپڑے لٹے کا تم نے دھیان رکھنا ہے۔ کیا کھانا ہے، کیا پہننا ہے، کیا کیا پسند ہے۔“

”تویوں کو نا کہ اس کے باڑے (اصطبل) اور کھلی (ناند) کا زمہ میرے اوپر ہے۔“

اس کے انداز کی ناگواریت بر اماں نے جھانپ کر جڑا۔
”منخوس! اس بیل کے ساتھ عیش بھی تو، تو ہی کرے گی تب یاد کرے گی اماں کے مشورے۔“

اماں کے مشوروں پر وہ چارو ناچار عمل کر رہی تھی۔ یہ چند دن بعد کی بات تھی جب وہ اس کے استری شدہ کپڑے اس کے کمرے میں رکھنے گئی۔ وہ بیڈ پر ایشٹھا فلم دیکھ رہا تھا۔ کپڑے دیکھ کر مسکرا دیا۔

”وہیے ہمیں یہاں آنے کا فائدہ ہو گیا، ہمیں کوئی کام کرنا نہیں پڑ رہا۔ آپ جتنی خوب صورت ہیں اس سے زیادہ خوب صورت کام کرتی ہیں۔“
وہ تو یہ جملے سن کر جانے خوش ہوئی تھی یا نہیں۔

اماں حسب عادت پیچھے پیچھے آتی دروازے میں سر جوڑے کھڑی تھیں۔ سنتے ہی خوشی سے اچھلتی اچھلتی رکیں۔

”تو جی گل ہی مک گئی، کڑی تے پسند آگئی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ اور فٹافٹ کینڈا۔“ اور اس دن تو اماں کا دل دھڑ دھڑ کر کے سوکھی پسلیاں توڑ جھولی میں گرنے کو تھا جب رفیق پچانے ان سے کہا۔

”بھابھی، تجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

”ہاں ہاں تو کرو۔“ خوشی میں ان کے منہ سے پانی بھی ٹپکنے کو ہو گیا۔ بڑی بہن یعنی فوزیہ کی والدہ مہینے بھر سے عینیں براجمان تھیں، سنتے ہی اندر تک کڑواہٹ سے بھر گئیں۔

”میرا بھائی جتنے دن رہے گا میں تو یہاں ہی رہوں گی غلام حسین کے سالے کا بیٹا جب بھی آتا ہے اس کی بیوی۔“

”ہاں ہاں اماں۔ آپ رہو آپ کو کون منع کر رہا ہے۔“ بھابھی فوزیہ نے ان کی بات کاٹ کر فوراً ان کے رہنے کی تائید کی تھی۔ گھر میں چونکہ صرف وہی غیر تھیں رز نہیں تھا۔ بھابھی نے وسیم سے کہہ دیا۔

”وسیم جانی! موہنی کو اپنے شہر کی سیر کرواؤ نا۔ اسے بھی تو یہاں کا کلچر بتا چلنا چاہیے، کتنے محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ اس شہر کے۔“

”بھیا کھانا کھا رہے تھے۔ رومال سے منہ پونچھتے، تمام حلاوت بالائے طاق رکھ، صفائی سے کہا۔

”بے شک۔ لیکن میری بائیک پر نہ لے جانا، پتھر ہو جائے گا۔ آگے ہی پیسے نہیں ہیں ٹھیک کروانے کے۔“

اماں نے ڈیٹا، ساس نے گھر کا اور بھابھی دانت کچکا پاتی رہیں، مگر ان کی بلا سے۔ بھئی اپنی عاشقی اپنی جیب سے اٹھتے ہوئے مشورہ دے رہے تھے۔
”آٹو رکشے پر لے جاؤ، انہوں نے کہاں ایسی سواری دیکھی ہو گی۔“

”اگر وہ پھنس گئی، نکالے گا کون؟“
وسیم کی سرگوشی پر روما کو مسکراہٹ چھپانا مشکل ہو گیا تھا۔ بھابھی اندر تک تلملائیں اور مصنوعی مٹھاس آواز میں بھرتے ہوئے سمجھایا۔

پیدل جاؤ نا۔ چلنے پھرنے سے ایک تو ویٹ لوز ہوتا ہے، واک ہو جائے گی اور پھر موقع ملتا ہے ایک دوسرے سے باتیں کرنے کا، سمجھنے کا۔ کیوں موہنی جانی۔“

اس نے موبائل پر ٹیم کھیلتے ہوئے تائیداً ”سرہلایا پھر کوئی اور بیج کھول کر بیٹھ گئی۔ غالباً“ اسے ان کی باتوں میں کچھ خاص دلچسپی نہیں ہوئی تھی۔

اماں نے روما کو الگ خدمت گزاری پر لگا رکھا تھا۔ پچھا، چچی کی کم جونہی (جنید) کی زیادہ۔ انگریزی بولنے اور

یا سوئم ہی بنو اور پر بنو اور سوہ پار بھرے انداز میں بھا بھی
کے کندھے پر ہاتھ رکھے شیرینی ٹکائے لگیں۔
”بھا بھی جب بھیا روما کا رشتہ مانگیں تو تم و سیم کا
موہنی کے لیے ڈال دیتا۔“

”اے رقبہ! تیرا داغ تو نہیں چل گیا۔ میری روما
گوری چٹی دلی تپی، اونچی لمبی جو دیکھے پسند کر لے اور
کہاں تیرا کالا کلوٹا، سوکھا چھوہارا و سیم۔ سچے گا بھلا
موہنی کے ساتھ۔“

آپا کو ان کی بات پر بے حد غصہ آیا۔ جی چاہا تپتی
چائے کی پیلی ان ہی پر الٹا کر دھالیں ڈالے یا پھر ان کی
پچھلی سات کالی نسلیں خوب چمکا ڈی جیسی تشبیہات
کے ساتھ یاد کروا دیں مگر اس وقت مسئلہ اپنے بیٹے کے
مستقبل کا تھا۔ بیٹ میں بھلے بل پڑے، موڑا تھے مگر
چہرے پر شکن تک نہ لائیں۔

”بھا بھی! یتیم بچہ ہے میرا، اس کا بھلا کرو گی تو اللہ
سے بھلا پاؤ گی۔ مجھے کی تقریر میں مولوی کفایت اللہ
نے قیموں پر۔“

”اے اچھا، اچھا رقبہ۔“ اماں نے فوراً انہیں روکا
بیشتر اس کے کہ وہ پورا یتیم نامہ کھول لیں۔ ”تم دم تولو،
کروں گی، ضرور کروں گی اپنے و سیم کی بات۔ کیوں
نہیں کروں گی بھلا، میرا بھی بچہ ہے وہ۔“

پھر دم بھی سری پاؤں کا دم ہی ہو گیا جو کھلنے میں ہی
نہ آتا تھا۔ اماں نے تفتی کو ششیں کیں۔ رفتی کو گھیر
گھار کر موضوع کی طرف لائیں۔ جہاں انہیں تنہا
بیٹھے دیکھا۔ لفظوں کا رن بوے تیار کرنے لگ جاتیں۔
بچوں کے رشتے، شادی، ان کا مستقبل، اڑوس پڑوس
کی مثالیں۔

چچا نے سرد آہ بھری۔ ”بس بھا بھی! ہم بھی بچوں کی
طرف سے پریشان ہیں۔“

”لے مجھے کیا پریشانی، اپنے چاروں طرف رشتے
ہیں تو اشارہ تو کر۔“

”بھا بھی جان، صرف رشتے ہی تو نہیں اور بھی کچھ
دیکھنا ہے۔“ اماں سمجھ داری کا مظاہرہ کرتیں رازدارانہ
انداز میں قدرے اور قریب سرکیں، بھیا کچھ دبر پہلے

”بھالی میرا اور باتیں بھانج سے، ساری دنیا کے
بھائی اپنی بہنوں سے مشورے کرتے ہیں پیغام
بجواتے ہیں مگر یہاں۔ یہ تو شروع دن سے ہی بے
دید ہے۔“ ان کے اندر حسد کی کشتی جاری تھی اور چچا
نے شاید ان کا چہرہ بڑھ لیا یا پھر آپا کی عادت سے واقف
تھے کہ بال کی کھال اتارتی ہیں۔ ایک بار شروع
ہو جائیں تو چپ کروانا مشکل اسی لیے دھتے سے کہہ
دیا۔

”بھا بھی ابھی نہیں، پھر کسی مناسب وقت پہ کروں
گا۔“

بس جناب اتنی سی بات ہوئی تھی اور اماں کے پاؤں
زمین پر نہ ٹکتے سارے محلے میں نشر کر دیا۔ ”میری روما
کینینڈا جانے والی ہے، میں تو خود وہیں چلی جاؤں گی،
یہاں تو نکھی چھری جان نہیں چھوڑتے، بغیر چھروانی
کے کیسی سہانی نیند آئے گی۔ اے میرے اللہ۔“
سینے پر ہاتھ رکھ جھوم جھوم گئیں۔

روما کو بھی صبر آگیا۔ ”چلو کینینڈا کی سیر ہاتھی کے
ساتھ ہی سہی۔“ ویسے تو اس کا جی چاہتا تھا کہ رندا لے
کر جونی کے چار اطراف پھیر دے۔ کچھ تو اس
جھڑے۔ بس یہ جی ہی چاہتا تھا، عمل نہ کر سکی۔
اور فوزیہ کی اماں صبح شام ہاتھ مل رہی تھیں۔

”بھا بھی سے تو بات طے ہونے والی ہے، مجھے سے
جانے کب کرے گا۔“

اماں بچن میں دودھ پی چیک کرنے آئی تھیں جو
خاص طور پر چچا کے لیے تیار کی جا رہی تھی۔ ایک
الپنگی منہ سے توڑ کر بیچ میں ڈالی، میٹھا چیک کیا۔ فوزیہ
کی اماں بھی دوپٹا کانوں پہ، اڑستی پیچھے پیچھے آگئیں۔
اور پکارا۔

”بھا بھی!“

اماں نے بھرپور رعوت سے گردن پھیری جیسے
کینینڈا کی خاتون اول منتخب ہو چکی ہوں۔
”کیا ہے؟“

آپا کو ذرا فرق نہیں پڑا بھا بھی کے خاتون اول بننے کا،
ان کی تو بس یہ خواہش تھی ان کے و سیم کو بھلے مرد دم

ہی دکان سے لوٹے تھے ہاتھ منہ دھو سیدھے اوھر آگئے۔ مونڈھا کھینچ قریب بیٹھ گئے جیسے چچا اہم اعلان کرنے لگے ہوں۔

”بھابھی کینڈا کے حالات اب زیادہ اچھے نہیں رہے، خاص کر پاکستانیوں کے لیے مسکھ تو وہاں خوش رہ رہے ہیں لیکن ہم پاکستانی آف۔ ہمیں ایسے گھورتے ہیں جیسے ہم بم لیے پھر رہے ہوں، جہاں جی چاہے ذلیل کر کے رکھ دیتے ہیں، ایسی ایسی تلاشی لیتے ہیں کیا ذکر کروں۔“

وہ پھر گویا ہوئے۔

”ہم نے تو پھر صفائیاں کر کے گوروں کے کتے ننلا کے جیسے تمسے گزارا کر ہی لیا مگر یہ نئی سسل یہ سب کڑنے والی تھیں، اسکولوں میں تو اتنا مسئلہ نہیں تھا مگر کالج، یونیورسٹیوں میں توبہ توبہ۔ جنید کی تو کئی بار وہاں لڑائی بھی ہو چکی ہے، اسی لیے سب کچھ سمیٹ سمٹ یہاں شفٹ ہونے کا سوچا۔ کچھ جمع پونجی ہے، سوچ رہا ہوں کوئی چھوٹی موٹی دکان ڈال لیتا ہوں، جیسے وہاں سوکھے برگرباسی بسکٹ کھانے کو مل رہے تھے، ویسے تو یہاں بھی کھالیں گے پر عزت تو ہوگی۔“

بھابھی کی آنکھیں ان کے ہر جملے پر سکڑتی، ہاتھوں پر ٹھہر گئیں۔ سخت محنت کش کھردرے ہاتھ۔

”پیسہ جمع کرنے کی دھن میں اپنی توانا عمر بردیسیوں پر لٹا کر پھر تھی داماں۔ ہونہ! یہ اپنی مٹی ہی کا طرف ہے جو بڑھا پے کی کمزور جان کو بانہوں میں سمیٹ لیتی ہے اور جوان و توانا بے روزگاروں کے اکڑے قدم بھی اپنے سینے پر برداشت کرتی ہے، اور یہ تو پھر جس قسم کی تنگی عزت افزائی کے بعد آئے انہیں بھی پناہ دے ہی دے گی۔“

چچا کچھ دیر توقف سے بتا رہے تھے ”جنید کا رشتہ میں نے اپنے ایک پرانے دوست کے گھر سحرات میں طے کر رکھا ہے، اور منیبہ کے لیے بھی ایک دو جگہ بات چل رہی ہے۔ بھابھی اگر آپ کی نظر میں منیبہ کے لیے کوئی اچھا لڑکا ہے تو ضرور بتائیں، وہ بھی دیکھ لیتے ہیں، بس لاپچی نہ ہوں، جینز وغیرہ کے لیے زیادہ سرمایہ نہیں ہے میرے پاس۔“

اماں کا تو سنتے ہی ہارٹ فیل ہونے کو تھا۔ لوڈ شیڈنگ کے سبب پہلے چاچا کو تیز تیز۔ ہاتھ کا پنگھا جھل رہی تھیں۔ وہ ہاتھ یک لخت گود میں جا گرا۔ جی چاہا سگھے کی ڈنڈی چاچا کی گھوڑی میں ٹھونک دیں۔ دل ہی دل میں گالیاں کوسنے دینے شروع کر دیے۔

کم بخت! پہلے نہیں پھوٹ سکتا تھا۔ ٹٹ پونہ جھا آرہا ہے، خواجواہ خاطر میں کیس، اتنی رقم مہمان داری پر لگائی، صرف اس کے لیے اوپر کے پورشن کو سیٹ کر دیا۔ سب کچھ اکارت چلا گیا، اچھا بھلا باہر دفع ہو گیا تھا۔ اب آگیا پانچ مرلے کے گھر میں بھینڑ بڑھانے کو، چار چار بندوں کی جگہ تو ایک سائڈ ساجھ لیتا ہے اکیلا، کل کلاں گھر میں سے حصہ بھی مانگے گا، بد بخت بد نصیب کینڈا کو ٹھوکر مار کر آگیا، کیا تھا تار تار تلاشی، کون سا جان سے مار رہے تھے، کم از کم ہم تو مسکھ سے رہتے اور وسیم۔ ہائے ہائے اسے نظر انداز کر کے اس چھچھورے کا دل بھی میلا کیا، کہاں جاؤں، کیا کروں، محلے والے الگ پوچھیں گے، اماں کا غم کسی طور کم نہ ہو رہا تھا یہاں تک کہ ان کے لائے ہوئے تحائف کپڑے اور جوتے ان ہی کے سر میں بجانے کو بے حد دل چاہا۔

بھابھی فوزیہ یہ ساری مسہری مونڈھا کا نفرنس دروازے سے کان لگائے بہت غور سے سن رہی تھیں، البتہ ان کی اماں دوا کھانے کے بعد نیند کے غلبے میں تھیں اور اس سب سے فیض یاب ہونے سے رہ گئیں ورنہ وہ تو بھائی کی ایسی دھجیاں اڑاتیں کہ اللہ کی پناہ۔ آخر ایک مہینے سے اپنا گھریا چھوڑے بیٹھی تھیں اور جو چھوٹی موٹی نوکری و سیم ان دنوں کر رہا تھا وہاں بھی اسے جانے نہ دیا۔

”کیا کرے گا یہ غریبوں والی نوکری کر کے کینڈا اجا کر اپنا سپر شٹور (اسٹور) کھولنا جس طرح خلیل کے بہنوئی نے کھول لیا تھا اور۔“ اور جانے کیا کیا کس نے کھول لیا تھا۔ لیکن اس وقت بھابھی کا جی اپنا یا پھر ماموں کا سر کھولنے کو کر رہا تھا جیسے ہی انہوں نے سنا کینڈا ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئے تو منہ سے نکلا۔

”لکھ لعنت!“

رکھا تھا۔ موسم خوش گوار دیکھ کر پروگرام بنالیا۔ اس وقت تک اماں بھابھی سب نچھاور تھے۔ کچھ رقم تھما کر انہیں ٹیکسی میں قاسم بیلا سے حرم گیٹ تک جانے کی ہدایت کی تھی۔

حرم گیٹ کا گہرا بازار پر رونق کھچا کھچ بھرا، کہیں ٹھہلے پھٹے ریڑھیاں تو کہیں چھوٹی چھوٹی دکانیں مال سے کم بندوں سے زیادہ بھری ہوئیں۔ کبوتر گلی میں سے گھس کر روتا چوڑی بازار کی طرف مڑ گئی۔ چھوٹی چھوٹی تنگ تنگ گلیاں تھیں۔ حسبِ عادت روتا وسیم ہر سیل پر رک رہے تھے۔ رنگین دوپٹوں پر پچاس فی صد سیل لگی تھی۔ وہ وہاں رک گئی۔ وسیم برابر پھٹے پر پھٹیں دیکھنے لگا۔ پھر ان کی بلا سے ہم پھٹے قیامت آئے، آگ لگے، ایسی جگہ تو انہیں اپنا ہوش نہیں رہتا تھا۔ ان کا کیا دھیان رکھتے۔ اتنا یاد تھا وہ ایک سی ڈیز کی ریڑھی پر رکے تھے پھر میلہ دیکھتے جانے کہاں سے کہاں نکل گئے۔ وسیم اور روتا جب دونوں چیزوں میں نقص نکال اور منگائی پر دکان داروں کو صلواتیں سنانے لگے۔

”ہمارے ساتھ باہر کے مہمان دیکھ کر تمہارے دماغ زیادہ ہی عرش پر پہنچ گئے۔ اتنی قیمت۔“

اس وقت وہ کینڈین یاد آئے تھے اور مڑ کر انہیں دیکھا پھر تو ہر جگہ دیکھا۔ سارا بازار چھان لیا۔ نوٹوں کے ہاروں والی دکانیں، ٹھنڈی کھیر کے ٹھہلے، سہوں کے بھٹے، موبائل شاہیں، جوتی، جیولری، گارمنٹس سب گھنگالیں۔ سوئی تو تھی نہیں جو نہ ملتی۔ جب تھک گئے تو گھر کی طرف دوڑ لگائی تھی۔

بھابھی فوزیہ نے سنتے ہی ایسی آواز نکالی جیسے چیونگم کا پٹاخہ بجا ہو۔ ”وہ کہاں گم ہو سکتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں چھوڑ جائے گا کوئی نہ کوئی، الگ ہی چمک رہے ہوں گے سفید بھینسے۔“

وسیم روتا نے حیرت سے اک دو بے کو دیکھا کہ انہیں کیا ہو گیا۔ کچھ دیر پہلے تک تو وہ جگر جان تھے اور اب سفید بھینسے اور جب وسیم نے بتایا۔ ”آپا آپ کا پو اور بلی بھی ان ہی کے ساتھ ہیں۔“

بھابھی کا دو تڑپنے پر پڑا تھا۔ ”ہائے بد بختو! میرے

اور جب کنگال معاشی حالت کا رونا کان میں پڑا تو باقاعدہ بند دروازے کو بچہ دکھایا اور منہ بگاڑ کر بولیں۔ ”تھوڑی سی جمع پونجی ہے وہ بھی دکان کے لیے ہو نہ، اس موہنی کے لیے رشتہ ہم دیکھیں۔ وہ کنگلی سفید ہتھنی میرے بھائی کے لیے رہ گئی ہے، درفٹے منہ۔ وہاں ہی کریں جہاں ایک دودھ دیکھ رکھے ہیں۔“

وہ انہیں غائبانہ گالیوں سے نواز رہی تھیں اور جوڑ جوڑ درد سے اکڑ رہا تھا۔ غالباً ”ان کی آمد سے پہلے اماں نے ساری صفائی ان ہی سے کروائی تھی۔ انہوں نے بھی خوش ہو کر خوب جوش و خروش سے کی۔ کمرے میں لگی سبز کالی کو برش سے خوب رکڑا۔ جب صاف نہ ہوئی تو کھلا تیزاب منگوا کر صاف کیا تھا۔ تیزاب کے ننھے منے جھینٹے اور دھسک جو اس وقت قطعاً ”محسوس نہ ہوئی تھی اس وقت گلے میں پھندے کی صورت ایک لگی تھی۔ بچے ہوئے تیزاب کی بوتل کو انہوں نے خونخوار نظروں سے دیکھا۔“

جی چاہا ماموں ماما پر الٹ آئے۔ کتنے دن سے خد متیں کروا رہے ہیں۔ پھوٹے ہیں تو یہ ”لٹ پٹ کر آئے“ کچھتاوے نے الگ ڈیرا ڈال لیا۔ ”روتا کے سامنے جو بڑے بڑے دعوے کر رکھے تھے بد بخت خوب مذاق اڑائے گی۔“ چلو وہ کون سا جج کر کے آئی ہے، ہوا تو اس کے ساتھ بھی وہی جو ہمارے ساتھ ہوا۔ یہ سوچ کر دل کو قدرے تسلی ہوئی۔

”ہم نے کون سا رشتہ ختم کر دیا تھا، منگنی کا سامان تو دونوں ندیدے کینے کب کا استعمال کر چکے، کون سا پٹایا ہے۔“

وہ دروازے سے سر جوڑے جانے مزید کیا سوچ رہی تھیں کہ اچانک سے وسیم اور روتا انتہائی بوکھلائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ ”وہ۔ وہ۔ موہنی، جونی گم ہو گئے۔“

وہ بیک زبان بولے تھے۔ غالباً ”اس دن موسم صبح سے ہی خوش گوار تھا۔ موہنی، جونی کا اندرون بازار دیکھنے کو بہت دل چاہ رہا تھا۔ ویسے بھی ملتان کی عمارتیں اور تاریخی دروازوں غصیلوں کے بارے میں بہت سن

بچے کہاں چھوڑ آئے، ستیا ناس ہو تمہارا اپنی عاشقی معشوقی میں میرے معصوموں کا دھیان بھی نہ رکھا۔
مرودوں۔

ان کے شور شرابے پر سارا گھر اکٹھا ہو گیا۔ یہاں تک کہ ان کی اماں بھی دوائی کے اثر سے باہر آ گئیں اور اپنے عزیزوں، پڑوسیوں کے بچوں کے حادثات و اغوا کی ایسی ایسی کہانیاں سنائیں کہ فوزیہ غش کھا کھا کرنے کو بھی۔ سب لوگ پریشان تھے اور خود تلاش کرنے کا پلان بنا رہے تھے کہ اتنے میں چچا کا موبائل تھر تھرایا۔ انہوں نے مین دیاکان سے لگالیا۔

”آپ کے کینیڈین مہمان ہمارے قبضے میں ہیں، دس ہزار امریکی ڈالر زلے کر چوک سلطان النک آجاؤ، بندے لے جاؤ۔“

فون کھٹ سے بند۔ یک مشت اتنی رقم! چچی زور سے رونے لگیں۔ بھابھی نے دہلتے ہوئے اپنے زیور کا بھاؤ لگانا شروع کیا۔ بھیا سر کھجاتے اپنی چھپائی ہوئی سیونگ سوچ رہے تھے۔ رفیق چچا نے کام کی بات کی تھی۔

”ہمیں اس طرح پریشان ہونے کے بجائے پولیس میں اطلاع دینی چاہیے، پولیس آخر ہوتی کس لیے ہے۔“

فوزیہ کی اماں تو سنتے ہی ایک فٹ اچھلی تھیں۔ ”او، قہقہے! تجھے نہیں پتا یہاں کی پولیس ولس کا۔“ پھر انہیں اپنے اس رشتے دار کا قصہ یاد آ گیا جنہوں نے بچے کی گمشدگی کی اطلاع پولیس میں کی تھی، بے چاروں نے تاوان بھی بھرا اور وصولی میں بچے کی لاش ملی۔

”وسیم۔!“ بھابھی فوزیہ نے بازو لہرا کر نعو مارتے ہوئے بھائی کو پکارا تھا۔ ”اماں کو دوائی پلا کر سلا دے ورنہ میں ہمیشہ کے لیے سو جاؤں گی۔“

”بھابھی حوصلہ رکھو۔ مل جائیں گے سب۔“ اس عرصے میں روبا پورے خلوص کے ساتھ بھابھی کے قریب آئی اور انہیں اپنے ساتھ لگایا تھا۔

”دفع ہو منحوس۔“ انہوں نے اسے جھٹک دیا۔ ”تمہاری لاپرواہی نے یہ دن دکھایا ہے۔“

”کوئی رونے پینے، مین ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اماں جو بہت در پہلے سے ہی رفیق چچا کے انکشافات پر جلی کیلسی کھڑی تھیں، منخوت بھرے انداز میں فرما رہی تھیں۔ ”اغوا کار کہاں تک کھینچیں گے ان بلڈوزروں کو، تھک ہار کر خود ہی چھوڑ جائیں گے۔“

”ہائے اماں! اتنی سنگدل مت بنو۔“ فوزیہ نے پھر ماتم شروع کر دیا۔ ”تمہارے پوتا پوتی بھی ان کے ساتھ ہیں۔ ہائے میرے لال۔“

”ہاں تو تیری تربیت پر پورا بھروسہ ہے مجھے، اگلوں کا منہ نیلا پیلا کر دیں گے تیرے لال اگر کھانے کو کچھ نہ دیا تو۔“

دراصل اماں کو فی الوقت چچا کی باتوں سے جو دکھ تھا سو تھا، مگر بچوں کی بھوک فطرت پر جو کچھ پرسوں ان کے ساتھ ہوا اس کا دکھ نہیں گیا تھا۔ ساتھ والی خالہ نے قیمہ بھرے کر لیے پکائے تھے۔ ایک ڈونگا خاص طور پر رفیق چچا کے لیے بھجوا دیا کہ چلو پردیس سے آئے ہیں، ’ڈکی کھانوں کی ضیافت بھی اڑائیں۔ اماں نے ڈونگے سے دو تین کر لیے نکال کر ایک گلاس میں چھپا فریج کی فروٹ باسکٹ میں چھپا دیے تھے۔ اس لیے کہ بے وقت کی بوڑھی بھوک میں خاموشی سے کھا لوں گی۔ رات کے بارہ بجے جب انہوں نے گلاس نکالا تو کر لیے کے خالی خول ان کا منہ چڑا رہے تھے۔ انہیں سو فی صد یقین تھا ہونہ ہو یہ ان نندیدوں کا ہی کام ہے۔ اگلے دن مان بھی گئے۔ ان خالی چھلکوں کی کڑواہٹ اس وقت اماں کے لہجے میں در آئی۔

”ایسی نندیدی فطرت کے بچے جنہیں ’نانی دودن‘ سے زیادہ نہ رکھ سکے، اغوا کار بے چارے کہاں تک سنبھالیں گے۔ ہاتھ جوڑ کر چھوڑ جائیں گے ان یا جوج ماجوج کی اولاد کو۔“

”اماں، میری غیرت کو گالی نہ دو۔ وہ خالص میری اولاد ہیں۔“ بھیا کی غیرت جوش میں آئی تھی جو اماں کا دھمو کا کھا کر دبا کر گئی۔

”تو کم بخت اسی لیے کہتی ہوں ان کے پیٹوں کا علاج کروالے، کیڑے اب تک سانپ بن گئے ہوں گے۔“

تھے۔ کھلی سڑک گاڑیوں، وین، ریکشوں کا رش اور سوہن حلوہ خرید، کھاتے کھاتے چل سو چل خامے آگے نکل گئے۔ پھر تو انہیں نہ آگے کی سمجھ میں آئی نہ پیچھے کی۔

وہ پراسرار سیڑھیاں بھی بہت سی نکل آئیں۔ جانے وہ کون سی والی سے اوپر چڑھے تھے۔ اوہر دیکھ اوہر دیکھ۔ پو، بلی سے پوچھا کہ شاید انہوں نے وہاں کوئی کھانے پینے کی چیز کی نشانی رکھی ہو، مگر ان کا وہ بیان تو باہر سوہن حلوے پر تھا۔ تنگ آکر انہوں نے ایک ٹیکسی کو روکا اور قاسم بیلا کا جو ٹوٹا پھوٹا ایڈریس معلوم تھا بتا کر بیٹھ گئے۔ ان کے حلیے اور باتوں سے ٹیکسی والے کو خوب اندازہ ہو چلا تھا کہ باہر سے آئے ہیں۔ باتوں باتوں میں تصدیق بھی کر لی۔ ڈالرز کی چمک بھی بڑی بری شے ہے اس نے فوراً ایک پلان ترتیب دے لیا تھا مسئلہ صرف انہیں گھر لے جا کر اتارنا تھا۔ اس نے بڑی فخریہ آفر کی تھی۔

”باجی! آپ کو تاریخی چیزیں دیکھنے کا بڑا شوق ہے“ میرا گھر دیکھو، بڑا تاریخی ہے۔ ابا کے ابا نے بنوایا تھا اور حالت سے تو لگتا ہے ان کے بھی ابا نے بنوایا ہو گا۔ اور پو، وہ تو یادگار تاریخی ہے، عمر اتنی نہیں ہے جتنی پرانی لگتی ہے۔“

اس نے اپنے گھر اور محلے کے ایسے تاریخی قصے سنائے ہندوؤں کے زمانے کی کبھی نہ ختم ہونے والی داستان گھڑی۔ وہ بھی مارے تجسس کے چند گھڑی کے لیے اس کے گھر کی گلی میں رک گئے۔ کچھ دیر ان اور بوسیدہ علاقہ تھا اور لمبی سی گلی بمشکل تین چار فٹ چوڑی ہوگی۔ اکھڑی اینٹوں سے بنی پرانی طرز کی گلی، پرانے پرانے مکانات، آگے بڑھے ایک دروازے کو ہلکا سا دھکا دے کر گندہ سا پھنپھناتا رہا، اٹھا، وہ اندر داخل ہو گیا، وہ سب بھی ڈرتے ڈرتے، گھر آگئے تھے۔ دل میں انگش فلموں، ٹائٹلز کا ایڈو سخر جوش مار رہا تھا البتہ پو، بلی صرف اس لیے پر جوش تھے کہ مسمان بن کر جا رہے ہیں کچھ اچھا کھانے کو ملے گا۔ کھانے کو تو پھر ایسا ملا کہ یاد ہی کرتے۔ اس نے ان کے اندر داخل

گھر میں مجھے اس ہنگامے کو پہچانے اور چچی صالحہ حیرت سے دیکھ رہے تھے البتہ باقی سب کے لیے معمول کی بات تھی۔

اماں کا قیافہ درست نکلا تھا۔ دکھی دل پر ویسے ہی الہام اترتے ہیں۔ اماں نے سچ کہا تھا خود ہی چھوڑ جائیں گے ایسا ہی ہوا۔

دراصل وہ ریڑھیوں پر رکے رکاتے ایک تنگ گلی کی جانب مڑ گئے۔ تھوڑا سا آگے تک چلنے پر سامنے النگ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ تو ان کے لیے عجیب منظر تھا۔ بازار کے اندر گلی، گلی میں پرانے زمانے کی تنگ سیڑھیاں اور سیڑھیوں کے آخری کنارے پر کھلی سڑک کی روشنی۔

النگ اصل میں مغل بادشاہوں نے تعمیر کروائے تھے۔ شہر کے چار اطراف فصیلیں بنا کر چھوٹے چھوٹے طاقچے نما سوراخ رکھ دیے تھے۔ ان کے وہ طاقچے اس وقت چھوٹے سے دروازے کے طور پر استعمال ہوتے تھے فصیل پر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں

بنوائی گئیں تھیں۔ اس وقت جنگیں گھوڑوں پر ہوتی تھیں اور سدھائے ہوئے گھوڑے بہ آسانی فصیل عبور کر لیتے تھے۔ جب النگ کے طاقچے اور شہر کے گیٹ بند کر دیے جاتے تو دشمن کی فوجیں داخل نہیں ہو سکتی تھیں اور النگ میں شہر کی زندگی معمول کی طرح چلتی رہتی۔ دشمن محاصرے میں رہتا کہ شہر بند ہے، لیکن اس وقت وہ خود چکر میں آگئے تھے۔ غالباً جب گلی میں داخل ہوئے تو دروازے نما طاقچے کی روشنی سے سوہن حلوے کی مشہور دکان کا بڑا سا بورڈ زمین سے جڑا نظر آ رہا تھا۔

مجھے چھوٹے اور قدرے نالائق تھے، بورڈ تو کیا پڑھتے تھیں اس دکان کے قریب مستقل کھڑی قلفی کی لال سفید ریڑھی کی شناخت پکی تھی۔ انہوں نے نظر پڑتے ہی کھانے کا شور مچا دیا۔ جنید اور منیبہ کے لیے وہ جگہ خاصی دلچسپ اور ایڈو سخر سے کم نہ تھی۔ وہ ان کی انگلی پکڑ کر ان تنگ سیڑھیوں کو عبور کر گئے۔ سیڑھیاں پار کرتے ہی وہ اس بازار سے خاصے دور آگئے

ہوتے ہی فوراً کنڈی لگائی اور بیوی کو جلدی جلدی سارا معاملہ بتا دیا تھا وہ منہ پر انگلی دھرے حیران تھی۔
 ”اے گورے اے (اتنے) جھلے۔ موٹے دنبوں کی عقل بھی موٹی۔“

ڈرائیور نے انہیں ڈرا دھمکا کر جنید کے موبائل سے رفق چچا کا نمبر ملایا اور تاوان گانٹھ دیا۔ جونی موہنی تو خوف زدہ ہو کر ایک چارپائی پر بیٹھ گئے اور دل ہی دل میں اپنی حماقت کو کوستے رہے اور پو، بلی کچھ دیر تو خاطر داری کا انتظار کرتے رہے پھر آہستہ اور پھر زور سے پکارنے لگے۔ بھلا ان چٹوروں کی نیت چائے پالوں سے بھرنے والی تھی؟ وہ تو پیسٹری، پیس، کوکیز کے خیالوں میں اندر آئے تھے۔ انہوں نے جو روئے پیٹنے میں قیامت خیز ہو کر بجائے توبہ۔

کچھ دیر تو ڈرائیور اور اس کی بیوی انہیں ڈراتے دھمکاتے رہے مگر ہر جھڑکی پر ان کی آواز مزید بلند انہیں چپ کروا کر وہ تنگ آگئی اور چلا کر میاں سے بولی۔
 ”کہاں صومالیہ سے اٹھا کر لے آئے ہو، کم بختوں کو۔“

میری شکل دیکھ دیکھ کیرنے (بین) ڈال رہے ہیں۔ دفعان کرو منحوسوں کو۔ چھوٹے چھوٹے قریب قریب گھر، اگر پولیس آگئی تو لینے کے دیئے پڑ جائیں گے۔“

یہ چارہ نیا نیا وارواتا تھا فوراً ہی ڈر گیا۔ سب کو دو دو پھینٹ لگائے جونی کا موبائل، چین موہنی کا پرس چھین دھکے مارتا گاڑی تک لے گیا اور قاسم، بیلا کے ایک سنسان چوک پر اتار دیا جامن کے درخت کی کسٹھلی سی خوشبو تنھوں میں پیچھے ہی بچے اپنا علاقہ پہچان گئے۔ یہاں سے دو گلیاں چھوڑ کر آم کا درخت اس سے آگے پھر ہماری گلی انہوں نے سارا رستہ سمجھا دیا۔ اور بھوک سے ہلکتے روتے پیٹتے وہ دھاڑ سے گھر کے دروازے میں داخل ہوئے تھے۔

وہ دونوں کئی دن تک ایک دوسرے سے خاصے کترائے کترائے رہے۔ غالباً ان پر رفق چچا کے شفٹ ہونے کا سارا عقدہ کھل چکا تھا۔ جہاں سفید گیندوں سے جان چھٹنے پر دل سے خوش تھے وہیں اندر ہی اندر خاصی شرمساری بھی تھی۔ اک دو بچے

کے سامنے جانے پر اپنا لالچی دل آئینہ دکھانے لگتا۔ ایک دوسرے سے معذرت کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے اور موقع اللہ نے دے ہی دیا۔
 آج جنید کی منگنی تھی۔ اماں نے طبیعت کی خرابی کے باعث گجرات جانے سے انکار کر دیا۔ غالباً ان کا صدمہ ابھی تک کم نہ ہوا تھا۔ چند جوڑوں اور روکھے پھکے سامان والی منگنی میں فوزیہ جائے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فوزیہ کی اماں اور بھیا تیار تھے فوزیہ کی جگہ وسیم اور اماں کی جگہ رومانے نمائندگی کرنی تھی۔ وہ ہلکی پھلکی تیار ہوئی۔ بالوں کو جوڑے کی شکل دے رہی تھی کہ وہ پیچھے آکھڑا ہوا۔ کچھ دیر آئینے میں دیکھا رہا پھر بولا۔

”میں تم سے بے حد شرمندہ ہوں، یقین مانو مجھے اماں اور آپا نے زبردستی راضی کیا تھا ورنہ کہاں تم کہاں وہ کینڈین گائے۔“
 ”میں بھی تم پر کبھی اس بیل کو فوقیت نہ دیتی اگر اماں باہر کے خواب نہ دکھاتیں۔“
 ”اچھا۔!“ وہ تھیر سے بولا۔

”پھر اپنے ان بھوری بندریا جیسے بالوں کی قسم کھاؤ۔ آئندہ کوئی تمہیں امریکا کا بھی لالچ دے، مگر مجھے نہیں چھوڑو گی۔“

وہ لفظ بھوری بندریا پر کڑھ کر رہ گئی اور پھر قدرے تحمل سے کہنے لگی۔ ”میرا تم سے وعدہ ہے، مگر تم بھی اپنے سوکھے چھوہارے جیسے بدن میں، چیکے پاؤں جیسے دل کی قسم کھاؤ۔ آئندہ گرین کارڈ کا لالچ بھی تمہیں ڈمگانہ سکے گا۔“

وہ اس کے القاب پر آنکھیں پھیلائے مصنوعی خفگی سے بولا۔

”دیکھو! تم میری توہین کر رہی ہو۔“
 ”تو تم نے کون سا میرے اعزاز میں ترانہ پڑھا ہے۔“

”تم۔۔۔!!!“ اس نے انگلی اٹھائی۔
 ”تم بھی۔!“
 جواباً وہ اسے گھورتی کھلکھلا رہی تھی۔



انسان کا وجود کیسا بے موقع، بے معنی لگتا ہے۔
خاص طور سے وہ انسان جو نظر بٹو کے طور پر ساتھ
ہو۔

جی ہاں کچھ رشتے ہم صرف نظر بٹو کے طور پر ساتھ
لٹکائے پھرتے ہیں ورنہ ہمیں ان کی قطعاً کوئی
ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسے رشتے صرف اس لیے
بھائے جاتے ہیں کہ یہ ہمیں بری نظر سے بچائے
رکھتے ہیں جیسے کوئی سفید چارو چلتی دھوپ میں ساتھ
لیے پھرے کہ لو سے بچالے گی۔ اسی طرح کے یہ نظر بٹو
رشتے ہوتے ہیں جو صرف نظریہ دور رکھنے کا سب
سے آسان اور مفت علاج ہوتے ہیں۔ یہی رشتے جو
آپ کے طعنے تشنہ اور بلا وجہ کے التزام بڑے صبر سے
سہتے ہیں آپ کی ذرا سی تکلیف سہ نہیں پاتے اور اللہ
کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور جب تک آپ
تکلیف دیکھ سے نجات نہیں پالیتے یا صبر نہیں کر لیتے
یہ سجدے میں گرے رہتے ہیں۔
”دعا کیجئے گا۔“

آپ بس اتنا کہہ کر نکلتے ہیں اور یہ پورا دن دعائیں
کرتے گزار دیتے ہیں۔ ان کے آپٹل اپنے لیے
نہیں آپ کی چھوٹی چھوٹی خواہش پر اللہ کے سامنے
حق اور بڑے مان سے پھیلے رہتے ہیں۔ ایسے رشتوں
میں ماں اور بہن سرفہرست ہیں اور ایک خاص لفظ
”بیوہ“ کے اضافے سے ان نظریہ رشتوں میں چار چاند
لگ جاتے ہیں اور میں اس چار چاند کی سند لیے ایک
جوان بیوہ بہن، اپنی اوقات پہنچاتی تھی۔ اس لیے
بھابھی سے ابھنے کا سوچتی تک نہیں تھی۔ مگر اب
کیا کہوں کہ نانہ بدل گیا ہے۔

”وہ دل کی بری نہیں ہے۔ اگر غصے میں کبھی کچھ
کہہ دے تو تم نظر انداز کر دیا کرو۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر
مجھ سے ابھنے نہ آجایا کرو۔“

بھائی صاحب یہ فرماتے ہی اپنے آئی فون پر نظریں
جما کر بیٹھ گئے اور یہ شریفانہ انداز میں تھیلہ کی پکار تھی
یعنی کہ دفعتاً ہو جاؤں۔ شکل گم کر لوں۔ میں خاموشی
سے کمرے سے نکل آئی۔

یہ بھی خوب کہا بھائی صاحب نے۔ ویسے تمام
شادی شدہ بھائی۔ خاص طور سے محبت کی شادی
کرنے والے حضرات اپنی بیوی کے لیے اپنے گھر
والوں کو کچھ ایسا ہی کہتے ہیں۔ ان کی بیگم جب ان کی
بہن یا ماں کے سامنے بڑے زور و شور سے اپنی پسند
سے حاصل کیے گئے شوہر کے خاندان پر بھرپور پچھڑ
اچھال کر دل کی بھڑاس نکال لیتی ہیں، نجانے کون سے
قصور کی سزا دے چکی ہوتی ہیں تو شکایت پہنچنے پر یہ
بھائی صاحب کچھ ایسا ہی فرماں جاری کرتے ہیں۔
”میری بیوی زبان کی تھوڑی تیز ہے مگر دل کی بری
نہیں۔“

میں کہتی ہوں، ہو جاؤ بری، دل میں بھر لو کینہ۔
سب سے نفرت کرو، ہر کسی کو دشمن سمجھو، مگر خدا را
زبان میٹھی کر لو۔ کیونکہ زبان کے گھاؤ بہت جان لیوا
ہوتے ہیں۔ اور کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی
زبان سے نکلے تیر، دل میں پھانس کی مانند چبھ جاتے
ہیں۔ ایسی سوئیاں بن جاتے ہیں جو جسم کے جس حصے
میں چبھتی ہیں۔ پہلے اسے مفلوج کرتی ہیں پھر آہستہ
آہستہ پورے جسم سے جان نکال دیتی ہیں۔ اس بھانگی
دوڑتی، ہستی کھیاتی دنیا میں ایسے بے جان سانس لیتے

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف ایڈفرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- Open Paksociety Page.
- Click Liked.
- Select Get Notifications.
- Select See First.

All Done

Like Liked Message

Get Notifications

Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First

See new posts at the top of News Feed

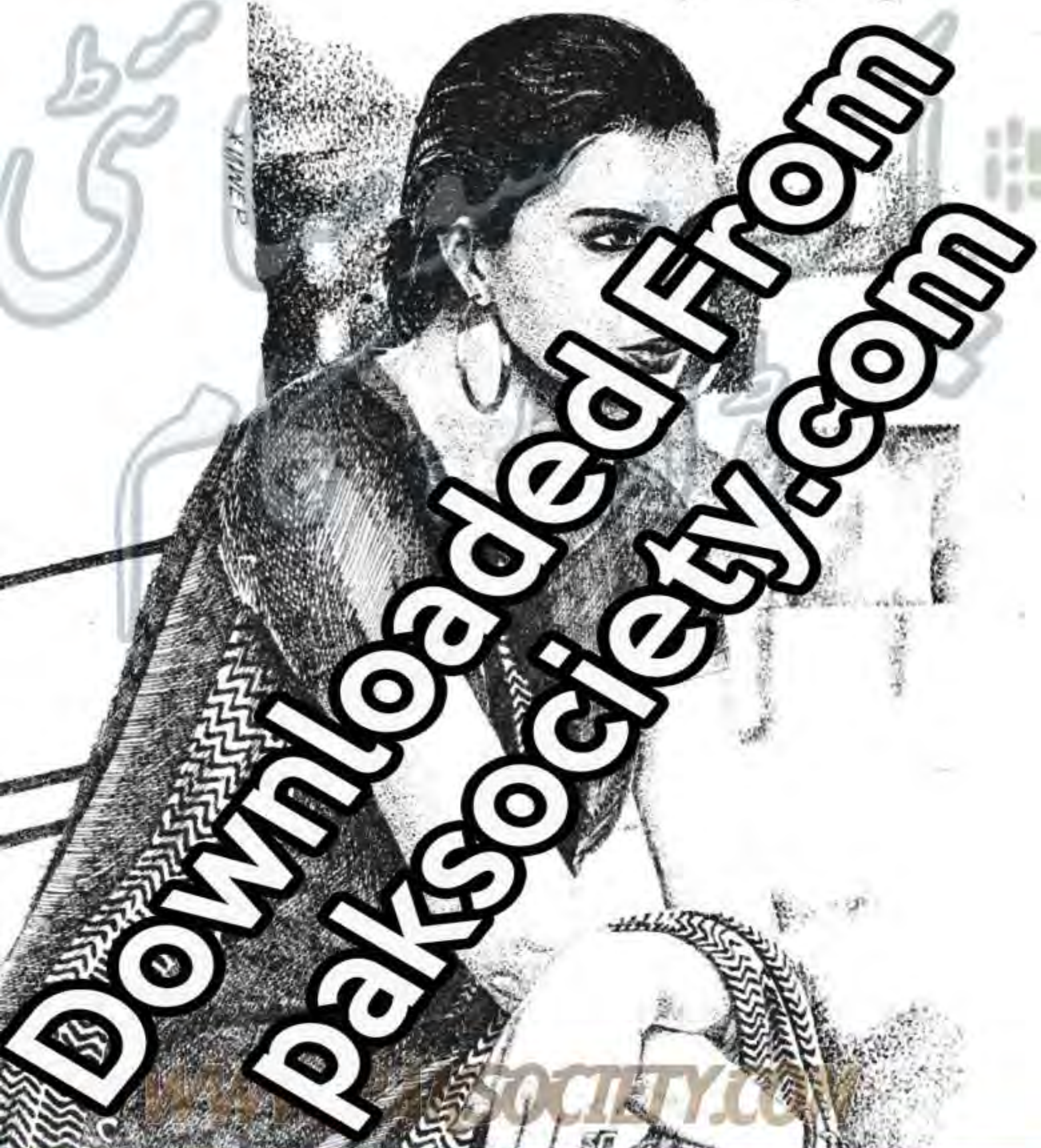
Default

See posts as usual

Unfollow

کوئی اچھائی ہو، یعنی وہ سچی محق بات جب ظہور پذیر ہوتی ہے تو ہمیں بری یا ناپسند ہو سکتی ہے لہذا اس طرح سوچنے میں کوئی برائی بھی نہیں مگر پھر سمجھ داری سے اس کو پرکھنا بھی بے حد ضروری ہے کوئی بھی لمحہ واقعہ یا حادثہ بلا وجہ نہیں ہوتا۔ اس کے پیچھے پوری کائنات نے جال بچھایا ہوتا ہے اور ہم نظر بٹوا اس قدر عقلمند کہاں کہ جو ہو چکا۔ اس پر غور و فکر کر کے تہ

لیکن کبھی کبھی نظر بٹو کی قسمت بھی ستارہ بن کر چمکنے لگتی ہے۔ کہ نظر بٹو زمین پر لوٹتا بیروں کی ٹھوکر کھاتا، کوئی پتھر جو کبھی بھی نرگس ہونے یا بننے کی امید نہ رکھتا ہوا سے بھی دیدہ و رمل جائے۔ اچانک کوئی مہربان ہو جائے۔ اور اللہ تو کہتا ہے کبھی کوئی بات جو ہمیں اپنے لیے اچھی نہ لگ رہی ہو، ہو سکتا ہے اس میں ہمارے لیے



تک پہنچ سکیں، لہذا کبھی کبھی بس اللہ کی مرضی کہہ کر دل کو ہٹالینے کا خیال برا نہیں بلکہ صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے، مگر عادت کسی بھی حالت میں ہو، اچھی نہیں ہوتی اور شاید یہی رب کریم کا۔ کرم ہے کہ جب وہ ہمیں عادی ہوتا دیکھتا ہے تو اچانک ہی وہ ہنسی اٹھی بات کا اعلان فرما دیتا ہے۔

تو وہ اچھی سچ بات اس لمحے میں جب وہ ظہور میں آکر اپنا آپ منواتی ہے تو آپ ایک دم چکر اکر رہ جاتے ہیں۔ ہمیں اپنی سڑی پد بودار اور بے کار حالت کچھ اس قدر پیاری ہو چکی ہوتی ہے کہ اس اچانک تبدیلی کے خوف سے ہی لرزے لگتے ہیں اور سب کچھ اپنے سامنے ہوتے دیکھ کر نظریں چرانے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ آپ کو نظر بٹو کی نوکری سے نکال دینے کا اشتیاق گھر والوں پر غالب آجاتا ہے۔ آپ پوچھ بھی نہیں پاتے کہ میرے پیارے بھائیوں بہنوں میں نے کیا گناہ کیا، اپنی نوکری کو دل و جان سے پیار کیا، ہمیشہ اپنی روکھی سوکھی پر شاد رہی، تم لوگوں سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ میں تو بہت ہی ذمہ داری سے اپنی نوکری کے تمام فرائض سرانجام دیتی رہی ہوں۔ تو کیوں۔۔۔ آخر کیوں مجھے نوکری سے نکال رہے ہو؟ میرے چار چاند مجھ سے کیوں چھین رہے ہو؟

اور یہ جو ”گن“ ہے اس کے پھیر میں سب آتے ہیں۔ جو نہیں چاہتے وہ بھی کر جاتے ہیں، توصیف صاحب کو میں نے کبھی بھی اس نظریے سے نہیں دیکھا تھا اور وہ بچارے پلکیں اٹھاتے ہی نہیں تھے کہ مجھے اندازہ ہوتا کہ ان کی نظریں یا نظریات کہاں کہاں کی سیر کر رہے ہیں لہذا جب ان کا رشتہ میرے لیے آیا تو میں حیران رہ گئی دل میں کہیں کسک ہوئی

کہاں میں انگریزی ادب میں ایم اے ایک اچھے انگریزی اسکول میں انگریزی ادب کی ٹیچر اور کہاں توصیف صاحب ایک میڈیکل اسٹور میں کام کرنے والے۔ گو وہ ایک چار منزلہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور تھا اور یقیناً ”توصیف صاحب کی تنخواہ بھی اچھی ہوگی۔ مگر میں تو مینے ڈیڑھ مینے میں ہی اسٹور کا چکر لگاتی تھی اور

توصیف صاحب سے اپنی جلد کی بیماری کی دوائی لیتی تھی۔ کبھی سرور کی گولیوں کا اضافہ، بس دو چار جملوں کی ہدایات ایسے میں کوئی انسان کس قدر آپ کو جان سکتا ہے؟ یا پسند کر سکتا ہے؟ کیا یہ محض ظاہری شکل و صورت پر مرثیے کی بات ہو رہی ہے یا پھر اس کے پیچھے کوئی باقاعدہ جال پھینکا گیا ہے؟ دل میں کئی بار یاد کرنے کی کوشش کی کہ آخر ان کو میرے بارے میں اس قدر معلومات کہاں سے ملیں اور خاص طور سے اس بات کا یقین کس نے دلایا کہ ان کا رشتہ اگر آیا بھی تو ہمارے ہاں سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی؟

کسی نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ توصیف صاحب کو تمام معلومات بھابھی کے چھوٹے بھائی نے پہنچائی ہیں جو توصیف صاحب کے ساتھ اکثر دیکھا جاتا تھا۔ بھابھی صاحبہ جن کو اپنے خاندان پر بہت مان تھا توصیف صاحب سے کسی بھی طرح کے تعلق یا راہ و رسم کے شک پر ہی چڑ جاتیں، گو دل کی اچھی ہی رہتیں مگر زبان کی بہت بری ہو جاتی تھیں یوں میں نے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

ویسے بھی وہ میرے منہ سے اپنے چھوٹے بھائی کے بارے میں کوئی بھی بات سننا گوارا بھی کہاں کرتی تھیں۔ ان کو شک تھا کہ میں ان کے چھوٹے بھائی کو ان کی شادی کے شروع کے دنوں سے ہی متفرک کر چکی ہوں۔ وہ مجھے بھائی بہن کے درمیان تفرقہ کی وجہ گردانتی تھیں۔ کئی سال ہوئے میں بھی ان کے چھوٹے بھائی سے ہاتھ اٹھا چکی تھی۔ کچھ بھابھی صاحبہ کے ہر وقت کے طعنے اور کچھ اپنی ناکامی، ٹالا نعتی اور نا اہلی نے بھی کسی سے ملنے ملانے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ وہ میرا اچھا، سمجھ دار مگر بہت ہی ننھا سادہ ست تھا۔ اب پتا نہیں کیسا دکھتا ہوگا؟ بھابھی صاحبہ کا چھوٹا بھائی اب اتنا چھوٹا بھی نہیں رہا تھا۔ ہاں جب بھابھی شادی کر کے ہمارے گھر تشریف لائی تھیں تو ہم سب یکسر مختلف صورتوں اور حیثیتوں کے مالک تھے۔ میں نے اپنی پسند سے ایم

شیرنی کی طرح شل رہی تھیں کہ چھوٹا بھائی گھبرایا ہوا سا داخل ہوا۔

”باجی! سوری میں پریشکیل کر رہا تھا کیمسٹری کا تودیر ہو گئی۔ میں سیدھا آپ کے پاس ہی آگیا اسی لیے۔“

چھوٹا بھائی گھبراہٹ میں باقاعدہ ہکلا تا جلدی جلدی بول گیا مگر بھابی صاحبہ کی نشانی نہ ہو سکی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ایک زوردار طمانچہ چھوٹے بھائی کے گل پر جڑ دیا اور پرس اٹھا کر کہتی نکل گئیں۔

”اب تم خود ہی جانا واپس گھر میں نہیں چھوٹوں کی غرضوں انسان۔“

گو ہم چھ بھائی بہن اپنی اپنی اکثر میں ایک دوسرے سے لڑتے بھی تھے اور اکثر امی یا ابو کو لڑائی میں فیصلہ یا انصاف کے لیے بلایا جاتا تھا مگر پھر بھی ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی بھائی یا بہن نے بڑے یا چھوٹے پر ہاتھ اٹھایا ہو۔ امی کو جب غصہ آتا تو وہ خوب مار لگاتی تھیں مگر وہ تو بس امی ہی تھیں۔ باقی کوئی بھی کبھی بھی کہیں بھی اس طرح ذلیل نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں تو اپنے آپ سے اس سے شرمندہ ہو گئی تھی کہ اس کی شرمندگی کا کیا سوچتی رہو چکر ہونے کے خیال کے بعد دوسرا خیال چھوٹے بھائی کے اسکول سے بھوکے آنے کا ہوا۔ پچھرا پچھرا ابھی تو اسکول سے تھکا ماندہ آیا ہے۔ میں نے ایسا ہی ظاہر کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور اس کو اپنے پاس بٹھالیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ اس کی نظریں جھکی رہیں اور وہ پیشین سا ایک طرف دبکا بیٹھا رہا۔ دبلا پتلا سا ڈول لمبائی میں کچھ مجھ سے نکلتا ہوا قد، چہرے پر گوکہ بالوں کے چند ایک خاکے سے ابھرے تھے مگر بچوں کا سا بھولہ پن موجود تھا۔ میں نے اسے بٹھلایا اور کھانا کھانے پر راضی کر لیا۔

امی ہمیشہ کی مصروف اس کو پیار محبت دے کر اپنے کام میں لگ چکی تھیں۔ اب وہ مکمل طور پر میرے حوالے تھا۔ اسے اکیلے لاؤنج میں چھوڑنے کو دل نہ مانتا۔ مجھے اس پر بڑا ہی رحم آتا جا رہا تھا۔ لہذا اس کے ساتھ ہی خود پر جبر کر کے بیٹھی رہی اور تھوڑی ہی دیر

اے انگریزی ادب میں داخلہ لیا ہی تھا۔ اور حوصلے جوان تھے۔ اس زمانے میں بھابی صاحبہ زبان کی بھی بری نہیں تھیں۔ امی حیات تھیں۔ دو یا تین بھائی بہن نمٹائے جا چکے تھے اور اپنے گھروں میں آبلو تھے۔ گھر میں کمرے زیادہ اور لوگ آہستہ آہستہ کم ہوتے جا رہے تھے۔ امی کا لنگر خانہ بدستور جاری و ساری تھا جس کے باعث اکثر ہی کوئی نہ کوئی رشتہ دار گھر کا مہمان ہو یا گھر کا کاروبار بہت اچھے انداز میں چل رہا تھا۔

بھابی صاحبہ جب بھی میکے جاتیں تو ان کو لینے آنے والوں میں — ان کا یہ چھوٹا بھائی ہمیشہ شامل رہتا۔ سیدھا، معصوم سانسوں جماعت کا طالب علم تھا۔ بھابی صاحبہ اس وقت زبان کی بری نہیں ہوئی تھیں مگر ان کے مزاج کی تنگی گلے گلے ظاہر ہوتی تھی۔ آخر کو وہ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں اور اپنے والد کے بے جالاؤ پیار سے (میری نظر میں) کافی بگڑی ہوئی تھیں۔

ایک دن کچھ یوں ہوا کہ انہوں نے گھر سے گاڑی منگوائی۔ ان کو شاپنگ پر جانا تھا اور ہمارے گھر کی واحد گاڑی ان کے شایان شان نہ تھی۔ گاڑی کو آتے تھوڑی تاخیر ہو گئی۔ حسب معمول چھوٹا بھائی ڈرائیور کے ساتھ آگیا تھا۔ اس نے یونیفارم تک نہیں اتارا تھا، شاید اسے اسکول سے لے کر ڈرائیور سیدھا ہمارے گھر چلا آیا تھا۔ میں اس دن چھٹی کر کے بستر کو بڑی مشکل سے چھوڑ کر لاؤنج میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

اکثر سوچتی ہوں کہ کاش! ہمیں کسی خاص لمحے کے وجود میں آنے سے ذرا پہلے بس یہی کوئی ایک دو لمحہ پہلے ہی اطلاع مل جائے۔ ایسے کسی خاص لمحے کو آتا اگر دیکھ لیں تو اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کر لیں گے کیونکہ بے خبری میں جب ہم بہت ہی کم ہمتی سے کسی اور ہی سوچ میں کم ہوتے ہیں۔ یہ لمحے ظہور پذیر ہو جاتے ہیں اور ہم اکثر اوقات ہی بلاوجہ کے چشم دید گواہین کر رہ جاتے ہیں۔ تو میں اس لمحے کو آمانہ دیکھ سکی تھی اور بے خبری میں جکڑی گئی تھی۔ بھابی صاحبہ صبح صبح کر لاؤنج میں

میں ہمیں مشترکہ طور پر پسندیدہ ناول نگار ابن صفی کا سہارا مل گیا۔ میرے پاس ابن صفی کی تمام ہی کتابیں موجود تھیں وہ بڑا متاثر ہوا۔ سچی بھگارت کے لیے میں اسے اپنے کمرے میں لے گئی اور کتابوں میں گم ہونے پر ہمیں وقت کا احساس تک نہ ہوا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ چھوٹا بھائی عام لڑکوں کی طرح لالچیل یا صرف کھیل میں مگن نہیں رہتا بلکہ بہت سمجھ داری سے کھیل اور کتابوں دونوں میں انصاف کرتا ہے۔ ہماری دوستی ہو گئی اس زمانے میں ہر گلی ہر محلے میں ایک چھوٹی سی لائبریری ہوا کرتی تھی جس پر نئی آنے والی ابن صفی اور ان ہی کی طرح لکھنے والوں کے ناولوں اور ڈائجسٹوں کو بروقت لینے کے لیے ہر وقت رش لگا رہتا تھا ہمارے محلے کی لائبریری تھی تو اچھی مگر میرے پہنچنے پہنچتے میری پسندیدہ کتاب کوئی نہ کوئی لے جا چکا ہوتا اور میں بار بار چکر نہ لگاتی تھی ایسے میں چھوٹا بھائی کام آنے لگا وہ نہ صرف ہمارے محلے کی لائبریری کا چکر کاٹتا بلکہ اپنے محلے سے بھی لے کر آجاتا۔ اکثر کسی کتاب کے اچھا ہونے کا سنتا تو میرے لیے مجھ سے پوچھے بغیر لے آتا اور کیا چاہیے مجھے تو چھوٹا بھائی خوب بھا گیا تھا موبائل فون تو موجود نہ تھے لہذا ایک دو دن میں ہی ملاقات ہوتی وہ زیادہ تر اسکول سے میرے پاس آجاتا میں موجود نہ ہوتی تو ایک منٹ بھی گھر پر نہ ٹکنا ٹوٹ جاتا میں محبت سے پیش آتی تھی امی عزت دیتی تھیں بھائی صاحب کو اس کا وجود نظر نہیں آتا تھا۔

میرے نام کے ساتھ باجی کے اضافے کے ساتھ مجھے پکارا جاتا تھا۔ ایک دو بار اس کی کچھ عادتوں کو ٹوکا تو اس نے سدھار لیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میری بات کو اہمیت دیتا ہے۔ اپنے دوستوں کی باتیں اسکول اور گھر کالج کے سننے مستقبل میں کیا کرے گا، کیسا بنے گا، مجھے سناتا تو مجھے خود پر بڑا فخر محسوس ہوتا کہ کوئی ہے جو مجھے اس قدر قابل سمجھتا ہے کہ اپنی ہر بات بتاتا ہے۔ یوں ہونے لگا کہ جس محفل میں ہمارا اور بھائی صاحب کا خاندان شامل ہوتا چھوٹا بھائی میرے ساتھ

ساتھ لگا رہتا میں بھی اس زمانے میں اپنی دھن میں کسی کی پروا کم ہی کرتی تھی ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح کھل مل کر بیٹھ جاتے تھے جیسے پرانے دوست صدیوں بعد ملے ہوں، بھابھی صاحبہ کی گنجی مجھ سے بڑھنے لگی مگر اس وقت وہ کچھ نہیں کر سکتی تھیں کہ امی حیات تھیں اور میں نظریہ نوکی نوکری پر فائز نہیں ہوئی تھی گور پھر وہی ہوا جو خیر سگلی خوش دلی اور خلوص کے ساتھ بیٹھے دو لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے کوئی تیسرا ان کے درمیان شیطان کی طرح آن ٹپکتا ہے۔

فائنل سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ رشتہ آگیا اور ہمیشہ کی طرح امی نے جلد از جلد میری کہانی بھی نمنا دی۔ شادی کے دنوں میں خوشی کے باوجود وہ بھی سی رہتی اور شاید منہ پر بارہ بخت سب کو نظر آتے تھے مگر سب خاموش تھے مجھے کوئی شکایت نہیں تھی بس کسک تھی کہ لڑکیوں کو اس قدر محبت دے کر خود سے علیحدہ کر دینے کی یہ رسم بہت جان لیوا ہے چھوٹا بھائی میری اداسی پر مجھ سے زیادہ اداس تھا ایسا لگتا جیسے میں کالا پانی کی سزا پر جا رہی ہوں میں اسے اداس دیکھتی تو مسکرا دیتی۔ اس کو بھلائی کہ وہ میرے پاس شوہر صاحب کے ہاں بھی آسکتا ہے وہ اب ایک اچھے سے کالج میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا۔

اور ایک بار پھر سے وہ ان دیکھا، انجانا، مخصوص لمحہ دے قدموں میرے سر پر آن گرا اور میں کچھ بھی نہ کر سکی فرق اتنا ہے کہ اس بار میں چشم دید گواہ تو تھی ساتھ میں مقتول بھی تھی مجھے اندازہ بھی نہ ہوسکا کہ کب بھابھی صاحبہ نے میری اور چھوٹے بھائی کی گہری دوستی پر میرے سرال میں کچھ اس طرح بات پھیلانی تھی کہ ولیمہ میں چھوٹا بھائی آنکھوں میں محبت بھرے جذبات اور ہاتھوں میں پھول لیے میرے قریب آیا تو شوہر صاحب نے اسے اسٹیج پر ہی سب کے سامنے بری طرح جھڑک دیا۔

”کیا مسئلہ ہے بھئی تمہارا اس طرح کسی غیر خاتون سے ہاتھ ملایا جاتا ہے کیا؟ جاؤ دوسرے لڑکوں کے

ساتھ بیٹھو!"

میں دنگ رہ گئی اور چھوٹا بھائی گڑبڑاتا اسٹیج سے فوراً اتر کھال سے غائب ہو گیا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہ میرا سگا بھائی نہیں ہے مگر مجھے سگی بہن کی طرح ہی عزت دیتا ہے اور پھر میری شاید آدمی عمر سے بھی کم اس کی عمر ہوگی مجھے اس سے بہت انیت ہے۔"

میں نے گھر پہنچ کر رات کی تنہائی میں شوہر صاحب کو سمجھایا۔ اللہ بخشے شوہر صاحب اچھے انسان تھے مجھے خوش رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے مگر جوان کی سمجھ میں آچکا تھا وہ برداشت نہ کر سکے بھابھی صاحبہ کی بات مجھ تک پہنچائی مجھے اور دکھ ہوا کہ میرے متعلق میرے ہی سسرال میں بھابھی صاحبہ نے ہم سب سے چھپ کر کس قدر غلط باتیں کیں دوسرے تیسرے دن میکے گئی تو امی اور بھائی صاحب نے بھی واقعہ کانٹھ لیتے ہوئے مجھے سختی سے ہدایات جاری کر دیں کہ اگر میرا شوہر چھوٹے بھائی سے ملنے پر خوش نہیں تو مجھے بھی خود پر قابو پانا چاہیے میں چپ ہو گئی۔

ایک دوست کے پھڑنے کا غم کیسا ہوتا ہے؟ وہ بھی یوں کہ آپ نے دوست کے بے قصور ہونے پر بھی خود سے اسے الگ کرنے کا ایک طرفہ فیصلہ صادر کر دیا ہو چھوٹا بھائی ایک دو بار مجھے کبھی میرے میکے یا پھر کسی دعوت میں مل بھی جاتا تو میں اسے نظر انداز کرتی نہیں چاہتی تھی کہ وہ میرے پاس آئے اور پھر مجھے اسے کنارے کہ میں اس سے بات کرنا نہیں چاہتی لہذا ہر ممکن حد تک اس کے ساتھ سرد مہری برتنے لگی اسے خود بھی اندازہ ہو گیا تھا۔ اب وہ بھی تو ایک لمبا صحت مند سمجھ دار نوجوان ہو چکا تھا مگر پھر بھی وہ دنیا کی تنگ نظری اور تنگ دلی کو سمجھا نہیں تھا پتا نہیں اس دن اسے میری اس قدر ضرورت کیوں تھی۔

وہ جانتا بھی تھا کہ اب ہم ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے مگر پھر بھی میرے میکے پہنچنے کی خبر پر چلا آیا اتفاق سے بھابھی صاحبہ اپنے میکے گئی ہوئی تھیں ہم

سب کھانے پر بیٹھے ہی تھے کہ اس کے آنے پر خوش گوار ماحول پر اوس بڑ گئی۔ وہ کسی کے بولنے سے پہلے ہی مجھے مخاطب کر چکا تھا۔

"مجھے آپ سے اکیلے میں بات کرنی ہے بہت ضروری پلیز بس چند لمحوں پلیز۔"

وہ اس طرح گھگھکیا کہ میں پریشان ہو کر جھٹ سے نوالہ چھوڑ چھاڑ کھڑی ہو گئی جیسے کہہ رہی ہوں کہ "چلو"

میرے دل میں اس کی جگہ ابھی تک دھڑکی ہی موجود تھی جیسے کہ وہ امتحان میں کوئی خالی کرسی خالی نشست جس کو بیٹھنا تھا وہ غیر حاضر تھا اور اس کی جگہ پر کوئی دوسرا کبھی بھی نہیں بیٹھ سکا کہ وہ نشست خالی کرسی بس اس کے لیے ہی وجود میں لائی گئی تھی ہم اپنے دلوں میں کیسی کیسی خالی نشست لیے ان کے حقیقی مالکوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور وہ کبھی نہیں ملتے مل بھی جائیں تو وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ میری حالت کو دیکھتے ہوئے شوہر صاحب سے برداشت نہ ہوا۔

"نکلو یہاں سے یہ میرا سسرال ہے ورنہ ابھی دھکے دے کر نکالتا میں چلو بھائی یہاں سے۔" شوہر صاحب کا پارہ چڑھنے لگا تو بھائی صاحب اور باقی سب مرد حضرات بھی حرکت میں آگئے امی نے بیچ بچاؤ کرایا۔ "ارے ارے بچہ ہے کیا ہو گیا ہے تم سب کو؟"

پھر امی چھوٹے بھائی کو سمجھا کر گھر سے باہر چھوڑ آئیں میرا دل ڈوب رہا تھا اور شوہر صاحب کا مزاج ساتویں آسمان پر پہنچ چکا تھا۔ امی اور گھر والوں کے سامنے تو سب ٹھیک رہا مگر گھر پہنچ کر انہوں نے مجھے خوب لتاڑا کمرے میں پہنچتے ہی وہ شروع ہو گئے۔ میں سب کچھ سن تو رہی تھی مگر میرا دھیان صرف چھوٹے بھائی پر لگا ہوا تھا۔ اللہ جانے اسے کیا بات کرنی تھی وہ کس قدر گھبرایا ہوا تھا اور کیسا مایوس لگ رہا تھا پتا نہیں گھر میں اس سے کوئی بات کیوں نہیں کرنا کہ وہ اپنے دل کی کہ سن کر سکون حاصل کر لے۔

میں اس کے لیے صدق دل سے جائے نماز بچھا کر بیٹھ گئی مجھے جائے نماز پر رونا دیکھ کر شوہر صاحب بھی

خوار بن جانے کی تمنا کرتے ہیں، ہمیں ذرا شرم نہیں آتی میں میکے آگئی اور پھر جب نظر بٹو کے رہتے رہا تو ہو گئی تو کبھی کبھی دل میں مجھے چھوٹے بھائی کا خیال آتا تھا، کیا پتا وہ بھی میری خبریں اسی طرح لوگوں کی نظروں سے بچ کر پوچھتا پھرتا ہو گا سے پتا چلا ہو گا تو اس نے کیا سوچا ہو گا؟

ہو سکتا ہے کہ خس کم جہاں پاک کہہ کر قہقہہ لگایا ہو یا ہو سکتا ہے تنہائی میں دکھ منایا ہو، توصیف صاحب کے ساتھ چھوٹے بھائی کی دوستی کا مجھے معلوم ہوا تو مجھے ایک دم غصہ آگیا بڑا آیا مجھے بے چاری پر رحم آرہا ہے اسے احسان کر رہا ہے کہ تم نے تو ساتھ نہ دیا میں ابھی تک تمہارا بھلا سوچتا ہوں۔ پہلے انکار کرنے کا سوچا، مگر پھر اپنے گھروں میں آسودہ اور خوشحال بھائیوں اور بہنوں کا خیال آگیا اور پھر ہم نظر بٹو وقت پڑنے پر بڑی آسانی سے اپنی ذات کی نفی بھی تو کر سکتے ہیں۔ میں نے خود پر قابو کیا، گزرے زمانے کو یاد کیا جب میں نظر بٹو نہیں تھی اور خود پر اپنی زندگی پر مان کرتی تھی، مگر اب یہ ماورائی تخیلات کتنے دن تک دل بہلا میں گئے ایک ہی جھٹکے نے سب کچھ چھین لیا تھا اور بچا ہی کیا جس کے لیے حفاظت پر مامور سوچ کے گھوڑے دوڑاتی پھوں سو میں نے تھک ہار کر سر خم کیا۔ وہ بے بھی کچھ کہنا سنا وہاں ہوتا ہے جہاں سماعتیں مختصر ہوں زبانیں نشتر نہ چلائی ہوں۔

توصیف صاحب خلاف توقع ایک اچھے انسان ثابت ہوئے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ دو منزلہ مکان میں رہتے تھے۔ ہمارا اوپر کا پورشن تھا جو کہ آدھا بتا ہوا تھا لہذا دن بھر خوب دھوپ سے واسطہ رہتا۔ آرام نہ نہیں تو بہت زیادہ بے آرامی بھی نہیں تھی وہ تین کمرے اپنی ملکیت تھے۔ یوں پتا گھر مجھے ایک بار پھر سے بھا گیا تھا مگر شہلا۔۔۔؟

اور وہ بھی کیا لمحہ ہوتا ہے جب آپ اپنی ہی جگہ پر اپنا ہی کام کرتے کسی اور کو ملاحظہ کرتے ہیں، توصیف صاحب کی ایک سترہ اٹھارہ سال کی بڑی بیٹی تھی سی لڑکی تھی جس کو دیکھتے ہی مجھے اس پر بہت رحم آیا شہلا،

نرم پڑ گئے، گو مجھے ان کے غصے کی کوئی پروا نہ تھی۔ میں تو چھوٹے بھائی کے لیے۔ اللہ کے سامنے رودھو رہی تھی میں شوہر صاحب کو اپنے اور چھوٹے بھائی کے پاک صاف رشتے پر کبھی بھی متکبر نہ کر سکوں گی اور نہ میں دنیا یا شوہر صاحب پر تنگ نظری کا کوئی الزام ہی دھر سکتی ہوں۔ دنیا اور اس کے باسی ایسے ہی ہیں جس بات کو سمجھ نہیں پاتے اسے غلط قرار دے کر خود کو بہلا لیتے ہیں اور دماغ استعمال کرنے سے کتراتے ہیں مگر میں اللہ کے سامنے تو کھلے دل سے اپنے دوست کے لیے پریشان ہو سکتی ہوں۔ وہ میرا اللہ تو جانتا ہے ہماری نیت اور دل کے حال سے واقف ہے۔

مجھے دکھ تھا تو اتنا کہ اگر اس رات میں نے چھوٹے بھائی کو مایوس نہ کیا ہوتا تو وہ خود کشی جیسا انتہائی قدم نہ اٹھاتا۔ اس کو انتہائی نگہداشت میں کئی دن گزارنے پڑے، بڑی تکلیف اٹھائی اور میں ایک دن بھی اس سے ملنے کا تصور تک نہیں کر سکی، مجھے اپنی بزدلی پر صدمہ تھا اور شرمندگی بھی، زیادہ شرمندگی اس بات پر کہ خبر ملتے کے ساتھ ہی جو میری حالت غیر ہوئی اور سسرال میں سب کے سامنے بھی آنسوؤں پر قابو نہ کر سکی تو چہ میگوئیاں کچھ اندر ہی اندر غیبت شکایتیں۔

ایسی دوڑی آئیں، سب کو اطمینان دلایا، مجھے بھی سختی سے ہدایات دیں، اس کے بعد دن بہت کٹھن گزرے میں چھوٹے بھائی کے متعلق سنی سنائی، آڑنی پڑتی خبروں کا پیچھا کرتی رہتی، مگر پھر ہم دوبارہ نہ مل سکے۔ وہ پڑھائی مکمل کرنے باہر چلا گیا اور میں بھی اپنی زندگی سے اچھ گئی۔ کیسے کیسے ٹھیل کھیلتا ہے یہ وقت، مجھے بھی زمین پر دو لٹا واپس میکے میں پہنچ گیا۔

شوہر صاحب کے اچانک حادثے اور پھر ان کے انتقال پر میرے لیے تعزیتی پیغام بہت تھے مگر کوئی باقاعدہ ساتھ دینے والا نہ ملا، کوئی غم خوار نہ ہوا اور کیسی عجیب بات ہے کہ جس انسان کے دکھ میں ہم نے اسے سننے کی کبھی کوشش نہ کی ہو اسی سے اپنے دکھ پر اپنا غم

توصیف صاحب کی اکلوتی بیٹی توصیف صاحب کے بڑے بھائی اور ان کے خاندان کے لیے نظر بٹو تھی چند دن تو سب کو پرکھنے اور غیر جانب داری سے گزارا کرنے میں لگائے پھر مجھے غیرت آنے لگی

یہ شہلا کو نوکر کی طرح چھوٹے چھوٹے کام کے لیے بلاتے ہیں؟ شہلا پودوں میں پانی کیوں دے پانی کی موٹر کیوں چلائے؟ بند وہ ہی کیوں کرے مہمانوں کو چائے ہمیشہ وہی کیوں بنا کر دے؟ کہیں جانے سے چند منٹ پہلے تک وہ ہی سب کے کپڑے کیوں استری کر کے دے رات کو دیر سے آنے والے اس کو فون کر کے نیچے آکر دروازہ کھولنے کو کیوں کہتے ہیں؟ اور ایسے بہت سے سوال۔ جو میں توصیف صاحب سے کرتی جاتی۔ وہ بے چارے کبھی ندامت سے سر جھکاتے کبھی ہنسی مذاق میں اڑا دیتے۔

ایک دن میں اسکول سے تھکی ہاری گھر میں داخل ہوئی ہی تھی کہ جیٹھانی صاحبہ کی چیخ و پکار سن کر پیرٹھیوں کے پاس ہی رک گئی۔ وہ شہلا پر برس رہی تھیں۔ ذرا سی دیر میں ہی اندازہ ہو گیا کہ قصور یہ تھا کہ دودھ والا آیا تھا اور دے بغیر لوٹ گیا شہلا شاید اوپر تھی جبکہ اصولاً ”اسے نیچے ہونا چاہیے تھا تاکہ دودھ لے سکے

میں ہمت کر کے اندر لاؤنج میں پہلی گئی جہاں یہ سب تماشا چل رہا تھا جیٹھانی حلق پھاڑ پھاڑ کر چلاتی چلی جا رہی تھیں۔ شہلا اسی قدر کونے میں دبکی چلی جا رہی تھی خود کو بے بس پاتی تھیں تو خود ایک نظر بٹو کے رتبے سے ابھی چند دن ہوئے ترقی پا کر اس باعزت مقام تک پہنچی تھی اور پھر ماں کا اپنی اولاد کے لیے دشمن کے سامنے سینہ سپر ہونا یا متناجیسے کسی جذبے سے تو میں آج تک نا آشنا ہی تھی لیکن وقت ایک بار پھر اپنی چال چل گیا جیسے کسی پری نے غیب سے میرے سر پر جادو کی چھڑی گھمائی اور میں نے بے اختیار بڑھ کر شہلا کو بانسوں میں بھر لیا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ اللہ کو مجھ سے کیا درکار تھا۔ وہ مجھ نظر بٹو جیسے انسان سے کیا کام کروانا چاہتا تھا۔

میرے اس عمل پر جیٹھانی کو پر یک لگ گئے شہلا سکی بھر کر مجھ سے چٹنی کھڑی تھی۔ میں اسے اسی طرح خود سے چمٹائے اور لے آئی۔

”اب تم ان لوگوں کا کوئی کام نہیں کرو گی پوچھیں تو صاف کہہ دنا کہ امی نے منع کر دیا ہے ان سے بات کر لیں سمجھیں؟“

میں اپنے سخت اور بارعب لہجے کو سن کر خود ہی حیران رہ گئی تھی۔ شہلا کی حیرانی کو کیا خاطر میں لاتی۔ ابھی میں تو اپنی نوکری سے ہمیشہ ہی وفادار رہی ہوں کام پسند ہونہ ہو کر پوری جانفشانی اور محنت سے ہوں لہذا اب شہلا کی ماں کا کام بھی دنیا دیکھے رات میں توصیف صاحب کو سارا احوال سنایا تو ان کے دل میں پہلی بار شاید میرے لیے اطمینان اور اعتماد پیدا ہوا۔

انہوں نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ میری بھابھی صاحبہ کا چھوٹا بھائی شہلا کو بہت پسند کرتا ہے لڑکا جلد ہی نوکری کے سلسلے میں کینیڈا جا رہا ہے اور جانے سے پہلے شہلا سے بات چکی کرنا چاہتا ہے مگر توصیف صاحب بات بڑھاتے ڈرتے ہیں۔ میں نے حیرانی سے پوچھا ”جب انہوں نے میرے لیے پیغام بھیجا تھا تو ان کو ڈر کیوں نہیں لگا تھا؟“

”وہ دراصل۔۔۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ بہت مختلف شخصیت ہیں۔ آپ میں غرور نہیں محبت دیکھتی ہیں رتبہ شکل و صورت نہیں ہمدرد ہیں مشکل میں ہیں مگر پھر بھی ہمت سے جی رہی ہیں۔ آپ کے ساتھ میں اور میرے ساتھ آپ مجھ سے نباہ کر لیں گے“

انہوں نے اپنے انہی جھجکتے لہجے میں جواب دیا میرے دل پر لگ گئی۔ میں کہاں کی ہمدرد کہاں کی ہمت والی ہوں میں تو وقت پڑنے پر دوستوں کو تنہا چھوڑ جاتی ہوں۔ رتبہ شکل و صورت محبت خلوص کیا میں تو کچھ بھی نہیں دیکھتی۔ بھاگنے پر آؤں تو سب کچھ ہی نظر انداز کر کے بھاگ کھڑی ہوتی ہوں۔ توصیف صاحب کچھ سوچتے ہوئے پھر گویا ہوئے تو میں چونک کر متوجہ ہو گئی۔

”آپ کو شاید پتا ہو گا کہ ایک لڑکے نے ایک باریکی

کوئی آٹھ نو سال پہلے خودکشی کی کوشش کی تھی آپ جانتی ہیں وجہ کیا تھی؟

میرا دل ڈوبنے لگا سانس بے قابو ہو گیا۔ کیا پھر وہی کہانی دہرائی جائے گی۔ کیا پھر مجھے آزمایا جائے گا۔

”اصل میں لڑکابت کرنے میں ہکلا تا ہے۔ اس

کمزوری کی وجہ سے بہت احساس کمتری تھا، مجھ سے

دوستی کی وجہ یہی تھی کہ میں نے اسپینج تھرائی میں

کورس کیا ہوا تھا اور کبھی ایک ڈاکٹر کے پاس کام کرتا تھا

جہاں ایسے ہی بچے آتے ہیں۔ خودکشی کے اقدام پر

اس کو ڈاکٹروں نے باقاعدہ بحالی صحت یعنی

(Rehabilitaion) کے لیے ہمارے پاس بھیجا تھا

گو کہ عمر کا اتنا چھوٹا نہیں تھا مگر مجھے یہ بچہ بہت سما ہوا

اور ڈراڈرا سا لگا۔ گھر میں بڑے بھائی بہن بہت مذاق

اڑاتے تھے اور اس بے چارے کا دل دکھاتے تھے۔

ماں باپ کے رویوں میں لاروائی تھی۔ میں محبت

سے پیش آیا تو وہ مجھ سے مل گیا۔ تھوڑے ہی دنوں

میں اس نے خود کو سنبھال لیا اور پڑھنے باہر چلا گیا۔

توصیف صاحب سانس لینے رکے ہی تھے کہ

میرے خیالات کی دوسرہ نکل۔

ہکلا تا ہے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میرے سامنے تو

کبھی بھی نہیں ہکلا یا۔ ہم نے کتنی ہی باتیں کی۔ کئی

بار ایک دوسرے کے ساتھ کئی کئی گھنٹے رہے اور کتنی

ہی بار ہم دونوں پڑھی ہوئی کتابوں کے اوپر اپنی اپنی

رائے دیتے۔ اس کے لہجے کی ہکلاہٹ آج تک مجھے

کیوں نہ محسوس ہوئی۔ نہیں میں نہیں مان سکتی وہ

ایک بار بھی میرے سامنے نہیں ہکلا یا وہ تو بڑی رواں

اور شستہ اردو میں بات کیا کرتا تھا۔

”اصل میں اس دن بھی اس کی اکلوتی بڑی بہن

یعنی آپ کی بھابھی صاحبہ نے بڑا ظلم کیا تھا کہ اسے

بہت کھری کھری سا کر اس کے ہکلانے پر مذاق اڑایا

تھا۔ خیر یہ سب تو وہ کرتی ہی تھیں مگر اس دن وہ کچھ

زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ گھر میں اکیلا تھا۔ تو بس

ایسے میں کوئی سننے والا سمجھانے والا مل جاتا تو شاید

اسے ایسا قدم نہ اٹھانا پڑتا، مگر کم عمر تھا ناں تو بس کچھ

زیادہ ہی دل پر لے گیا۔“

یہ کہتے ہوئے توصیف صاحب نے مجھے بہ غور دیکھا

اور میں سمجھ گئی کہ اب وہ لمحہ آنے کو ہے۔ شاید پہلی

بار مجھے اس مخصوص لمحے کے آنے سے پہلے خبر ہو گئی

تھی۔ میں تیار ہو گئی۔ خود کو ہوشیار کر لیا پھر سے چشم

دید گواہ میں ہی بننے جارہی تھی۔ پتا نہیں مقتول بھی

میں ہوں یا۔

”اسے کچھ کچھ آپ کا بھی دکھ تھا۔“

توصیف صاحب نے دھیرے سے ٹھہر ٹھہر کر بات

مکمل کی۔

”میرا؟“ میرے منہ سے تو نکل گیا تھا مگر میں جانتی

تھی کہ سچ کا ایک پہلو تو یہ بھی ہے۔

”ہاں! آپ کوئی غلط مطلب نہ نکالیں۔ اس نے بتایا

تھا مجھ سے کچھ نہیں چھپاتا، آپ دونوں کی دوستی ایک

دوسرے کے ساتھ کتابوں پر بھرے سب کچھ بتا رہا

ہے اور پھر اس نے بڑی ہی عجیب بات بتائی۔“

توصیف صاحب پھر سے رک کر مجھے دیکھنے لگے۔

میں نے نظریں جھکا لیں۔ وہ پھر بولے۔

”اس نے بتایا تھا کہ آپ کے ساتھ وہ کبھی بھی

نہیں ہکلا یا۔ پہلی ہی ملاقات سے جیسے آپ کے ساتھ

ہوتے ہوئے اس کی خود اعتمادی بحال ہو جاتی تھی، تمام

الفاظ جیسے خود بخود اس کی زبان سے پھسلنے چلے جاتے۔

وہ خود بھی بڑا حیران ہوتا پھر چند دنوں بعد اسے آپ سے

بات کرنا اچھا لگنے لگا اور آپ سے ملنا ضروری سمجھنے

لگا۔“

میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ ہم بہت سے

لوگوں سے ملتے ہیں ہر کوئی ہماری کوئی نہ کوئی ضرورت

پوری کر رہا ہوتا ہے۔ کبھی جان کر بھی انجانے میں

اصل قدر دان تو وہ ہے جو اپنی ضرورت پورا کرنے

والے کو نہ صرف پہچان لے بلکہ اس کا احسان مند بھی

ہو۔ وہ تو ایسا ہی کوئی قدر دان نکلا مگر میں کس قدر کند

ذہن نکلی کہ ابھی تک نہیں سمجھ پائی تھی میں۔

بے چین ہو گئی اور جلدی میں محفل برخاست کرنا چاہتی

تھی کہ توصیف صاحب نے ایک اور انکشاف کر دیا

زندگی کے اصول کچھ اور ہی ہیں بھائی صاحب کے کمرے سے ناکام باپوں سر جھکائے نکل ہی رہی تھی کہ بھابھی صاحبہ آئی نظر آئیں میں نے خود کو سنبھالا نوکری کا سوال ہے بھابھی صاحبہ بولیں۔

”جاری ہو؟ کھانا کھا کر جاتیں؟ اچھا چلو جیسے تمہاری مرضی میں اتنا کہنا ہے کہ تو صیف بھائی کو سمجھا دیتا ہمارے خاندان اور ان کے خاندان میں کافی فرق ہے یہ رشتہ ممکن نہیں۔“

میں اپنی نوکری وفاداری سے کرتی ہوں اپنا کام بروقت ہر حال میں پورا کرتی ہوں اور اب میری نوکری نظر بٹو کی نہیں بلکہ ایک ماں کی تھی اور شاید ایک دوست کی بھی میں نے گلا کھنکھار کر ممتا اور دوستی کے زعم میں جواب دیا۔

”ہاں خاندان میں فرق واضح ہے مگر خاندان کا ایک جیسا ہونا مشکل و صورت کا اچھا ہو پیسہ جائیداد یہ سب کوئی نانے کا آلہ نہیں ہیں جو ناپ تول کر جڑنے والے انسانوں کو بتا دے کہ اس کے ساتھ تمہارا صحیح جوڑ ہے۔ یہی تمہارا دوست بننے کا اہل ہے یہی تمہاری مدد کو دوام بخشنے کا وہ بس ایک نظر بے خیالی میں کہا گیا کوئی جملہ یا پھر کسی کے ساتھ سے خود اعتمادی محسوس کرنا۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے اور کچھ ایسے قدر دان بھی اسی دنیا میں پائے جاتے ہیں جو اپنی ذات کو مکمل کرنے والے کو دل سے لگانا اور آنکھوں میں بسانا جانتے ہیں اتفاق ہی سمجھیں کہ آپ کا چھوٹا بھائی ایسے ہی قدر دانوں میں شامل ہے میں آپ سے اجازت لینے نہیں آئی تھی میں تو صرف اطلاع دینے آئی تھی کہ آپ کا خاندان شادی کی تیاری شروع کر دے۔“

بھابھی پر کیا گزری یہ دیکھنے کے لیے میں وہاں رکی نہیں تھی۔

”شہلا اس سے ٹیوشن لیتی تھی، کبھی کبھار کوئی کتاب وغیرہ کے تبادلے بھی ہوئے ہوں گے جب اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ میاں تم تو اس قدر اونچے خاندان کے پڑھے لکھے خوب صورت جوان اور کہاں ہم بے چارے زمین سے لگے ہوئے فقیر تو اس نے جذباتی ہو کر بتایا کہ زندگی میں دوسری بار اس کی خود اعتمادی بحال ہوئی ہے آپ کے وقت میں وہ مجبور تھا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا مگر اب۔“

تو صیف صاحب خاموش ہوئے تھے کہ میرے منہ سے نکل گیا۔

”زمانہ بدل گیا ہے۔“ ہم دونوں مسکرائے۔ ایک دو دن بعد شہلا سے اس کی مرضی معلوم کر کے میں ڈرتے ڈرتے بھائی صاحب کے گھر پہنچ گئی۔ شروع کے چند لمحے اچھی آؤ بھگت کی گئی اور پھر سب اپنے کام و دھندوں میں لگ گئے۔ میں بھابھی صاحبہ کے پاس پہنچ گئی۔ ان کو احوال بتایا۔ چھوٹے بھائی کی پسند بتائی شہلا کی تعریف کی کبھی ہوئی پڑھنے میں بھی تیز شکل و صورت میں بھی اچھی اور کیا چاہیے؟ بھابھی صاحبہ پھر سے زبان کی بری ہو گئیں مجھے کھری کھری سناتے لگیں۔

”شکل دیکھی ہے ان لوگوں نے آئینے میں اوقات بھول گئے ہیں وہ لوگ اپنی میرے معصوم بھائی کو محبت کے جال میں پھانس لیا ہے۔ اور غلا کر اب شادی بھی کرنا چاہتے ہیں۔ ہم جیسے لوگ اتنا نہیں کرتے۔“ وہ نخوت سے شروع ہو چکی تھیں۔

مجھے بڑی حیرانی ہوئی خود محبت کی شادی کر لیں تو ٹھیک اپنے بھائی سے کوئی لڑکی محبت کی شادی کرنا چاہے تو ور غلایا گیا ہے پھانس لیا ہے جیسے سنگین الزام وہ خاندان جو منہ کے لیے بالکل ٹھیک لگا اپنے بھائی کے لیے چھوٹا کتر ہو گیا؟

وہ جو کہتے ہیں کہ مسلمان کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی بہن کے لیے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے مگر یہ سب تو کہانیوں کی باتیں ہیں،



”یہیں پہ تو رکھے تھے اب نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں۔“
 وہ ہیل چیئر کو گھسیٹتے ہوئے انہوں نے بیڈ روم سے کچن تک کا فاصلہ طے کیا تھا۔ کچن میں رکھے مائیکروویو کے اوپر ہاتھ پہنچنا مشکل تھا مگر جیسے تیسے کر کے پہنچ ہی گیا تھا۔ ان کے ہاتھ سے وٹامن کی شیشی لڑھک کر نیچے جا گری تھی مگر مطلوبہ چیز میسر نہ آسکی، انہوں نے کچن کی مختلف درازوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔

صائمہ اقبال

سنگاتی



”درد کم ہو جائے۔“
انہیں ہسپتال اور اس کے ماحول سے نفرت تھی
اسی لیے وہ آخری حد سے بھی آگے جا کر اس درد کو
برداشت کرنا چاہتے تھے۔



لندن کے اس مصروف علاقے میں زیادہ تر ایشیائی
آباد تھے۔ انہوں نے اپنی تنہائی ہی کی وجہ سے یہاں گھر
خریدا تھا۔ گلاس وینڈو سے نظر آتا باہر کا منظر اور
گزرتے لوگ ان کا دیکھنا مشغلہ تھا، کتنی کتنی دیر وہ
اس کھڑکی میں بیٹھے نیچے دیکھتے رہتے۔ شوگر کی وجہ سے
ایک ٹانگ سے محروم ہو چکے تھے اور دوسری ٹانگ میں
دردنا قابل برداشت حد تک بڑھ گیا تھا۔

”فریج! تمہارے ڈاکٹر ہونے کا مجھے کیا فائدہ ہوا۔“
درد سے تڑپتے ایک شکوہ ان کے لبوں سے آزاد ہوا تھا۔
ان کی بیٹی ڈاکٹر تھی اور وہ دو اکو ترس رہے تھے۔
فریج شادی شدہ تھی۔ اس نے ان کی مرضی کے
خلاف ایک بال بچوں والے آدمی سے شادی کر لی تھی
۔ دو بچوں کا باپ ان کی بیٹی کو خوش رکھ رہا تھا یا نہیں
لیکن وہ خود بالکل خوش نہیں تھے۔

وقت اپنے آپ کو دہراتا ہے اور دہرا رہا تھا۔ انہوں
نے بھی تو فائزہ سے دوسری شادی کی تھی۔ فائزہ سے
ان کی ملاقات لندن میں ایک سیکیٹریس ہوئی تھی اور
پہلی ملاقات ہی میں دل ہار بیٹھے تھے فائزہ سے دوسری
شادی کے وقت ان کی پہلی شادی سات سال پرانی ہو کر
کھڑے لائن لگ چکی تھی ان سات سالوں میں ان کے
صرف دو چکر پاکستان کے لگے تھے۔

نعیمہ ان کے والدین کی پسند اور ان کی فرسٹ کزن
تھی جسے انہوں نے کبھی بھی قابل اعتنا نہ سمجھا تھا اور
بیوی بن کر تو اس نے ساری کشش ہی کھودی تھی۔
نعیمہ ان کے والدین کی خدمت گزار تھی اور جتنا عرصہ
وہ پاکستان رہے اس نے ان کو مکمل آرام پہنچانے کی
کوشش کی تھی مگر انہیں خدمت گزار بیوی سے چڑ
تھی۔ کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی دائرے میں

”لخت ہے بھی۔ اب کیا کروں، کہاں
ڈھونڈوں۔“ سر پر ہاتھ مارتے ہوئے تأسف کا اظہار
کیا۔ اب ان پر چڑچڑاہٹ طاری ہونے لگا تھا۔
”یہاں بھی نہیں تو کہاں ہو سکتی ہے دوا۔“

انہوں نے وہیل چیئر گھسیٹ کر دوبارہ کچن سے بیڈ
روم تک کا سفر طے کیا تھا۔ داہنی طرف کی دروازہ پہلے
ہی کھنگال چکے تھے ایک بار پھر اسی کی تلاشی لی جا رہی
تھی۔

”ہائے“ ٹانگ میں درد تو تھا ہی اب پیٹ میں بھی
اینٹھن ہونے لگی تھی۔ اتنی دیر سے وہ درد کی دوا ہی کی
تلاش میں تھے۔ جواب بھی تک مل کے ہی نہ دی تھی۔
”فریج! کو فون کرتا ہوں“ آکر دیکھ لے یا کم از کم
میرے لیے کیسول ہی لیتی آئے۔“

انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کا نمبر ملایا۔ دیر تک بیل
ہونے کے بعد بھی فون نہیں اٹھایا گیا تھا فون بج بج کر
خود ہی بند ہو گیا تھا۔ دوسری طرف وہی سکون تھا جس
کے وہ عادی تھے۔

”اس نے بتایا تو تھا کہ اس کی کانفرنس ہے اور وہ
امریکہ جا رہی ہے۔ مصروف ہوگی شاید خود ہی فون کر
لے۔“

انہیں یاد آیا کہ دو دن پہلے ہی تو ان کی فریج سے
بات ہوئی تھی۔ ”کیسا بھلکر ہوتا جا رہا ہوں۔“
خود کو کوستے ہوئے انہوں نے فون بیڈ سائیڈ ٹیبل پر
پٹھ دیا۔

”ہائے مر گیا۔“ درد کی شدید لہر نے ایک دم ہی ان
کو تڑپا دیا تھا۔ وہیل چیئر بیڈ کے ساتھ جوڑتے انہوں
نے خود کو بیڈ پر گرالیا۔ وہ اونچی آواز میں بچوں کی طرح
واویلہ کر رہے تھے۔ شام تک اس درد میں ناقابل بیان
حد تک اضافہ ہو چکا تھا۔ مگر فریج کا فون ابھی تک نہیں
آیا تھا۔

”اب کیا کروں“ اسٹیو کو ہی فون کرتا ہوں۔“
انہوں نے سیل ہاتھ میں پکڑا۔
”یا تھوڑی دیر اور انتظار کر لوں شاید۔“

رکاوٹ نہ تھی۔ فائزہ اپنے فیصلوں میں بالکل ان کی طرح خود مختار تھی۔

سوچتے سوچتے نہ جانے کب آنکھ لگی تھی کہ درو کی تیز لہر نے انہیں بیدار کر دیا۔ وہ ابھی درو حتم کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اب درو ان کی برداشت سے باہر تھا۔ شاید اب بیساکھیوں کے سہارے چلنا بھی موقوف ہونے والا تھا۔ اب فون کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

”ہیلو اسٹیو! میری ٹانگ میں بہت درد ہے میں نے۔ وہ ابھی لی مگر کئی گھنٹے گزر گئے، کوئی فرق نہیں پڑا درد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ فریج لندن میں نہیں ہے تمہیں ایسپلینس کا انتظام کرنا پڑے گا۔“ اسٹیو ان کا کیرئیر ٹیکر تھا جو منٹے میں چار دن ان کے پاس آتا تھا۔ اسٹیو کے آنے کے بعد کے کچھ گھنٹے ان کے دن کے بہترین گھنٹے ہوا کرتے تھے۔

”شاید اس طرح درد کچھ بہتر ہو جائے۔“ ٹکیے کے سہارے اونچا ہو کر بیٹھنے کی کوشش کرتے وہ بے دم سے ہو گئے تھے۔ ٹکیہ نکال کر انہوں نے خود کو بیڈ پر ایک بار پھر گرالیا۔

”ہیلو!“ وہ عالم بیداری میں تھے یا عالم بے ہوشی میں پرانی باتیں وہ کہہ کر یاد آ رہی تھیں۔ ان کا ذہن پاکستان سے آنے والی کئی سال پہلے کی کال میں گم تھا۔ یہ ان کی دوسری شادی کی تیسری سالگرہ تھی۔

”ابا کا آج صبح انتقال ہو گیا۔ آپ کو بار بار یاد کرتے رہے اور پھر اچانک۔“ اس مسالوں کی بو بھی رچی عورت کے اندر اس کے باپ کی محبت نہ جانے کب رچ بس گئی تھی۔

بھرائی ہوئی آواز کی بدولت وہ جملہ مکمل نہ کر پائی تھی۔ فون اس کی اماں کو منتقل کیا جا چکا تھا۔ ان کی ذمہ داریاں پوری کرتے کرتے وہ خود کو بھول گئی تھی۔ وہ عورت جسے انہوں نے دس سالوں میں دس بار بھی یاد نہیں کیا تھا۔ ان کے وہ وعدے بھی پورے کر رہی تھی جو انہوں نے سرے سے کبھی اس سے کیے ہی نہیں

گھومتی بے کشش ہستی جس کے اندر تک پیاز لہسن اور مسالوں کی بو رچ بس گئی تھی۔ اس کے پاس جانا انہیں ہمیشہ ناگوار گزرا کرتا۔ انہیں اپنے گھر کے قریب بنے ہوئے کا چھوٹا یاد آ جاتا جس کے کپڑوں سے مسالوں کی ایسی ہی مہک آیا کرتی تھی۔ ان کی بیوی بھی ایک ایسا چھوٹا ہی تھی جو بغیر تنخواہ کے ان کے مال باپ کی خدمت کر رہی تھی۔

لندن آکر جہاں ان کا رہن سہن بدلاتھا وہیں ان کی ٹانگ نے مختلف خوشبوؤں کی پہچان میں بھی پی ایچ ڈی کر لی تھی بالکل گوروں کی طرح۔ قریب سے گزرنے والے کسی دیسی کے کوٹ سے کس طرح کی بو آرہی تھی ان کی ٹانگ کو فوراً پتا چل جاتا تھا۔

”کیپول کا پتا تو میں نے خود بیڈ کے دوسری طرف کی دراز میں رکھا تھا۔“

انہوں نے پرامید نظروں سے بیڈ کے دوسری طرف دیکھا اور پھر رینگتے رینگتے بیڈ کی دوسری جانب چلے گئے۔ اور واقعی کیپول کا وہ پتا انہیں بیڈ کی تیسری دراز میں پڑا مل گیا۔ ایک بار پھر رینگتے وہ داہنی جانب آ گئے۔

”افوہ۔“ ایک بار پھر اٹھنا پڑے گا۔“ گلاس اور جگ دونوں خالی تھے پانی لانے کے لیے ایک بار پھر انہیں اٹھنا تھا۔ درو کی میسوں کو نظر انداز کرتے ایک بار پھر وہیل چیر بریڈھ کر انہوں نے کچن تک کا سفر کیا تھا۔

”شکر ہے اب تھوڑی دیر میں طبیعت بہتر ہو جائے گی۔“ پانی لے کر انہوں نے کیپول نگل لیا اور خود کلامی کرتے ہوئے ایک بار پھر بیڈ روم میں آ گئے۔

بیڈ پر لیٹ انہوں نے سونے کی کوشش کی مگر ان کا ذہن جانے کہاں بھٹک رہا تھا۔

فائزہ سے پہلی نظر کی محبت ہوتے ہی نچیمہ ان کے دل سے ہمیشہ کے لیے اتر گئی تھی۔ فائزہ کو ان کی پہلی شادی پہلی عورت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ فائزہ کی دو بہنیں تھیں جو شادی شدہ تھیں سو شادی میں کوئی

تھا۔ تانہ تھا۔ ہاں وہ خود ہی تو پوچھ رہے تھے۔ اماں نے انہیں بصر اصرار بلایا تھا۔

”سہیل! ایک بار بس ایک بار اپنی شکل دکھا دے میری آنکھیں ترس گئی ہیں تجھے دیکھنے کے لیے۔ اب تو نظر بھی کمزور ہو گئی ہے۔ اس سے پہلے کہ نظر آنا بند ہو جائے۔ ایک بار آجا میرے پتر!“

کیسی التجا تھی ان کا اماں کے کنبے میں اور پھر نہ جانے کیا ہوا تھا۔ وہ کس موڈ میں تھے کہ ایک ہفتے کے اندر اندر ساری تیاری مکمل کر کے وہ ان کے پاس تھے۔

”میری آنکھوں کی روشنی تو تو تھا میرے بچے پھر آنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی۔“

جھریوں بھرے ہاتھوں والی عورت ان سے لپٹ کر رو رہی تھی نہ جانے کس کس موقع کے لیے سنبھالے گئے آنسو تھے جو ان کو دیکھتے ہی بے اختیار ہو گئے تھے۔ آنسو ان کی شرٹ میں جذب ہوتے رہے۔ پاں کو تھکتے ان کی نگاہیں دور کھڑی عورت سے ملی تھیں۔ اس کی یاسیت بھری نگاہوں میں نہ جانے کیا تھا کہ خود ان کی نظریں جھک گئی تھیں۔ اجنبی عورت جو ان کی بیوی تھی ان کی ماں کے ساتھ رہتے رہتے نہ جانے کب ان ہی کے جیسی لگنے لگی تھی۔

”بس اماں! اب میں آگیا ہوں نا۔“ دن کی تسلیوں نے ماں کو بہلا لیا تھا۔

”Can you hear me?“ (”کیا آپ مجھے سن سکتے ہیں۔“)

دور سے آئی آواز کتنی قریب تھی۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ جو ان ڈاکٹر ان پر جھکا ان سے پوچھ رہا تھا انہوں نے آہستگی سے سر ہلا دیا۔

”کہاں کہاں درد ہے؟“

ان کی سوجی ہوئی زخم شدہ ٹانگ کا معائنہ کیا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر ٹانگ کے مختلف حصوں کو ٹھونک بجا کر چیک کر رہا تھا۔ جہاں جہاں درد تھا وہ سر ہلا کرتا جا رہے تھے۔ اب انہیں کتنے دن تک یہاں رہنا تھا اور

”اماں! فائزہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آخری ہفتہ چل رہا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ بچہ اور ماں دونوں بہت کمزور ہیں، کسی وقت بھی اسپتال جانا پڑ سکتا ہے۔“

ماں کی روتی آواز ان کے جملوں سے ایک دم بند ہو گئی تھی۔ بو بھل خاموشی طاری تھی جب دوسری طرف سے ابھرنے والی آواز نے ان کو ایک دم ہی شرمندہ کر دیا تھا۔

”اچھا پتر! ٹھیک ہے اللہ خیر کرے۔“

ان کی بہت ساری باتوں کے جواب میں ایک جملہ اور پھر فون رکھ دیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے ہی تو ان کی دوسری شادی کا راز فاش ہوا تھا۔ ان کے دوست فیب کے کزن نے ہی ان کے گھر جایا تھا۔

اور وہ اپنے باپ کے مرنے پر بھی پاکستان نہیں گئے تھے۔ کچھ دن رہنے والی شیرمن بی بی کی پیدائش کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی تھی۔ کبھی فریحہ کا پہلا س ابھی بھی ان کے بوڑھے ہاتھوں میں جو ان تھا۔ ٹانگ کے درمیان تکیہ رکھ کر انہوں نے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

”اسٹیو آنے والا ہو گا۔“

عالم ہوش میں یہ ان کی آخری سوچ تھی۔



”آریو اوکے۔ کیا آپ ٹھیک ہیں؟“

ایسولینس جھٹکا کھا کر رکی تھی۔ نہ جانے پوچھنے والا کون تھا ان کے بیدار ذہن نے وہ جملہ سنا تھا۔ اسٹریچر گھسیٹا جا رہا تھا، ہسپتال کی وہی لمبی راہداری، اسٹریچر گھسیٹتے وارڈ بوائز اور ہسپتال اور اس کے ماحول سے نفرت کرنے والا شخص، انہوں نے سر جھٹک کر خود کو اس راہداری کی لمبائی سے باہر نکالنا چاہا۔

”کیا آپ ٹھیک ہیں اماں۔“

اور وہ اس راہداری سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ کئی سال پہلے کا منظر ان کے ذہن میں اب بھی

لے اس کی بہن اور بھائی تو کئی بار اس کو الگ ہونے کا کہہ چکے اور کئی بار تو خود میں نے بھی اس نمائی کو کہا۔ اگر یہ اس کی سزا ہے تو اب یہ سزا ختم کر دے۔ سزا کی بھی تو کوئی مدت ہوتی ہوگی، بس کر پتر! اب بس کر دے خدا سے ڈر۔“

ان کی ماں اس عورت کی محبت میں پور پور ڈوبی ہوئی تھی جس سے انہوں نے بلاوجہ نفرت کی تھی۔ ”تجھ سے اتنی محبت کرتی ہے۔ اسی لیے تو اب تک تیرے نام یہ بیٹھی ہے۔“ وہ نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ کہہ اس کے وجود سے خالی تھا۔

”اچھا اماں! لے جاؤں گا۔“ اور ماں نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔ بند کے کنارے پر تھی وہ عورت جسے لوگ ان کی بیوی نعیمہ کے نام سے جانتے تھے ان کے لیے اتنی ہی اجنبی تھی جتنی دوسری کوئی عورت ہو سکتی تھی۔ سالوں کا مہیب و طویل فاصلہ ان دونوں کے بیچ حاصل تھا۔ کئی منٹ تو ان کو سوچنے میں لگے تھے کہ اسے مخاطب کیسے کیا جائے شاید وہ بھی ایسی ہی کسی بے چینی کا شکار تھی۔ اپنے نام کی طرح پرانے خیالات کی مالک عورت، نئے کپڑوں میں ملبوس بلاوجہ الماری میں سر گھسیڑے کھڑی تھی۔

”مجھ سے محبت کرتی ہے۔“ دل میں ابھرنے والی سوچ پر دل یکدم فخر سے بھر گیا تھا۔

”ہاں تو مجھ سے محبت ہی کی جاسکتی ہے۔“ ان کا اپنی ذات پر فخر تھا کہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ وہ ایک شان دار مروت تھے۔ اونچے لبا خوب رو اعلا تعلیم یافتہ اور تعلیم یافتہ تو وہ بھی تھی۔ کبھی خوب صورت بھی تھی مگر اس کی خوب صورتی انہیں بھلا کب متاثر کر سکی تھی۔

”آپ کو کچھ دن تک ہسپتال میں ہی رہنا پڑے گا۔“ اور یہ بات تو وہ پہلے ہی جانتے تھے۔ ان کی ٹانگ کا معائنہ اور ٹیسٹ کرنے کے بعد انہیں وارڈ میں شفٹ

ان کے بعد نہ جانے وہ یہ ٹانگ لے کر گھر جاسکیں گی یا پھر۔

انہوں نے اپنا دھیان پھر کسی اور جانب لگانا چاہا۔ کمرے سے فرار ہونا اتنا آسان تو نہیں تھا۔ ہسپتال کی مخصوص — بونٹھنوں میں کھسی چلی آرہی تھی۔

”اماں! اتنا کھانا کون کھائے گا؟“ یہ پاکستان میں ان کے قیام کے پہلے دن کی پہلی شام تھی۔ کھانے پر اتنا اہتمام دیکھ کر وہ حیران رہ گئے تھے۔ وہ سب کھانے جو انہیں کبھی پسند ہوا کرتے تھے، ٹیبل پر موجود تھے۔ قورمہ، بریانی، کباب، نان، سلاوا اور نہ جانے کیا کیا۔

فائزہ لیگل ایڈوائزر تھی۔ بہت مصروف رہا کرتی، گھر میں اس کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا فریج کی پیدائش کے بعد فائزہ اپنے آپ کو بندھا ہوا محسوس کرنے لگی تھی اور اس کے کچھ مہینے کی ہونے پر اس کو ڈیڑے کیڑے چھوڑ کر اس نے اپنی یہ مشکل بھی آسان کر لی تھی۔ اس کی دفتری سرگرمیاں پھر زور و شور سے جاری ہو گئی تھیں۔ کھانا عموماً ”باہر سے کھایا جاتا تھا“ اس لیے اتنا اہتمام دیکھ کر انہیں بہت حیرت ہوئی تھی۔

”نعیمہ سارا دن لگی رہی ہے تیری پسند کی چیزیں بنانے میں۔“

اماں نے نعیمہ کی جانب اشارہ کیا جو سکرسمٹ کر میز کے کونے میں چھپنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ نہ جانے اس وقت کیوں وہ انہیں ایک چھوٹی سی بچی لگی تھی جو مہمانوں کے آنے پر چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک دم ہی ان کے اندر شکرگزاری کا احساس بیدار ہوا تھا۔

”پتر! اب تو نعیمہ کو بھی ساتھ لے جا۔ اس نے بڑی مشکل کھائی ہے۔ بڑی ہی بی بی کڑی ہے۔ اس

نے ہماری اتنی خدمت کی ہے کہ اگر اپنی دھی بھی ہوتی تو اتنا نہ کرتی۔ تیرے ابا اور میرا خیال رکھتے رکھتے خود کو بھول گئی، ساری عمر بہاد کر دی اس نے ہمارے

”اسے طلاق دے کر آزاد کرونا چاہیے۔“
ان کی پر سوچ نظریں ابھی تک اسی پر مچی تھیں۔
اس سوچ پر ان کا اپنا ضمیر چلا اٹھا تھا۔

”اب اتنے سالوں بعد جب اس کے بالوں میں
چاندی کی چمک تھی۔ یہی فیصلہ تم نے پہلے کیوں نہ
کیا۔“

ان کا ضمیر آج بار بار انہیں کچوکے لگا رہا تھا۔
”اماں ابا اکیلے تھے تو ان کے لیے“ سوال و جواب
کا دور چل رہا تھا۔

”وہ تو تمہاری ذمہ داری تھی، تمہارے ماں باپ
بھی تمہاری ہی ذمہ داری تھے تو تم نے خود کیا کیا اور
اب۔“

”کس منہ سے اس کا سامنا کر رہے ہو سہیل احمد؟“

اور ایک بار پھر وہ ہسپتال کے اسی کمرے میں واپس
آگئے تھے۔



”ہماری بہن کو تم نے لاوارث سمجھ رکھا ہے۔ کتنے
سال ہو گئے اسے تمہارے نام پر بیٹھے ہوئے اور ابھی
بھی۔“

نعیمہ کا بھائی رفاقت علی ان سے ملنے آیا تھا۔ نہ
چاہتے ہوئے بھی وہ بول رہا تھا۔ اس کا گھر تھوڑی ہی
دور تھا۔ نعیمہ کی بہن بھی آئی تھی۔ دونوں اپنے اپنے
گھر میں مگن تھے۔ نعیمہ کی ویران آنکھیں خاموش
رہتے ہوئے بھی بولتی رہتی تھیں۔ اس نے بھی کسی
سے کوئی شکوہ نہ کیا تھا مگر بھائی جب بھی اسے دیکھتا۔
اس کی ساری ہستی مل جاتی۔

”تم نے شادی کر لی، ہم نے پھر بھی صبر کیا لیکن یہ
کب تک ادھر بیٹھی رہے گی اور اب کتنے سال کے
بعد آئے ہو تم۔“

”دوسری شادی کے بعد رفاقت نے فون کر کے
انہیں سخت باتیں سنائی تھیں لیکن وہ سب اب قصہ

کر دیا گیا تھا۔ نہ جانے کون سی دوا تھی جس سے اب
درد کی شدت تخفیف مگنی تھی۔ ٹانگ اب بے حس سی
تھی۔ سیدھے لیٹ کر وہ بھت کو ٹکنے لگا۔

”نا جانے اسٹیو ان کو چھوڑنے یہاں تک آیا تھا یا
پھر ویسے ہی ایسولینس کو فون کر دیا تھا۔“

ایک لمبا سانس لیتے ان کا دھیان پھر پرانے زمانے
کے نام والی سالوں میں بسی عورت کی جانب مڑ گیا تھا،
آج کل وہ بے حد یاد آیا کرتی تھی۔ جس کو انہوں نے
کبھی اپنے آس پاس اپنی زندگی میں گھسنے نہ دیا تھا، بلا
روک ٹوک ان کے خیالوں میں گھسی چلی آتی تھی اور
وہ اسے روک بھی نہ پاتے تھے۔

”کھانا بہت اچھا تھا۔ بہت عرصے بعد اتنا اچھا کھانا
کھایا۔“

کمرے میں چھائی خاموشی ان کے بہت سوچنے کے
بعد ترتیب دیے گئے جملے سے ٹوٹی تھی۔ الماری میں
کئی منٹ سر گھمیرے کھڑے رہنے کے بعد اب وہ بیڈ
کے انتہائی دوسرے کنارے پر بیٹھی کوئی رسالہ کھنگال
رہی تھی۔

”شکریہ۔“

کئی سیکنڈ ان کی طرف دیکھنے کے بعد اس نے کہا
تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتا غم انہیں پہلے
کبھی کیوں نظر نہیں آیا تھا۔ کتنے ہی سیکنڈ وہ بھی اس
کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ مڑی ہوئی بسی پلکوں
والی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہی نہ تھا۔ وہ بنا جرم
کیے سزا کاٹ رہی تھی۔

”پتر! اب بس کرو۔“

ماں کا کہا جملہ اب بھی ان کے کانوں میں گونج رہا
تھا۔

”اے ساتھ لے جا اب پتر! اس نے بڑی ”مشکل“
کاشلی۔“

لیکن لندن میں ان کی زندگی میں اس کی جگہ تو
کیس بھی نہیں تھی۔ نہ پہلے نہ آج تو وہ اس کو کہاں
لے جاتے۔

بڑھا دیں۔ انہیں ننگے کے بعد وہ نرس کو جانا دیکھتے رہے۔

”اسے بھلا میری کیا فکر ہوگی۔ ایک لاوارث بوڑھے سے کسی کو کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔ دو سیکنڈ بھی ٹھہرنا گوارا نہیں کیا اس نے، کیسے چلی گئی۔ ہونہ۔“

خود ترسی کی کیفیت اور منفی سوچیں اٹھ اٹھ کر آتی تھیں اور وہ ان ہی کے دھارے پر بہتے چلے جاتے تھے۔

”فکر ہمدردی۔“ ان دونوں لفظوں نے انہیں جکڑ لیا تھا بالکل ایک آکٹوپس کی طرح ”فکر اور ہمدردی جیسے لفظوں کے مفہوم سے ناواقف شخص آج دو سروں سے توقع کر رہا تھا کہ وہ اس سے ہمدردی کریں اور اس کی فکر کریں۔“



”بھائی جان! مجھے کہیں نہیں جانا آپ کو اور اماں کو چھوڑ کر، سہیل کئی بار مجھے لے جانے کا کہہ چکے ہیں مگر میں خود جانا نہیں چاہتی میں آپ کے بغیر کہیں بھی سیٹ نہ ہو پاؤں گی۔ میں آپ کو پہلے بھی کئی بار بتا چکی ہوں۔“

نعیمہ کی آواز دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے کیسے موقع پر ان کا دفاع کیا تھا ان کی ڈھال بن کر کھڑی تھی۔ اپنے بھائی کے سامنے انہیں عزت دے رہی تھی جس سے کبھی انہوں نے رتی بھر ہمدردی تک نہیں کی تھی۔ جسے انہوں نے کبھی عزت نہ دی تھی وہ ان کی عزت کے لیے اپنے سگے بھائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لے کھڑی تھی۔

اس نعیمہ کو تو انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ تو کوئی اور ہی عورت تھی۔ جس عورت کو وہ اپنی بیوی کے طور پر جانتے تھے وہ تو کبھی اونچی آواز میں سراٹھا کر بات ہی نہ کر سکی تھی۔ من من کرتے شاید اسے بھی اپنی آواز سنائی دیتی ہوگی کہ نہیں۔

جہاں وہ حیرت زدہ تھے وہیں ان کی اماں بھی حیرت

پارہ تھیں۔ وہ انہیں بھول چکے تھے اب بھی ان کے سامنے بیٹھے خاموشی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”اس بار تم اسے ساتھ لے کر جاؤ گے۔“ رفاقت نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں تنبیہ کی اس کی آنکھوں میں ان کے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔ اتنی نفرت انہوں نے آج تک اپنے لیے کسی کی آنکھوں میں نہیں دیکھی تھی۔

”میں نے تو نہیں کہا تھا کہ اپنی بہن کی شادی میرے ساتھ کرو، یہ تمہارے اور میرے ماں باپ کا مشترکہ فیصلہ تھا اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میری پسندنا پسند کی فکر کے تھی۔“

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے۔

”ایک ایسی عورت کو میرے سر پر مسلط کر دیا گیا جو سرے سے مجھے کبھی اچھی ہی نہیں لگی اور ابھی بھی قصور میرا ہی ہے۔“ ان کی سوچ اتنی ہی خود پسند تھی جتنے وہ خود تھے۔

”آہ درد سے مر رہا ہوں میں، کوئی ہے؟“ ٹانگ میں جیسے آرے جانے لگے تھے۔ درد حد سے بڑھ گیا تھا رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ وقت کا حساب رکھنا بھی چھوڑ دیا تھا انہوں نے۔ بیڈ کے ساتھ لگے بٹن پر ہاتھ دھرتے ہی انہوں نے دروازے کی جانب دیکھنا شروع کر دیا۔

”میری ٹانگ میں بہت درد ہے، بے حد اذیت ناک مجھے بس اس سے نجات دلاؤ، کوئی ایسی گولی دے دو کہ سب ٹھیک ہو جائے۔“

نرس کو دیکھتے وہ بے اختیار ہو گئے تھے۔ اس کے آنسو ان کا چہرہ بھگور رہے تھے۔

”اچھا اچھا ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔“ نرس ان کو تسلی دے کر چلی گئی تھی۔

”یہ لے لو کچھ دیر بعد سکون مل جائے گا۔ صبح آپ کے ٹیسٹ کی رپورٹس آئیں گی تو ڈاکٹر دیکھ کر کچھ فیصلہ کریں گے۔“

نرس نے کچھ دوائیاں پانی کے ساتھ ان کی جانب

زندہ تھیں اور رفاقت حسین بغیر کچھ کے دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔ اور وہ سارا دن انہوں نے اس عورت کو سوچتے ہوئے گزارا تھا۔

وہ بہت تھوڑے دنوں کے لیے آئے تھے۔ اماں بار بار پوچھتیں ”پھر کب آؤ گے؟“

ان کا بس نہ چلنا کہ انہیں روک لیں لیکن وہ ان کو پہلے ہی نہیں روک سکی تھیں تو اب کیسے روک سکتیں۔

”اماں! میں جلدی ہی واپس آؤں گا اور فریجہ اور فائزہ کو بھی لے کر آؤں گا۔“

وہ روز تسلیاں دیتے مگر ماں کو جانے کیسی بے اعتباری تھی۔ نہ جانے میرے مرنے پر بھی آئے گا کہ نہیں۔“

اور وہ ان کے اس بار کے آنے پر ہی مر گئی تھیں۔ انہوں نے اپنی بہتی آنکھوں کو بنسنے دیا اور کروٹ بدل کر اسی منظر میں کھوئے رہے۔ یہ ان کے واپس جانے سے ایک دن پہلے کی صبح تھی۔ ماں سوئی کی سوئی رہ گئی تھیں۔ رات کیسی بے چینی سے ان کو دیکھ کر چھوٹی رہی تھیں۔ شاید وہ انہیں جانتا نہ دیکھ سکتیں اس لیے خود رخصت ہو گئی تھیں۔ اور وہ نعیمہ کو جلدی بلانے کے جھوٹے وعدے کرتے اگلے ہی دن لندن آ گئے تھے۔

واپس آنے کے بعد ان کی وہی مصروفیات شروع ہو گئی تھیں۔ ننھی فریجہ ان کی دلچسپیوں کا مرکز تھی۔ آفس سے آنے کے بعد ان کا بہت سا ٹائم فریجہ کے ساتھ گزرتا تھا۔ فائزہ کی وہی روٹین تھی ”آفس“ ”آفس“ اور بس ”آفس“۔ میٹنگز، وفد، کانفرنس، یہی سب کچھ ویسا کا ویسا تھا کچھ بھی تو نہ بدلاتھا۔ فائزہ مزید بچے پیدا کرنے کے لیے تیار نہ تھی اور اب انہیں اس کی مصروفیات سے جڑ ہونے لگی تھی۔ ٹیپ ٹاپ سے رننے والی عورت کیوں بری لگنے لگی تھی۔ اسے اپنے سوا کبھی کچھ نظر ہی نہ آیا تھا۔ شوہر کی محبت، بیٹی کی محبت کو دفتری فائلوں کے سب سے نیچے رکھے نہ

جانے وہ کون سی دنیا فتح کرنا چاہتی تھی۔ پہلے کبھی کبھار کی ہونے والی لڑائیوں میں اب شدت آگئی تھی۔ ”گھر کو دیکھنا صرف عورت کی ذمہ داری تو نہیں ہے۔ تم بھی تو ہو پھر میں ہی اپنے کیریئر کی قربانی کیوں دوں، تمہاری بھی اولاد ہے۔ جتنی اسے میری ضرورت ہے اتنی ہی تمہاری بھی ہے۔ اگر ایسی ہی ستی ساوتری کی ضرورت تھی تو مجھ سے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں اپنا کیریئر داؤ پر ہرگز نہیں لگاؤں گی۔“ ننھت سے کہتے ہوئے اس نے میز پر رکھا جوس کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

”تو نہ لگاؤ داؤ پر لیکن کچھ ٹائم تو تم نکال ہی سکتی ہو اپنی اولاد کے لیے۔ کبھی تو گھر کو دیکھ لیا کرو۔ میری تو خیر کبھی کسی چیز کی پروا تمہیں نہیں رہی۔ فریجہ ہی کی فکر کرو۔“

”کیا ہوا ہے فریجہ کو؟“ چچی بھلی ہے اور میں نہیں دیکھتی تو کون دیکھتا ہے اسے۔“ اس نے ایک شان بے نیازی سے فرش پر کھیلتی فریجہ کی جانب اشارہ کیا تھا۔ ”اس کی صحت دیکھو، کتنی کمزور ہے۔ کبھی فلو تو کبھی بخار۔“

”سب بچوں کو ہو جاتا ہے یہ فلو کوئی موذی مرض نہیں ہے۔ اب تمہارے لیے میں گھر میں جھاڑو پونچھا کرنے سے تو رہی۔“ دو دو جواب دیتے ہوئے کہیں سے بھی تو بڑھی لکھی نظر نہ آتی تھی۔ اور پھر یہ لڑائیاں طول پکڑنے لگی تھیں۔

اور وہ اس سالے میں بسی عورت کو وہیں چھوڑ کر بھی ساتھ لے آئے تھے۔

نہ جانے وہ کہاں تھی؟ کس حال میں تھی؟ انہوں نے تو مڑ کر ایک فون تک کرنا گوارا نہ کیا تھا۔

”کیا کہوں گا کہ میں تمہیں یہاں نہیں بلوا سکتا۔“

اور بہت سے سال فائزہ اور ان کی اسی کھینچا تانی میں گزر گئے تھے۔ انہوں نے فریجہ کو ہاسٹل داخل کرا دیا تھا۔ کم از کم اس کی جانب سے بے فکری ہو گئی تھی۔ ان کی لڑائیوں سے وہ متاثر ہو رہی تھی اور یہ بہت ضروری تھا۔

فائزہ اور وہ دو اجنبیوں کی طرح رات گئے گھر آتے تھے اور رات کے وہ چند گھنٹے بھی سکون سے گزرنے مشکل ہو جاتے تھے۔ فائزہ کا عہدہ بڑھ گیا تھا، ساتھ ہی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی تھیں۔ ان ہی بھاگتے دوڑتے دنوں کے ساتھ ریس لگاتے نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ خود ان کے تجربے کا ان کی قابلیت کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ پورے لندن میں ان سے بہتر وکیل کوئی نہیں تھا۔ فریجہ اٹھارہ سال کی تھی جب فائزہ کا الیکسٹریٹ ہو گیا تھا اور وہ جابر نہ ہو سکی۔ اس کی موت سے ان کی زندگی میں صرف ایک فرق آیا تھا اب رات گئے اجنبیوں کے لڑنے کی آواز کے بجائے مہیب خاموشی ہو کر رہی۔



”مجھے ایک ہی بار کیوں نہیں مار دیتے؟ کیوں بار بار کند چھری سے قتل کرتے ہو۔ ایک ٹانگ تو پہلے کاٹ ڈالی ہے اور اب دوسری! ایک ہی بار زہر کا انجکشن لگا دو، سکون کی نیند سلا دو مجھے۔ ایک مرے ہوئے شخص کو بار بار کیوں مارتے ہو۔“

فریجہ کا نفرس سے واپس آگئی تھی۔ ڈاکٹر زہر نہ جانے کتنی دیر آپس میں جھگڑا خیال کرتے رہے تھے اور فیصلہ وہی ہوا تھا جس کا انہیں پہلے سے ڈر تھا۔ ان کی ٹانگ کا ناقابل برداشت درد اب ان کی یہ ٹانگ بھی لے جانے والا تھا۔ زخم پھیلتا جا رہا تھا اور اب اس سے نجات ضروری تھی۔

”ڈیڈ پکیز“ سمجھنے کی کوشش کریں۔“

ان کا دواؤں کا ہسپتال کے کوریڈور تک سنائی دے رہا تھا۔ فریجہ خود پریشان تھی اور اس پریشانی و فکر مندی کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔

”ڈیڈ! آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ بالکل ٹھیک، آپ کو درد بھی نہیں ہوگا، کل آپریشن ہو جانا چاہیے پہلے ہی۔“

”فریجہ تم تو ڈاکٹر ہو، تم تو انجکشن لگا سکتی ہو میں تنگ آ گیا ہوں اس زندگی سے مجھ پر ایک احسان کر

و۔“ وہ بچوں کی طرح ملکنے لگے۔

اور وہ بھی تو رو رہی تھی۔

”اس زندگی سے تو موت بہتر ہے۔“

روتے روتے وہ نہ جانے کیا کہتے جا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کو دکھا جو نظریں جھکائے فرش کو گھورے جا رہی تھی۔

”ابھی آتی ہوں ڈیڈ!“

شاید اس کے لیے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا۔ ان کا دواؤں کی کام نہ آ سکا تھا۔ ان کی دوسری ٹانگ ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ طویل بے ہوشی کے بعد ان کی نگاہیں چھت سے ہٹ کر ہی نہ دیتی تھیں۔ وہ خاموش تھے جیسے ٹانگ کی جگہ ان کی زبان کاٹ دی گئی ہو۔

”ڈیڈ! سوپ لے لیں۔“

وہ ان کے پاس بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھی۔ ان کے آفس کی باتیں، اچھے دنوں کی یادیں لیکن انہیں تو کچھ بھی سنائی نہ دے رہا تھا۔ وہ چھت سے۔ نگاہیں نہ ہٹا رہے تھے۔

”اب سلام علیکم۔“

وہ ابراہیم تھا، فریجہ کا شوہر۔ وہ بالکل ان ہی کے جیسا تھا۔ اس کا حال اور ان کا ماضی کتنا ملتا جلتا تھا۔ وہ۔

تار نگاہوں سے اسے دیکھتے رہے۔

”اب آپ کیسے ہیں؟“

ابراہیم نے نرمی سے انہیں مخاطب کیا مگر انہوں نے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ اسے وہ کوئی جواب نہیں دینا چاہتے تھے۔ ایک بار پھر وہ اس کمرے سے کٹ کر رہ گئے تھے۔

”بیوگی کی زندگی گزارنے والی عورت کی زندگی کیسے گزرتی ہوگی۔ شوہر کو یاد کرتے کرتے اس نے اپنی جوانی برباد کر لی تھی۔ اب کیسی ہوگی۔“ ہاں وہ ایک شوہر کے ہوتے ہوئے بھی بیوہ تھی۔ آنسو تھے کہ بے چلے جا رہے تھے۔

”بچے کے لیے ترسی ہوگی۔“ ان کا دل چاہا وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔

”ڈیڈ! اب آپ میرے ساتھ چل رہے ہیں۔ میں

آپ کو بہت مس کر رہی تھی۔“ ان کی لاڈلی بیٹی ان کو بہلا رہی تھی۔
 ”ہاں، ٹانگ کٹنے کے بعد اتنی ہمدردی تو بنتی ہی ہے۔“ انہوں نے تنقیر سے سوچا، ”انہیں وہ پچھلے سارے دن یاد آگئے تھے جب وہ روز فریج کو فون کرنے کے بعد اس کے فون یا میسج کا انتظار کرتے رہے تھے لیکن اس نے ایک کال تک کرنا گوارا نہ کیا تھا۔“
 ”مجھے کہیں نہیں جانا۔ بس یہیں رہنا ہے کچھ دن۔“

منہ موڑے موڑے انہوں نے فریج سے کہہ دیا تھا۔
 ہسپتال میں رہنا انہیں شدید ناپسند تھا مگر اس کے ساتھ جانا اس سے بھی زیادہ ناپسند تھا۔ اس شخص کو دیکھتے ہی نہ جانے کیوں اپنا آپ زیادہ برا لگنے لگتا تھا۔ شدید نفرت ہونے لگتی تھی خود سے۔
 ”نہ ہی انہیں کوئی سمجھا سکا تھا اور نہ ہی وہ اسے سمجھا سکتے تھے کہ وہ سری شادی کرنے کے باوجود ہر چیز میں توازن رکھا جاسکتا ہے۔“
 ان کی سوچیں وقت کی قید سے آزاد تھیں کوئی ہے نہیں ہے۔ اس سے انہیں کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ اور ایک بار پھر انہیں ہسپتال سے نجات مل گئی تھی۔ فریج انہیں روز دیکھنے آتی تھی کبھی کبھار ابراہیم بھی دیکھنے آجاتا جو ان کے لیے بہت ناگوار وقت ہوا کرتا۔
 ”نہ جانے کہاں چلی گئی۔ یہیں پر تو تھی۔“

ہسپتال سے واپس آئے تیسرا دن تھا جب انہیں نعیم بے طرح یاد آئی تھی۔ دن گزر رات اتر آئی اور یہ کیفیت تھی کہ زائل ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ لمبی پلکوں والی آنکھیں بار بار اٹھ رہی تھیں۔ انہیں شکایتیں اور پھر جھک جاتیں۔ نہ جانے یہ لگا چھپی کب تک جاری رہی تھی۔ اسے یاد کرتے کرتے وہ سو گئے تھے۔ صبح بھی وہی کیفیت تھی۔ اپنے عمر کے ساٹھ ویں سال جب ان کی شادی پینتیس سال پرانی ہو چکی تھی وہ اپنی بیوی کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ ان کا حال بالکل نوجوان لڑکے جیسا ہو گیا تھا۔ جو نیا نیا محبت کا

شکار ہوا ہو۔ وہ نعیم کی تصویر ڈھونڈ رہے تھے جو مل کے نہیں دے رہی تھی۔ وہ آخری بار جب پاکستان گئے تھے تو نہ جانے کیسے ان کے بیگ میں آگئی تھی شاید ان کے کپڑوں کے ساتھ اور انہوں نے لاپرواہی سے اسے کہیں ڈال دیا تھا۔
 ”مگر کہاں؟“

اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہی تھی۔
 ”اب کیسے اور کہاں ڈھونڈوں؟“

آج کل ان کا سب سے اہم مسئلہ یہی تھا باقی سب چیزیں اس تصویر کے سامنے بچ ہو گئی تھیں۔ فریج آئی تھی بیٹھ کر کٹنی دیر تک ان سے باتیں کرتی رہی تھی اور وہ کھوئے کھوئے سے اسے سنتے رہے تھے۔

”نہ جانے کب واپس جائے گی۔“
 انہیں تو صرف ایک ہی فکر کھائے جا رہی تھی۔
 ”اگر نہ ملی تو؟“

اور اس سے آگے ان سے سوچا ہی نہ گیا۔ فریج کے جانے کے بعد ایک بار پھر تلاش شروع ہوئی اور آخر کار انہیں یاد آگیا تھا کہ وہ تصویر اگر کہیں ہو سکتی تھی تو اسی سفری بیگ میں اور اب انہیں کل تک کا انتظار کرنا تھا۔

”اسیو آئے گا تو اس سے کہوں گا وہی لا کر دے گا بیگ مجھے۔“

رات کروٹیں بدلتے گزری تھی۔ اور اب تصویر ان کے ہاتھوں میں تھی۔ لگتا تھا جیسے انہیں ہفت اقلیم مل گئی ہے۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ نارنجی کپڑوں کا عکس اس کے چہرے پر تھا اور ہونٹوں پر ننھا مل مسکرا رہا تھا۔ وہ خوب صورت تھی۔ اس کی شرمیلی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ لے آئی۔
 ”بھلا کب اتری تھی یہ تصویر؟“ انہوں نے سوچنے کی کوشش کی۔

”شاید شادی کے بعد جب پہلی بار نعیم کی بہن نسیم کے گھر گئے تھے۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



مسالوں کی بو کا تصور تھا نہ اور ک لسن کی بو کا۔

”کل فون کروں تو کیا وہ اٹھائے گی۔“

لیکن فون کرنے کی ہمت وہ کہاں سے لاتے اس سے کیا کہتے۔

”کیا وہ اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہوگی۔“ سوپ کا پیالا ایک طرف رکھنے کے بعد وہ صرف اسے سوچ رہے تھے۔

جو کچھ انہوں نے اس کے ساتھ کیا تھا اس کے بعد بھی انہیں محبت کی توقع تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد انہوں نے ایک فون تک کرنا گوارہ نہ کیا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں تھی، کس حال میں تھی۔

وہیل چیئر کھینچتے وہ گلاس وینڈو کے سامنے رک گئے۔ پارش کی موٹی بوندیں کھڑکی پر گر رہی تھیں۔ سب کچھ دھندلا گیا تھا۔ سب ہر طرف اسی طرح دواں دواں تھا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ رکے تو صرف وہ تھے اور ایسے رکے تھے کہ چلنے کا امکان ممکن ہی نہیں رہا تھا۔



وہ ان کے انگلینڈ آنے سے ایک دن پہلے کی رات تھی۔ ابھی شادی کو ایک مہینہ ہی تو ہوا تھا اور وہ صبح سے کونوں کھدروں میں سرگھسیڑے روٹی پائی جاتی۔ ”آپ چلے جائیں گے تو وقت کیسے گزرے گا۔“ وہ اپنا بیگ پیک کر رہے تھے اور وہ ان کے سر پر کھڑی تھی۔

”کیسی بے عقل لڑکی ہے۔ اتنی سرد مہری کے باوجود مجھ سے گرم جوشی کی توقع رکھتی ہے۔“

انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ نیلے لباس میں روٹی روٹی آنکھیں لیسے وہ انہیں تک رہی تھی۔

”اماں اباجیں نایساں اور پھر تمہارا گھر بھی تو پاس ہی ہے۔“

کوئی وعدہ نہ تھا نہ انہوں نے کیا تھا نہ کرنے کا ارادہ تھا اور وہ پھر بھی رو رہی تھی ان کے لیے رو رہی تھی۔

اور وہ ماضی سے چلتے چلتے حال میں آ کر رک گئے تھے۔

انہیں وہ دن یاد آ ہی گیا تھا۔ ان کی شادی کا دسواں دن تھا جب اس نے انہیں یاد دلایا تھا۔

”آج نسیمہ آپا کے گھر دعوت میں جانا ہے۔“ ان کے پاس کھڑی عورت من من کر رہی تھی۔

”کیا اونچا بولو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔“ ان کے زور سے بولنے پر وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔

اور پہلے جو بات اس نے روآنی سے کہی تھی اب اسے ادا کرتے ہوئے وہ تین جگہ انکی۔

”وہ نسیمہ آپا کے گھر دعوت ہے۔“ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور انہوں نے صرف چند سیکنڈ اس کی جانب دیکھا تھا۔

ان دنوں وہ قانون کی ڈگری ممتاز نمبروں سے حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ جانے کی تیاریوں میں مگن تھے۔ اماں اور ابا ان کی شادی پر

مصر تھے شادی اور وہ بھی نسیمہ سے جوتی۔ اے کرنے کے بعد گھرداری میں مصروف تھی۔ انہوں نے ایک

دوبارہ کوشش کی تھی کہ اماں اور ابا باز آ جائیں اور وہ بغیر کسی بیٹری کے وہاں سے نکل آئیں مگر ان کی ایک نہ

چلنے دی گئی۔ شادی کی تیاریوں میں ان کا حصہ صفر تھا وہ تو اپنے انگلینڈ جانے کی تیاریوں میں مگن تھے۔

نسیمہ روایتی سرخ لباس میں ان کے کمرے میں موجود تھی۔ دلہنا پے کا روپ اور نسیمہ کی چھب پر وہ

صرف کچھ دیر کے لیے مہسوت ہوئے تھے۔ دلہن اور وہ بھی ان کی دلہن نہیں سب کچھ بھول گیا تھا۔ آخر کو

وہ بھی انسان ہی تھے۔ اس سے دور کیسے رہتے مگر پھر رات گئی بات گئی اور ان کی دلچسپی صرف اپنے جانے

تک محدود ہو کر رہ گئی۔ نہ وعدہ نہ کوئی وعید نہ تعریف نہ توصیف بس وہ تو جانے کے دن مگن رہے تھے۔

نسیمہ ان کے آگے پیچھے پھرتی مگر انہیں کوئی فرق نہ پڑتا۔

فریحہ کا رکھا سوپ انہوں نے گھونٹ گھونٹ پیا تھا اور سارا وقت وہ اس تصور کو دیکھتے رہے تھے۔

”نہ جانے اب کیسی ہو گئی ہوگی۔“ حیرت کی بات تھی اب اس کے تصور کے ساتھ نہ

اندر تک اتر رہی تھی۔ باقی رات بہت سوچنے پر بھی کوئی خیال، کوئی لمس، کوئی لمحہ ان کے پاس نہ پہنچا تھا۔ اگلے دن کی صبح انہیں فریج کا انتظار تھا۔

”فریج! میری ایک خواہش پوری کرو۔ مجھے ایک بار پاکستان لے جاؤ۔ چاہے کچھ دن کے لیے ہی سہی مگر میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔“

فریج بہت دن سے ان میں تبدیلی دیکھ رہی تھی مگر اس کی وجہ جاننے سے قاصر رہی تھی۔ ان کی پہلی بیوی اور شادی کے بارے میں وہ جانتی تھی مگر ان کی تبدیلی کا تعلق ان کی بیوی سے ہو سکتا تھا یہ وہ نہیں جانتی تھی۔

”ڈیڈ! آپ کی حالت اس قابل نہیں ہے کہ آپ اتنا لمبا سفر کریں اور آپ کی سرجری کو ابھی بہت زیادہ ٹائم نہیں گزرا۔ آپ گورسٹ کرنا چاہیے۔“ ایک لمبی سانس لینے کے بعد اس نے اپنا جملہ مکمل کیا تھا۔

”میری حالت بالکل ٹھیک ہے، مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔ بس اسے میری خواہش سمجھ کر پورا کرو۔“

”لیکن آپ اکیلے کیسے جائیں گے؟ اتنا لمبا سفر۔“ اس نے پرسوج نظروں سے انہیں دیکھا اب وہ رکنے والے نہیں تھے۔

”تم چلو نا میرے ساتھ، ایک بار بھی پاکستان نہیں گئی ہو۔“ کیسی التجا تھی ان کے لہجے میں، اس کا دل پینچ گیا تھا۔

”ڈیڈ! یہ اتنا آسان نہیں ہے۔“

”آسان ہو یا مشکل، بس مجھے جانا ہے اور کچھ دن کے اندر اندر، پلیز۔“ ایک دم ہی وہ ڈٹ گئے تھے اور آخر میں پھر منت پر اتر آئے۔ ان کے لیے پاکستان جانا جیسے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تھا۔

”اچھا کچھ کرتی ہوں۔“ فریج نے ان کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

”بس کچھ دن کے اندر اندر انتظام کر لو، مجھے زیادہ انتظار نہ کروانا۔“

اور ان کی بات پر فریج انہیں غور سے دیکھتی رہی

بارش کے ساتھ ساتھ شاید وہ بھی رو رہے تھے۔ وہ عجیب رات تھی۔ وہ ساری رات پاکستان میں اماں ابا اور نعیمہ کے ساتھ پھرتے رہے تھے۔ خوش باش، ہواؤں میں اڑتے، نعیمہ ان کے بچوں میں گھری بیٹھی تھی۔ وہ بچے جن کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ جو خواب میں ہی پیدا ہو کر عدم سدھا رہ گئے تھے۔ ان کی قبریں انہوں نے اپنے ہاتھوں سے تیار کی تھیں۔ وہ رو رہے تھے۔

پھر منظر تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ لندن کی جامع مسجد میں تھے مسجد کے وسیع صحن میں رکھا جنازہ نہ جانے کس کا تھا ہر طرف خاموشی تھی۔ نہ رونے کی آواز نہ بین کرنے کی آواز۔ ایسا کون تھا جس کے مرنے پر ایک بھی آنسو بہانے والا نہ تھا، کوئی رونے والا ہی نہ تھا ابھی تک واضح نہ ہو سکا تھا کہ مرا کون ہے۔

کوئی ابراہیم کو آوازیں دے رہا تھا۔ فریج تھی جو مولانا صاحب کے پاس گھڑی ابراہیم کو بلا رہی تھی۔ سفید کپڑوں میں لپٹا شخص درمیان میں رکھا تھا۔ مولانا شاید وہی کہہ رہے تھے جو انہوں نے بار بار سنا تھا۔

”اگر آپ کفن دفن کے پے دینا چاہیں تو ٹھیک ہے ورنہ فنڈ سے سارا انتظام کیا جاسکتا ہے۔“

اور تب ان پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ خود اپنا جنازہ دیکھ رہے ہیں۔ ان کی میت پر رونے والا کوئی نہیں ان کی بیٹی صرف فرض پورا کر رہی تھی۔ انہوں نے ایسے بہت سے جنازے دیکھے تھے۔

دیوار غیر کی موت ایسی ہی تو ہوتی ہے۔ اور پھر منظر بدل گیا تھا۔ وہ دونوں ٹانگوں کے ساتھ چلتے چلتے نعیمہ کے پاس چلے گئے تھے۔ نعیمہ دلہن بنی تھی اور وہ بہت خوش تھے اتنے خوش کہ شاید ہی کبھی زندگی میں اتنے خوش ہوئے ہوں گے اور پھر ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اب شاید خواب میں خوش ہونا بھی ان کی قسمت میں نہیں تھا۔

کتنی ہی دیر وہ چھت کو گھورتے رہے تھے کمرے میں کلاک کی ٹنگ ٹنگ کے سوا صرف ان کی سانسون کی آواز تھی۔ ایک ہی رات میں انہوں نے کیا کچھ نہ دیکھ لیا تھا۔ اور اب مہیب اداسی اور خاموشی تھی جو

تھی۔

”میں انتظار کروں گا کب مجھے خبر سناؤ ہو۔“

وہ دروازے سے باہر نکل رہی تھی جب ان کی آواز اس نے پیچھے سے سنی تھی۔

”اسٹیو! مجھے شاپنگ کرنی ہے۔“

اسٹیو حیران تھا۔ دوسری ٹانگ کٹنے کے بعد وہ توقع کر رہا تھا کہ بوڑھا شخص حد سے زیادہ چڑچڑاہونے والا ہے مگر سب تو ہر چیز الٹی ہو گئی تھی وہ چڑچڑاہونے کے بجائے خوش تھا۔ اس کی خوشی کی وجہ اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ ایک عرصے کے بعد آج وہ شاپنگ کے لیے جانا چاہتا تھا۔

”اوکے سر!“ اسی حیرانی میں وہ اسے شاپنگ سینٹر لے گیا تھا۔ لیڈریز جوتے، ہیکو، پرفیومز نہ جانے کیا کچھ خرید لیا تھا انہوں نے اور اسٹیو کی حیرانی اپنے عروج پر تھی۔

”شاید ایک ہفتے کے بعد میں پاکستان جاؤں۔“

”اوہ اچھا۔“ اسٹیو نے ایک لمبا سا اچھا کہہ کر سر ہلا دیا تھا۔

”اب مجھے جیولری شاپ لے چلو۔“

اسٹیو انہیں Steven Stone (اسٹی دن اسٹون) لے آیا تھا۔ ننھے جگمگ جگمگ کرتے ہیرے اس انگوٹھی کو نایاب بنارہے تھے۔ کتنی ہی دیر وہ اسے پکڑے بیٹھے رہے تھے۔

”نہ جانے اس کی انگلیوں میں کیسی لگے گی۔“

بہت سلا پہلے کی نعرہ ان کی سوچوں میں مسکرا رہی تھی۔ انگوٹھی خرید کر وہ سرشار سے گھر آ گئے۔ ساری شاپنگ انہوں نے فریج سے خفی رکھی تھی۔ پاکستان جانے سے پہلے کے وہ دن ان پر بہت بھاری گزر رہے تھے۔

”اب نہ جانے کیسی دکھتی ہوگی۔ مجھ سے لڑے گی مجھے برا بھلا کہے گی۔ اس کی زندگی کو میں نے برباد کر دیا۔ لیکن میں اس سے ساری کوتاہیوں کی معافی مانگ

لوں گا۔ اسے اپنی محبت کا تعین دلاؤں گا۔“

”محبت!“ کوئی ان کے اندر ہنساتھا (لنگری محبت) ان کے اندر سے آتی آواز نے ان کی خوشیوں کا گلا گھونٹ دیا۔ ان کی نظر اپنی ٹانگوں پر جا کر ٹھہر گئی۔

”جب اسے تمہاری ضرورت تھی اس وقت تو تم نے اسے محبت کے قابل نہ سمجھا اور اب چلے ہو محبت کا ڈراما رچانے۔“

”آرام کرو“ اب چھوٹا پاکستان جانے کی باتیں زندگی جیسے چل رہی ہے اسے ایسے ہی چلنے دو۔“

”اس کا بھائی یاد ہے تمہیں اب تو شاید تمہیں یاد ہی دے گا۔ کیوں ذلیل ہونے کے لیے بے تاب ہو رہے ہو۔ تمہاری بیٹی بھی تمہارے ساتھ ہوگی۔“

انہیں ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ یہاں تو جانے سے پہلے ہی عدالت لگ گئی تھی جا کر کیا ہو گا۔

”نعیمہ ہے نا تمہارا سب سے بڑا سہارا وہ تمہارا ہی ساتھ دے گی۔“

یہ دل کی آواز تھی اور وہ کچھ مطمئن ہو گئے تھے۔

ان دس دنوں میں انہوں نے واہموں، خیالوں، خوشیوں اور نہ جانے کن کن جذبوں کو محسوس کیا تھا۔ بالکل ایک بیس پچیس سالہ لڑکے کی طرح جو پہلی بار اپنی محبوبہ سے ملنے جا رہا تھا۔ وہ نروس ہو رہے تھے اتنے نروس تو وہ فاترہ سے ملاقات پر بھی نہ ہوئے تھے۔ الوہی جذبوں کی لے پر رقص کرتے کرتے ان کی نظر اپنی ٹانگوں پر چلی جاتی اور سارے جذبے ٹھنڈے ٹھار ہو جاتے۔

دس دن وہ فریج کے ساتھ اپنے گھر کے سامنے تھے گھر کو لگا تالا ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ کب کی سنبھال کر رکھی گئی چابی فریج کو دیتے وہ ابھی بھی اسی کو سوچ رہے تھے۔

”شاید اپنی بہن یا بھائی کے گھر گئی ہوگی۔“

”مجھے اپنی چچا زاد بہن کے گھر جانا ہے فریج۔“

ان سے صبر کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

”ڈیڈ! سلامن رکھتے ہیں۔ تھوڑا ریسٹ کر لیں اس

”وہ وہاں پر ہیں جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔
کئی سال پہلے ان کا انتقال ہو چکا اور میری اماں کہہ رہی
ہیں کہ آپ یہاں سے چلے جائیں اور اب کبھی لوٹ کر
نہ آئے گا۔“

وہ اطلاع دے کر اندر جا چکا تھا۔ اگر وہ کھڑے
ہوتے تو شاید گر جاتے مگر گرے ہوؤں کے لیے اور
نیچے گرنا ممکن نہیں ہوتا۔

ان کے ہاتھ میں کھلا خط تھا جس میں صرف ایک
ہی سطر تحریر تھی۔

”سہیل احمد ہمیں نے تمہیں معاف کیا۔“

اور وہ دھاڑیں مار کر رونے لگے۔



کے بعد چلیں گے۔“ فریجہ ان کی وہیل چیئر گھسیٹ کر
اندر لے آئی۔ ان کا ہیڈ روم گردے سے اٹا ہوا تھا۔

”یہاں بیٹھنا تو مشکل لگ رہا ہے۔ ڈیڈ کیوں نا کسی
ہوٹل میں بنگ کرالیں۔ یہاں مشکل ہو جائے گی۔“

وہ تھوڑے پریشان ہو گئے تھے۔

”ہوں اچھا!“ نہ جانے وہ کیا سوچ رہے تھے۔ کوئی

بھی بحث و تکرار نہیں کی تھی۔ وہ دو کھٹے انہوں نے

نہایت مشکل سے گزارے تھے۔ نسیم کے گھر کے

سامنے ان کا دل کانوں میں دھڑک رہا تھا۔ صرف گیٹ

کھلنے کی دیر تھی۔ ہاتھ پسینے سے کیلے ہو رہے تھے۔

”جی!“ نوجوان لڑکا ان سے پوچھ رہا تھا۔

”نسیم باجی سے ملنا ہے۔“

”آپ کون؟“

”میں سہیل احمد ہوں۔“ انہیں اپنی آواز کسی

گہری کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

”جی اچھا!“ انہیں وہیں چھوڑ کر وہ اندر چلا گیا تھا۔

”امی آپ سے ملنا نہیں چاہتیں“ انہوں نے آپ

کے لیے یہ دیا ہے۔“

نوجوان نے آگے بڑھ کے ایک زردی مائل سفید

کاغذ ان کی جانب بڑھا دیا۔

”سنو!“ وہ گیٹ بند کر کے جانے لگا تھا تو وہ اسے پکار

بیٹھے۔

”نعمہ ہیں؟ ان کو ہی بلا دو“ ان سے کہو، سہیل احمد

ان سے ملنے آیا ہے۔ لندن سے۔“

اس نے بڑی عجیب نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”وہ نہیں ہیں۔“ اس کا لہجہ بھی اس کی نظروں کی

طرح عجیب تھا۔

فریجہ ابھی تک خاموش تماشائی کا سا کردار ادا کر رہی

تھی۔ سفر نے اسے بے حد تھکا دیا تھا۔

”نہیں ہے تو کہاں ہے۔ رفاقت بھائی کی طرف ہو

گی ہے نا۔“ حیرت سے پوچھتے ہوئے انہوں نے خود

ہی سوال کیا تھا اور خود ہی جواب دیا تھا۔

”نہیں وہ وہاں بھی نہیں ہیں۔“ اب نوجوان کے

لہجے میں افسردگی اتر آئی تھی۔

مشہور و مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش

کتاب کا نام

قیمت

450/- آوارہ گرد کی ڈائری ستر نامہ

450/- دنیا گول ہے ستر نامہ

450/- ابن بطوطہ کے تعاقب میں ستر نامہ

275/- چلتے ہو تو چین کو چلیے ستر نامہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

میرے خیال کا پیکر

”میرے دلیس کی مٹی بہت زرخیز ہے اہل سخت
سے سخت دل برسوں کی خشک آنکھیں بھی نم ہو جاتی
ہیں وہاں۔“ آنکھوں میں نمی محسوس ہوتے ہی اسے

جیسے ہی جہاز کے پیروں نے اسلام آباد کے رن
وے کو چھوا اس کے احساسات خوشی بن کر اس کے
چہرے پر چمکنے لگے اور آنکھوں میں نمی اتر آئی۔



مکمل ناول

نے ہارن بجا کر اپنی آمد کا اعلان کیا۔ وہ گاڑی سے اتر رہی تھی تو اس نے مرکزی دروازے سے رخسانہ آنٹی اور شہرین کو ایک ساتھ باہر آتے دیکھا۔

رخسانہ آنٹی نے اسے دیکھ کر دور سے ہی اپنی بانہیں وا کر دیں وہ کچھ جھجک کر ان کی طرف بڑھی اور انہوں نے اپنے بھاری بھرکم وجود میں اسے ایسے سمو لیا جیسے مرغی اپنے پروں میں چوزے کو لے لیتی ہے۔ اسے ایک بہت ہی پیاری ممتا بھری مسک ان کے وجود سے اٹھتی محسوس ہوئی۔ انہوں نے اس کا چہرہ اپنے

پاپا کی بات یاد آگئی اور پاپا کی یاد آتے ہی اس کے دل پر افسردگی سی چھاتی چلی گئی۔

جیسے ہی وہ سامان کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی ایرپورٹ کی عمارت سے باہر آئی تو نخب بستہ ہوا کے تھپیڑوں نے اس کا استقبال کیا۔ اپنے پیاروں کو ریسو کرنے آنے والوں میں اسے بہت جلد اقبال انکل کا چہرہ نظر آگیا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ انکل اقبال نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور خیریت دریافت کی۔ پھر اس کے ہاتھ سے ٹرالی لے کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے پر اسلام آباد کی سڑکوں پر گہما گہمی تھی، جلد ہی وہ اقبال انکل کے گھر پہنچ گئے۔ یہ ایک چھوٹا اثالیں طرز پر بنا ہوا بنگلہ تھا۔ جیسے ہی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی اقبال انکل



ہاتھوں میں لے کر بہت پیار سے اسے دیکھا اور اس کا ماتھا چوم لیا۔

”تمہارے ماں باپ کا سن کر بہت افسوس ہوا بیٹی، تمہاری ماں کو تو دیکھا نہیں پر باپ بہت ہی ٹھیکس اور اچھے انسان تھے۔ خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔“ ماں باپ کے ذکر پر اس کے چہرے پر آنکی مسکراہٹ مدھم ہو گئی۔ یہ محسوس کر کے شہرین فوراً آگے بڑھی۔

”ماں جی! اجازت ہو تو میں بھی مل لوں۔“ اور یہ کہتے ہی وہ اہمل سے لپٹ گئی۔

”شہرین بیٹا! باہر سردی بہت ہے، اہمل کو اندر لے چلو۔“ انگل اقبال نے گاڑی کی ڈگلی سے اس کا سامان باہر نکالا۔

”ہاں بیٹا! چلو اندر چلو۔“ رخسانہ آنٹی اور شہرین اسے اپنی بانہوں کے حصار میں گھر کے اندر لے آئیں۔

آج رات وہ ان لوگوں کی مہمان نمئی، کل صبح اسے اپنے پارٹمنٹ میں شفٹ ہو جانا تھا۔ رات گئے تک وہ انگل اقبال، رخسانہ آنٹی اور شہرین سے باتیں کرتی رہی۔ کسی بھی پاکستانی فیملی سے ملنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ پاکستان پہلی بار آئی تھی۔ نیویارک میں بھی ان کا پاکستانی کمیونٹی سے زیادہ میل جول نہیں تھا۔ اس کے پاپا چند پاکستانیوں سے ملتے جلتے تھے۔ پر وہ انہیں کبھی بھی اپنے گھر نہیں لے کر آتے تھے۔ انگل اقبال بھی امریکہ آتے تھے تو ان کے گھر کبھی نہیں آتے تھے۔ ہمیشہ ہوٹل میں ہی ٹھہرتے تھے۔ پاپا کی وفات سے چھ ماہ قبل جب وہ امریکہ آئے تو پاپا اہمل کو ہی ان سے ملوانے ہوٹل لے گئے تھے۔

انگل اقبال اس کے پاپا کے بیسٹ فرینڈ اور پاکستان میں ان کے پڑوسی تھے۔ اس کے پاپا اقبال انگل پر بہت بھروسہ کرتے تھے اور اسی بھروسے پر وہ اہمل کی تمام ذمہ داری انہیں سونپ گئے تھے۔ انگل اقبال نے بھی دوست ہونے کا حق نبھایا تھا۔ اس کے ماما پاپا کی

اچانک حادثاتی موت کے بعد سے لے کر اب تک وہ مستقل اس سے فون اور انٹرنیٹ کے ذریعے رابطے میں تھے۔ اس نے پاکستان میں مستقل رہائش کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے لیے تمام انتظامات اس کی مرضی کے مطابق اقبال انگل نے ہی کیے تھے اور آج جب وہ اپنے اسی فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پاکستان آئی تھی تو ان کی فیملی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں شہرین سے اس کی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ رخسانہ آنٹی نے اس کے لیے بہت مزے دار کھانا بنایا تھا اور بے حد اصرار اور محبت سے کھلایا بھی تھا۔ انگل اقبال اسے ایک سے بڑھ کر ایک لائے اور اس کے پاپا کے بچپن کے قصے سن رہے تھے اور کچھ شرارتیں تو ان کی ایسی تھیں کہ شہرین اور اہمل ہنس ہنس کر دہری ہوئی جا رہی تھیں۔

”آپ مردوں کے قصے بھی ختم ہونے میں نہیں آتے، کب سے اپنی اور فریاد بھائی کی باتیں بتا رہے ہیں؟“ اس کی ماں کے بارے میں پوچھنے دیں کہ وہ کیسی تھیں، ان کی عادت کیسی تھی، فریاد بھائی خود تو ہر سال آتے تھے، پر بھابھی کو کبھی ساتھ نہیں لائے۔ میں کہتی تھی کہ بھابھی کو کبھی پاکستان لے کر آئیں تو یہ ہی کہتے تھے۔ بھابھی اگلی بار آؤں گا تو ساتھ لاؤں گا اور پھر اگلی بار بھی یہ ہی کہتے تھے کہ اگلی بار آؤں گا تو ساتھ لاؤں گا۔ تم بتاؤ اہمل! تمہاری ماما اور تم کبھی فریاد بھائی کے ساتھ آئیں کیوں نہیں۔“ گرم گرم چائے پیتے ہوئے رخسانہ آنٹی نے بڑی لگاؤ سے پوچھا تھا، پر ان کا سوال سن کر اہمل کے چہرے پر ایک ماریک سایہ سا رنگ گیا۔

اس نے چور نظروں سے اقبال انگل کی طرف دیکھا تھا تو وہ بھی اسے بہت سنجیدگی کے ساتھ گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے اس طرح دیکھنے پر اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ نہ جانے وہ اس کے اور ماما کے بارے میں کیا کیا جانتے ہوں گے۔

دیے تو اس نے برا سامنہ بنا کر وہ پیپر زان سے لیے ضرور تھے، پر انتہائی غیر ضروری چیز جان کر اپنی وارڈ روپ کی دراز میں پھینک دیے تھے ان پانچ سالوں میں اس نے پانچ بار بھی ان کاغذات کو نہ چھوا ہوگا، پر پاکستان آتے وقت اس کے سامان میں سب سے ضروری اور قیمتی چیز اس اپارٹمنٹ کے پیپر ہی تھے۔ اگلے تین دن وہ شہرین کے ساتھ مل کر اپنے دو بیڈ

رومز کے اس لکڑی اپارٹمنٹ کو ضروری چیزوں سے آراستہ کرتی رہی تھی۔ اقبال انکل کی مدد سے اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی بھی خرید لی تھی۔ اگلا مرحلہ اس کی جاب کا تھا۔ آنے سے پہلے اس نے اپنے ڈاکو منٹس اقبال انکل کو بھجوا دیے تھے۔ انہوں نے کچھ جگہوں پر اس کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا اور پھر ایک ملٹی نیشنل کمپنی سے اسے جاب کی آفر بھی آئی۔



آج اسے پاکستان میں آئے آٹھ ماہ سے زائد ہو گئے تھے وہ قبح سویرے اٹھنے کی عادی نہیں تھی، پر پاکستان آنے کے بعد وہ بہت سویرے اٹھ جاتی اور بانی سارے دن میں کوئی نماز پڑھے نہ پڑھنے فجر کی نماز ضرور پڑھتی تھی۔ صبح کے وقت اسے مارگلہ کی پہاڑیوں کا منظر بہت بھلا لگتا۔ پہاڑوں پر اترنے والی دھند اسے اپنے وجود میں اترتی محسوس ہوتی۔

”ہر صبح نیویارک پر چند لمحوں کے لیے ایسی دھند اترتی ہے“ ”بی“ جو اس شہر کو اپنی آغوش میں گھیر لیتی ہے۔ تم دیکھو تو دیوانی ہو جاؤ۔“

”سچ“ کسی کی سرگوشیاں اس کے آس پاس سرسرا رہی تھیں۔

ان تکلیف دہ یادوں سے وہ لاکھ چاہنے کے باوجود بھی جان نہیں چھڑا سکی تھی۔ آفس میں اس کا وقت اچھا گزرتا تھا۔ آفس سے واپس آتے ہوئے وہ کھانے پکانے کا ضروری سامان لے آتی تھی۔ اپارٹمنٹ میں

”وہ“ آئی۔ اہکچو کلی ماما بہت مصروف اور سوشل دو مین تھیں اور میں زیادہ تر اپنی پڑھائی میں مصروف رہی اس لیے پیپا کے پاکستان کے پروگرام میں کبھی انہیں جوائن نہیں کر سکے۔ بس یہی بات تھی۔“ اس نے اقبال انکل کی نظروں سے اپنی شرمندگی چھپاتے ہوئے کہا۔

”اھل تمہاری ماما مسلمان تھیں۔“ شہرین نے شوق سے پوچھا۔

اس سوال پر وہ چند لمحے شہرین کی طرف دیکھتی رہ گئی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس سوال کا کیا جواب دے۔ ”ہوں“ کہہ کر اس نے جان چھڑائی۔

”ان کا اسلامی نام کیا تھا“ میں نے تو فریاد بھائی کے منہ سے مارٹنا ہی سنا ہمیشہ۔“ رخسانہ آئی نے کچھ حیرت سے کہا۔

”ان کا مسلم نیم سارہ تھا آئی!“ اس سوال کا جواب اھل کو چند لمحے سوچنا پڑا تھا۔ شاید وہ خود بھی بھول چکی تھی کہ ماما کا کوئی مسلم نام بھی تھا۔ ”اچھا بھئی۔ اب اھل کو آرام کرنے دو۔ بانی باتیں صبح کر لیتا، رات کانی ہو گئی ہے اور پھر اتنے لمبے سفر کی تھکن بھی ہوگی۔“ اقبال انکل کی اس سوال جواب کے بیچہ اختلاط پر اس نے شکر گزار نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ شاید انہیں اس کی اذیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔

رات چاہنے کے باوجود بھی وہ سکون سے سونہ سکی، پلکوں کے پیچھے تلخ یادوں کی پرچھائیاں اسے تڑپائی رہیں۔ دل کا درد آنسو بن کر آنکھوں سے بہتا رہا۔



اگلی صبح وہ ناشتے کے بعد انکل اقبال اور شہرین کے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ میں آئی تھی۔ یہ اپارٹمنٹ اسلام آباد کے ایک پوش ایریا میں واقع 8 منزلہ بلڈنگ مارگلہ ٹاور میں فور تھ فلور پر تھا۔ پچھلی بالکنی میں سے مارگلہ ہلز کا دلکش منظر اس بہت اچھا لگا۔ یہ اپارٹمنٹ اس کے پیپا نے پانچ سال پہلے اس کے نام سے خریدا تھا اور جب انہوں نے اس کے پیپر ز اسے

صورت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی، اس نے گھوم کر دیکھا تو چند لمحے دیکھتی ہی رہ گئی۔
سانولا مگر پرکشش رنگ، سلیقے سے تراشی ہوئی کھنٹی مونچھیں، چھ فٹ سے ٹھکانا، چوڑا سینہ، گرے پینٹ کے ساتھ وائٹ شرٹ اور اوپر بلیک کوٹ، ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں اور دوسرے میں موبائل لیے وہ بے حد پرکشش شخصیت لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔
تب ہی وہ ہوش میں آئی اور اسے یاد آیا کہ اسے

بھی تو نیچے جانا ہے۔ ایک بار لفٹ نیچے چلی گئی تو اسے اوپر آنے میں ٹائم لگے گا، یہ سوچ کر وہ تیزی سے لفٹ کی طرف بڑھی۔ لفٹ کے نزدیک پہنچ کر اس کی رفتار کچھ اور تیز ہو گئی۔ یہاں تک کہ وہ لفٹ میں کھڑے واحد شخص سے ٹکراتے ٹکراتے پہنچی۔
”اوہ! سوری۔“ اس کی خجالت بھری آواز لفٹ میں ابھری۔

”اٹس اوکے۔“ بندے نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

اہمل نے اپنا رخ دروازے کی طرف کر لیا۔ ساتھ کھڑا بندہ بھی اس سے ایک فٹ کے فاصلے پر دروازے پر نظر میں جمائے کھڑا تھا۔ پر جیسے ہی دروازہ کھلا، دونوں ہی جھجک کر قدم نہ بڑھا سکے۔ پھر اس کے ساتھ کھڑے شخص نے مذہب انداز میں اسے دیکھتے ہوئے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اہمل نے مسکراتی نظر اس پر ڈالی اور ”تھینکس“ کہتی لفٹ سے باہر آ گئی۔

تھوڑے فاصلے پر چلتے دونوں پارکنگ میں آئے اور اپنی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ احتیاط کے ساتھ پچھلی گاڑیوں کی رو سے اپنی گاڑی نکالتے ہوئے اس نے اپنے سامنے سے سلور منڈا کار کو ٹکلتے ہوئے دیکھ کر سوچا۔

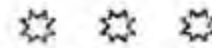
”واہ بھئی۔۔۔ بندہ اور گاڑی دونوں ہی شان دار ہیں۔“

اتوار کا دن اس کا اقبال انگل کی طرف گزرتا تھا یا پھر شہرین اس کی طرف آجاتی تھی۔ دونوں خوب باتیں

آکر اپنے لیے چائے بناتی، کچھ دیر بیٹھی دیکھتی، پھر اپنی پسند کی کوئی ڈش بناتی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ پچھلی بالکنی میں آجاتی اور مارگلہ کی پہاڑیوں پر بنے چند گھروں سے پھونتی روشنی دیکھتی رہتی۔ دیوں کی طرح ٹھٹھانی یہ روشنیاں بہت بھلی لگتی تھیں۔

آج بھی وہ ان روشنیوں پر نگاہ جمائے یادوں میں گھری کھڑی تھی کہ اچانک اسے فضا میں تمباکو کی مہک محسوس ہوئی۔ یہ ایک برانڈڈ سگار کی مہک تھی جو اس کے پیلا بھی میتے تھے۔ جانی پہچانی خوشبو محسوس کر کے اس کا چوتھنا لازمی تھا۔ اس نے بالکنی میں لگی لوہے کی گرل سے باہر جھانک کر دیکھا تو اسے اپنے بائیں ہاتھ پر بنے اپارٹمنٹ کی گرل کے ساتھ کھڑا ہوا ایک تاریک ہیولہ سا نظر آیا۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی، یہ اپارٹمنٹ خالی پڑا ہوا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ والے دو اپارٹمنٹ آباد تھے۔ ایک میں کوئی میاں بیوی تھے اور دوسرے میں بال بچوں والی فیملی تھی۔ یہاں سب اپنے آپ میں مگن رہتے تھے۔ لوگ زیادہ ایک دوسرے سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے وہ آج تک کسی دوسرے اپارٹمنٹ میں نہیں گئی تھی۔ اسی لیے اسے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ ساتھ والے خالی فلیٹ میں کب کون آکر آباد ہو گیا۔

ہوا کے رخ کے ساتھ آنے والی سگار کی مہک کو وہ اپنے اندر اتار رہی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ خوشبو آنا بند ہو گئی۔ جو بھی وہاں کھڑا تھا، اب واپس اندر جا چکا تھا۔ وہ بھی اپنے کمرے میں سونے کے لیے آ گئی۔



خلاف معمول آج اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ فجر کی نماز بھی نکل گئی۔ جلدی جلدی معمولات پنپنا کر وہ آفس جانے کے لیے تیار ہوئی اور پرس سنبھال کر اپارٹمنٹ سے باہر آ گئی۔ جیسے ہی وہ دروازہ لاک کرنے کے لیے پلٹی، ساتھ ہی بائیں ہاتھ والے اپارٹمنٹ سے کوئی باہر آیا۔

”اوکے ماں، اللہ حافظ۔ دعا کرتا۔“ بہت ہی خوب

”ہوں۔ اور میں تمہیں دیکھتی چلی گئی۔ ماشاء اللہ
 بہت پیاری ہو۔“
 اپنی تعریف سن کر ایک شرمیلی مسکان اس کے
 لبوں کو چھو گئی۔ ”تھمنکس“
 ”کیا نام ہے تمارا۔“ خاتون نے پیار سے اس کا نام
 پوچھا۔

”اھل۔ اھل فرما۔“
 ”اھل۔ بہت پیارا نام ہے، پڑھتی ہو؟“ وہ شاید
 اسے کالج اسٹوڈنٹ سمجھ رہی تھی۔
 ”جی نہیں۔ میں ایک ملٹی میڈیئل کمپنی میں جاب
 کرتی ہوں۔“
 ”گند۔ یہاں کہیں قریب ہی رہتی ہو؟“
 ”جی، مارگلہ ٹاور میں۔“

کرتیں، اپنی پسند کی موویز دیکھتیں۔ شاپنگ کے لیے
 چلی جاتیں۔ اکثر اقبال انکل اور رخسانہ آنٹی بھی
 آجاتے، پھر وہ سب مل کر کسی پکنک سپاٹ کی طرف
 نکل جاتے یا کسی ریسٹورنٹ میں ڈنر کے لیے چلے
 جاتے۔

پر اس اتوار نہ تو وہ اقبال انکل کی طرف جاسکتی تھی
 اور نہ ہی شہرین اس کے پاس آسکتی تھی، کیونکہ وہ دن
 پہلے ہی وہ لوگ رخسانہ آنٹی کے کسی قریبی عزیز کی
 اچانک وفات پر جہلم جا چکے تھے۔ رخسانہ آنٹی کا سارا

ممکنہ جہلم میں آباد تھا۔ سو آج وہ اپنے پارٹنرٹ میں
 ہی بور ہو رہی تھی۔ شام میں اس نے سوچا کیوں نہ
 قریبی پارک میں ہی چلی جائے۔ مارگلہ ٹاورز کے قریب
 ہی بہت خوب صورت بچوں کا چھوٹا سا پارک تھا۔ آج
 موسم بھی بہت خوش گوار تھا۔ اس نے قریبی اسٹال
 سے کولڈ ڈرنک اور اسٹینکس خریدے، پھر ایک بیچ پر
 بیٹھ کر چھوٹے بچوں کو کھیلنے کودتے دیکھنے لگی۔ پکنک
 فراک بنے ایک بہت چھوٹی بچی جس نے شاید ابھی
 ابھی چلنا سیکھا ہو گا۔ پھولوں کے قطفے کی طرف لپک
 رہی تھی۔ وہ بار بار گرتی اور اس کی ماں بار بار بھاگ کر
 اسے اٹھاتی، اس خوب صورت منظر کو وہ بہت محویت
 سے دیکھ رہی تھی کہ اچانک قریب سے ابھرنے والی
 نسوانی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”ہیلو۔“ اس نے سرگھما کر دیکھا تو اس کے بیچ
 کے قریب ہی ایک بزرگ خاتون لائٹ براؤن ساڑھی
 کے اوپر آف وائٹ شال لپیٹے وہیل چیئر پر بیٹھی نظر
 آئیں۔
 وہ ایک دم سنبھل کر بیٹھی اور مسکرا کر جواباً بولی۔
 ”ہیلو۔“

”سوری۔ میں نے تمہیں ڈسٹرب کر دیا۔“
 بزرگ خاتون نے دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ارے نہیں۔ وہ تو میں۔ بس ویسے ہی وہ چھوٹی
 بچی بہت پیاری لگ رہی تھی تو میں بس اسے دیکھتی چلی
 گئی۔“ اھل نے کچھ تھپکتے ہوئے کہا۔

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے، بہنوں کے لیے ایک اور جہاں

دستِ کدوگر

فوزیہ یاسمین



قیمت - 750 روپے

کتب و قرائن ڈائجسٹ: 37 - ایڈیٹر: فخریہ - فون نمبر: 32735021

”اچھا۔ میں بھی وہیں رہتی ہوں۔“

”لوہ رنکلی۔ پر میں نے بھی آپ کو وہاں دیکھا نہیں۔“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”میں ابھی چند دن پہلے ہی وہاں شفٹ ہوئی ہوں۔“

”آہاں۔ تو وہاں سے یہاں تک آنے میں آپ کو کافی پرابلم ہوئی ہوگی۔“ اس نے ان کی وہیل چیئر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اصل میں مارگلہ ٹاور سے اس پارک تک آنے کے لیے دو رویہ بڑی سڑک کراس کرنی پڑتی تھی۔

”نہیں۔ ایسی کوئی مشکل تو نہیں ہوئی، ویسے بھی میں یہاں اپنے بیٹے کے ساتھ آئی ہوں۔“

”لوہ۔“ اس نے غیر ارادی طور پر ادھر ادھر نظر گھما کر ان کے بیٹے کی ان کے پاس موجودگی محسوس کرنا چاہی۔

”میرا بیٹا پیٹرول بھروائے گیا ہے، آتا ہی ہوگا۔“

”آتا ہوگا نہیں، آلیا۔“ ایک خوب صورت مردانہ آواز ان کے پیچھے سے ابھری۔ اہمل نے سر اٹھا کر دیکھا تو چند لمحے دیکھتی رہ گئی۔ یہ تو وہی تھا۔

”جی ماں۔ آپ بوری تو نہیں ہوئیں۔“ انہوں نے پیار سے اپنی ماں سے پوچھتے ہوئے جوس کا کین کھول کر اپنی ماں کو دیا اور ایک نزدیکی شیخ پر بیٹھ گئے۔

”نہیں۔ میں نے اپنی بوری دور کرنے کے لیے اپنی ایک ساتھی چن لی۔“ بزرگ خاتون نے پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آں ہاں۔ السلام علیکم۔“ ان کے بیٹے نے دلچسپی سے اہمل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”وا۔ وعلیکم السلام۔“ جواب دیتے ہوئے اسے خاصی شرمندگی ہوئی، کیونکہ وہ عمر میں اس سے خالص بڑے تھے۔ اسے سلام میں پھل کرنی چاہیے تھی۔

”ریشارڈ۔ میجر جہاں زیب احمد۔“ انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔

”اہمل فراہ۔“ جواب میں اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا نام بتایا۔

”جہاں زیب! یہ بچی بھی مارگلہ ٹاور میں رہتی ہے۔“

”آں ہاں۔ جب ہی یہ چہرے مجھے کچھ جانا پہچانا لگ رہا ہے۔“ میجر صاحب کی گہری نگاہیں اہمل کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ”مارگلہ ٹاور میں کون سے فلور پر کون سا اپارٹمنٹ۔“ انہوں نے اہمل سے پوچھا۔

”نور تھ فلور پر 408۔“

”ارے ماں! ابھی یہ تو ہماری پڑوسن نکلی۔“

”واقعی۔ گنڈ۔ پھر آؤ نہ۔“ بھی ہماری طرف۔“

میجر صاحب کی ماں نے اہمل کو کھلے دل سے دعوت دے ڈالی۔

”جی ضرور۔ اچھا آئی! اب میں چلتی ہوں۔“ اس نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے اجازت طلب کی۔

”اچھا۔ پر آنا ضرور۔“ ایک بار پھر انہوں نے پر زور دعوت دی، جس کے جواب میں اہمل کے چہرے پر ایک بھرپور مسکراہٹ آئی اور وہ بغیر کچھ بولے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ یہ دیکھے بنا کہ اس کی مسکراہٹ میجر صاحب کے گرد ایک حصار کھینچ چکی تھی۔



”کاشان یار۔ تمہیں یاد ہے، بچپن میں۔ میں تمہیں سبز آنکھوں والی ایک فیری کی کہانی سنا تھا۔“

”جی یاد ہے اور وہ فیری جسے مسکرا کر دیکھ لیتی تھی، اس پر جادو ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی مسکراہٹ سے لوگوں کو پتھر کا بنا دیتی تھی۔“

”ہاں وہی۔ پر آج میں نے سچ مچ کی سبز آنکھوں والی اپنی مسکراہٹ سے دلوں پر جادو کرنے والی جیتی جاگتی فیری دیکھی ہے۔“

”مائی گاڈ! یا! تو کہیں اس نے آپ کو تو پتھر کا نہیں بنا دیا۔“

”ہاہاہاہ۔ نہیں یا۔ یہ ذرا اور طرح کی فیری ہے۔ یہ پتھر نہیں بناتی، بلکہ پتھر دلوں میں جان ڈال کے انہیں

ضروری چیزیں لینے چن میں آئی تو شیفت پر رکھے
باؤل پر نظر پڑی۔

”اؤف۔ شش۔ یہ ابھی تک نہیں جاسکا۔ چلو پھر
آج کچھ بناتے ہیں سفینہ آئی کے لیے۔“ اس نے دل
میں ارادہ کر لیا۔

آفس سے واپسی پر وہ پکانے کا کافی سارا سامان لے
آئی اور پھر اس نے بڑی محنت سے اسٹیکس تیار کیں
۔ انہیں باؤل میں ڈال کے اچھی طرح دوپٹہ اوڑھ
کر کے اپارٹمنٹ سے باہر آگئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ
باؤل ان کے ملازم کے حوالے کر کے وہ واپس آجائے
گی، پر دروازہ کھولنے والی شخصیت۔ میجر جہاں زیب کی
تھی۔

نگاہ ملے ہی دونوں کے منہ سے آہستہ سے نکلا۔
”اؤف۔“

”السلام علیکم۔“ اس نے جھٹ میجر صاحب کو
سلام کیا۔ پہلی بار کی شرمندگی یاد تھی۔
”وعلیکم السلام۔“ انہوں نے سلام کو کھینچتے ہوئے
جواب دیا۔

”فہم۔ میں۔ یہ۔“ اس نے باؤل والا ہاتھ آگے
کیا۔

”پلیز۔ ویلکم۔“ میجر صاحب نے اس کی بات
سنی ان سنی کر کے نہایت مسرت کے ساتھ ہاتھ کے
اشارے سے اسے اندر آنے کی دعوت دی۔

چند لمحے سوچنے کے بعد وہ ہچکچاتی ہوئی اندر داخل
ہوئی اور اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔
تھوڑا سا آگے آکر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔
پورے لاؤنج میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اسے خیال آیا
کہیں میجر صاحب اکیلے ہی نہ ہوں اور۔ اور۔

”سفینہ آئی کہاں ہیں؟“ اس نے فوراً پلٹ کر
جلدی سے پوچھا۔ میجر صاحب کی مسرت اس کے
چہرے پر تحریر تشویش دیکھ کر سنجیدگی میں بدل گئی۔
انہوں نے نرمی سے اس کے ہاتھ سے باؤل لے لیا۔
”گھر میں ہی ہیں، اپنے بیڈ روم میں۔ ڈاکٹر سے

دھڑکنا سکھاتی ہے۔“
”اوہ۔ تو لگتا ہے آپ کے پھر دل پر اس فیری کا
جادو چل گیا ہے۔“

”ارے نہیں۔ اب ایسا بھی نہیں، پر میں سوچ رہا
ہوں تم اس کی مسکراہٹ کے جادو سے بچ نہ
سکو گے۔“

”اچھا تو یہ بات ہے۔ چلیج؟“ اور پھر دونوں طرف
دونوں نے قہقہہ لگایا۔ پچھلے ایک گھنٹے سے میجر صاحب
لندن میں موجود اپنے بیٹے سے انٹرنیٹ پر بات چیت
کر رہے تھے۔

آج کام زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ آفس سے کافی
لیٹ آئی تھی اور آتے ہی لاؤنج کے صوفے پر ہی لیٹ
گئی۔ قریب تھا کہ اس کی آنکھ لگ جاتی پر ڈور بیل کی
آواز پر مجبوراً اسے اٹھنا پڑا، دروازہ کھولتے ہی اسے
اجنبی صورت نظر آئی۔

”یہ جی سفینہ بیگم نے بھیجا ہے آپ کے لیے۔“
اس آدمی نے شیشے کا پیالہ۔ اس کی طرف
برہنایا۔

”کون سفینہ بیگم؟“ اس نے باؤل لینے کی
 بجائے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ جی یہ ساتھ والے
اپارٹمنٹ میں رہتی ہیں، میجر جہاں زیب کی والدہ۔ میں
ان کا ملازم ہوں شکیل۔“ اس نے سفینہ بیگم کے
ساتھ ساتھ اپنا تعارف بھی ضروری سمجھا۔

”اؤف۔“ اسے پارک میں ہونے والی ملاقات یاد
آگئی۔ اس نے باؤل لے کر شکریہ کہلا دیا۔ باؤل میں
کھیر تھی، اس نے ریک میں سے چچہ نکالا اور باؤل میں
ہی کھانا شروع ہو گئی۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی سوچ لیا
تھا کہ کل وہ بھی کچھ بنا کر ان کی طرف بھجوائے گی۔ پر
اگلے تین دن مصروفیت زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ کچھ
اچھا بنا ہی نہ سکی۔ انکل اقبال کی فیملی واپس آگئی تو ایک
رات کے لیے ان کی طرف چلی گئی۔ اگلے دن آفس
جانے سے پہلے وہ اپنے اپارٹمنٹ واپس آئی تھی، کچھ

”تو تھنکس۔ پھر کبھی سہی“ ابھی ذرا جلدی میں ہوں۔“ ڈاکٹر واقعی جلدی میں تھی۔ اس لیے فوراً ہی دروازے کی سمت بڑھ گئی۔

”ماں! میں ڈاکٹر مریم کو نیچے تک چھوڑ کر آتا ہوں“ ٹھیک ہے۔“ ڈاکٹر کے پیچھے میجر صاحب بھی اپارٹمنٹ سے باہر چلے گئے۔

”اھل بیٹا کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھو نا۔“ سفینہ بیگم نے اھل کو کھڑے دیکھ کر کہا۔

اھل اس سارے منظر کو خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ سفینہ بیگم کے اصرار پر بیٹھ گئی۔

”اور سناؤ۔ کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں میں آپ کے لیے یہ لائی تھی۔“ اس نے ڈش کی طرف اشارہ کیا۔

”تم نے بنایا ہے یا تمہاری ماں نے۔“ انہوں نے ڈش ٹھیکل کے حوالے کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی میں نے ہی بنایا ہے، میری ماما کچھ نہیں بنا سکتیں۔“

”کیوں۔؟“ انہیں حیرت ہوئی۔

”بچھلے سال ایک روڈ ایکسپنڈنٹ میں میرے ماما اور پاپا دونوں کی ڈھنچھ ہو گئی نیویارک میں۔“ اس کے لہجے میں اداسی اتر آئی تھی۔

”او بیٹا! آم سوری۔“ انہوں نے آگے کو جھک کر اس کے کاندھے کو ہلکے سے تھپتھپایا۔ ”اب تمہارے ساتھ کون رہتا ہے، میرا مطلب کوئی بھائی، بہن یا دیگر رشتے دار وغیرہ۔“

”انٹی میں اپنے ماما، پاپا کی بس ایک ہی بیٹی ہوں اور باقی رشتے داروں سے کوئی خاص ملنا جلتا نہیں۔ ویسے یہاں قریب میں ہی میرے پاپا کے دو۔“

اقبال انکل، وہی پاکستان میں میرے کیرئیر ٹیکر ہیں۔“

”اچھا۔ اچھا ویسے اس روز میں نے تمہیں دیکھا تو تمہارے چہرے میں مجھے یورپین جھلک نظر آئی تھی۔ خاص طور پر تمہاری سبز آنکھوں میں۔“

”جی۔۔۔ میری ماما امریکن تھیں اور پاپا پاکستانی۔“

”ہوں۔۔۔ تمہیں دیکھ کر لگتا ہے تمہاری ماں بہت

روٹین چیک اپ کروا رہی ہیں۔ ٹھیکل۔!“ ساتھ ہی انہوں نے اس کے عدم تحفظ کے احساس کو کم کرنے کے لیے اپنے ملازم کو بھی آواز دے ڈالی۔

”بیٹھو۔“ انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے بیٹھے ہی وہ خود بھی بیٹھ گئے۔

”اس میں کیا ہے؟ کیا بنا کر لائی ہو؟“ انہوں نے ڈش کا ڈھکن اٹھایا۔

”یہ اسٹیکس ہیں۔ وہ ایک چوٹلی مجھے پاکستانی روایتی ڈشز بتائی تھیں آتیں، اس لیے۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مزید کیا بولے۔

”کیوں بھی۔ پاکستان میں رہتی ہو اور پاکستانی ڈشز ہی بنانا نہیں آتیں۔“ انہوں نے باؤل میں سے ایک چھوٹا سا پیس لے کر اپنے منہ میں ڈالا۔

”جی سر! بلایا آپ نے۔“ اس کے جواب دینے سے پہلے ہی ان کا ملازم آگیا۔

”ہاں۔ دیکھو ماں فارغ ہوئیں یا نہیں؟“

”جی سر!“ ٹھیکل سر کے اشارے سے اھل کو سلام کر کے ایک کمرے میں چلا گیا۔

”ویسے یہ جو کچھ بھی تم نے بنایا ہے، اچھا، مزے دار ہے۔“

”تھنکس۔“ اس نے کچھ شرماتے ہوئے ان کی تعریف قبول کی۔

چند لمحوں بعد ہی ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور وہیل چیئر پر سفینہ آنٹی باہر آئیں۔ وہ انہیں دیکھ کر کھڑی ہو گئی، ان کے پیچھے ایک لیڈی ڈاکٹر بھی تھی۔

اھل نے انہیں سلام کیا۔

”ارے تم۔ آؤ بھئی۔ کیسی ہو۔“ سفینہ بیگم نے خوشی سے کہا۔

”جی ڈاکٹر! کیا رپورٹ ہے؟“ میجر صاحب بھی کھڑے ہو چکے تھے۔ ”یوری تھنگ از فائن۔“ شی از

پرفیکٹلی آل رائٹ۔“ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”گڈ۔ پلیز جوائن اٹ۔“

کو شادی کے آٹھ سال بعد اس حادثے نے جہاں زیب کی دنیا ہی اچاڑ دی۔ بہت سمجھایا اسے کہ دوسری شادی کر لے، پروہ کہتا ہے محبت ایک بار ہوتی ہے اور میں اپنے حصے کی محبت کر چکا۔

”یا اللہ! ایسی محبت کرنے والے بھی ہوتے ہیں۔“
مبصر صاحب کا دکھ اسے اپنے اندر اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اسی اثنا میں اس کے موبائل کی بیل بج اٹھی، دیکھا تو شہین کا مسیج تھا۔

”فورا“ پیچے آجاؤ۔ ڈنر کے لیے جانا ہے، ہم سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ مسیج پڑھتے ہی وہ اٹھ گئی۔

”او کے آئی! میں چلتی ہوں۔ اقبال انکل کی فیملی میرا سٹ کر رہی ہے پارکنگ میں۔“

”او کے بیٹا! بہت اچھا لگا تمہارا آنا۔ پھر کسی وقت دوبارہ چکر لگانا۔“

”شیور آئی۔!“ جیسے ہی وہ واپسی کے لیے پلٹی، اسی وقت مبصر صاحب اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔

”کہاں بھیجی۔ اتنی جلدی جارہی ہو بیٹھونا“ ابھی۔“

”جی وہ اب کھجوا ٹلی۔“ مبصر صاحب پر نظر پڑتے ہی اس کے احساسات عجیب سے ہو گئے۔

”جہاں زیب! اہمل کے انکل اس کا نیچے انتظار کر رہے ہیں۔“

”او کے۔ چلو پھر نہیں روکتے۔“ اہمل دھیرے سے مسکرا کر اپارٹمنٹ سے باہر آگئی۔

اس دن کے بعد سے وہ سفینہ بیگم کے گھر نہیں گئی تھی، پر ایک کام وہ غیر ارادی طور پر روزانہ کرتی تھی، رات کا کھانا کھا کر عشاء کی نماز پڑھ کر وہ بالکنی میں آجاتی اور سگار کی خوشبو کو دھیرے دھیرے اپنے اندر اتارنی رہتی۔



”واچ مین۔ واچ مین۔“ وہ پیدل ہی پارکنگ سے نکل کر بلڈنگ کی پچھلی طرف آئی۔

خوب صورت عورت ہوں گی۔“ ان کی بات سن کر اہمل کے چہرے پر چھائی مسکراہٹ تشویش بھری سنجیدگی میں بدل گئی وہ اندر ہی اندر گھبرا گئی کہ اب نہ جانے یہ کیا کچھ پوچھیں گی۔

”جی۔“ بدقت تمام اس کے منہ سے نکلا، پھر اس نے فورا ہی بات کا رخ موڑ دیا۔ ”آئی آپ کی یہ پر اہم پیدائشی ہے یا حادثاتی۔“ اس نے وہیل چیئر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ سب پندرہ سال پہلے ایک حادثے میں ہوا۔ میں اور تمینہ اسلام آباد سے ایبٹ آباد جا رہے تھے کہ ایک موٹر مٹرے ہوئے سامنے سے تیز رفتار بس آگئی۔

ڈرائیور نیا تھا، وہ پتویشن سمجھ نہیں پایا اور کچھ زیادہ ہی گاڑی کنارے کی طرف موڑ دی۔ نیچے گہری کھائی تھی، تمینہ اور ڈرائیور موقع پر ہی دم توڑ گئے اور میں بد نصیب بچ تو گئی، پر میری دونوں ٹانگیں ناکارہ ہو گئیں۔ بس جب سے اس وہیل چیئر کا ساتھ ہے۔

جہاں زیب مجھے لندن لے گیا تھا، بہت علاج کرایا۔ پر ان بے جان ٹانگوں میں جان نہ بڑ سکی۔“ یہ بتاتے ہوئے سفینہ بیگم کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔

”اوہ! سوری آئی! انجانے میں میں نے آپ کا دل دکھادیا۔“ اسے یہ سب سن کر بہت افسوس ہوا تھا۔

”کوئی بات نہیں۔ یہ باتیں تو اپنوں کو یاد کرنے کا بہانہ بن جاتی ہیں۔“

”تمینہ آپ کی۔“ اسے تجسس ہوا۔

”بسو تھی میری، جہاں زیب کی بیوی۔“

”اچھا۔ تو پھر۔“ مبصر صاحب نے شادی نہیں کی دوبارہ۔“

”نہیں۔ میں نے بہت کہا، آج تک کہتی ہوں، پر وہ مانتا ہی نہیں، تمینہ میرے دیور کی بیٹی تھی۔ جہاں زیب اور تمینہ ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔

خاندان میں سب ہی اس رشتے پر خوش تھے۔ ہم بہت دھوم دھام اور ارامنوں سے تمینہ کو بیاہ کر لائے تھے۔

شادی کے بعد بھی دونوں کی محبت دن بہ دن بڑھتی ہی گئی، پر نہ جانے کس کی نظر کھا گئی میرے ہنستے ہنستے گھر

”پیس میڈم۔“ واج من اسے دیکھ کر بھاگا ہوا آیا تھا۔

”کیا ہوا؟ یہ لفت کیوں بند ہے۔“

”میڈم! پروجیکٹ کے پاور پلانٹ میں کچھ پر اہم ہے کام ہو رہا ہے جلد ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اوہ گاڈ! کتنا ٹائم لگے گا۔“ وہ سخت کوفت میں مبتلا ہو چکی تھی۔

”میڈم! ایک سے ڈیڑھ گھنٹہ تو لے گا بھی۔“

”اوہ نو! میرے پاس کافی سلمان ہے۔ وہ اٹھا کر میں اوپر تک کیسے جاؤں گی۔“ آج وہ عام گروسری کے ساتھ ساتھ اپنی پسند کی کافی ساری بکس اور سی ڈیز بھی لائی تھی اور آج ہی بجلی کا مسئلہ بن گیا تھا۔

”میڈم! آپ کا سلمان میں اوپر پہنچا دیتا ہوں“ آپ فوراً تھک رہی تھی۔

”ہاں ٹھیک ہے“ لے چلو اور سنو 408 کے سامنے رکھ دیتا“ کسی اور پارٹمنٹ میں نہ دے دیتا۔“ اس کی اور واج من کی رفتار میں فرق تھا۔ اس لیے اسے خیال آیا کہ یہ کسی اور پارٹمنٹ میں سلمان نہ دے آئے۔

وہ خود اب آرام آرام سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر جا رہی تھی پر فوراً تھک رہی تھی۔ اس کے لیے مشقت طلب کام تھا۔ تھوڑے فلوور تک پہنچتے پہنچتے اسے لگا اس کی ٹانگوں سے جان نکلتی جا رہی ہے وہ بمشکل تمام خود کو گھسیٹتی ہوئی فوراً تھک رہی تھی۔ سیڑھیوں کی طرف مڑی کہ اچانک تیزی سے اوپر سے اترتے شخص سے ٹکرائی۔ قریب تھا کہ وہ پیچھے سیڑھیوں پر لڑھک جاتی پر وہ مضبوط ہاتھوں نے اسے سہارا دیا اور بازوؤں نے اپنی پناہ میں لے لیا۔ خوف سے اس کی آنکھیں سختی سے بند ہو چکی تھیں اور اس کے ہاتھوں نے سامنے والے کاکلر اور بازو سختی سے دبوچ رکھا تھا۔

”اے اے!“ بہت ہی خوب صورت مدھم سرگوشی بن کر اس کے کانوں میں ڈھلتی آواز اسے چونکا گئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو میجر جہاں زیب کو سامنے پایا۔

انہیں خود سے اتنا قریب دیکھ کر اس نے ایک جھٹکے سے خود کو الگ کرنا چاہا، پر سنبھل نہ پائی اور ایک بار پھر وہ سیڑھیوں پر پھسلنے لگی تھی، پر اب کی بار اس کے وجود کے گرد ان کے بازوؤں کا حلقہ زیادہ تنگ ہوا تھا۔

”کیا کر رہی ہو، گر جاؤ گی، سنبھالو خود کو۔“ انہوں نے اسے اپنی طرف کھینچ کر دو قدم پیچھے ہو کر دیوار کے ساتھ ٹکا دیا اور اپنے بازوؤں کی گرفت سے اسے آزاد کیا۔ شرم اور گھبراہٹ سے اس کی نگاہیں زمین میں گر گئیں تھیں۔

”اب ٹھیک ہو۔“ ان کے لمبے میں پہلے والی نرمی لوٹ آئی تھی، اہل نے ان کی طرف دیکھے بغیر سر کو اثبات میں جنبش دی۔

”سلی گرل!“ انہوں نے اس کے سر پر ہلکی سی چپٹ لگائی اور سیڑھیوں کی طرف مڑ کر نیچے اتر گئے۔

پارٹمنٹ میں آتے ہی اس نے سلمان شیعٹ پر رکھا اور خود بیڈ روم میں آکر بیڈ پر گر گئی، اسے ابھی تک سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کے ساتھ ہوا کیا، ایک خیال، ایک آواز، ایک خوشبو اس کے حواسوں پر بری طرح چھا گئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی پلکوں کی باڑھ توڑ کر آنسوؤں کی لڑیاں اس کے گالوں پر بننے لگیں۔ سانس تیز تیز چلنے لگا اور دل اتنے زور سے دھڑکنے لگا جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔ وہ بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”نہیں۔ اب نہیں۔ ایک بار پھر میرے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا، نہیں ہو سکتا۔“



”اے اے!“ وہ اپنے دھیان میں نل فائل کیے جا رہی تھی۔ ”اے اے!“

”ہاں۔“ شہرین کے دو سری بار اتنے قریب سے پکارنے پر وہ بری طرح چونکی تھی۔

”کیا بات ہے، سب ٹھیک تو ہے نا؟“ شہرین کو اس میں ایک واضح تبدیلی محسوس ہوئی تھی۔

اے اے بہت اکتھو لڑکی تھی پر پچھلی چند ملاقاتوں

”بخوس! پتا تھا یہ ہی کہوگی، مرویس میں لاتی ہوں۔“
شرین برا منہ بناتی چلی گئی۔

اہل خستے ہوئے دو قدم پیچھے ہوئی تو دوسری طرف سے بھاگ کر آتے ایک بچے سے ٹکرائی۔ اس کا برس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ اس نے پلٹ کر بچے کو زور سے آواز دی۔ ”لوئے“ پر بچہ شرارت سے ہنسا اور بھاگ گیا۔ اس نے مڑ کر اپنا برس اٹھاتا چاہا، پر اس سے پہلے کہ وہ جھکتی اس نے دیکھا گولی اس کا برس اٹھا رہا تھا۔

”تھمکنس۔“ پر جیسے ہی وہ شخص برس اٹھا کر سیدھا کھڑا ہوا اہل کو ایک جھٹکا لگا۔ مگر جہاں زب اس کے سامنے کھڑے تھے مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے۔

”کہاں کہاں ٹکراتی پھرتی ہو لڑکی! لگتا ہے سارے زمانے سے ٹکرانے کا ٹھیکہ اکیلے تم نے ہی لے رکھا ہے۔“ وہ شرارت ہی شرارت میں اسے کچھ یاد دلا رہے تھے۔

”جی۔ نہیں تو۔ وہ۔ ایک چوہلی میں شاپنگ کے لیے آئی تھی۔“ چند ہی لمحوں میں اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر انہیں جواب دیا۔
”میرا خیال ہے شاپنگ مال میں لوگ شاپنگ کے لیے ہی آتے ہیں۔“ ان کے شرارتی انداز پر وہ صبر سے مسکرا دی اور وہ جب جب مسکراتی تھی وہ اپنی نظر اس پر سے ہٹاتا بھول جاتے تھے۔
”مکمل ہو۔“

”ہیں، میری دوست شرین بھی میرے ساتھ ہے۔“ اس نے فریج فراز لاتی شرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”لو کھاؤ اور عیش کرو۔ تم بھی کیا یاد کرو گی کسی رئیس سے پالا بڑا تھا۔“ شرین دونوں ہاتھوں میں بمشکل گرم گرم فریج فراز سنبھالتی ہوئی لائی تھی۔ اور اپنی محویت میں۔ مگر صاحب کو دیکھا ہی نہیں تھا۔

”بھئی تھوڑے فریج فراز، ہمیں بھی مل جاتے تو ہم بھی یاد رکھتے کہ کس رئیس سے پالا پڑا ہے۔“ میجر

سے وہ نوٹ کر رہی تھی کہ اہل کچھ گرم صم سی ہے بات کرتے کرتے بھول جاتی ہے کہ وہ کیا کہہ رہی تھی کام کرتے کرتے اس کے ہاتھ رک جاتے۔ ہستے ہستے اس کی آنکھوں میں نمی اتر آتی۔ نہ جانے اسے کیا ہو رہا تھا۔

”ہاں۔ سب ٹھیک ہے، کیوں کیا ہوا؟“ اہل نے حیرت سے پوچھا۔

”پتا نہیں کیوں، تم مجھے کچھ عجیب عجیب سی لگ رہی ہو۔“

”تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو، ایسی کوئی بات نہیں جو عجیب ہو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے شرین سے نگاہ چرائی تھی۔

”آریو شیور۔“ شرین نے کچھ بے یقینی سے پوچھا۔

”اوہ کم آن شرین۔ آف کورس۔“ اہل نے ہستے ہوئے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”اچھا بھئی۔ چلو چل رہی ہو۔“
”کہاں جانا ہے۔“ اہل نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”یہاں قریب ہی ایک شاپنگ مال میں ڈیزائن ویئر شاپس پر سیل لگی ہے۔ چلتے ہیں، کچھ سردیوں کے لیے شاپنگ کر لیتے ہیں، کیا خیال ہے۔“

”اچھا خیال ہے، مجھے بھی کچھ نئی چیزیں لینی ہیں۔ جو میں امریکہ سے لائی تھی وہ سب اب بالکل رف ہو گئی ہیں۔“ اہل نے الماری میں سے اپنا ہینڈ بیگ نکالا اور دونوں لبار ٹمنٹ سے باہر آ گئیں۔

ایئر کنڈیشن مال میں داخل ہوتے ہی اسے سردی کا احساس ہوا تو اس نے اپنے شانوں پر شال پھیلا لی۔ کچھ دیر وہ دونوں ایسے ہی گھومتی رہیں، انہیں ابھی تک اپنے مطلب کی کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی۔

”فریج فراز کھاؤ گی۔“ شاپنگ کے دوران کھانا پینا شرین کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

”ضرور تم کھاؤ گی تو ضرور کھاؤ گی۔“ اہل نے ہنس کر کہا۔

”فریج فراز کھاؤ گی۔“ شاپنگ کے دوران کھانا پینا شرین کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

”ضرور تم کھاؤ گی تو ضرور کھاؤ گی۔“ اہل نے ہنس کر کہا۔

”فریج فراز کھاؤ گی۔“ شاپنگ کے دوران کھانا پینا شرین کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

لحموں کے لیے اہمل ان کے ہنستے مسکراتے چہرے سے نگاہ ہٹانا بھول گئی۔

”ارے سر! کچھ نہ پوچھیں۔ میری ماما کی چوائس تو مجھ سے زیادہ تنگ ہے۔ وہ تو مجھے ہر وقت ٹوکتی رہتی ہیں۔ یہ کیا ڈل کلر پہن رکھا ہے۔ یہ کیسے بوڑھوں والے شوز لے آئی ہو۔ وہ تو سر سے لے کر پیر تک فل میچنگ میں رہتی ہیں۔“ شہرین نے مزے سے رخسانہ آنٹی کی چند باتیں انہیں بتائیں۔

”آں ہاں اور تمہاری ماما وہ بھی شہرین کی ماما جیسی ہیں۔“ انہوں نے اہمل سے پوچھا تھا۔ اہمل نے جواب دیے بغیر منہ دوسری طرف کر لیا، پراس کی سبز آنکھوں میں اترنے والا کرب میجر صاحب کی زیرک نظروں سے چھپانہ رہ سکا تھا۔

”آئیں، اس گفٹ شاپ میں آنٹی کے لیے کچھ دیکھتے ہیں۔“ اور پھر وہ ان دونوں سے پہلے خود ہی اس دکان میں چلی گئی۔

میجر صاحب نے ان دونوں کے مشورے پر سفینہ بیگم کے لیے ایک سوئس ریسٹ وائچ خریدی۔

”اوکے گرلز! تھینک یو سوچ۔“ انہوں نے آنکھوں پر ڈارک گلاسز لگاتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ اہمل نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ بس ایسے ہی یہ گفٹ اپنی ماں کو دے دیں گے۔“ شہرین نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

”ایسے ہی کیا مطلب، کیسے دینا چاہیے گفٹ۔“ جواباً میجر صاحب نے بھی حیرت سے پوچھا۔

”میرا مطلب آپ ان کا برتھ ڈے سلیبویٹ نہیں کریں گے۔“

”آپ بتائیں کیسے سلیبویٹ کریں۔ میں تو ہمیشہ ایسے ہی دے دیتا ہوں۔“

”آپ کو چاہیے کہ ایک خوب صورت سا کے اور کپک آنٹی کے لیے لے کر جائیں اور جب وہ کیک کائیں تو انہیں برتھ ڈے وش کرتے ہوئے یہ گفٹ دیں۔“ شہرین نے اپنے خیال میں ایک بہترین آئیڈیا

صاحب نے اسے خود ہی اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

”جی۔“ شہرین نے حیرت سے پہلے ان کی پھر اہمل کی طرف دیکھا۔

”ریشارڈ میجر جہاں زیب احمد۔ میرے ساتھ والے اپارٹمنٹ 407 میں رہتے ہیں۔“ اہمل نے ساوگی سے ان کا تعارف کرایا۔

”اوہ۔ تو آپ اہمل کے پڑوسی ہیں۔ پلیز لیس نا۔“ شہرین نے پیکٹ ان کی طرف بڑھایا۔

”تھینک یو۔“ میجر صاحب نے چند فرائز نکال کر اپنے منہ میں رکھ لیے۔

”ویسے گرلز! تم لوگ مجھے اچھے ٹائم پر ملیں۔“ تھوڑی میری ہلپ کرونا۔

”وبائی ناٹ۔ پلیز بتائیے۔ ہم آپ کی کیا مدد کریں۔“ شہرین نے سچویشن کو انجوائے کرتے ہوئے کہا۔

”آج میری ماں کا برتھ ڈے ہے۔“

”ریسی۔“ اہمل نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ہاں اور مجھے ان کے لیے ایک اچھا سا گفٹ لینا ہے۔“

”تو کیا آپ نے پہلے کبھی ان کی کسی برتھ ڈے پر انہیں گفٹ نہیں دیا۔“ شہرین کو کچھ حیرت ہوئی۔

”نہیں گفٹ تو میں انہیں ہر سال اس موقع پر دیتا ہوں، پر پچھلے چند سالوں سے میں جو بھی ان کے لیے لے کر جاتا ہوں تو وہ کہتی ہیں۔ ارے بیٹا یہ کیا تم جوان لڑکیوں والا گفٹ لے آئے ہو میرے لیے، یہ میں کہاں استعمال کروں گی۔ تو تم لوگ مجھے کوئی بوڑھوں والا گفٹ سلیکٹ کرنے میں ہلپ کرو۔“ ان کی اس بات پر دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”سر! آپ کو کیا لگتا ہے، ہمیں بوڑھوں کی شاپنگ کا کوئی تجربہ ہوگا۔“ شہرین نے شرارت سے میجر صاحب سے پوچھا۔

”آف کورس ناٹ۔ پر تم لوگ اپنی ماما کے لیے بھی تو کچھ لیتی ہو گی نا۔“

میجر صاحب نے اس کی بات پر ہنستے ہوئے کہا تو چند

دیا انہیں۔

”ہوں۔ آئیڈیا اچھا ہے، پر کیک کا نئے وقت
تالیاں بجانے والے بھی تو ہونے چاہئیں۔ اگر یہ کمی تم
دونوں پوری کرو تو اس آئیڈیے پر عمل کیا جاسکتا
ہے۔“

”شیور سر! وہائی ناش۔ بتائیں کب آنا ہے۔“ میجر
صاحب کی دعوت نے شہرین میں جوش و خروش بھر
دیا۔ اس تھوڑی سی دیر میں وہ ان سے خاصی فرینک
ہو گئی تھی۔

”بس تم لوگ شاپنگ سے فارغ ہو کر آ جاؤ۔“

”نہیں میں۔ میں اس وقت بڑی ہوں۔ میں
نہیں آسکوں گی۔“ اہمل نے کچھ گھبرا کر کہا۔
میجر صاحب کی موجودگی اسے عجیب سے احساس
سے دوچار رکھتی تھی۔

”کم آن اہمل! تم تو ایسی بات نہ کرو۔ تمہیں تو
میری ماں بہت یاد کرتی ہیں۔ اس خاص موقع پر آ جاؤ گی
تو وہ بہت زیادہ خوش ہوں گی۔“ انہیں اہمل کی بات
سے افسوس ہوا۔

”ارے اس کو چھوڑیں سر! یہ تو پہلے ہی آدم بے
زار ہے۔ یہ میں اسے کھینچ کھانچ کر لے آؤں گی۔“
میجر صاحب ہماری نظروں سے اہمل کے تاثرات نوٹ
کر رہے تھے۔

اور پھر واقعی شہرین اہمل کو کھینچ کھانچ کر سفینہ بیگم
کی طرف لے گئی۔ وہ ان دونوں سے مل کر بہت خوش
ہوئیں۔ میجر صاحب کیک لے آئے تھے، دونوں
لڑکیوں نے مل کر ٹیبل سیٹ کی اور جب سفینہ بیگم نے
کیک کاٹا تو ان دونوں کے ساتھ مل کر میجر صاحب نے
بھی تالیاں بجاائیں، جھک کر ماں کے ماتھے پر بوسا دیا اور
سینے سے لگا کر دیکھا۔ اس بے حد خوب صورت منظر
کو اہمل نے اپنے دل میں اور شہرین نے اپنے موبائل
میں محفوظ کیا تھا۔ وہ دونوں بھی سفینہ بیگم کے لیے ایک
خوب صورت مثال لے کر آئی تھیں۔

اسی بل ڈور ٹیل بج اٹھی۔ چند لمحوں بعد ٹکیل
ایک گفٹ پیک ہاتھوں میں لیے سفینہ بیگم کے پاس

آیا۔

”یہ کوریئر آپ کے لیے لایا ہے۔“ ٹکیل گفٹ
پیک ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔

”ماں یہ تو لندن سے ہے۔“ اور پھر انہوں نے
کھول دیا۔ اندر چائینڈز نقش و نگار سے مزین تین
خوب صورت سرونگ باؤلز تھے اور ساتھ میں ایک
وشنگ کارڈ جس پر ایک گلاب کا پھول بنا ہوا تھا۔ بھیجنے
والے کا ٹیسٹ کمال کا تھا۔ کارڈ کے اندر لکھا تھا۔ ”تو
مائی سوٹ ہارٹ، مائی ڈارلنگ دادو، دادو اے بگ لوفرام
کاشان۔“

”کاشان۔“ اہمل نے کارڈ پڑھ کر سوالیہ نظروں
سے میجر صاحب کی طرف دیکھا۔

”بٹنا ہے میرا لندن میں رہتا ہے وہ۔“ انہوں نے
اپنے دام میں جانب کی دیوار کی طرف اشارہ کیا، جہاں
ایک نہایت خوبو اور شوخ لڑکے کی تصویر لگی ہوئی
تھی۔ سفینہ بیگم اتنی ڈھیر ساری محبتیں ایک ساتھ پا کر
آبدیدہ ہو رہی تھیں۔

”ماں کاشان کا میسج ہے۔ آپ کو سکاٹ پر کال
کر رہا ہے۔ آپ تھوڑی دیر اس سے بات کر لیں۔“
میجر صاحب نے موبائل پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے
کہا۔

”ارے پر یہ بچیاں کیا سوچیں گی کہ مہمانوں کو
چھوڑ کر میزبان غائب ہو گئے۔“ وہ اپنے پوتے سے
بات کرنا تو چاہ رہی تھیں، پر انہیں اچھا نہیں لگ رہا تھا
کہ وہ ان بچیوں کو چھوڑ کر خود کمپیوٹر کے سامنے جا
بیٹھیں۔

”ارے نہیں آنی! آپ بات کریں، ہم اب چلتے
ہیں۔ پھر کبھی آ جا میں گے۔“ اہمل نے موقع غنیمت
جان کر نکلتا چاہا۔

”اچھا جناب! آپ تو چلی جائیں گی اور وہ اتنا بڑا پڑا
جو میں آپ لوگوں کے لیے لایا ہوں، وہ میں اکیلا کھاؤں
گا کیا؟ ماں اور ٹکیل تو صرف ویسی کھانے ہی کھاتے
ہیں۔“

”ایسی بات ہے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں، ہم آپ کا پڑا

اس کے پیچھے سے سامنے آئے اور ہاتھ بڑھا کر کتاب اتاری۔ وہ اس کے اتنے قریب تھے ان کے وجود سے اٹھنے والی مہک اہل کے وجود میں اترنے لگی۔ انہوں نے کتاب اہل کی طرف بڑھائی، پر وہ کتاب کی طرف کیا دیکھتی، اس کی نظروں نے ان کے دلکش چہرے سے ہٹنے سے انکار کر دیا تھا۔ چند لمحے انہوں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، پر کچھ سمجھ نہیں پائے۔

”کیا ہوا؟“ ان کی آواز سن کر وہ حواسوں میں واپس آئی۔

”جی۔ کچھ نہیں۔ وہ سوری میں بغیر اجازت کے اندر آگئی۔“ اس نے فوراً معذرت کی۔

”اچھا کیا۔ اگر تم ایسے نہ آتیں تو مجھے کیسے پتا چلتا کہ ان کتابوں کا میرے علاوہ بھی کوئی قدر دان ہے۔“

ان کی اس بات پر اہل نے مسکرا کر کتابوں کی طرف دیکھا۔

”کتاب میری کمزوری ہے، میں بہت چھوٹی تھی، تب میرے پیامیرے لیے چھوٹی چھوٹی اسٹوری بکس لاتے تھے۔ پھر جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی کتابیں بھی بڑی ہوتی گئیں۔ ہم دونوں نے مل کر اپنی ایک چھوٹی سی لائبریری بنالی تھی، ہر ماہ اس میں ایک دو نئی کتابوں کا اضافہ ہوتا تھا۔“ بات کرتے کرتے اس کی نظر میراج صاحب پر پڑی تو اسے احساس ہوا، وہ اس کے چہرے کی کتاب کو بہت دلچسپی سے پڑھ رہے تھے۔ اس نے خاموشی سے چہرہ جھکا لیا۔

”چپ کیوں ہو گئیں، بولو نا۔ تم کم بولتی ہو، پر اچھا بولتی ہو۔“

”میرے پیامیرے تھے زیادہ بولنے سے بعض اوقات انسان اپنی عزت کم کر لیتا ہے۔“

”پیامیرے بہت محبت تھی؟“

”وہی تو تھے میرا سب کچھ اور اب ان کی یاری ہی میرا کل اثاثہ ہیں۔“

”اور ماما؟ ان سے محبت نہیں تھی؟“ اس کی آنکھوں میں اترنے والا کرب وہ ابھی تک نہیں بھولے تھے۔

کھانے میں بھرپور ساتھ دیں گے۔“

”شیریں۔“ اہل نے دلی آواز میں غصے سے شیریں کو پکارا، جانتی تھی کہ پڑا اس کی کمزوری ہے اب وہ اور پھیل جائے گی۔

”گڈ گرل، یہ ہوئی ثابت۔ آپ لوگ بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔“ پھر وہ سفینہ بیگم کی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

”شیریں یہ اچھی بات نہیں ہے۔“ ان کے جاتے ہی اہل نے اندر دے ہوئے غصے کو آزاد کیا۔

”چل ناں یار! اپنے لپار ٹمنٹ میں جا کر بھی توٹی وی ہی دیکھنا ہے تو یہاں دیکھ لیتے ہیں۔“ شیریں مزے سے صوفے پر ٹانگیں اوپر کر کے بیٹھ گئی اور چھٹل سر جنگ شروع کر دی۔

اہل کچھ دیر بے مقصد ادھر ادھر دیکھتی رہی، پھر ایک کمرے کی جانب بڑھ گئی، یہ اس کے لپار ٹمنٹ کے مقابلے میں کافی بڑا لپار ٹمنٹ تھا اور اس کا اسٹرکچر بھی بالکل الگ تھا۔ کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر دیکھا تو وہ حیران رہ گئی۔ یہ کمرہ نہیں، پوری لائبریری تھی، جس کی تین دیواروں میں بڑی بڑی الماریاں نصب تھیں۔ چوتھی دیوار کے آگے بڑی سی ٹیبل اور اس کے پیچھے ریو الونگ چیئر تھی۔ ٹیبل پر لمپ ٹیپ ٹاپ اور کافی ساری فائلز تھیں۔ اہل کی چند ایک کمزوریوں میں سے ایک کتاب تھی اور اتنی ساری کتابیں دیکھ کر وہ رہ نہیں پائی، ایک ایک الماری کے پاس جا کر دیکھتی۔ تمام کی تمام کلکشن لاجواب تھی۔ ایک جگہ وہ رک گئی۔ الماری کے سب سے اوپر والے حصے میں اسے، سٹری آف گاڈ نظر آئی تھی۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اوپر کی طرف اٹھا۔ پر وہ کتاب اس کی رینج سے باہر تھی۔ اس نے مایوس ہو کر ہاتھ کھینچ لیا۔

”میں اتار دوں۔“ خوب صورت، مدھم سرگوشی بن کر کانوں میں ڈھلتی آواز ایک بار پھر اسے چونکا گئی۔ کتابوں کی دنیا میں وہ ایسی کھوئی تھی کہ اسے پتا بھی نہ چلا کہ وہ اندر آئے اور اس کے انہماک کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے قریب چلے آئے۔ وہ

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

”ضرور آئی۔ میں لے جاؤں گی۔ آپ مجھے ان ڈرائیپس کا نام نوٹ کروادیں۔“
مارگلہ ٹاور کی طرف آتے ہوئے اس نے ایک میڈیکل اسٹور سے ڈرائیپس خریدے۔ اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ میجر صاحب سے اس کا سامنا نہ ہو، پر ان کے بیمار ہونے کا سن کر وہ اندر سے بے چین ہو گئی تھی۔ فورتحہ فلور پر آتے ہی وہ 407 کی طرف آئی۔ بیل بجانے کے کافی دیر بعد دروازہ کھلا۔ بلیک شلوار قمیص میں آف وائٹ شل کاندھوں پر ڈالے وہ اس کے سامنے تھے۔ بال کچھ بکھرے ہوئے، چہرے پر تھکن کے آثار اور آنکھوں میں گہری سرخی، وہ دیکھتی چلی گئی۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام، کیسی ہو۔“ آج انہوں نے اسے اندر نہیں بلایا تھا۔

”ٹھیک ہوں میں آپ کے لیے یہ لائی تھی۔“ اس نے ڈرائیپس ان کی طرف بڑھائے۔

”ارے۔۔۔ پر تمہارے پاس یہ کیسے۔“ ڈرائیپس دیکھ کر انہیں حیرت کا جھٹکا لگا۔

”مجھے سفینہ آئی نے فون پر بتایا تھا۔“

”اوہ۔۔۔ میری ماں گریٹ یو آر۔“ انہوں نے آنکھیں بند کر کے سفینہ آئی کو خراج تحسین پیش کیا۔

”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے، ڈاکٹر کو دکھایا۔“

”ہوں۔۔۔ دکھایا تھا، پر دوائی نہیں لی ابھی تک۔“

”کیوں۔“

”کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ کچھ کھاؤں گا تو دوائی لوں گا۔“

”اوکے۔۔۔ آپ آرام کریں میں چلتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے اپارٹمنٹ کی طرف آگئی۔

اپنے معمولات پنپاتے ہوئے اس کا دھیان میجر صاحب کی طرف لگا رہا تھا۔ کھانا کھانے بیٹھی تو دھیان آیا، پتا نہیں انہوں نے ابھی تک کچھ کھایا ہو گا یا نہیں، دوائی لی ہوگی یا نہیں۔ پھر اس سے کھانا کھایا ہی نہیں

”ان سے بھی تھی، ماں سے تو محبت ہوتی ہی ہے۔“ اس کے چہرے پر ناگواری پھیلی تھی۔ ”مشہرین باہر اکیلی ہوگی، اس کے پاس چلتے ہیں۔“ کہیں ٹاپک لبانہ ہو جائے اس لیے اس نے راہ فرار چاہی۔
”اے۔۔۔“ میجر صاحب کی آواز پر اس کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔
”کہہ دینے سے دل کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔“

”پر کچھ دکھ ایسے پھوٹیوں کی مانند ہوتے ہیں جو پھوٹ جائیں تو ہر طرف تعفن ہی تعفن پھیلا دیتے ہیں۔“ یہ کہتے ساتھ ہی وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔
پر اس کی آنکھوں میں دکھوں کی اذیت دیکھ کر ان کے قدم وہیں جم گئے۔

آج آفس سے اٹھتے اٹھتے اسے کافی ٹائم ہو گیا تھا۔ جیسے ہی وہ آفس سے باہر آئی اس کا فون بج اٹھا۔ ”سفینہ آئی کالنگ۔“ اس نے کال ریسیو کی۔

”السلام علیکم! جی آئی کیسے۔“

وعلیکم السلام، جیتی رہو، اے۔۔۔ ایک کام تھا اگر کر سکو تو۔

”جی آئی کیسے نا۔“

”بیٹا میں اس وقت ایبٹ آباد میں ہوں، شکیل بھی میرے ساتھ ہے۔ یہاں ہماری زمینوں کا کچھ مسئلہ تھا۔ ویسے تو جہاں زیب ہی تمام معاملات سنبھالتا ہے، پر کل رات اسے بخار بھی ہو گیا۔ وکیل سے ملنا ضروری تھا۔ اس لیے اسے آرام کرنے کا کہہ کر میں شکیل کے ساتھ آگئی۔ سوچا تھا شام سے پہلے واپس آ جاؤں گی، پر یہاں بہت تیز بارش ہو رہی ہے۔ شکیل اتنا اچھا ڈرائیور نہیں ہے، اس لیے جہاں زیب واپس آنے سے منع کر رہا ہے اور وہاں اس کا بخار تیز ہو گیا ہے۔ بخار میں اس کی آنکھیں سرخ ہو کر جلنے لگتی ہیں۔ ابھی ابھی مجھے یاد آیا کہ جو ڈرائیپس وہ استعمال کرنا ہے، وہ ختم ہو گئے ہیں۔ اگر تم اس کے لیے ڈرائیپس لے جا سکو تو۔“ وہ چپ ہو گئیں۔

گیا۔ اس نے کھانا سمیٹا اور چکن کارن سوپ بنانے لگی۔ ایک باؤل میں سوپ نکال کر وہ ان کے پارٹنمنٹ کی طرف آگئی۔ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو دروازہ کھل گیا۔ شاید اس کے جانے کے بعد وہ دروازہ اندر سے لاک کرنا بھول گئے تھے۔ اندر آکر اس نے دروازہ بند کیا۔ آج اسے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا، بس وہ یہ چاہتی تھی۔ میجر صاحب جلدی سے کچھ کھا کر دوائی لے لیں۔

لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ یقیناً وہ اپنے بیڈ روم میں ہوں گے۔ اس نے بلکے سے دروازہ کھٹکھٹایا، وہ کمرے میں بھی نہیں تھے۔ بیڈ کی چادر اور کبل پے ترتیب تھے۔ ہاتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر باؤل بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھا تو ساتھ ہی اس کی نظر تکیے پر رکھے فوٹو فریم پر گئی۔ اس نے اٹھا کر دیکھا تو ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی کی کافی پرانی تصویر تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ پٹی۔ میجر صاحب تو کئی سے منہ صاف کرتے باہر آ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر چونک گئے۔

”تم؟ اس وقت یہاں۔“ وہ اس کی احتیاط پسند طبیعت سے واقف تھے۔

”میں آپ کے لیے سوپ لائی ہوں۔“ اس نے فریم واپس تکیے پر رکھا اور سوپ کا پیالہ ان کی طرف بڑھایا۔

”شکریہ۔“ اس زحمت کی کیا ضرورت تھی۔ میں کچھ نہ کچھ لے لیتا۔“ جواباً وہ خاموش رہی۔

”بیٹھو۔“ اس کے ہاتھ سے پیالہ لے کر وہ بیڈ پر بیٹھ گئے اور آہستہ آہستہ سوپ پینے لگے۔ وہ بھی ان کے کہنے پر بیڈ کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔

اس کی آنکھیں ان کی سرخ آنکھوں پر جمی تھیں۔ اچھل کے لیے اس دنیا میں کسی بھی مرد کی سرخ آنکھوں سے زیادہ کراہیت انگیز چیز کوئی نہیں تھی۔ پر یہ کیسی آنکھیں تھیں کہ جن کی سرخی اسے ان آنکھوں میں ڈوب جانے کی دعوت دے رہی تھی۔ اسے ہوش و حواس سے بے گانہ کر رہی تھی۔ اس کا یہ

بے باکانہ رویہ میجر صاحب کو الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے نظریں اٹھائیں اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھ ہی لیا۔

”کیا ہوا؟“

”جی۔“ ان کے اس طرح پوچھنے پر وہ چونک گئی۔

”ایسے کیوں دیکھ رہی ہو۔“

”وہ۔ میں دیکھ رہی تھی، آپ کی آنکھیں تو ابھی بھی بہت سرخ ہو رہی ہیں۔“ اس کی بات سن کر وہ ایک بار پھر اطمینان سے سوپ پینے لگے۔

”ہاں۔ ابھی ڈراپس ڈالے ہی نہیں۔“

”یہ تصویر آپ کی۔“ وہ پوچھتے پوچھتے رک گئی۔ انہوں نے سرگھما کر تصویر دیکھی اور پھر چند لمحے دیکھتے ہی رہے۔

”میری بیوی کی ہے۔“

”بہت خوب صورت تھیں۔ شاید اسی لیے آپ نے دوبارہ شادی نہیں کی۔“ اس کی بات سن کر میجر صاحب نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

”بات خوب صورتی کی نہیں ہوتی، دل کے جذبات اور محبت کی ہوتی ہے۔ محبت دلوں کو وہ احساس دیتی ہے کہ محبوب ہو یا نہ ہو، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ محبت خود وجود میں ڈھل جاتی ہے۔ سچی محبت انسان کو ایسا راستہ دیتی ہے جس پر کوئی بھٹکتا نہیں۔“

وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہوئے تو وہ بول اٹھی۔

”محبت اگر اتنی ہی طاقتور ہوتی ہے تو پھر وہ کیسے بھٹک گیا۔ میں نے بھی تو اسے سچے دل سے چاہا تھا۔“ میجر صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”اف۔“ یہ کیا ہو گیا، یہ کیا نکل گیا، منہ سے جس راز کو وہ خود سے بھی چھپاتی آرہی تھی۔ وہ کھلا بھی تو کسی کے سامنے۔ وہ ایک دم گھبرا کر اٹھی۔

”میں چلتی ہوں۔“

”اچھل۔“ انہوں نے نرمی سے اسے پکارا۔ وہ رک گئی، پر ان کی طرف دیکھ نہیں سکی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ وہ بیٹھ گئی، نظر قالین کے ڈیزائن میں الجھی رہی۔

کھانا کھاؤں۔“ ان کی آواز کی نقاہت بتا رہی تھی کہ صبح سے انہوں نے بھی کچھ نہیں کھایا۔
 ”کیوں فکر کرتی ہیں اماں جی! خیر سے گاؤں آگیا ہے نا تو سب ٹھیک ہے۔ آپ کھانا گرم کرو میں اسے لے کر آتا ہوں۔ پھر میں بھی آج آپ کے ساتھ ہی کھانا کھاؤں گا۔“
 ”بسم اللہ! میرا پتر کیوں نہیں۔ جابلدی سے اسے بلا لا۔“

دن کے تین بجے خانو کے ہوٹل پر رش برائے نام تھا۔ اقبال نے دور ہی سے فرہاد احمد کو دیکھ لیا۔ وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھی بنائے ٹیبل پر رکھے بیٹھا تھا۔
 ”اوئے کہاں چلا گیا تھا؟ آتے ہی بغیر بتائے۔ اماں جی گھر میں پریشان ہو رہی ہیں۔“ اقبال نے آہستہ سے اس کے کاندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا اور ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔
 ”حکیم چاچا کی طرف چلا گیا تھا یار۔“ فرہاد احمد نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بتایا۔
 ”خیریت وہاں کیوں گیا تھا۔“ اقبال نے سلور کے جگ سے شیشے کے گلاس میں پانی نکالتے ہوئے پوچھا۔
 ”فون کرتے گیا تھا۔“
 ”کسے۔“
 ”فیض کو۔“

”فیض کو۔ امریکہ؟“ اقبال کی حیرت دوچند ہوئی۔
 ”ہاں۔“ فرہاد نے ٹھنڈی سانس بھری اور ہوٹل سے باہر خانو کی بھینس کو ادھر ادھر گھومتے دیکھنے لگا۔
 ”کیوں کیا ہوا؟ سب خیریت ہے نا۔“
 ”ہوں۔ سب خیریت ہی ہے۔“ فرہاد کا لہجہ بے حد سنجیدہ تھا۔

”اچھا۔ چھوڑو یہ بتا تیرے انٹرویو کا کیا ہوا۔“ اقبال نے فرہاد کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”وہی یار جو ہمیشہ ہوتا ہے۔ کچھ بھی اچھا نہیں ہے میرے پاس بتانے کو۔“
 ”چل چھوڑو۔ گھبرا نا اللہ مسبب الاسباب ہے جلد ہی کوئی اچھی نوکری مل جائے گی تجھے۔“ ہمیشہ کی

”دکھوں کاموا وہمہ جائے تو دل کے زخم بھر جاتے ہیں۔“ مسجانی ان پر مرہم رکھتی ہے۔ زندگی میں کسی نہ کسی کو مسجیانا ہی پڑتا ہے جو ایسا نہیں کرتے ان کی زندگی کو ڈھیوں کی مانند ہو جاتی ہے۔ کیوں اپنی زندگی کو اذیت میں ڈالتی ہو کہہ دو جو دل میں ہے۔“ اہمل کی آنکھوں میں نمی اتر آئی اس نے نم آنکھوں سے ان کی سرخ آنکھوں کی طرف دیکھا۔ ان آنکھوں میں مسجانی کا وعدہ تھا۔ کچھ ماحول کافسوں بھی تھا۔
 اس نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ اس کے دکھ اس کے لفظوں میں بنے لگے۔



حافظ خلیق احمد جہلم سے چند کلو میٹر دور گاؤں ٹوگراں کے رہنے والے تھے نہایت شریف النفس، پرہیزگار، صوم و صلوة کے پابند انسان تھے۔ فرہاد احمد ان کی اور سیکینہ بی بی کی اکلوتی اولاد تھے۔ ورثے میں ماں باپ سے نیک فطرت نرم لہجہ اور کردار کی خوبیاں پائی تھیں۔ غریب ماں باپ نے دن رات محنت کر کے اچھی تعلیم دلوائی تھی۔ براب تین سال سے ایم اے معاشیات کی ڈگری جگہ جگہ لیے پھرتے تھے۔ پرکریں جاب نہیں مل رہی تھیں۔ ہر کوئی رشوت مانگتا یا پھر سفارش اور وہ دونوں چیزیں دینے سے ہی قاصر تھے۔
 رشوت کو ان کا دل نہ مانتا اور سفارش ان غریبوں نے کہاں سے لانی تھی سو آج کل وہ قسمت کے رحم و کرم پر تھے۔ دروازے پر دستک ہوئی تو سیکینہ بی بی بی بیج ہاتھ میں لیے کمرے سے باہر آئیں۔
 ”اقبال پتر تو ہے۔“ دروازے کی طرف قدم بڑھاتے انہوں نے پوچھا تھا۔
 ”جی اماں جی! فرہاد آیا یا نہیں۔“ سیکینہ بی بی نے دروازہ کھولا۔

”ہاں پتر۔ آٹو گیا ہے پر کچھ پریشان تھا۔ آتے ہی نہ جانے کدھر چلا گیا۔ روٹی کھائی نہ پانی پیا جاتے کہہ گیا تھا اقبال آئے تو اسے خانو کے ہوٹل بھیج دینا جاتو میرا پتر پتا تو کسب خیریت ہے نا۔ اسے بلا لا تو میں بھی

طرح آج بھی اقبال نے تسلی دے کر ان کی ہمت بندھانی چاہی تھی۔

جواب میں ایک طنز بھری دھکی مسکراہٹ فرہاد کے لبوں کو چھو گئی۔ ”کچھ بھی اچھا نہیں ہو سکتا یہاں۔ آوے کا آواہی بگڑا ہوا ہے، یہاں کے سٹم میں ہم جیسوں کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں۔ پر اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے اقبال میں ڈگریوں کا کشکول اٹھا کر جگہ جگہ نوکری کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ شہر سے آتے ہوئے میں پاسپورٹ کے لیے اپلائی کر آیا ہوں۔“

”پاسپورٹ۔ کیوں اس کا کیا کرے گا؟“ اقبال فرہاد کی بات سن کر دھکی تھا۔ پاسپورٹ والی بات نے اسے حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔

”میں نے فیض کو فون کر دیا ہے۔ اسپانسر شپ لیٹر بھجوانے کے لیے پچھلی بار جب وہ آیا تھا تو اس نے مجھے کہا تھا کہ میں امریکہ آجاؤں وہ مجھے سیٹ کروادے گا۔“

”کیا۔؟ تو امریکہ چلا جائے گا اور یہاں تیرے بوڑھے ماں باپ کا کیا ہو گا۔ انہیں کس کے آسرے پر چھوڑ جائے گا۔ وہ دونوں تجھے دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں۔ کیا زندہ مارنا چاہتا ہے انہیں۔ فرہاد! کیا ہو گیا ہے یار تجھے۔“ اقبال کو حیرت کے ساتھ دکھ ہوا اس کی بات سن کر۔

”انسان کو اپنی زندگی سنوارنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اقبال آخر تو ہی بتا کب تک نوکری کے لیے جوتیاں چمکتا پھروں یا پھر اتنا پڑھ لکھ کر ابا کی چھوٹی سی کریانے کی دکان پر بیٹھ کر چار چار آٹھ آٹھ آنے والی گولی ٹائی پتوں۔ عمر کے چھبیس سو سال میں لگ گیا ہوں۔ اماں ہر وقت میری شادی کے خواب دیکھنے لگی ہے۔ نوکری ملے نہ ملے اس نے سال دو سال میں میرے سر پر سہرا باندھ دینا ہے۔ کیا یہ ذمہ داری اٹھا پاؤں گا میں۔ آگے اولاد ہوگی تو کیا اپنے بچوں کو اعلا تعلیم دلوا سکوں گا یا میری اولاد بھی ٹاٹ پر بیٹھ کر تختیاں لکھے گی اور پھر کچھ عرصے کی بات ہے نہیں اماں ابا کو بھی بلوالوں گا۔“ فرہاد کی بات سنی سے شروع ہو کر

نری پر ختم ہو گئی۔ اور پھر ایک دن اچانک فرہاد نے اقبال کا دروازہ پیٹ ڈالا۔ جیسے ہی اقبال باہر آیا فرہاد خوشی میں اس سے لپٹ گئے۔

”اوہ شکر الحمد للہ۔ آج میرا یار بہت خوش ہے، لگتا ہے نوکری مل گئی۔“ اقبال نے بھی فرہاد کو کس کر بھینچ لیا۔ اس کی بات سن کر فرہاد مسکراتے ہوئے الگ ہوئے۔

”نہیں یار نوکری تو نہیں ملی، پر آج مجھے امریکہ کا ویزا ضرور مل گیا، یہ دیکھ۔“ فرہاد نے حبیب سے پاسپورٹ نکال کر اقبال کو دکھایا۔ اقبال نے فرہاد کو حیرت سے دیکھا، پھر کچھ دکھ سے اس کے ہاتھ سے پاسپورٹ لے کر دیکھنے لگا۔

”تو آخر تو نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوا تجھ پر۔“

”ایسی بات نہیں ہے اقبال۔“ فرہاد نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”میں نے خود کو قسمت کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ ویزا لگ جاتا تو میری قسمت اور اگر نہیں لگتا تو میں کچھ کرنے کا سوچا تھا۔ اب دیکھ قسمت نے فیصلہ سنا دیا، سالوں دھکے کھانے کے باوجود نوکری نہیں ملی اور ویزا دونوں میں مل گیا، ورنہ تو جا کر

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

کی جانب سے بہنوں کے لیے خوشخبری
خواتین ڈائجسٹ کے ناول گھر بیٹھے حاصل کریں

30 فی صد رعایت پر

طریقہ کار ناول کی قیمت کے 30 فی صد کاٹ کر
ڈاک خرچ - 100/- روپے فی کتاب مٹی آڈر کریں۔

منگوانے اور دستی خریدنے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

دیکھ میرے یار لوگ کیسا کیسا خوار ہو رہے ہیں۔
امریکہ کے ویزے کے لیے۔۔۔“
اقبال چند لمحے خاموش رہا پھر پوچھا۔ ”اور اس کے
لیے تیرے پاس پیسے کہاں سے آئے۔“
”وحید سے ادھار پکڑا ہے۔“
”اور ٹکٹ۔“

”اماں نے میری شادی کے لیے کچھ زیور اور پیسے
جوڑ کر رکھے ہیں وہی مانگوں گا۔“
”چل بتا پھر اقبال سے کیا چاہیے۔“
”نہیں یار ابھی کچھ نہیں پر شاید زندگی میں بہت
کچھ مانگ لوں۔“ فرہاد نے ایک بار پھر تڑپ کر اقبال کو
گلے لگالیا۔



وہ رات فرہاد احمد کے لیے بہت کٹھن تھی۔ اس کی
آنے والی زندگی کا فیصلہ اسی رات ہونا تھا۔ رات کھانا
کھانے کے بعد حافظ خلیق احمد صحن میں کچھی چارپائی
پر بیٹھ کر حقہ پینے لگے۔ اماں ان کے ساتھ بیٹھ کر پٹکھا
تھانے لگیں کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد
فرہاد احمد نے سنانے ہوئے بات شروع کی۔
”وہ اباجی۔۔۔ آپ سے ایک بات کرنی تھی۔“
حافظ خلیق احمد کی سوالیہ نگاہیں اس کی طرف اٹھیں
تو انہوں نے آہستہ آہستہ ساری بات بتا کر باقاعدہ
امریکہ جانے کی اجازت طلب کی۔
”فرہاد! یہ تو نے کیا کیا پتر ہمیں چھوڑ کر جانے کا
فیصلہ ایسے کیسے کر لیا تو نے؟ کیا اس دن کے لیے پیدا کیا
تھا کہ ہم بوڑھے ہوں تو تو ہمیں چھوڑ کر چلا جائے۔ تو
میری ایک ہی اولاد ہے نا۔ میرے کون سے دس پتر ہیں
جو میں تجھے بھیج دوں۔ میں تجھے نہیں جانے دوں گی
سن لے۔“ سیکنہ بی بی کی آنکھوں سے آنسو ہلے نکلے
تھے۔ منہ سے بات بعد میں۔ فرہاد نے بے بسی سے
مدد طلب نظروں سے اباجی کی طرف دیکھا۔ وہ دکھی
آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بہت ہی بردبار اور
موقع کی نزاکت کو دیکھ بات کرنے والے تھے۔

”اتنا سب کچھ چپ چاپ اکیلے ہی کر لیا بتایا بھی
نہیں۔“

”اباجی میں نے سوچا تھا ویرا لگ گیا تو۔ نہیں لگتا تو
میں نے یہیں کچھ نہ کچھ کرنا تھا پر اباجی میں یہاں کے
سسٹم سے مایوس ہو چکا ہوں کوئی چھوٹی موٹی نوکری
لگ بھی جاتی تو میرا ذہن اسے قبول نہ کرتا۔ میرے
کچھ خواب ہیں۔ آپ دونوں جانتے ہیں شہر میں بنگلہ
گاڑی اچھی نوکری یا اچھا کاروبار ان سب کے لیے
بہت بہت سا پیسہ چاہیے اور اتنا پیسہ میں یہاں ساری
عمر محنت کرتا رہوں تب بھی نہیں کمایاؤں گا اور اگر
امریکہ چلا گیا تو چند سالوں میں ہی کمالوں گا۔“

”انسان کے کچھ خوابوں کی حقیقت سراپوں جیسی
ہوتی ہے بیٹا۔ ساری عمر بانی سمجھ کے رست کے پیچھے
بھاگتا رہتا ہے اور جو کہیں چند گھونٹ مل بھی جائیں تو
اس کی پیاس نہیں بجھتی۔ اللہ پر توکل کرنا سیکھ بیٹا اور
خوابوں کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دے۔ جو قسمت میں ہے
اور جتنا قسمت میں ہے اتنا ہی ملے گا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اباجی مجھے اختلاف
نہیں پر کوشش بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے بنا کوشش کے
تو کچھ نہیں ملتا۔“

”وہ کوشش یہاں رہ کر بھی تو ہو سکتی ہے۔“
”تین چار سال سے مسلسل کوشش میں ہی تو ہوں
اباجی جب کچھ نہیں ہو سکتا تب ہی تو یہ قدم اٹھایا ہے
اور پھر چند سالوں کی ہی تو بات ہے میں وعدہ کرتا ہوں
جلد واپس آ جاؤں گا۔“

”پتر جب تو شہر بڑھنے کے لیے جاتا تھا نا تو میں پیچھے
سارا وقت گھنٹے ہی گنتی رہتی تھی کہ اتنے گھنٹے ہو گئے
تجھے گئے ہوئے اور اتنے گھنٹے رہ گئے تیرے آنے میں
پر پتر سالوں کے گھنٹوں کی گنتی تو مجھے نہیں آتی۔“

فرہاد احمد نے تڑپ کر اماں کے قدم پکڑ لیے۔ ”ایسی
باتیں نہ کریں اماں جی آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ
میں بھی آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وقت ہاتھ نہیں
آتا اور اگر یہ وقت میرے ہاتھ سے نکل گیا تو پھر شاید
ترقی کا اس سے اچھا موقع نہ مل سکے۔“

سے سر نکال کر غصے سے کہا۔ اتنے میں وہ بھاگ کر ان کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ انہوں نے گھور کر اسے دیکھا تو پتا چلا وہ مارٹینا تھی۔

”چلو۔ جلدی چلو۔“ وہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔

”کہاں چلوں؟“ انہیں اس کے اس انداز پر حیرت ہوئی۔

”اوہو۔۔۔ کہیں بھی چلو، پر یہاں سے نکلو فوراً۔“ اس کا لہجہ تیز اور سانس بے ترتیب تھیں۔

اتنے میں انہوں نے دور سے بھاگ کر ادھر آتے کچھ لڑکوں کو دیکھا، خطرے کو بھانپ کر انہوں نے فوراً ہی ٹیکسی آگے بڑھا دی۔

”تم اتنی رات کو اکیلی یہاں کیا کر رہی تھیں؟“ کچھ دور آگے جا کر انہوں نے غور سے اس کی طرف دیکھا، اب اس کے چہرے پر کچھ اطمینان تھا۔

”میں یہاں اپنی دوست سے ملنے آئی تھی۔ وہ تو آئی نہیں، پر یہ لڑکے میرے پیچھے لگ گئے۔“ اس نے اصل بات چھپاتے ہوئے انہیں ایک جھوٹی کہانی سنا ڈالی۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ خود ان لڑکوں کے ساتھ پارک آئی تھی اور جب ان لڑکوں نے مارٹینا کی جیب گرم کیے بغیر اپنا الو سیدھا کرنا چاہا تو یہ وہاں سے بھاگ نکلی۔ جو ان اکیلی لڑکی کو چار عیاش لڑکے کیسے اتنی آسانی سے ہاتھ سے نکلنے دیتے۔ اس لیے وہ اس کے پیچھے بھاگے تھے۔



”تم۔۔۔ تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو۔“ وہ ٹیکسی اس کے مالک کے گیراج میں کھڑی کر کے آئے تو مارٹینا ان کے بیڈ پر نیم دراز میگزین پڑھ رہی تھی۔

”تمہارا انتظار۔“ اس نے میگزین سائڈ ٹیبل پر رکھا، بیڈ سے اٹھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

”کس لیے۔“ انہیں مارٹینا کو اپنے بیڈ روم میں دیکھ کر عجیب طرح کی الجھن محسوس ہونے لگی تھی۔

”تمہارا شکریہ ادا کرنا تھا اس لیے۔“ اس کی زبان سے یہ نکلا، حالانکہ دل میں کچھ اور ہی تھا۔

”سیکنڈ ہم نے آج تک جو کچھ بھی کیا، اس کی خوشی کے لیے ہی کیا ہے۔ اسے اجازت دے دے۔ کہیں یہ نہ ہو کل کو اس کے دل میں ہمارے لیے یہ گلہ رہ جائے کہ ماں باپ کی وجہ سے یہ بڑا آدمی نہ بن سکا۔“ لبا جی کی اس بات پر وہ اندر سے کٹ کر رہ گئے۔

وہ جانتے تھے کہ ماں باپ کی اس اجازت میں ان کے دل کی خوشی شامل نہ تھی اور پھر آنے والے وقتوں میں انہوں نے جان لیا کہ جس بات میں ماں باپ کی خوشی شامل نہ ہو اس کے نتائج اچھے نہیں نکلتے۔



ادھر پھر چند دن بعد ہی وہ نیویارک ایئر پورٹ کے باہر فیض سے گلے مل رہے تھے۔ فیض سے فرہاد احمد اور اقبال کی دوستی کالج میں ہوئی تھی۔ وہ جہلم شہر میں رہتا تھا اور سال قبل امریکہ آیا تھا۔ فیض نے فرہاد احمد کو بخوشی امریکہ بلایا تھا۔ پر دو دن کے بعد ہی اس نے انہیں بتا دیا تھا کہ یہاں ڈالر زانہیں اپنی محنت کے بل بوتے پر خود کمانے ہوں گے۔ اپنے لیے کوشش خود کرنی ہوگی۔ تیسرے دن سے انہوں نے کام ڈھونڈنا شروع کیا اور شام تک وہ ایک سپراسٹور میں بطور سیلز بوائے کے کام حاصل کر چکے تھے۔ وہیں ان کی ملاقات ابو بکر سے ہوئی، جس نے انہیں ٹیکسی چلانے کا مشورہ دیا۔

اور ایک ماہ بعد انہوں نے نیویارک میں نسبتاً بہتر علاقے میں ایک چھوٹا سا کمرہ کرائے پر لے لیا۔ اس مکان کے مالکوں میں ایک بوڑھی عورت مسز جوزف اور اس کی جوان بیٹی مارٹینا شامل تھیں۔ رات گیارہ بجے واشنگٹن اسکوائر پارک کے سامنے سے گزرتے ہوئے اچانک ہی وہ ان کی ٹیکسی کے سامنے آگئی اور اگر وہ بروقت بریک نہ لگاتے تو عین ممکن تھا وہ ٹیکسی کے نیچے پھلی جاتی۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ اگر خود کشی کرنے کا اتنا شوق ہے تو کسی امیر کی گاڑی کے نیچے آؤنا مجھ غریب کو کیوں اپنے ساتھ مارنا چاہتی ہو۔“ انہوں نے کھڑکی

”بہت اچھی۔“ انہوں نے کپ کاؤنٹر پر رکھا اور اس کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے گھر سے باہر آ گئے۔ یہ ان کی دوستی کی ابتدا تھی اس کے بعد وہ اکثر انہیں رات میں سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی ملتی، کبھی صبح ان کے لیے ناشتہ تیار کر دیتی۔ چھٹی والے دن وہ اکثر کہیں گھومنے پھرنے نکل جاتے۔



”کیا بات ہے، کچھ پریشان لگ رہے ہو۔“ آج وہ کافی دنوں بعد فیض کی طرف آئے تھے۔ ”ہاں۔۔۔ پار بس میں اس ڈرائیوری سے مطمئن نہیں ہوں۔ ٹھیک ہے، کمار ہا ہوں، پر یہ میری زندگی کی ترجیح نہیں ہے، میں اس سے بہتر کچھ کرنا چاہتا ہوں، ایک تو پرمینٹ جاب بھی نہیں ملتی کہیں۔“ فیض انہیں گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہر ملک اپنے لوگوں کو اچھی جاب کے لیے ترجیح دیتا ہے، تم بھی یہاں کی شہریت حاصل کر لو، پرمینٹ جاب مل جائے گی۔“ ”تمہارا مطلب گرین کارڈ پر وہ مجھے کیسے مل سکتا ہے؟“

”مل جاتا ہے یا ر! پرائیویٹ کرنا پڑتا ہے۔“

”انتا سرمایہ کس کے پاس ہے؟“

”ایک اور طریقہ بھی ہے۔“

”وہ کیا۔“

”شادی کر لو۔“

”شادی! جیسے تم نے کر لی۔“

”ہاں۔۔۔ یہاں آنے کے بعد میرا بھی تمہارے جیسا حال تھا، پر شادی کرنے کے بعد میں اسٹیبلشمنٹ ہو گیا ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، پر میں یہ نہیں کر سکتا، میں اپنے ماں باپ کی اگلوٹی اولاد ہوں فیض۔ میری ماں کو میری شادی کے بہت ارمان ہیں۔“ ان کے ماتھے پر گہری لکیریں تھیں۔

”ہر ماں کو اپنی اولاد کے لیے ارمان ہوتے ہیں، پر یار

”ایک جوان لڑکی آدمی رات کو ایک لڑکے کے کمرے میں کیوں جاتی ہے ڈفر۔“ ”یہ کام صبح بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے اس وقت آنے کی کیا ضرورت تھی۔“ انہوں نے چیخ بر بخت کر اپنے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہے تھے۔ ”ہوں۔۔۔ کافی پیو گے۔“ وہ اٹھ کر ان کی طرف آئی۔

”ضرور پیوں گا، مگر ابھی نہیں، صبح۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ ”ویسے تم بہت عجیب ہو۔“ اسے ان کا گریز بہت عجیب لگا۔

”تعریف کا شکریہ۔“ اس کے باہر قدم رکھتے ہی انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور دروازے کے باہر اس نے سوچا، کیا کوئی ایسا بھی کر سکتا ہے اس کے ساتھ۔ ”گڈ مارنگ۔“ وہ اپنا کمرہ لاگ کر کے سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے تو انہیں اپنے دائیں ہاتھ پر کچن سے آواز آئی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو مارٹینا ہاتھ میں کافی کاک لیے کھڑی تھی۔

”گڈ مارنگ۔۔۔ آج اتنی صبح کچن میں۔؟“ انہوں نے مک اس کے ہاتھ سے لے کر حیرت سے پوچھا۔ انہیں یہاں رہتے ہوئے چار مہینے ہو گئے تھے اور ان چار مہینوں میں وہ انہیں چار پانچ بار ہی گھر پر نظر آئی تھی۔

”ہوں۔۔۔ تمہارے لیے کافی بنانی تھی اس لیے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تھینکس۔۔۔ پر کسی بات کے لیے انتا سیریس نہیں ہوتے۔“

”بات اتنی معمولی تو نہیں تھی نا۔۔۔ میری جان بھی جاسکتی تھی ان لڑکوں کے ہاتھوں۔“ ”ہاں تو نہ جایا کرو، نا اکیلی پارکوں میں۔ احتیاط کیا کرو۔“

”مشورے کا شکریہ۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ویسے کافی کیسی بنی۔“

دیکھا ہے کہ تم ایک ذمہ دار اور شریف انسان ہو، میں
مخلص لوگوں کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ یہ کہہ کر مسز
جوزف تو اپنے کمرے میں چلی گئیں، پر فرہاد احمد کے
لیے سوچ کے نئے دروازے کھل گئے۔
اگلے دن انہوں نے فیض کو ساری بات فون پر بتا کر
مشورہ مانگا تھا۔

”واہ یار! تیری تو لائری نکل آئی، اب سوچنے میں دیر
نہ لگا، فوراً شادی کر لے۔“

”ہاں ادھر میں شادی کر لوں اور ادھر بوڑھے ماں
باپ کو کیا کہوں۔“

”کیوں ٹینشن لے رہا ہے پار! مناسب لفظوں میں
سمجھا دینا کہ اس کے بغیر گزارا نہیں تھا۔“ پھر کافی سوچ
و بچار کے بعد انہوں نے مارینا سے شادی کا فیصلہ
کر لیا۔

”مسز جوزف مجھے آپ کی آفر قبول ہے، پر میں
اپنے مذہب کا پابند ہوں، اگر مارینا بخوشی اسلام قبول
کر لے تو میں اس سے شادی کے لیے تیار ہوں۔“ مسز
جوزف کے کمرے میں اس وقت وہ تینوں موجود تھے
مذہب کی بات پر مسز جوزف کے چہرے پر ناگواری
چھائی تھی، پر مارینا کو مذہب سے کوئی سروکار نہیں تھا۔
اس کے لیے صرف اس کے دل کی خوشی کافی تھی۔ سو
وہ فوراً ”رضامند ہو گئی۔“
”مجھے منظور ہے۔“

مسز جوزف نے اسے کڑے تیوروں سے دیکھا، پر
بولیں کچھ نہیں۔ جانتی تھیں کہ ایک بار وہ جس بات
کی ضد ٹھان لے وہ کر کے ہی چھوڑتی ہے اور فرہاد احمد
بھی اس کی ضد تھے، محبت نہیں۔ جس رات انہوں
نے اس کے وجود کی نفی کی تھی اسی رات اس نے
اپنے آپ کو منوانے کی ٹھان لی تھی، جائز ناجائز ہر
طریقے سے۔ پھر جس دن اس نے کلمہ پڑھا اسی دن
فرہاد احمد نے نکاح کر لیا اور مارینا کا اسلامی نام سارہ
رکھا۔

ابتدا میں وہ اسے سارہ سارہ کہتے اس پر اپنی محبتیں
نچھاور کرتے رہے، پر اگلے چند دنوں ہی میں اس نے

ارمان بھی پیسے ہی پورے ہوتے ہی تم اچھی طرح
سوچ لو، پھر کوئی فیصلہ کرنا۔“

ان ہی سوچوں میں گم وہ گھر واپس آئے تو آج بھی
مارینا سیڑھیوں میں بیٹھی منتظر ملی۔ وہ اس کے ساتھ
ہی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔

”کیا ہوا، کیا سوچ رہے ہو۔“ اس نے انہیں گہری
سوچ میں ڈوبے دیکھ کر پوچھا۔ انہوں نے اپنے اور
فیض کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو اسے بتادی۔
ساری بات سن کر مارینا کی آنکھیں ایک نئے خیال
سے جگمگا اٹھیں۔

”تم فکر نہ کرو فرہاد، تمہاری ساری پریشانی جلد دور
ہو جائے گی۔“ انہوں نے مارینا کو مسکرا کر دیکھا۔ وہ
کبھی شاید وہ بہ حیثیت دوست کے تسلی دے رہی

اگلی رات وہ واپس آئے تو مارینا کا بجائے مارینا کی
بوڑھی ماں مسز جوزف ان کی منتظر تھی۔ ”فرہاد مائی سن!
مارینا میری اور جوزف کی بڑھاپے کی اولاد ہے، میری
اور جوزف کی شادی کے اٹھارہ سال بعد گاڈ نے ہمیں
مارینا کی صورت اولاد سے نوازا۔ جوزف کی بڑی
خواہش تھی کہ مارینا ان کی زندگی میں شادی کرے، پر
اکھوتی ہونے کی وجہ سے یہ ہمارے لاڈلیاں میں کافی بگڑ
گئی ہے، اس کا مزاج کچھ الگ ہے، اسے کوئی جلدی
پسند نہیں آتا، پر میں نے محسوس کیا ہے، یہ تم سے
بہت متاثر ہے، آج اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم اپنی
ٹیکسی ڈرائیوری کی جاب سے مطمئن نہیں ہو، زندگی
میں ترقی کرنا چاہتے ہو، میں تمہیں ایک آفر دیتی ہوں،
اگر مناسب لگے تو منظور کر لیتا، ورنہ تمہاری مرضی
ہے۔“ وہ کافی دیر سے لاؤنج میں بیٹھے مسز جوزف کی
باتیں سنجیدگی سے سن رہے تھے۔

”میں چاہتی ہوں تم مارینا سے شادی کر لو اور
جینیفر ڈی پارٹنٹل اسٹور تم سنبھال لو، میں اب کافی
بوڑھی ہو گئی ہوں۔ اسٹور سنبھالنا اب میرے بس
سے باہر ہوتا جا رہا ہے اور مارینا کو اس کام میں کوئی
انٹرسٹ نہیں، پچھلے چار پانچ مہینوں میں میں نے

کھینچ کر اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا یہ مارینا کے منہ پر پڑنے والا اس کی زندگی کا پہلا تھپڑ تھا۔ وہ حیرت اور صدمے سے چند لمحے فرہاد احمد کو دیکھتی رہی، پھر ایک جانب لڑھک کر بے ہوش ہو گئی۔ تھوڑی دیر فرہاد احمد اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے۔ پر جب وہ ہوش میں نہ آئی تو اسے اٹھا کر قریبی اسپتال لے گئے۔

اس رات کا ایک ایک لمحہ فرہاد احمد پر قیامت کی طرح گزرا تھا۔ صبح ہونے تک انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس رشتے کو ہمیں پر ختم کر دیں گے۔ پر تھوڑی دیر بعد ہی انہیں اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔ جب ڈاکٹر کی رپورٹ ان کے ہاتھ میں آئی اور رپورٹ میں لکھا تھا کہ مارینا پر مگنٹ ہے، زندگی نے انہیں ایک عجیب بے بسی کے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔ مارینا کے ساتھ نبھا کر ان کے لیے مشکل تھا اور اپنی اولاد سے دستبردار ہو جانا ناممکن۔

مارینا گھر آگئی، اس کی پوری کوشش تھی کہ بچے اور فرہاد احمد دونوں سے جان چھڑالے۔ پر فرہاد احمد اور مسز جوزف دونوں اس کے ہر برے ارادے کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہو گئے۔ مسز جوزف بھی چاہتی تھیں کہ وہ اپنے بچے کو جنم دے، شاید اسی طرح اس میں اپنی گھریلو ذمہ داریوں کا احساس جاگ اٹھے، ان کے بہت زیادہ سمجھانے اور اصرار پر بالا خرہ بے بی ڈیور کرنے پر تیار ہو گئی، پر فرہاد احمد کی وہ صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ حالات کو سازگار بنانے اور اپنی آنے والی اولاد کی خاطر انہوں نے مارینا سے باقاعدہ معافی مانگی تھی۔

سلگتے دن یوں ہی گزرتے رہے اور پھر ایک صبح درد کی اذیتوں کو جھیل کر مارینا نے اہمل کو جنم دیا۔ زندگی اہمل کی صورت فرہاد احمد کی گود میں آگئی۔ چھوٹی سی پیاری سی گڑیا کو پا کر مارینا بھی خوش تھی۔ فرہاد احمد کی زندگی کے وہ تین خوب صورت سال تھے۔ اسی دوران وہ ایک بار بھی پاکستان نہیں گئے تھے۔ مسز جوزف کا اسٹور ان کے دم سے چل رہا تھا۔ اہمل کی پرورش وہ

فرہاد احمد کو منع کر دیا کہ اسے سارا کہہ کر نہ بلائیں، کیونکہ ہر کوئی اسے مارینا کے نام سے جانتا ہے۔ اب اگر وہ اپنا نام سارا سے بدلے گی تو اس کا تماشا بن جائے گا۔ فرہاد احمد کو اس کی یہ بات پسند نہیں آئی، دونوں کے بیچ بحث بن گئی اور اس سے پہلے کہ بات بڑھتی۔ مسز جوزف دونوں کے بیچ میں آ گئیں۔ نرمی سے دونوں کو سمجھایا، پھر فرہاد احمد کو لے کر اسٹور پر آ گئیں، ان کے نزدیک دونوں کو تلخی سے بچانے کا حل یہ ہی تھا کہ فرہاد احمد کو ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے مصروف کر دیا جائے اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہیں۔

فرہاد احمد صبح ناشتا کر کے اسٹور پر چلے جاتے اور رات سات آٹھ بجے تک واپس آتے، اسٹور ایک ٹف ٹائم جاب تھی، پر تھی منافع بخش، اس لیے وہ پوری ایمان داری اور محنت سے اپنی ڈیوٹی نبھا رہے تھے۔ دوسری طرف مارینا ان کے جانے کے بعد اپنی آوارہ گردیوں پہ نکل جاتی، شادی نے اس کی بری زندگی پر کوئی اچھا اثر نہ ڈالا تھا۔ بس یہ تھا کہ رات کو وہ ان کے آنے سے پہلے واپس آ جاتی۔

شروع شروع کے ایک دو مہینے بہت اچھے گزرے، پر فرہاد احمد کو اندازہ ہو گیا کہ مارینا وہ ایسی نہیں تھی جیسی وہ اسے سمجھ رہے تھے۔ دو ماہ بعد ہی مارینا کا دل فرہاد احمد سے بے زار ہو گیا۔ مسز جوزف، مارینا کی حرکتوں سے سخت پریشان تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ مارینا اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو سمجھے اور اپنے شوہر سے بنا کر رکھے، پر ان کی چھٹی حس بتا رہی تھی غمگین ایسا کچھ ہونے والا ہے جو اچھا نہیں ہے اور پھر ایک رات وہ بارہ بجے تک گھر واپس نہ آئی، فرہاد احمد اسے ڈھونڈتے پھرے۔ اسٹریٹ اسٹیشن پر وہ انہیں نشے میں دھت ڈگمگاتی ہوئی ملی۔ وہ بمشکل اسے کھینچ کھانچ کر گھر لے کر آئے اور پانی سے بھرا جگ اس پر اندیل دیا۔

اس کے بعد مغالطات کا ایک طوفان تھا جو اس کے منہ سے نکل رہا تھا۔ چند لمحے وہ برداشت کرنے کی کوشش کرتے رہے اور جب نہیں ہوا تو انہوں نے

لی بی کی قبر کی مٹی نے ان کے پاؤں پکڑ لیے اور وہ اس غمی کے ڈھیر پر ہی ڈھیر ہو گئے۔

غم کا ایک پہاڑ تھا جو فرہاد احمد پر ٹوٹا تھا۔ چند دنوں میں ان کے ماں باپ ان کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ گئے تھے۔ پاکستان میں ان کی دنیا اجڑ چکی تھی۔ خالی گھر میں انہیں ہر طرف اماں جی اور بابا جی کی روحیں چلتی پھرتی دکھائی دیتیں۔ انہوں نے دکان اور مکان دونوں کرائے پر چڑھا کر حساب کتاب اقبال کے حوالے کیا اور امریکہ واپسی آگئے۔ پر یہاں بھی زندگی رنگ بدل چکی تھی۔

فرہاد احمد کے پیچھے مارٹینا نے اسٹور سنبھالنا شروع کر دیا تھا۔ چند دن تو سب صحیح چلا، پھر اسٹور پر اس کے پرانے دوستوں کے آنے جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مارٹینا اپنی بد فطرتی کی طرف لوٹنے لگی، ہاتھ میں پیسہ بھی کھلا آ رہا تھا۔ سو عیاشی کے راستے کھلتے گئے۔ مسز جوزف ایک بار پھر اس کی طرف سے خوف کا شکار ہو گئیں۔ اہمل پر سے بھی اس کی توجہ ختم ہو گئی۔ دن کو وہ اسٹور کے نام پر جانے لگی اور پھر آدھی آدھی رات تو کبھی پوری رات گھر سے باہر گزار کر آتی، آدھے آدھے دن تک بد قسمت سوئی رہتی اس طرح کاروبار بھی متاثر ہونے لگا۔ تین ماہ بعد فرہاد احمد کی واپسی ہوئی تو کاروباری اور گھریلو حالات بگڑ چکے تھے۔



”مارٹینا، مارٹینا اٹھو، اسٹور کی چابیاں دو۔“ امریکہ واپسی کا یہ فرہاد احمد کا دوسرا دن تھا۔ احساس ذمہ داری کی وجہ سے انہوں نے ایک دن بھی آرام کرنا نہیں چاہا تھا۔

”تمہیں اب اسٹور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اچھی طرح سنبھال رہی ہوں، تم اپنے لیے کوئی اور کام تلاش کر لو۔“ اس کی باتیں نہیں ایک ہتھوڑا تھا جو اس نے فرہاد احمد کے سر پر دے مارا تھا۔

”کیا؟ یہ کیا کہہ رہی ہو، شو میں تو ہوں۔“

”ہاں میں پورے شو میں ہوں۔“ وہ انگڑائی لے

اپنے انداز سے کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ مارٹینا کے ساتھ بھی پیار سے برداشت سے نبھا کرنے کی کوششیں کرتے، تاکہ وہ پھر غلط راستوں پر نہ چل پڑے زندگی اتنی مصروف ہو گئی تھی کہ ان سے چاہنے کے باوجود بھی پاکستان جانے کے لیے وقت نہیں نکالا گیا، پر ایک دن وہ پاکستان جانے کے لیے بے چین ہو گئے، جب اقبال نے انہیں فون پر بتایا کہ اماں جی ان کے انتظار میں اپنی آخری سالیں گن رہی ہیں۔

فرہاد احمد نے مارٹینا کو ساتھ لے جانا چاہا، پر اس نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ وہ چلی گئی تو پیچھے اسٹور کون سنبھالے گا اور پھر اہمل ابھی بہت چھوٹی ہے۔ وہ پاکستان کی گرمی برداشت نہیں کر پائے گی۔ سو وہ اکیلے ہی پاکستان آگئے اماں جی کی حالت بہت پری تھی فرہاد احمد کی جدائی ان کے دل کا ناسور بن گئی تھی۔ فرہاد احمد نے ماں باپ سے بہت کہا کہ وہ ان کے ساتھ امریکہ چلیں، وہ وہاں ان کا علاج کروائیں گے۔ پر دونوں نے امریکہ جانے سے بہتر اپنے وطن میں مرنے کو ترجیح دی۔ فرہاد احمد جانتے تھے کہ مارٹینا میں مستقل مزاجی نام کو نہیں ہے، وہ اسٹور نہیں سنبھال پائے گی اور پھر اہمل ماں کی بہ نسبت باپ سے زیادہ قریب تھی۔ مسز جوزف کے لیے اکیلے اسے سنبھالنا بہت مشکل تھا۔

تین ہفتے پاکستان میں رہ کر فرہاد احمد نے واپسی کی تیاری پکڑی، پر جس صبح انہوں نے وطن چھوڑنا تھا، اس سے ایک رات پہلے اماں جی دنیا چھوڑ گئیں۔ ایک پار پھر بیٹے کی جدائی کا غم جھیلنے کی ان میں سکت نہ تھی۔ فرہاد احمد نے چند دنوں کے لیے واپسی منسوخ کر دی۔ انہوں نے حافظ خلیق احمد پر زور دیا کہ اب وہ اس کے ساتھ ضرور چلیں۔ انہیں اپنی مجبوریاں بتائیں کہ نہ وہ باپ کو چھوڑ سکتے ہیں اور نہ ہی امریکہ میں اپنی فیملی کو۔ حافظ خلیق احمد ان کی پریشانی سمجھ کر خاموش ہو گئے۔

فرہاد احمد نے ان کے کاغذات بنوانے شروع کر دیے اور پھر جس دن ان کا ویزا اور ٹکٹ آیا، وہ اپنی شریک حیات کو الوداع کہنے قبرستان گئے، جہاں سیکڑ

”کر بیڈ سے اتری۔“

”تم اسٹور سنبھالو گی تو اہمل کو کون سنبھالے گا۔ تمہاری ضرورت گھر کو ہے، اسٹور کو نہیں۔“ انہوں نے اسے رمان سے سمجھانا چاہا، جانتے تھے ہتھ سے اکھڑ جائے تو اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔

”اوہ تو تم یہ چاہتے ہو کہ میں گھر میں پڑی سڑسڑ کر اپنی زندگی گزاروں اور تم اسٹور اور اس کی تمام آمدنی سنبھال کر عیش کرتے پھرو، شاید تم یہ بھول گئے ہو کہ یہ اسٹور میرے ماں، باپ کا ہے اور ان کے بعد میرا۔“ حیرت سے فرہاد احمد کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، اس کی باتیں سن کر چند لمحوں بعد انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور پیچھے ہوئے مسز جوزف کے کمرے میں لے آئے۔

”اب بولو جو بول رہی تھیں۔“ ماں کے سامنے مارٹینا کی بولتی بند ہو گئی۔ انہوں نے خود مارٹینا کا کہا ہوا ایک ایک لفظ مسز جوزف کے سامنے دہرایا۔

”بتائیں اپنی بیٹی کو یہ اسٹور کس نے میرے حوالے کیا تھا، میں نے کتنا اس پر قبضہ کیا اور اس کی آمدنی سے کتنی عیاشی کی۔ کیا میں ایک ایک پیسے کا آپ کو حساب دیتا نہیں رہا۔ بتائیں اسے کہ ایک ایک ڈالر میرے نہیں آپ کے اکاؤنٹ میں جاتا ہے۔“ فرہاد احمد غصے سے کانپ رہے تھے۔

”یہ کیا ہے ہو دیگی ہے مارٹینا؟ تم کس طرح فرہاد سے ایسی باتیں کر سکتی ہو، اس کی ایمان داری کے بل پر یہ کاروبار اتنے عرصے سے چل رہا ہے اور تمہاری خواہش پر ہی یہ سب طے ہوا تھا۔“ مسز جوزف، فرہاد احمد کی ایمان داری سے بہت متاثر تھیں، کیونکہ انہوں نے کبھی بھی ایک ڈالر کی بھی ہیرا پھیری نہیں کی تھی اور وہی کچھ اپنے لیے لیتے تھے، جو مسز جوزف سے انہوں نے طے کیا تھا۔

”پر می! یہ تمام کاروبار میرا ہے۔ اگر فرہاد نہ سنبھالتا تو مجھے ہی سنبھالنا تھا اور اب میں نے اچھی طرح سنبھال لیا ہے۔“ مارٹینا کی بات پر کچھ جزبہز ہوئی تھی۔

”مارٹینا ابھی میں زندہ ہوں، یہ کاروبار میرا تھا اور ہے۔ فرہاد کے ساتھ میرا الگ کانسٹریکٹ ہے۔“ فرہاد احمد کو یہ بات سن کر شاک لگا، کیونکہ ایسا کوئی کانسٹریکٹ نہیں ہوا تھا۔ سب کچھ زبانی کلامی طے ہوا تھا۔

مسز جوزف کے کہنے پر مارٹینا کو مجبوراً ”اسٹور کی چابیاں فرہاد کو دینی پڑی تھیں۔ پر ان کے جاتے ہی اس نے وہ طوفان بد تمیزی اٹھایا تھا کہ اللہ کی پناہ! تین سالہ اہمل اپنی ماں کا یہ جنونی انداز دیکھ کر سہم گئی تھی۔ تین ماہ میں اسٹور کے کام میں جو بد عنوانی اور پیسے کی گڑبڑ ہوئی تھی، وہ سب فرہاد احمد نے من و عن مسز جوزف کے گوش گزار کر دی تھی۔ ان باتوں سے مسز جوزف بے حد پریشان ہوئی تھیں، کیونکہ انہیں نظر آ رہا تھا کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی بیٹی سب کچھ برباد کر دے گی، جس کے لیے انہوں نے فوری پیش بندی کر دی، اپنا مکان اہمل کے نام کر دیا اور اگلے اٹھارہ سالوں کے لیے جمنیفیو سپر اسٹور کے مالکانہ حقوق فرہاد احمد کے نام کر دیے پر اس بات کا اسے پابند کیا کہ یہ اسٹور بیچے گا نہ کس اور کے حوالے کرے گا۔ اٹھارہ سال بعد اس کے مالکانہ حقوق اہمل کو منتقل ہو جائیں گے۔

اس بات کا جب مارٹینا کو پتا چلا تو وہ غصے سے پاگل ہو گئی۔ گھر کی ایک ایک چیز اٹھا کر پھینکنے لگی۔ وہ پہلے ہی فرہاد کے سامنے اپنی ہتک پر ناراض تھی۔ ماں سے اور اب تو اس کے حساب سے بات حد سے باہر ہو گئی تھی۔ وہ کسی بھی طرح ماں اور شوہر کے قابو میں نہیں آرہی تھی۔ فرہاد احمد اس پر ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتے تھے، کیونکہ امریکی عورتیں برداشت نہیں کرتیں اور فوراً پولیس کو بلا لیتی ہیں اور پھر امریکی پولیس ایشیائی شوہروں کا جو حال کرتی ہے، وہ قصے فرہاد احمد نے سن رکھے تھے۔

اہمل ان سب باتوں سے بے حد خوف زدہ رہنے لگی تھی۔ مارٹینا کی آنے والی بد تمیزیاں، مسز جوزف کو اندر سے ختم کرتی جا رہی تھیں اور پھر ایک دن وہ فرہاد احمد کو پریشان اور اہمل کو روتا ہوا ملتا چھوڑ کر چلی گئیں۔

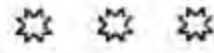
WWW.PAKSOCIETY.COM

138 | 2016 دسمبر

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اس گھر میں فرہاد احمد کو مسز جوزف کی ذات سے بہت سہارا تھا۔ کسی نہ کسی طریقے سے وہ مارٹینا کو قابو کر ہی لیتی تھیں، پر اب آگے کیا ہوگا؟ فرہاد احمد سوچ سوچ کر پریشان تھے۔



رات آٹھ بجے فرہاد احمد گھر لوٹے تو بے ہنگم شور گھر سے باہر آتا محسوس ہوا۔ انہوں نے بیل بجائی تو انتہائی بے ہودہ لباس میں ملبوس ایک امریکی لڑکی کے دروازہ کھولنے پر وہ حیران رہ گئے۔ اندر آئے تو منظر ہی عجیب تھا۔ مارٹینا کے علاوہ تین لڑکیاں اور چار جوان لڑکے فاسٹ میوزک پر بے ہودہ ڈانس کر رہے تھے۔ بو تلیں کھلی پڑی تھیں اور تقریباً ”سب ہی کے منہ میں پاؤڈر والے سگریٹ تھے۔“

”مارٹینا، مارٹینا!“ مارٹینا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے انہیں چیخنا پڑا۔ مارٹینا اپنے ساتھی لڑکے کی کسی بات پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ فرہاد احمد کی آواز سن کر اس کی ہنسی کو بریک لگی۔ ”آؤٹ۔“ وہاں موجود ہر شخص کو سانس سوگھ گیا تھا۔ ”ایوری بڈی آؤٹ۔“ فرہاد احمد کی آنکھیں اور چہرہ غصے سے دھک اٹھا۔ آہستہ آہستہ تمام لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو دیکھتے گھر سے باہر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی فرہاد احمد نے دروازہ لاک کیا اور مارٹینا کے پاس آگئے۔

”کیا ہے یہ؟ سب کچھ۔ ذرا سی شرم غیرت بھی باقی بچی ہے تم میں یا نہیں۔ ایک مہینہ نہیں ہوا تمہاری ماں کو مرے ہوئے اور تم نے اس گھر کو ڈانس کلب بنا ڈالا۔“ فرہاد احمد کاغصے اور دکھ سے برا حال تھا۔

”یہ میرا گھر ہے، تمہارا نہیں۔ جو چاہوں گی وہ کروں گی۔ تم کسی بھی طرح مجھے روک نہیں سکتے اور تم ہوتے کون ہو میرے دوستوں کو اس طرح بے عزت کر کے گھر سے نکالنے والے؟“ مارٹینا آہستہ آہستہ اپنی فارم میں واپس آرہی تھی۔

”تم بھول رہی ہو، یہ گھر تمہارا نہیں، اہمل کا ہے

اور اہمل میری بھی بیٹی ہے۔ تمہاری ان بے ہودگیوں کا اس کے دل و دماغ پر کتنا برا پڑے گا، یہ سوچا ہے تم نے۔ کھلے عام تم اس کے سامنے پی رہی ہو، غیر لڑکوں کے ساتھ فری ہو رہی ہو، ہمارے مذہب میں یہ سب جائز نہیں ہے۔“

”مذہب۔۔۔؟ کون سا مذہب؟ میں کسی ایسے مذہب کو نہیں مانتی جو انسانوں کی زندگیوں کو پابند کر کے انہیں خوشیوں سے محروم کرتا ہو۔“

”مارٹینا۔“ فرہاد احمد کاغصہ ساتویں آسمان تک جا پہنچا تھا۔ وہ حافظ خلیق احمد کے بیٹے تھے، سب کچھ برداشت کر سکتے تھے، پر مذہب کے لیے ایک غلط لفظ بھی نہیں سن سکتے تھے۔ ”خبردار جو تمہاری زبان پر میرے مذہب کے لیے کوئی غلط بات آئی، میرا مذہب غلط اور صحیح کی تمیز سکھا کر انسانیت کو حیوانیت سے الگ کرتا ہے۔ انسان کے کردار کو اخلاق کی بلندیوں تک پہنچاتا ہے، پر تم جیسے لادین لوگ ہمیشہ کتے، بلیوں والی زندگی گزارتے ہیں۔“

”شٹ اپ۔۔۔“ فرہاد احمد کے لہجے کی گرج مارٹینا سے برداشت نہ ہو سکی۔

”شوٹ اپ۔۔۔ اور خبردار جو آئندہ اس گھر میں یہ سب کچھ دوبارہ ہوا۔“

فرہاد احمد خوف سے سہمی اہمل کو اپنے ساتھ لگا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

”کروں گی، جو دل چاہے گا وہ کروں گی۔ دیکھتی ہوں کون روک سکتا ہے مجھے۔“ مارٹینا ان کے پیچھے پیچ چھ کر بولتی رہی۔

فرہاد احمد کا خون کھول اٹھا اس کی بات سن کر، مگر اہمل کی خراب حالت کے پیش نظر وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر اور اپنے کمرے میں آگئے۔ وہ جانتے تھے کہ مارٹینا اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گی۔ اس لیے انہوں نے اہمل کی تمام تر ذمہ داری اب خود اٹھالی، وہ اسے تیار کر کے اسکول چھوڑتے ہوئے اسٹور پر چلے جاتے، پھر اسکول آف ہونے پر اسے اسٹور پر ہی لے آتے۔ اہمل خود بھی باپ سے زیادہ قریب تھی۔

نہیں ہیں۔“ وہ دھیمی آواز میں اسے سمجھا رہا تھا۔
اہمل نے اسے مسکرائی نظروں سے دیکھا تو چند لمحے وہ
اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

”ایک بات پوچھوں، تم دوسری امریکی لڑکیوں سے
اتنی الگ سی کیوں ہو۔“

”میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔“

”میرا مطلب بائیں فیس تم کچھ الگ سی ہو۔“

”اوہ۔ ایک چوکی میری ماما تو امریکن ہیں، پر پاپا
پاکستانی ہیں۔“

”ریٹلی۔ میں بھی تو پاکستان سے ہوں، کراچی سے
اور تمہارے پاپا کہاں کے رہنے والے ہیں۔“

”دھلم کے۔“

”آچھا۔ جب ہی تو میں حیران ہوتا تھا کہ تم ایشیائی
لڑکیوں سی کیوں دکھتی ہو۔“

اس وقت اہمل کو میڈیم لوسی کلاس کی طرف جاتی
دکھائی دیں۔ ”میری کلاس کا ٹائم ہو گیا ہے۔ میں چلتی
ہوں، تھمنکس اکیس۔“ اہمل نے اپنا بیگ اٹھایا
اور سرفراز کو مسکرا کر دیکھتی کلاس روم کی طرف چلی
گئی۔

یہ اہمل اور سرفراز کی دوستی کی ابتدا تھی اور یہ
دوستی بڑھتے بڑھتے کب گہری محبت میں بدلی دونوں کو پتا
نہ چلا۔ اہمل نے فرہاد احمد سے کچھ نہیں چھپایا۔ وہ
اس کے دلی جذبات سے آگاہ تھے۔ اہمل کی یونیورسٹی
میں وہ خاص طور پر سرفراز سے ملنے گئے تھے اور اس
سے مل کر بہت مطمئن تھے۔ وہ پاکستان کے ایک
باعزت کھاتے بیٹے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کی
بیٹی نے ایک پاکستانی کا انتخاب کر کے انہیں کچھ اور بھی
متحیر کر دیا تھا۔ سرفراز بھی فرہاد احمد سے مل کر بہت
متاثر ہوا تھا۔ وہ جیمینفر اسٹور بھی جا چکا تھا دو چار بار پر
وہ اہمل کی ماں سے ابھی تک نہیں ملا تھا اور ملتا بھی
کیسے اہمل تو کبھی اپنی ماں کا ذکر بھی نہیں کرتی تھی۔ وہ
اکثر اپنی ممی کا ذکر کرتا تھا اور جب اس سے اس کی ماما
کے بارے میں پوچھتا تو وہ ہاں ہوں میں جواب دے کر
ٹال جاتی۔ اہمل نے ابھی تک اسے اپنے گھر بھی نہیں

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماریٹنا کے غلط
رویے کی وجہ سے دونوں ماں بیٹی کے بیچ اجنبیت کی
ایک دیوار بلند ہوتی چلی گئی۔ فرہاد احمد اور اہمل مستقل
اوپر والے پورشن کے دو کمروں میں شفٹ ہو گئے۔
ماریٹنا کے ساتھ آئے دن کوئی نہ کوئی مرد اس کے
کمرے میں پایا جاتا۔ اہمل کو اپنی ماں کی ان حرکتوں
سے گھن آتی اور باپ کے لیے اس کے دل میں دکھ اور
افسوس بڑھتا جاتا تھا۔ بیوی کے ہوتے ہوئے بھی وہ
گھر بلو خوشیوں سے محروم تھے۔ وہ بیک وقت اس کے
باپ بھی تھے اور ماں بھی۔ دونوں باپ بیٹی کی اپنی ہی
ایک دنیا آباد ہو گئی تھی۔

”آؤج۔“ آلی ٹی ڈیپارٹمنٹ کو جاتی سیڑھیوں
کے آخری سرے پر وہ پہنچی ہی تھی کہ اچانک اس کا
پاؤں مڑا اور وہ اپنا توازن کھو بیٹھی۔ قریب تھا کہ وہ پیچھے
لڑھک جاتی، پر نیچے سے آتے سرفراز نے اسے اپنے
مضبوط بازوؤں میں تھام لیا۔

”ہے اہمل۔ کچھ نہیں ہوا یا۔ دیکھو میں نے
تمہیں گرنے سے بچالیا ہے، چلو شاباش آنکھیں
کھولو۔“ نیچے گرنے کے خوف سے اہمل نے حتی
سے آنکھیں بند کر لی تھیں اور وہ بری طرح سرفراز کے
بازوؤں میں کانپ رہی تھی۔ وہ اسے اپنے بازوؤں کے
حلقے میں لیے ہوئے کوریڈور تک لے آیا اور آرام سے
اسے ایک بیچ پر بٹھادیا اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ
گیا۔ پھر اپنے بیگ سے سوٹ ڈرنک کین نکال کر
اس کی طرف بڑھایا۔ اہمل نے اس کی طرف غائب
دماغی سے دیکھا، پھر کین اس کے ہاتھ سے لے کر
آہستہ آہستہ پینے لگی۔

”اب ٹھیک ہو۔“ سرفراز نے اسے دلچسپی سے
دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہوں۔ تھمنکس۔“ اہمل نے ممنونیت سے
کہا۔

”نوٹ مینشن! ہو جاتا ہے، ایسا کبھی کبھی گھبراتے



اور کافی بنانے لگی۔ کافی بنانے اور سرفراز کے پینے کے دوران اس نے اسی طرح چھوٹے چھوٹے سوالوں کے ذریعے جان لیا کہ اہمل اور سرفراز ایک دوسرے کو چاہتے ہیں، کچھ دیر سرفراز بیٹھ کر چلا گیا اور اس کے پیچھے مارٹینا کھری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کی آنکھ میں کلاٹل ابھر آیا تھا۔



کہتے ہیں کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ قدموں تلے جنت بھی ان ہی ماؤں کو ملتی ہے جو اولاد کی خاطر اپنی نیندیں، اپنا چین، آرام اور اپنی خواہشیں کھو دیتی ہیں، پر جب کوئی عورت اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے کروار کی پستیوں میں گرتی ہے تو سب سے پہلے اس کی اولاد ہی اس کے وجود کی نفی کر دیتی ہے۔

اہمل اور مارٹینا کے درمیان بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ مارٹینا کی نظر میں عورت کی عصمت کا کوئی تصور نہ تھا۔ اس کے نزدیک ایک مرد کے ساتھ ساری عمر گزار دینا انتہائی بے وقوفی تھی، جبکہ نسوانی عزت و وقار کی خوبیاں اہمل کو اس کی جینز میں ملی تھیں۔ وہ حافظ خلیق احمد کی پوتی تھی جو گاؤں کی کسی بھی گلی سے گزرتے تو گلی میں کھڑی باتیں کرتی عورتیں ان کے احترام میں خاموش ہو جاتیں وہ سیکنہ بی بی کی پوتی تھی جو گاؤں کے مردوں اور عورتوں کے لیے شرم و حیا کی مثال تھیں۔ گاؤں کی عورتیں اپنی بچیوں کی تربیت کے لیے انہیں سیکنہ بی بی کے پاس بھیجا کرتی تھیں۔ وہ فریاد احمد کی بیٹی تھی، جن پر جوانی آئی تھی اور نوٹ کر آئی تھی۔ پر گاؤں کی کوئی لڑکی یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ فریاد احمد نے اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا ہے۔ وہ امریکہ آئے تو یہاں کی آزاد معاشرت میں بھی انہوں نے اپنے عزت و وقار اور تشخص کو احتیاط سے سنبھال کر رکھا اور ان کی یہ ہی احتیاط پسندی مارٹینا کے لیے چیلنج بن گئی تھی۔

مارٹینا کی بد فطرت دیکھتے ہوئے فریاد احمد نے

اہمل کو سرفراز سے محبت کے رشتے میں بندھے ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ یہ یونیورسٹی میں ان کا آخری سال تھا۔ اس دن اہمل اپنے بہت ہی ضروری نوٹس کلاس روم میں بھول گئی تھی اور وہی نوٹس لے کر سرفراز اس کے گھر آیا تھا۔ بیل بجانے پر بلیو جینز اور بلیک سیلوئس شرٹ میں ملبوس مارٹینا نے دروازہ کھولا۔ اس نے خود کو بہت مین مین رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بہت کم عمر لگتی تھی۔

”ہیلو۔“ سرفراز نہیں جانتا تھا وہ کون ہے۔
”ہیلو۔“ جواباً مارٹینا نے اسے سر سے پیر تک دلچسپی سے دیکھا۔

”اہمل گھر پر ہے۔“
”نہیں۔ پر تم کون۔“ اہمل کا نام ایک ایشیائی لڑکے کے منہ سے سن کر وہ چونکی تھی۔
”میں اہمل کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں وہ اپنے نوٹس بھول آئی تھی۔ میں وہ لے کر آیا ہوں۔“
آپ اہمل کی۔
”اندر آؤ۔ پھر بتاتی ہوں۔“ مارٹینا نے اسے تجسس میں مبتلا کر کے اندر بلایا۔
”بیٹھو۔“ وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔
”میں اہمل کی بدمعاش ہوں۔“

”اوہ۔ پر آپ تو بالکل اس کی بڑی بہن لگتی ہیں۔“ اس کی بات پر مارٹینا نے صرف مسکراتے پر اکتفا کیا۔

”کیا لوگے کافی یا سوفٹ ڈرنک۔“
”تو تھمنکس۔ میں اب چلوں گا۔“ میں تو بس یہ نوٹس اہمل کو دینے آیا تھا۔“ سرفراز جانے کے لیے کھڑا ہونے لگا۔

”کتنے عرصے سے جانتے ہو اہمل کو۔“ اس کے سوال پر کھڑا ہوتا سرفراز پھر بیٹھ گیا۔

”پاکستانی ہو۔“ یہ پوچھتے ہوئے مارٹینا کھڑی ہو گئی

عصمت اور کردار کی پختگی کا تصور اہمل کے اندر کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا اور اس بات نے اہمل اور مارینا کے بیچ ایک خلیج حاصل کر دی تھی۔

فطرتاً مارینا اہمل سے محبت کرتی تھی۔ پر اہمل کا اس کی ذات سے گریز اس میں چریدہ اکر رہتا تھا۔ اس کا ذمہ دار وہ فراہ احمد کو سمجھتی تھی۔ بھرپور جوانی کا وقت اس نے عیاشیوں میں گزار دیا اور اب بھی اس کے معمولات کچھ زیادہ نہیں بدلے تھے، اب جب وہ پینتالیس سال کی ایک بچختہ کار عورت تھی تو اپنا آپ اندر سے خالی خالی محسوس کرتی تھی۔ سچی خوشی کا کوئی احساس اس کے اندر نہیں تھا۔ فراہ احمد اور اہمل کے مطمئن چہرے اس کے اندر وحشت سی بھردتے تھے۔ وہ اکثر اہمل کو آتے جاتے اپنے پاس بلانے لگی اور چاہتی تھی کہ اس سے باتیں کرے پر وہ چند ایک باتوں کا جواب ہوں ہاں میں دے کر ادھر ادھر ہو جاتی۔

دو سال قبل اس نے اہمل کی برتھ ڈے پر اسے ایک بلیک سیولیس بڑے گلے والی سلور بیڈز سے مزین میکسی گفٹ کی اور اس سے پوچھا کہ وہ اس کے پاس آنے سے کتراتی کیوں ہے۔ اس سے پاس بیٹھ کر باتیں کیوں نہیں کرتی، اس پر چند لمحے اہمل دکھ بھری نظروں سے ماں کو دیکھتی رہی۔

”میں آپ سے کیا بات کروں! جو باتیں آپ کو پسند ہیں وہ مجھے پسند نہیں اور جو مجھے پسند ہیں وہ آپ کے نزدیک انتہائی فرسودہ ہیں اور پھر ماں میں آپ سے بات کروں یا نہ کروں آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ کے سبکدوش دوست ہیں نا، آپ سے باتیں کرنے کے لیے“ آخر میں اس کی زبان پر ماں کے لیے طنز آ ہی گیا۔

”ایسی بات نہیں ہے اہمل! تمہارے بات نہ کرنے سے مجھے فرق پڑتا ہے بیٹا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تم میرے پاس آؤ، مجھ سے باتیں کرو، میرے ساتھ ٹائم اسپینڈ کرو۔“ اس کے انداز میں تھوڑی سی لجاجت تھی۔

”اما“ میں نے آپ کے ساتھ ٹائم اسپینڈ کرنا

شروع کر دیا تو پھر آپ کے ان دوستوں کا کیا ہو گا جن کے ساتھ ٹائم اسپینڈ کرنے کے لیے آپ نے مجھے چھوڑ دیا۔“ اس کا طنز کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

”اہمل۔“ مارینا کے انداز میں ایک تنبیہ تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ اپنی حد میں رہو۔ میں نے تمہیں نہیں چھوڑا۔ تمہارے باپ نے تمہیں مجھ سے چھین لیا۔

”اچھا؟ کیوں؟ کیوں کیا اما انہوں نے ایسا؟“

”کیونکہ وہ تمہارے ذریعے سے یہ مکان اور

جینیفورڈ پارٹمنٹل اسٹور تھکانا چاہتا ہے۔“

”اما آپ کو کیا لگتا ہے اگر ایسا ہوتا تو کیا آپ اس

گھر میں ہوتیں۔ لیگل ی یہ گھر میرے نام ہے اور

اسٹور کا پاور آف اٹارنی بیلا کے نام اگر وہ آپ کو اس گھر

سے باہر نکال دیں تو کوئی قانون آپ کو یہ گھر اور کاروبار

نہیں دلواسکتا یہ بیلا کا طرف ہے جو انہوں نے اس گھر

میں آپ کے وجود کو آپ کی تمام بے ہودگیوں سمیت

برداشت کیا ہوا ہے اور وہ صرف اس لیے کہ آخر کو کچھ

بھی سہی آپ ہیں تو میری ماں۔“

”چٹا رخ۔“ اہمل کے باپ کا طرف بہت بڑا تھا، پر

ماں کا طرف بہت چھوٹا تھا، بیٹی کے دکھائے ہوئے

آئینے میں اپنی بد صورت دیکھ نہ سکی، اس لیے بیٹی کو

تھپڑ مار دیا۔

”کیوں۔“ اما کیا ہوا۔ سچ برداشت نہیں ہوا آپ

سے۔“

”سچ۔ کون سا سچ۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سب

تمہارے باپ نے چالاکی سے چھینا ہے۔ میری ماں کو

بے وقوف بنانے کے اور تمہیں مجھ سے بدظن کر کے

اس خبیث شخص نے مجھے برباد کر ڈالا اور تم اس کی

حمایت میں میرے سامنے کھڑے ہو کر مجھے ذلیل

کر رہی ہو، دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے۔“

غصے سے مارینا ہانپ رہی تھی۔

اہمل نے ہاتھ میں پکڑی میکسی وہیں صوفے پر

پھینکی اور بھاگ کر اوپر اپنے کمرے میں آگئی اور بیڈ پر گر کر

بھوٹ بھوٹ کر رو دی۔

ملاقات ہو گئی۔ وہاں اے لیڈی یار! وہ تو بالکل تمہاری بڑی بہن لگتی ہیں۔“ سرفراز نے مسکرا کر اہمل سے کہا۔ اہمل کا چہرہ بے تاثر رہا۔

”تم نے اپنا اسائنمنٹ جمع نہیں کرایا ابھی تک۔“ اہمل نے عام سے انداز میں بات بدل دی۔ سرفراز کو حیرت ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی می کے ذکر پر برجوش ہو جائے گی۔

”ہاں۔۔۔ کل کرواؤں گا۔“ چند لمحے دونوں خاموش رہے پھر سرفراز بولا۔

”کیا بات ہے اہمل۔ تم اپنی می کے ذکر سے اتنا کتراتے کیوں ہو۔“ یہ وہ سوال تھا جس سے اہمل ہمیشہ بچنا چاہتی تھی۔ یہ جانتی تھی ایک نہ ایک دن سرفراز اس کی ماں کے بارے میں جاننا ضرور چاہے گا، لیکن وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ماں کا گند اکروار اس پر تھلے

”نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں، ابھی چوٹلی میں اور ماما بائے نیچر ایک دوسرے سے کافی الگ ہیں۔ میں بچپن سے ہی پیپا سے کافی الٹیج رہی ہوں۔“

”ہاں یہ تو میں نے بھی محسوس کیا ہے کہ ان کا مزاج تم سے کافی الگ ہے اور وہ خاصی بولڈ بھی ہیں۔“ سرفراز کی اس بات پر اہمل کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا کا نیچے رہ گیا۔ جانے وہ کیا کیا محسوس کر چکا تھا۔

”اچھا۔۔۔ تم یہ بتاؤ ویک اینڈ پر کیا کر رہے ہو۔“ اس نے ایک دم ہی سرفراز کا دھیان بٹانے کی کوشش کی۔

”ڈیٹ پر جا رہا ہوں۔“ وہ بھی اہمل کی بات پر شوخ ہوا۔

”اچھا، کس کے ساتھ۔۔۔؟“

”تمہارے ساتھ اگر جو تم راضی ہو جاؤ۔“ اس بات پر دونوں ہی قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

”اچھا، کس کے ساتھ۔۔۔؟“

”اچھا، کس کے ساتھ۔۔۔؟“

”اچھا، کس کے ساتھ۔۔۔؟“

”اچھا، کس کے ساتھ۔۔۔؟“

”اچھا، کس کے ساتھ۔۔۔؟“

”اہمل۔“ سیڑھیاں چڑھتے اہمل کے قدم ساکت ہو گئے۔ آج بہت عرصے بعد مارینا نے اہمل کو آواز دی تھی۔

”جی۔“ اہمل نے اٹھنے والے قدموں سے ہٹ کر اپنے آگے آتے ہوئے پوچھا۔ مارینا نے ہاتھ میں پکڑا نوٹس کا ریٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ نوٹس۔ تمہارا بوائے فرینڈ سرفراز دے گیا ہے۔“ مارینا نے نما کے حوالے سے اس کے کردار پر ایک کیا تو اہمل اندر ہی اندر تلملا گئی۔ پر بولی کچھ نہیں۔ سرفراز پر غصہ بھی آیا کہ اسے کیا ضرورت تھی نوٹس گھرانے کی، میں کل یونیورسٹی میں ہی لے لی تھی۔ اہمل نے مارینا کے ہاتھ سے نوٹس لیے اور خاموشی سے سیڑھیوں کی طرف مڑ گئی یہ ابھی دوسری سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک بار پھر اسے مارینا کی آواز پر رگنا پڑا۔

”ویسے۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم نے بوائے فرینڈ کے طور پر ایک پاکستانی ہی کو کیوں چنا۔“ اہمل نے گھوم کر مارینا کی طرف دیکھا۔ ”کیونکہ مجھے اس کے باوفا ہونے کا یقین ہے۔“

”اوہ۔۔۔ ریکی۔“ مارینا کے ہونٹوں پر طنزیہ ہنسی آئی۔ اہمل مزید کچھ بولے بغیر تیزی سے اوپر آگئی۔

”ہے۔۔۔ ایسی کہاں یار، میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔“ سرفراز کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اہمل سر پیٹر کے آفس میں اسائنمنٹ جمع کروا کر باہر آئی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے گھاس کے طول سبز قطعہ پر آکر بیٹھ گئے۔ یہ یونیورسٹی میں ان دونوں کی پسندیدہ جگہ تھی۔

”نوٹس مل گئے تھے؟“

”ہاں۔۔۔ یہ تم گھر کیوں لے کر آئے، میں یہیں لے جاتی۔“ اہمل کا لہجہ کچھ مبہم تھا، سرفراز سمجھا نہیں۔

”اچھا ہوا نا۔ اس بہانے تمہاری می سے بھی

”اچھا ہوا نا۔ اس بہانے تمہاری می سے بھی

”اچھا ہوا نا۔ اس بہانے تمہاری می سے بھی

”اچھا ہوا نا۔ اس بہانے تمہاری می سے بھی

”آپ یہاں۔۔۔ خیریت۔۔۔ اہمل تو جا چکی ہے۔“
 ”ہاں۔۔۔ میں اہمل سے نہیں، تم سے ملنے آئی تھی۔“

”مجھ سے۔۔۔“ سرفراز کی حیرت بڑھ گئی۔ ”کیوں؟“
 کوئی خاص بات۔۔۔

”ہوں۔۔۔ بات تو خاص ہی ہے۔“ مارینا کی نظر اور لہجہ دونوں معنی خیز تھے۔
 ”جی۔۔۔ کہیے۔۔۔“

سرفراز کے کہنے پر مارینا نے ارد گرد نظر دوڑائی۔
 ”جو بات میں تم سے کرنے آئی ہوں، اس کے لیے یہ جگہ موزوں نہیں۔ کسی ریستورنٹ میں چلتے ہیں۔“
 ”چلیں۔۔۔“ سرفراز نے کندھے اچکائے، پھر وہ دونوں ایک کافی شاپ میں جا بیٹھے۔

”سرفراز۔۔۔ میں اور اہمل ماں، بیٹی ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت دور ہیں، کیا تم یہ بات جانتے ہو۔“ مارینا نے نپے تلے انداز میں بات شروع کی۔

”جی۔۔۔ میں نے محسوس کیا ہے۔“
 ”میں اہمل سے بہت محبت کرتی ہوں اور بہت چاہتی ہوں کہ وہ میرے قریب آجائے، پر میں جتنی کوشش کرتی ہوں۔ وہ اور زیادہ مجھ سے دور ہو جاتی ہے۔“ سرفراز خاموش رہا۔

”کیا تم اس کی وجہ نہیں جانتا چاہو گے۔“
 ”آپ کہیں، میں سن رہا ہوں۔“
 ”اس کی وجہ تمہارا ہم وطن اہمل کا باپ فرہاد ہے۔“ مارینا کا لہجہ طنز آمیز تھا۔

فرہاد کو اس بات پر حیرت کا جھٹکا لگا۔ ”پر فرہاد انکل تو بہت اچھے انسان ہیں۔“

”ہر شخص کا ظاہر اور باطن ایک سا نہیں ہوتا۔ وہ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ اور ہے۔ اس نے مجھ سے شادی صرف اور صرف میری جائیداد ہتھیانے کے لیے کی اور یہ کام اس نے بڑی چالاکی سے میری بوڑھی ماں کو بے وقوف بنا کر کر لیا، میں کم عمر تھی اس کی چال سمجھ نہ سکی، میری ماں نے گھر اور کاروبار اہمل

کے نام کر کے پاور آف اٹارنی فرہاد کو دے دیا اور پھر آہستہ آہستہ اہمل کو مجھ سے ذہنی طور پر دور کر دیا۔“
 یہ کہتے کہتے مارینا کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔
 سرفراز کا دل مارینا کے لیے ہمدردی سے بھر گیا۔ وہ سادہ دل نوجوان تھا۔ مارینا جیسی گھاگ عورت کو زیادہ دیر نہ لگی۔ سرفراز کو شیشے میں اتارنے کے لیے۔
 ”مجھے آپ سے ہمدردی ہے، پر میں سمجھ نہیں پایا، یہ سب آپ مجھ سے کیوں کہہ رہی ہیں۔“

”یہ ساری باتیں میں نے تم سے اس لیے کی ہیں، کیونکہ میں سمجھ گئی ہوں کہ تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو اور میری نظر میں اسی ساری دنیا میں تم واحد شخص ہو جو میری بیٹی کو میرے قریب کر سکتے ہو، وہ تم سے محبت کرتی ہے، تمہاری بات ضرور مانے گی۔ مجھے مایوس مت کرنا سرفراز، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ مارینا نے لجاجت سے ٹیبل پر رکھے سرفراز کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ اس کی بے قراری پر سرفراز کا دل پکھل گیا۔

”میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لیے۔“ سرفراز کی اس بات نے مارینا کے اندر کی شیطانیت کو سکون بخشا۔

”پہلے تو تم مجھ سے وعدہ کرو اہمل کو ابھی ہماری اس ملاقات کے بارے میں نہیں بتاؤ گے۔“
 ”میں وعدہ کرتا ہوں، پر آگے کیا کرنا ہے۔“
 ”یہ میں تمہیں اگلی ملاقات میں بتاؤں گی۔ مجھے اپنا کانٹیکٹ نمبر دے دو۔“

اور پھر ہر چند دن بعد مارینا سرفراز کو کہیں نہ کہیں بلا لیتی، کبھی کسی ریستورنٹ میں، کبھی کسی پارک میں اور کبھی اہمل اور فرہاد کی غیر موجودگی میں گھر پر۔ سرفراز اہمل کی ماں کے احترام میں چلا آتا۔ مارینا کی پوری کوشش تھی کہ وہ معصوم بن کر سرفراز کو اہمل کی زندگی سے نکال دے، پر بہت جلد اسے احساس ہو گیا کہ اہمل کے لیے سرفراز کے جذبات بہت گہرے ہیں۔ اس احساس کے بعد مارینا کے شیطانی ذہن نے کچھ اور ہی پلان کر ڈالا۔

ایک بار پھر پاکستانی مسلمان کے کروار کی مضبوطی اس کے لیے چیخا رہی تھی۔

امہل کی شدید فرمائش پر فرہاد احمد نے اس بار کمرس کی چھٹیوں پر اسے پیرس لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ ویسے تو وہ دونوں اپنے کسی پروگرام کو مارٹینا سے ڈسکس نہیں کرتے تھے۔ پر اس پروگرام کے بارے میں مارٹینا کو سرفراز کے ذریعے خبر مل چکی تھی۔ اتفاق سے جس رات امہل پیرس جا رہی تھی اس سے اگلے دن امہل کی برتھ ڈے تھی۔ رات کے آٹھ بجے دونوں باپ بیٹی ایرپورٹ کے لیے نکل گئے اور ٹھیک رات ساڑھے دس بجے مارٹینا نے سرفراز کو فون کیا۔

”خیریت۔ اتنی رات کو کال کی سب خیریت ہے نا۔“

”ہاں سب خیریت ہے۔ کل امہل کا برتھ ڈے ہے تو سوچا کیوں نہ رات بارہ بجے سیلہ بیوٹ کریں۔“

”پر امہل تو پیرس چلی گئی ہے۔ اس وقت تو اس کا جہاز ٹیک آف کر رہا ہوگا۔“

”ارے نہیں، شدید برف باری کی وجہ سے اس کی فلائٹ کینسل ہو گئی ہے۔ وہ رات بارہ بجے سے پہلے واپس آجائے گی۔ ایرپورٹ یہاں سے زیادہ دور تو نہیں ہے اور اب اس کی فلائٹ صبح دس بجے کی ہے۔“

”واقعی۔ اچھا ٹھیک ہے، پھر میں آتا ہوں۔“

سرفراز کا چہرہ دلی مسرت سے جگمگا اٹھا۔

اور کبھی کبھی انسان کو پتا بھی نہیں چلتا اور اس کے منہ سے نکلی بات سچ ہو جاتی ہے۔ مارٹینا نے سرفراز سے جھوٹ بولا تھا۔ پر دوسری طرف سچ بھی شدید برف باری کی وجہ سے امہل کی فلائٹ کینسل ہو گئی تھی۔ ساڑھے گیارہ بجے سرفراز نے ہاتھوں میں پھولوں کا بڑا سا بوکے لیے نیل بجائی تو مارٹینا نے دروازہ کھولا وہ بلیک لائٹ کوٹ میں ملبوس تھی۔ اس نے گرجوٹی سے فراز کو اندر بلایا۔ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھتے دونوں لاؤنج میں آگئے۔

ہلکی ہلکی میوزک اور دھیمی روشنیوں میں اندر کا

ماحول خاصا رومانٹک لگ رہا تھا۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد مارٹینا کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔ سرفراز کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مارٹینا اپنے گلاس میں مشروب انڈیل رہی تھی۔ وہ دو گلاس لے کر پلٹی۔

”سوری۔ میں یہ نہیں پیتا۔“

”جانتی ہوں، اسی لیے میں تمہارے لیے سو فٹ ڈرنک لائی ہوں۔“ سرفراز نے مارٹینا کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔

”امہل نہیں آئی ابھی تک۔“ سرفراز کچھ الجھن میں تھا۔

”آنے ہی والی ہوگی، تم بیٹا۔“ سرفراز نے ڈرنک پینا شروع کیا، پروہ یہ نہ جان سکا کہ نہایت ہوشیاری سے مارٹینا اس کے مشروب میں نشلی دوائی ملا چکی ہے۔

”اس کا ٹیسٹ کچھ عجیب سا ہے۔“ مشروب ختم کر کے سرفراز نے گلاس نیل پر رکھا۔

”ہوں۔ ہو سکتا ہے، پرتاؤ ہے کیسا۔“ مارٹینا کی گہری نظریں مسلسل سرفراز کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”اچھا ہے۔“ سرفراز نے کندھے اچکائے۔

”ارے تو پھر اور لوٹا۔“ اور پھر سرفراز کے منع کرنے کے باوجود مارٹینا نے دوبارہ اس کا گلاس بھر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ لگاؤ بھری باتیں بھی شروع کر دیں۔ گلاس ختم کرتے کرتے سرفراز کو سر بھاری ہوتا محسوس ہوا اور وہ گلاس واپس کاؤنٹر پر رکھنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھا تو اس کے قدم ڈگمگائے اور اسے ہر چیز چکراتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

”کیا ہوا سرفراز، تم ٹھیک تو ہوتا۔“ مارٹینا کی ایکٹنگ اپنے عروج پر تھی۔

”جی نہیں۔ ہاں۔ شاید چکر سا آ رہا ہے۔“

سرفراز کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا، وہ کیا کہہ رہا ہے۔

”اوہو۔۔۔ شاید تم تھک گئے ہو۔ میرے ساتھ آؤ کچھ دیر آرام کر لو۔“ مارٹینا سرفراز کا بازو تھام کر ایک کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے کے وسط میں پہنچ کر سرفراز رک گیا، اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ یہ مارٹینا کا بیڈ روم تھا۔ وہ واپس جانے کے لیے پلٹا، پر یہ

دیکھ کر اپنی جگہ پر جم گیا کہ مارٹینا دروازہ لاک کر چکی تھی۔ سرفراز کا سر جکڑا رہا تھا۔ سوٹ ڈرنک میں ملی لاشی دوا اور مارٹینا کی نازبا حرکات اس کے بعد اس کو کچھ ہوش نہ رہا تھا۔

رات ساڑھے بارہ بجے دونوں باپ، بیٹی بے زاری سے گھر میں داخل ہوئے۔ فرہاد احمد تو اپنا بیگ لے کر فوراً ہی اوپر اپنے کمرے میں چلے گئے، جبکہ امحل مرے مرے قدموں سے سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی، آہستہ آہستہ اوپر چڑھتے اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ لاؤنج سے آتی سلومیوزک کی آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔

”کیا ماما لاؤنج میں ہیں۔“ وہ بے خیالی میں پلٹ کر لاؤنج میں آئی کاؤنٹر پر شیشے کی بوتل اور دو گلاس دیکھ کر اس کے اندر اپنی ماں کے لیے ایک نفرت انگیز جذبہ ابھرا، وہ واپس پلٹ کر سیڑھیوں کی طرف آئی تو ایک دم چونک کر رک گئی، دروازے کے پاس رکھے بلیک اینڈ وائٹ جو گرز اسے بہت جانے پہچانے لگے۔

”نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا“ سرفراز اس وقت یہاں کیوں آئے گا۔“ اپنے آپ سے ابھتی وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی، آخری سیڑھی تک پہنچ کر اس کی برواشت سے باہر ہو گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے پلٹی اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی، مارٹینا کے بید روم کے سامنے پہنچ کر اس نے دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا اور پھر کھینچ لیا۔

”یہ۔ یہ میں کیا کر رہی ہوں۔ اور۔ اور۔ میں نے ایسا سوچا بھی کیسے؟ بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ اپنی ہی سوچ پر شرمندہ ہو کر دو قدم پیچھے ہوئی اور واپس پلٹنے ہی والی تھی کہ اچانک دروازہ کھل گیا اور پھر جو منظر اس نے دیکھا وہ ایک بھیاں تک یا دین کر ساری عمر کے لیے اس کے ذہن کے پردے پر جم گیا۔



نثر اتر تو سرفراز کو اپنا آپ آگ میں جھلتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے اپنے آپ سے گھن آرہی تھی۔

شرٹ پہنتے ہوئے اس نے ایک نظر مارٹینا پر ڈالی، وہ گہری غیند میں تھی۔ اس نے نظر پھیر لی، ایک عجیب سی وحشت میں گھر کر اس نے دروازہ کھول دیا۔

”اوس۔ خدا۔۔۔“ امحل کو سامنے کھڑا دیکھ کر سرفراز کو چکر آگیا، ایک قیامت تھی جو دونوں پر ٹوٹی تھی۔ سرفراز سے ہوئی امحل کی نظر پیچھے بیڈ پر اوندھی لیٹی مارٹینا تک گئی تو شدت جذبات سے اس نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لیں، پر دل کا درد آنسوؤں کی صورت پلکوں کی باڑھ توڑ کر اس کے رخساروں پر بننے لگا۔ امحل کی یہ حالت دیکھ کر سرفراز کو اپنا آپ انتہائی گرا ہوا لگا۔ اس کا دل چاہا کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس نے بہتری اسی میں جانی کہ فوراً ”یہاں سے نکل جائے وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا۔“

”سرفراز۔ تم یہاں اس وقت۔۔۔“ سرفراز نے پیچھے مڑ کر دیکھا، فرہاد احمد سیڑھیوں سے اتر رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر سرفراز ایک جھٹکے سے باہر نکلا اور تیزی سے بھاگتا گلی میں غائب ہو گیا۔

فرہاد احمد کچھ نہ سمجھنے کی کیفیت میں لاؤنج کی طرف آئے، مگر امحل کو بے آواز روتے دیکھ کر ان کے قدم تھم گئے۔ پھر ایک دم انہوں نے آگے بڑھ کر امحل کو سینے سے لگایا۔

”امحل کیا ہوا بیٹے؟ تم رو کیوں رہی ہو اور یہ۔ یہ سرفراز یہاں کیسے۔“ یہ کہتے کہتے ان کی نظر کھلے دروازے سے ہوتی ہوئی مارٹینا کے بیڈ تک گئی، تو ایک لمحے میں انہیں ساری صورت حال سمجھ میں آگئی۔

دکھ کا آتش فشاں ان کے دل میں پھٹا اور لہولہا بن کر ان کی رگوں میں بنے لگا۔ انہوں نے امحل کو خود سے الگ کیا اور کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ امحل کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا، مگر اگلے ہی لمحے مارٹینا کی چیخ اسے سب کچھ سمجھا گئی۔ مغلظات کا ایک طوفان تھا جو فرہاد احمد کے منہ سے نکل رہا تھا۔ ان کی لائیں، کے مارٹینا کے جسم پر کوٹوں کی طرح برس رہے تھے اور مارٹینا کی چیخوں سے سارا گھر گونج رہا تھا۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف ایڈفرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- Open Paksociety Page.
- Click Liked.
- Select Get Notifications.
- Select See First.

All Done

Like Liked Message

Get Notifications

Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First

See new posts at the top of News Feed

Default

See posts as usual

Unfollow

زیب کے ساتھ ہی آئی ہوں۔“
 ”اچھا۔۔۔ پر میجر صاحب نظر تو نہیں آرہے۔“
 اہمل کے دل میں ابھرنے والا سوال شہرین نے پوچھ ڈالا۔

”تمہارے پیچھے ہی تو کھڑا ہے۔“ ان کے کہنے پر دونوں ایک ساتھ پلٹیں۔ بلیو جینز اور وائٹ شرٹ میں سیاہ گالز لگائے وہ اپنی بھرپور مردانہ وجاہت کے ساتھ بہت اچھے لگ رہے تھے۔ شہرین نے انہیں دیکھتے ہی سلام کیا۔ پر اہمل کے لب نہ ہل سکے۔ انہوں نے گہری نظروں سے اہمل کو دیکھتے ہوئے شہرین کے سلام کا جواب دیا۔

”کہاں ہو بھی گر! آج کل نظر ہی نہیں آتیں۔“ انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں بات شروع کی۔

”سر! میں تو دو دن پہلے ہی جہلم سے آئی ہوں، پر یہ محترمہ تو مستقل آپ کے بڑوس میں ہوتی ہیں۔ حیرت ہے آپ کو، پھر بھی نظر نہیں آتی۔“ شہرین کی اس بات پر اہمل نے پہلے شہرین، پھر میجر صاحب کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ وہ بھی مسکرا دی۔

”بالکل صحیح کہہ رہی ہو بیٹا، بڑوس میں ہوتے ہوئے بھی یہ بچی مجھے نظر نہیں آتی۔“ سفینہ بیگم نے پیار بھرا شکوہ کیا۔

”بس آئی فرصت ہی نہیں ملتی۔“

”ارے بھی ایسی بھی کیا مصروفیت ہے، چند گھنٹی کو ہی سہی مجھ بوڑھی لپانج کے پاس آجایا کرونا۔“ انہوں نے بہت پیار سے اہمل کا ہاتھ تھام لیا۔

”اوس گی ان شاء اللہ۔“ اس نے بھی پیار سے اپنا دوسرا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھا۔

”آئی یہ تو آتی جاتی رہے گی، آج آپ لوگ آجائیں نا اہمل کی طرف۔ رات میں اہمل زبردست بریانی بنانے لگی ہے میری فرمائش پر۔“

”ارے پر تمہیں تو پاکستانی کھانے بنانے نہیں آتے تھے، پھر یہ بریانی کیسے۔“ اہمل مسکرا دی۔

”آئی یہ میرا کمال ہے۔ محترمہ میری تابعدار

بت مشکل سے اہمل نے فرہاد کی ضمانت کروائی تھی۔ بیوی پر تشدد کے جرم میں پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا تھا۔ ثبوت کے طور پر مارشٹنا نے اپنے جسم کا ایک ایک نیل پولیس والوں کو بہت بے باکی سے دکھایا تھا۔ قریب تھا کہ فرہاد احمد کو قید ہو جاتی، پر اہمل نے فرہاد احمد کی رہائی کے عوض گھر اور ڈیپارٹمنٹل اسٹور مارشٹنا کے نام کر دیا۔ اہمل اور فرہاد احمد نے پاکستان چلے جانے کا پروگرام بنایا تھا، پر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

جس دن قانونی کارروائی ختم ہوئی اور مارشٹنا اور فرہاد احمد پولیس اسٹیشن سے باہر آ رہے تھے تو دونوں ایک تیز رفتار اسٹیشن ویلن کی زد میں آ گئے۔ مارشٹنا موقع پر ہی دم توڑ گئی، جبکہ فرہاد احمد دو دن اسپتال میں سخت جان کنی کی کیفیت میں مبتلا رہ کر جان کی بازی ہار گئے، پر جاتے جاتے اہمل کو اقبال سے رابطہ میں رہنے کی تاکید کر گئے۔

میجر جہاں زیب کی طبیعت سنبھل گئی تھی، پر اہمل کو اپنا آپ بہت خالی خالی لگ رہا تھا۔ پچھلے دو دن سے اس نے میجر صاحب کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس نے اپنے بارے میں میجر صاحب کو بتا کر ٹھیک کیا یا غلط۔

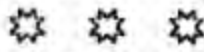
آج وہ شہرین کے ساتھ کچن کا کچھ سامان لینے قریبی سپر اسٹور پر آئی تھی۔ ”ارے اہمل! سفینہ آئی۔“ ”السلام علیکم آئی! کیسی ہیں۔“ دونوں نے سلام کیا۔

”ارے۔۔۔ وعلیکم السلام۔۔۔ بھی تم دونوں یہاں کہاں۔۔۔“ وہ ان دونوں کو دیکھ کر کھل اٹھیں۔

”بس ایسے ہی آئی کچھ سامان لینے آئے تھے اور آپ۔۔۔ اکیلی آئی ہیں۔“ اہمل نے محتاط انداز میں پوچھا۔

”نہیں بھی۔۔۔ میں اکیلی کیسے آسکتی ہوں۔ جہاں

ہونے والی آرٹ ایگزیشن کا پاس دے گئے تھے۔

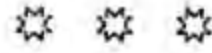


ایگزیشن بہت زبردست تھی۔ بہت سے مصوروں کے فن پارے رکھے گئے تھے۔ اہمل میجر صاحب کے ہمراہ تصویریں دیکھ رہی تھی اور ان پر اپنی رائے کا اظہار بھی کر رہی تھی۔ میجر صاحب بھی کبھی کبھی کچھ کہہ دیتے، ویسے وہ آج کچھ چپ چپ ہی تھے۔
”اس رات تم کچھ پوچھ رہی تھیں۔“ اہمل کو یقین نہیں تھا کہ وہ خوب بات شروع کریں گے۔
”جی۔۔۔“

”پوچھو جو پوچھنا ہے، میں اپنا آپ بالکل بھی نہیں چھپاؤں گا تم سے۔۔۔“
اہمل ان کے دیکھنے پر کچھ جھینپ سی گئی۔ ”نہیں ایسا کچھ خاص تو نہیں۔ بس یہ ہی پوچھ رہی تھی کہ آپ نے دوبارہ شادی کیوں نہیں کی۔“
”دوبارہ شادی نہ کرنے کی تین وجوہات تھیں۔“ انہوں نے ایک تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔
”ایک تو یہ کہ کاشان بہت چھوٹا تھا۔ اسے سوتیلی ماں کے حوالے کرنے کو میرا دل نہیں مانتا تھا۔ دوسرے ماں معذور ہو گئی تھیں اور میری نظر میں کسی بھی عورت یا لڑکی پر شادی ہوتے ہی چھوٹے بچے اور اپناج ساس کی ذمہ داری ڈال دینا بہت بڑی زیادتی کی بات ہے، تیسری وجہ اور سب سے بڑی وجہ میرا دل تھا جو کسی اور عورت کو قبول کرنے پر کبھی تیار نہ ہوا۔“
”کیوں؟“ اہمل کو اپنے دل میں درد سا ابھرتا محسوس ہوا۔

”کیونکہ محبت ایک بار ہوتی ہے، بار بار نہیں اور میرے حصے کی محبت تمہینہ کے ساتھ ہی دم توڑ گئی، اب صرف اس کی یادیں زندہ ہیں۔“
”اور اگر کسی اور کو آپ سے محبت ہو جائے تو۔۔۔؟“ انجانے اندیشوں میں گھر کر اس نے پوچھ ہی لیا۔ میجر صاحب نے اسے دیکھا اور ہلکے سے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر چپٹ لگائی۔

شاگرد ہیں۔“ شہرین نے اہمل کی پیچھے پھرتی سائی۔
”تو پھر کہیں بریانی کے نام پر کوئی تجربہ تو کھانا نہیں پڑے گا۔“ میجر صاحب نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔
”ارے نہیں سر، بس یہ ہی تو غلطی ہو گئی مجھ سے، اپنے سارے گراسے سکھا دیے۔ اب یہ مجھ سے بھی اچھی بریانی بناتی ہے۔“
”بس تو پھر ٹھیک ہے، ماں! آج اہمل کے ہاتھ کی بریانی ہی کھانی ہے۔“ میجر صاحب کی بات سن کر وہ تینوں ہی مسکرا دیں۔



رات میں اہمل نے خوب دل سے بریانی بنائی جو میجر صاحب اور سفینہ بیگم کو بہت پسند آئی، ہلکی پھلکی باتوں میں کھانا کھایا گیا، پھر اہمل قہوہ بنانے کچن کی طرف آگئی۔ شہرین سفینہ بیگم کو اپنے خاندانی بیک گراؤنڈ سے متعارف کروانے لگی اور میجر صاحب اہمل کی کتابوں کی طرف آگئے۔ اہمل ان کا کپ لے کر آئی تو وہ کہنے لگے۔
”تمہارا ادبی ذوق تو بہت اچھا ہے۔“
”پر آپ کا تو کمال کا ہے۔“ اس کی بات سن کر وہ مسکرا دیے۔
”میری عمر تک تم بھی کمال کو پہنچ جاؤ گی۔“
”ایک بات پوچھوں آپ سے۔۔۔“
”شہرین۔۔۔“

”اپنی وائف کی ڈیوٹی کے بعد آپ نے دوبارہ شادی کیوں نہیں کی۔“ اس کی بات سن کر وہ کچھ دیر قہوے پر نظریں جمائے کھڑے رہے، پھر ماں اور شہرین کو دیکھ کر بولے۔
”اس پر پھر کبھی بات کریں گے۔“

”مجھ سے تو میرے بارے میں سب کچھ جان لیا آپ نے اور اپنا آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔“ اہمل کی اس بات پر انہوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ان کے فون کی بیل بج اٹھی اور باتوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا، پر جانے سے پہلے وہ اسے پی سی میں

”محبت اپنا آپ منوالیتی ہے“ اگر کسی کی میرے لیے محبت اتنی پاور فل ہوئی تو ضرور اپنا آپ منوالے گی۔“ اور اس رات اہمل نے اپنی محبت آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔



اپنا آپ آئینے میں دیکھ کر چند لمحے وہ خود بھی دنگ رہ گئی۔ کبابی سفید ریشم اور شیشوں سے مزین کڑھائی والی فراک اس پر بہت سوٹ کر رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہم رنگ نازک سی جیولری نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ آنکھوں میں کاجل اور لائٹ پنک لپ اسٹک لگا کر اس نے اپنی تیاری کو آخری ٹیچ دیا۔ آج وہ سفینہ بیگم کی دعوت پر ان کی طرف ڈنر کے لیے جا رہی تھی۔ پرفیوم لگا کر اس نے اپنا پرس اور پھول اٹھائے اور اپارٹمنٹ سے باہر آگئی۔ پھولوں کا گلہستہ اس نے آفس سے آتے ہوئے سفینہ بیگم کے لیے لیا تھا اور گلاب کی ایک کلی خاص میجر جہاں زیب کے لیے دروازے پر دستک دیتے ہوئے اس کی شدید خواہش تھی کہ دروازہ میجر صاحب کھولیں۔ اس کا یہ روپ سب سے پہلے ان کی نظروں میں آئے۔ یہ سوچ کر اس کے لبوں پر ایک بہت دل فریب مسکراہٹ آگئی اور نظریں جھک گئیں۔

”اوہ مائی گاڈ! وہاٹ اے بیوٹی۔“ اجنبی آواز پر اہمل نے حیرت سے سر اٹھایا۔ اکیس بائیس سال کے ایک جوان لڑکے کو بلیک جینز اور شوخ رنگوں کی شرٹ میں چیونٹم چباتے ہوئے خود کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے دیکھا۔

”سفینہ آئی ہیں۔“ اہمل نے قدرے بے زاری سے پوچھا۔

”آہا تمہاری تو آواز بھی تمہاری طرح پیاری ہے۔“ لڑکے نے لہک کر کہا تو اہمل سخت بد مزہ ہو گئی۔

”کون ہے دروازے پر کاشان۔“ سفینہ بیگم کی پیچھے سے آواز آئی تو اہمل چند لمحوں میں سمجھ گئی کہ یہ میجر صاحب کا بیٹا ہے۔

”ہشو از اے فیری گریٹڈام۔“

”ارے بھئی تو فیری کو اندر بھی بلاؤ گے یا نہیں۔“

لڑکے کے پیچھے سفینہ بیگم اپنی وہیل چیئر پر نمودار ہوئیں۔

”اوہ آتم سوری۔ پلیز ویلکم۔“ کاشان نے دروازے سے ہٹ کر اہمل کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اہمل نے آگے بڑھ کر سفینہ بیگم کو سلام کیا اور پھول دیے۔ انہوں نے پھول لیتے ہوئے پیار سے اس کے ہاتھ چوم لیے۔

”اور یہ کلی تو آپ یقیناً“ میرے لیے لائی ہوں گی“ کیونکہ اس کا حق دار یہاں صرف اور صرف میں ہی ہو سکتا ہوں۔“ کاشان نے کلی اس کے ہاتھ سے اچک لی۔ سفینہ بیگم پوتے کی شرارت پر ہنس پڑیں جبکہ اہمل کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

وہ جو سوچ کر آئی تھی سب کچھ الٹ گیا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ فوراً ”واپس چلی جائے اتنے میں اسے ایک کمرے سے میجر صاحب باہر آتے دکھائی دیے۔ وہ بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس تھے۔ اس کے کمرے سے باہر آتے ہی ان کے پرفیوم کی خوشبو سے ساری فضا مہلک اٹھی۔ تیاری سے لگ رہا تھا وہ کہیں جا رہے ہیں۔ ان کی نظر اہمل پر پڑی تو دھیمے سے مسکرا دیے اور قریب آکر بولے۔

”کننگ گارجیں۔“

”تھینکس۔“ اہمل نے کچھ شرما کر نظریں جھکا لیں۔

”کاشان تم اہمل سے ملے“ یہ وہی فیری ہے جس کے بارے میں تمہیں ٹیٹ پڑتا تھا ہا ہوں۔“

”بایا میں نے پہلی نظر میں ہی جان لیا تھا۔ ویسے آنے سے پہلے مجھے اپنے جیت جانے کا یقین تھا۔ پر اب لگتا ہے میں چیلنج ہار جاؤں گا۔“ اس بات پر دونوں باپ بیٹا قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

”بھئی یہ کون سے چیلنج کی بات ہو رہی ہے کوئی مجھے بھی بتائے گا کچھ یا نہیں۔“ سفینہ بیگم اپنے بیٹے اور پوتے کو مبہم باتوں پر ہنستا دیکھ کر بول اٹھیں۔

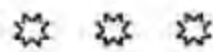
”اُس اے سیکرٹ ہونے اندر گرینڈ مام۔“
 کاشان کی آنکھوں میں شرارت تھی۔
 ”آپ کہیں جا رہے ہیں۔“ اہمل نے مہر صاحب سے پوچھا۔

”ہاں۔ میں آج اپنے ایک دوست کی طرف انوائسٹ ہوں۔“ ان کا جواب سن کر اہمل کو اپنے اندر کچھ ٹوٹا محسوس ہوا۔ اتنا تیار ہو کر آج وہ اپنے جذبے آزمانے آئی تھی۔ پر پہلے ہی قدم پر اسے ناقدری کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا۔

”جہاں زیب بیٹا اب یہ کوئی اچھی بات تو نہیں آج کاشان دو سال بعد پاکستان آیا ہے۔ میں نے اہمل کو بھی بلایا تھا کہ سب مل کر کھانا کھائیں گے اور تم جا رہے ہو۔“ سفینہ بیگم نے بیٹے سے شکوہ کیا۔

”کم آن ماں! شان اب یہیں ہے۔ اس نے کہاں جاتا ہے اور اہمل کو آپ دونوں مجھ سے زیادہ اچھی سمجھتی دو گے۔ آئی ایم شیور۔“ انہوں نے گھڑی دیکھتے ہوئے جلدی جلدی کہا اور پھر سب کو خدا حافظ کہتے ہوئے چلے گئے۔

اہمل کو سب کے بیچ ہوتے ہوئے بھی اپنا آپ بالکل تنہا لگا۔ وہ مسکرا مسکرا کر کاشان اور سفینہ بیگم سے باتیں کرتی رہی، پر گہری اداسی اس کے اندر رات چلی تھی۔ کھانا بھی اس نے بدولی سے کھایا اور پھر کھانے کے بعد وہ جلد ہی وہاں سے واپس آگئی۔



اگلی صبح وہ آفس جانے کے لیے اپارٹمنٹ سے باہر آئی تو کاشان اپنے اپارٹمنٹ کے آگے ہی کھڑا تھا۔ گرین ٹریک سوٹ میں کانوں میں ہینڈ فری لگائے ہوئے وہ بہت فریش لگ رہا تھا۔

”ہائے۔“ اہمل پر نظر پڑتے ہی وہ قریب چلا آیا۔
 ”السلام علیکم۔“ اس کے ہائے کہنے پر اہمل نے اسے سلام کیا اور لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔

”اوہ سوری۔“ وعلیکم السلام کیسی ہو۔“ کاشان نے مسکرا کر جواب دیا اور اس کے پیچھے پیچھے لفٹ کی طرف

چلا آیا۔ ”یار تم تو بہت فاسٹ موو ہو۔ میں تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔“ لفٹ کال کرتی اہمل نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا۔
 ”کیوں کوئی خاص بات تھی۔ ابھی رات کو تو اتنی باتیں کی ہیں۔“

”ہاں نا۔ پر ایسا لگ رہا ہے کوئی بات ہی نہیں کی اس لیے اور باتیں کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔“ کاشان نے اہمل کے ساتھ لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”سوری۔ ابھی تو میں آفس جا رہی ہوں، پھر کبھی کرس گے اور ویسے بھی میں اتنی اچھی باتیں نہیں کرتی، بہتر ہے تم اپنا دل بھلانے کے لیے کسی اور سے دوستی کرلو۔“ اہمل کو اس کی بے تکلفی بری طرح کھل رہی تھی۔

”واہ بھئی! تمہاری تعریفیں سن سن کر تو میرے کان پک گئے اور تم کہتی ہو کسی اور سے دوستی کرلو۔ یہ تو نہیں ہو سکتا۔ دوستی میں ان سے کرتا ہوں جو مجھے اچھے لگتے ہیں اور تم مجھے بہت اچھی لگی ہو، اسی لیے دوستی تو تمہیں ہی مجھ سے کرنی ہوگی۔“ کاشان کے بے ساختہ انداز پر اہمل کو ہنسی آگئی۔ لفٹ کا دروازہ کھل چکا تھا۔

”واہ بھئی۔ اچھی زبردستی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ اتنی تعریفیں کس نے کر ڈالیں تم سے میری۔“ اس نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

”واہی نے اور سب سے زیادہ بیایا ہے۔“ کاشان نے لہک کر جواب دیا۔

گاڑی کا دروازہ کھولتے اس کے ہاتھ چند لمحوں کو رک گئے۔ اس کے دل نے ایک ہیٹ مس کی۔

”واہ۔ مجھ سے تو کبھی کچھ نہیں کہا اور بیٹے سے اتنی تعریفیں کر ڈالیں۔“ یہ سوچتے ہوئے وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”اچھا بتاؤ نا پھر کب ملوگی۔“ کاشان نے شوق سے کھڑکی میں جھکتے ہوئے پوچھا۔

”آفس سے آنے کے بعد۔“ اہمل نے عجلت

”اچھا۔ واقعی۔ چلو کوئی بات نہیں میں کہوں گا۔
ان سے اب وہ تمہاری تعریف میرے ساتھ ساتھ
تمہارے سامنے بھی کیا کریں گے۔“

”کوئی ضرورت نہیں میری کوئی بھی بات اپنے بابا
سے کرنے کی، تم یہ قہو پو اور چلتے بنو یہاں سے۔۔۔“
امہل نے کپ کا شان کو تھماتے ہوئے کہا۔

”یہ مہمان نوازی کا کون سا طریقہ ہے بھی؟ اتنی
بے مروتی تو لوگ یورپ میں بھی نہیں دکھاتے۔“

”یہ بے مروتی نہیں، احتیاط پسندی ہے۔ یورپین
سوسائٹی اور پاکستانی سوسائٹی کی اخلاقیات جلیج ہیں،
یہاں لڑکے لڑکی کا ایک چھت کے نیچے ملنا پسند نہیں
کیا جاتا۔“ امہل نے اسے رساں سے سمجھایا۔

”فرتم تو پاکستانی نہیں ہوا؟ امریکہ میں تو یہ سب برا
نہیں سمجھا جاتا۔“

”یہ ٹھیک ہے کہ مجھے یہاں شفٹ ہوئے زیادہ
عرصہ نہیں ہوا، پر میرے فادر پاکستانی تھے۔ ان کی وجہ
سے میں یہاں کے تمام رسوم و رواج سے واقف ہوں
اور بہت حد تک انہیں فالو بھی کرتی ہوں۔“

”ہوں تو اس کا مطلب بابا ٹھیک کہہ رہے تھے۔“
”کہا کہہ رہے تھے۔“

”یہ ہی کہ شاید تم میرے یہاں تنہا آنے کو پسند نہ
کرو۔“

”بالکل صحیح۔ تم ان سے سیکھا کرو نا۔“
”ان سے تو سیکھوں گا ہی، پر اب بہت کچھ تم سے
بھی سیکھنا پڑے گا۔“ کا شان کے لہجے میں شرارت سی
تھی۔

”مثلاً؟“

”مثلاً یہی کہ تمہیں یہاں کے کون سے رسوم و
رواج پسند ہیں کون سے نہیں۔“ کا شان نے کپ خالی
کر کے ٹیبل پر رکھا۔

”تمہیں میرے متعلق جاننے کی کیا ضرورت
ہے۔“ امہل نے کچھ الجھتے ہوئے پوچھا۔

”ہے نا ضرورت۔ بالکل ہے۔ مستقبل میں
تعلقات نبھانے میں آسانی رہے گی۔“ کا شان

میں جان چھڑانے کے لیے کہا اور گاڑی نکال کر لے
گئی۔ پیچھے کا شان مسکراتی نظروں سے گاڑی جاتے
دیکھتا رہا۔

آفس میں کام زیادہ ہونے کی وجہ سے واپسی میں
امہل کافی تھک گئی تھی۔ اس لیے آتے ہی عصر کی نماز
پڑھی اور پھر سونے کے لیے لیٹ آگئی۔ اسے لیٹے

ہوئے بمشکل آدھا گھنٹہ ہی ہوا ہو گا کہ گھنٹی کی آواز پر
اسے اٹھنا پڑا۔ انتہائی کوفت کے عالم میں اس نے

دروازہ کھولا اور سامنے کھڑے بندے کو دیکھ کر اس کی
کوفت میں دگنا اضافہ ہو گیا۔ کا شان سرخ گلابوں کا

خوب صورت بکے ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ امہل سوچ
میں پڑ گئی۔ اسے اندر بلائے یا نہیں۔

”کیا آپ کے ہاں مہمانوں کو ویل کم کرنے کا کوئی
رواج نہیں۔“ امہل نے دروازے کے سامنے سے

ہٹ کر اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ اندر آتے ہی
کا شان نے جھک کر امہل کو بکے پیش کیا جو اس نے

مسکرا کر شکریہ ادا کرتے ہوئے لے لیا۔
”ہوں۔ تو یہ ہے جناب کا اپارٹمنٹ۔ ٹائس۔

اچھا ڈیکوریٹ کیا ہے۔ اوف۔ واؤ۔ اتنی ساری بکس
بھی لگتا ہے تمہارے اندر بھی بابا والی روح سمائی

ہے۔“
میجر صاحب کے ذکر پر امہل کے دل کی دھڑکن بڑھ

گئی۔ کا شان کی اپنے اپارٹمنٹ میں موجودگی بھی اس
نے میجر صاحب سے اس کی نسبت کی وجہ سے ہر

برداشت کی تھی۔
”چائے پو گے یا کافی۔“

”نہ چائے نہ کافی۔ میں تو تمہارے ہاتھ کا بنا قہو
پینے آیا ہوں، ایک روز بابا نے نیٹ پر تمہارے ہاتھ

کے بنے قہوے کی بہت تعریف کی تھی۔“ کا شان
صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا اور امہل کچن کی طرف

آگئی۔
”اچھا۔ حیرت ہے۔“

”میرے سامنے تو میری تعریف کبھی نہیں کی۔
انہوں نے۔“ امہل کے لہجے میں شکوہ سا تھا۔

”مٹی مٹی ابھی برتھ ڈے ویسے یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے، تم پہلے بتا دیتیں تو میں تمہارے لیے کوئی گفٹ لے کر آتا۔“

”آپ کا آنا ہی میرے لیے سب سے بڑا گفٹ ہے۔“ اس کی اس بات پر میجر صاحب چند لمحے چپ کے چپ رہ گئے۔ اہل نے ایک کاپس کاٹ کر سیلقے سے پلیٹ میں رکھ کر میجر صاحب کی طرف بڑھایا۔

”ارے بھی میری کمپنی میں تم کہاں انجوائے کرو گی بہتر تھا تم کا شان کو بلا لیتیں۔“

”نہیں مجھے صرف آپ کو بلانا تھا۔“ اہل کے ہونٹوں پر دل فریب مسکراہٹ تھی۔ وہ اس کی بات اور مسکراہٹ پر کچھ الجھ سے گئے۔

”کیوں صرف مجھے ہی کیوں۔“

”کیونکہ میرے پاس آپ کے لیے کچھ ہے۔“ اس نے کارڈ کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے پلیٹ ٹیبل پر رکھ کر کارڈ اٹھالیا۔ اندر جو کچھ لکھا تھا وہ ان کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔

میجر صاحب نے حیرت اور بے یقینی سے اہل کی طرف نگاہ اٹھائی، اس کی نگاہیں حیا کے بار سے جھکی ہوئی تھیں۔

شرارت سے کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔
”میں سمجھی نہیں۔“ اہل کے ذہن میں کہیں دور ایک گھنٹی سی بجی تھی۔

”ابھی سے اپنے ننھے سے دماغ پر بوجھ نہ ڈالو آہستہ آہستہ سب سمجھ جاؤ گی۔ اوکے چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر کا شان ہنستا مسکراتا چلا گیا۔

پر اہل کو کچھ اندیشوں میں مبتلا کر گیا۔ ”مجھے جلد ہی میجر جہاں زیب سے بات کرنا ہو گی، پر کب۔ کیسے۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر اچانک ایک خیال آنے پر اس کے لب دھیرے سے مسکرا اٹھے۔

شام کے پانچ بجے اسلام آباد کی سڑکوں پر آفس ٹائم آف ہونے کی وجہ سے خاصا رشت تھا۔ ایٹ آباد سے آتے آتے خاصا ٹائم ہو گیا۔ ان کی گاڑی پارکنگ میں آکر رکی ہی تھی کہ فون بج اٹھا۔ اہل کی کال دیکھ کر وہ چونک گئے۔

”ہیلو۔ وعلیم السلام۔ آئی ایم فائن۔
تھینکس۔ ہاں کیوں نہیں ویسے سب حیرت ہے
تا۔ ٹھیک ہے میں دو منٹ تک آتا ہوں۔“

جیسے ہی دروازے پر دستک ہوئی اس نے جلدی جلدی تمام فالتو چیزیں ٹیبل سے سمیٹ لیں اور دوپٹا ٹھیک کرتی ہوئی دروازے تک آئی۔

”پلیز۔ آئیے۔ آئیے۔“ دروازہ کھول کر اس نے مسکراتے ہوئے میجر صاحب کا استقبال کیا۔
”شکریہ۔“ اندر آتے ہی ان کی نظر سینٹر ٹیبل پر پڑی تو وہ چونک کر پلٹے۔

”یہ سب کیا ہے بھی؟“ ٹیبل پر ایک گلاب کے پھول اور ایک بہت خوب صورت ہارٹ شپ پینک کارڈ رکھا ہوا تھا۔

”آج میرا برتھ ڈے ہے۔“ اس نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

ہستی بلا لکھی



مترجمہ بخاری

قیمت - 300 روپے

WWW.PAKSOCIETY.COM 154/2016 دسمبر 2016

”اہل۔ یہ سب کیا ہے۔“ انہیں اپنی ہی آواز بہت دور سے آتی سنائی دی۔ ”مجھے تم سے اس بچکانہ حرکت کی توقع نہیں تھی۔“ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اہل نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ”میں نے۔۔۔ میں نے کبھی تمہارے لیے ایسے نہیں سوچا۔ تم مجھے بہت پسند ہو۔ اچھی لگتی ہو۔ بہت عزیز ہو مجھے پر یقین کرو میں تو ہمیشہ تمہیں تصور میں کاشان کے ساتھ کھڑے دیکھتا رہا۔ اف بے وقوف لڑکی! یہ کیا کر دیا تم نے۔“ ان کی باتوں پر اہل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کاشان کی جن باتوں کو وہ خطرے کی گھنٹی سمجھتی تھی وہ میجر صاحب کی باتوں میں ہم کی طرح نہیں۔ وہ دکھ سے اہل کی طرف دیکھتے ہوئے جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اہل بھی ان کے ساتھ اٹھی پر شدت غم سے نہ کچھ بول سکی نہ روک سکی۔ ایک دفعہ پھر اس کی برتھ ڈے پر اس کی محبت موت کے گھاٹ اتر گئی تھی۔



”جہاں زیب۔“ سفینہ بیگم نے میجر صاحب کی کھانے سے بے رغبتی دیکھ کر انہیں پکارا۔ ”جی۔ جی ماں۔“ میجر صاحب پلیٹ میں تھوڑے سے چاول نکال کر صرف ان میں چھپو گھما رہے تھے۔ دھیان ان کا نہیں اور تھا ماں کے پکارنے پر بری طرح چونک گئے۔

”کیا بات ہے بیٹے آج بہت کھوئے کھوئے سے لگ رہے ہو کھانا بھی صحیح طرح سے نہیں کھا رہے کوئی پریشانی ہے کیا۔“

”نہیں ماں۔ ایسی کوئی بات نہیں میں ٹھیک ہوں بس ویسے ہی آج کھانے کا موڈ نہیں بن رہا۔“ میجر صاحب نے اپنی کیفیت چھپائی۔

”ڈونٹ وری دادو! بابا اب بوڑھے ہو رہے ہیں اور بوڑھے لوگوں کو زیادہ بھوک نہیں لگتی۔“ کاشان نے شرارت سے باپ کی طرف دیکھا۔ ”ارے ہٹ کیسے ابھی تو میں بوڑھی نہیں

ہوئی، میرا اتنا خوبو بیٹا کیسے بوڑھا ہو جائے گا۔“ سفینہ بیگم نے تنک کر پوتے کو جواب دیا۔ ”کیا بات ہے دادو آپ کی پھر آپ اپنے خوبو بیٹے کے لیے کوئی لڑکی کیوں نہیں ڈھونڈتیں۔ ان کا اصل پر اہلیم تنہائی ہے۔“ کاشان کی اس بات پر میجر صاحب پہلو بدل کر رہ گئے۔ ایک دم اہل کا چہرہ ان کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔

”میں کیا کروں میں تو نانوں سے کہہ رہی ہوں شادی کر لو یہ میری سنے تب نا۔ اب تم ہی سمجھا کر دیکھ لو شاید تمہاری ماں لے۔“ سفینہ بیگم نے پیار سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

”کیوں بابا کیا خیال ہے ڈھونڈیں پھر آپ کے لیے کوئی لڑکی۔ بہتر ہے آپ میری شادی سے پہلے ہی شادی کر لیں۔ کیونکہ بعد میں کریں گے تو پھر میری فیوری پر آپ کا کوئی اچھا امپریشن نہیں پڑے گا۔ کاشان کا لہجہ شرارت سے بھرپور تھا۔

”سٹاپ اٹ لیو دس ٹاپک۔“ میجر صاحب جھٹکے سے اٹھے اور غصے میں کہتے چلے گئے۔

کھانے کی میز پر بیٹھے دادو پوتے نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی اور آہستہ سے اپنی اپنی ہلٹھوں پر جھک گئے۔ دونوں کے لیے میجر صاحب کا رویہ مبہم تھا۔ آج سے پہلے وہ کبھی ماں بیٹے کے ساتھ اس موضوع پر تلخ نہیں ہوئے تھے۔



اہل کے سامنے اس کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ میجر صاحب کے جانے کے بعد سے وہ سخت اذیت اور تکلیف میں تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا۔ اس کے دکھ سمیٹنے والا شخص اس کے نازک جذباتوں کو یوں کرچی کرچی کر جائے گا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ نارسائی کا کرب اور محبت میں ناکامی کی اذیت اس کے وجود میں اتر گئی۔ صبح تک رو رو کر اس کی آنکھیں سوچ چکی تھیں جس وقت

شہرین کا فون آیا وہ حیز بخار میں پھنک رہی تھی۔
ساتویں، آٹھویں گھنٹی پر اس نے فون اٹھایا۔
”شہرین... پلیز... یہاں آجاؤ۔“ یہ کہہ کر اہمل
پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”اہمل... اہمل کیا ہوا ہے، تم ٹھیک تو ہو۔ اچھا
اچھا روؤ نہیں، میں آرہی ہوں، تم گھبراؤ نہیں، بس
میں ابھی آرہی ہوں۔“ اہمل کے رونے پر شہرین گھبرا
گئی اور اس کے پیچھے کھڑی رخسانہ آنٹی بھی اور پھر کچھ
ای دیر میں دونوں اہمل کے پاس پہنچ گئیں۔

”جہاں زیب! میں کل سے دیکھ رہی ہوں بیٹے تم
پریشان ہو۔ تمہاری آنکھوں کی سرخی بتا رہی ہے کہ
کوئی بات ایسی ہے جو تمہیں پریشان کر رہی ہے۔ اب
ماں کو بھی نہیں بتاؤ گے کیا۔“ سفینہ بیگم نے میجر
صاحب کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ ان کے کمرے
میں انہیں چائے کے لیے بلانے آئیں تھیں۔
”کیا بتاؤں ماں آپ کو، کچھ بھی نہیں ہے۔“ ان کی
نظریں دور خلاؤں میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔
”نہیں بیٹے، کچھ تو ہے۔ تم بتانا نہ چاہو تو یہ اور بات
ہے۔“

”آپ جانتی ہو کہ ماں میں آپ سے کچھ نہیں چھپا
سکتا۔ بات یہ ہے کہ۔“ اور پھر انہوں نے سب کچھ
سفینہ بیگم کو بتا دیا۔ کچھ دیر دونوں ماں بیٹے کے درمیان
خاموشی حائل رہی، پھر سفینہ بیگم نے میجر صاحب کو
دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے جہاں زیب تم نے اہمل کے
ساتھ صحیح کیا۔“

”میں سمجھا نہیں ماں۔“
”بیٹے! وہ تو پہلے ہی محبت کا دکھ اٹھائے ہوئے تھی۔
تم اس کے دکھوں میں اور اضافہ کر آئے۔“ سفینہ بیگم
کو اہمل کا دکھ اپنے دل میں محسوس ہو رہا تھا۔

”اس بات کا مجھے بھی افسوس ہے ماں، پر آپ ہی
بتائیں میں کیا کرتا، وہاں ایک انتہائی اوڈر سچوئیشن تھی

میرے لیے اور پھر میرا اور اس کا کیا جوڑ بنتا ہے۔“
”جوڑے بنانے والی ذات تو میرے رب کی ہے
بیٹے، ہماری غلطی یہ ہے کہ ہم خود ساختہ جوڑے اپنے
ذہنوں میں بنا کر حقیقت میں ان کے ہونے پر اصرار
کرتے ہیں۔ تم نے یہ کیوں سوچ لیا کہ تم جو کاشان
کے ساتھ اسے تصور میں ساتھ کھڑا دیکھ رہے ہو تو
حقیقت میں بھی وہ اس کا ساتھ قبول کرے گی، وہ ایک
جیتی جاگتی انسان ہے جہاں زیب! اس کے بھی جذبات
ہیں پسند، ناپسند کا حق اسے بھی حاصل ہے، اس بات
کے بعد تم نے ایک دفعہ بھی یہ جاننے کی کوشش کی کہ
اس کے دل پر کیا گزری ہوگی؟“ میجر صاحب نے کچھ
شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

اہمل کی جسمانی حالت کافی حد تک سنبھل چکی
تھی۔ پر اس کی ذہنی حالت اب تک ابتر تھی۔ اقبال
انگل، رخسانہ آنٹی اور شہرین تینوں ہی اس کے لیے
فکر مند تھے۔ شہرین اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گئی
تھی پر اس نے جو چپ کا روزہ رکھا تھا وہ ٹوٹنے کا نام ہی
نہیں لے رہا تھا۔ اسے وہ کہہ کر خود پر غصہ آ رہا تھا۔
ایک دفعہ محبت میں بے وفائی کا منہ دیکھنے کے لیے بعد
اسے کسی اور طرف دیکھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ ایک
بار پھر زندگی اس کے ساتھ مذاق کر چکی تھی۔ اب دور،
دور تک اس کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا تھا ایسے میں
اس نے اپنے لیے ایک فیصلہ کیا اور اقبال نگل کے
پاس آگئی۔ وہ اپنے بیڈ روم میں آفس جانے کے لیے
تیار ہو رہے تھے، کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

”او بیٹا۔ ٹھیک ہو، اب طبیعت کیسی ہے۔“
انہوں نے اسے دیکھ کر ہار سے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں انگل۔ وہ مجھے آپ سے ایک
بات کرنی تھی۔“

”ہاں۔ ہاں۔ کہو۔ بلکہ پہلے تم ایسا کرو بیٹھ جاؤ۔
پھر آرام سے بات کرتے ہیں۔“ انہوں نے صوفے کی
طرف اشارہ کیا۔

”انگل میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“

”تھوڑی طبیعت اور سنبھل جائے تو چلی جانا ابھی کچھ دن اور ہمارے پاس رہ کر آرام کر لو۔“

”انگل میں مارگلہ ٹاور جانے کی بات نہیں کر رہی ہیں نیویارک واپس جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے کہا۔

”واٹ؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو اہمل۔“ اس کی بات سے انہیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ”وہاں جا کر تم کیا کرو گی اور اب ہے ہی کون وہاں پر۔“

”یہ ٹھیک ہے انگل کہ اب میرا وہاں پر کوئی بھی نہیں پر میرا گھر ہے۔ بابا کا اسٹور ہے۔ میں اب اپنی پراپرٹی خود سنبھالوں گی۔“

”اہمل بیٹے! تمہارے ساتھ ایسا کیا ہوا ہے کہ تمہارا یہاں سے دل ہی اچاٹ ہو گیا، تم تو بہت خوش تھیں یہاں اپنے انگل کو بھی نہیں بتاؤ گی۔“ انہوں نے بہت پیار سے اہمل کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اہمل نے بہت مشکل سے اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روکا۔

”انگل میں۔ میں کیا بتاؤں آپ کو۔ ایسی کوئی بات ہی نہیں۔ بس مجھے بابا اور اپنا گھر بہت یاد آرہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے میں مزید یہاں نہیں رہ سکوں گی۔ آپ پلیز میرا ٹکٹ ارجیج کر دیں۔“

”اہمل! فرہاد کا اور میرا تعلق سکے بھائیوں سے بھی بڑھ کر تھا۔ میں اس کی اور تمہاری زندگی کے ہر دکھ سے آشنا تھا۔ اس لیے اس نے مرنے سے پہلے تمہاری ساری ذمہ داری مجھے سونپ دی تھی۔ میں تمہیں واپسی بھیج کر فرہاد کی روح سے شرمندہ نہیں ہو سکتا۔ تم میرے لیے شہرین سے کم نہیں ہو۔ تمہاری صرف تمہاری خوشی کے لیے میں نے تمہیں مارگلہ ٹاور میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ ورنہ میرے گھر میں اور دل میں تمہارے لیے کمی نہیں ہے۔“

اہمل نے ممنونیت سے انہیں دیکھا، ان کی باتوں سے اسے احساس ہوا کہ ابھی دنیا میں ایک سائبان اس

کے لیے باقی ہے۔

”ٹھیک یو انگل۔ مگر۔“

”مگر مگر کچھ نہیں، تم امریکہ جانا چاہتی ہو، شوق سے جاؤ۔ مگر چند دن گھوم پھر کر واپس آ جاؤ۔“ اہمل نے شش و پنج کی کیفیت میں کچھ سوچا اور پھر باہر بھری۔

آتے جاتے میجر جہاں زیپ کی نظر اہمل کے ایئر ٹمٹ کے بند دروازے پر پڑتی تو ان کا دل جیسے کوئی مٹھی میں لے لیتا۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ وہ جا چکی ہے۔ شکیل نے اسے انتہائی مذہمال حالت میں اپنی آنٹی اور شہرین کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

”آخر وہ کہاں جا سکتی ہے دادو۔ فون بھی ریسیو نہیں کر رہی، آپ کو کچھ تو پتا ہو گا، بابا بھی کچھ نہیں جانتے اور آپ بھی۔ آخر ایسا کیا ہو گیا کہ وہ اچانک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلی گئی۔“ میجر صاحب گھر میں داخل ہوئے تو کاشان کی آواز کانوں میں پڑی۔

”بیٹا میں کیا بتاؤں، وہ کہاں چلی گئی، جانے سے پہلے وہ مجھ سے ملی ہوئی تو میں کچھ بتائی، اب کیا بتاؤں۔“ سفینہ بیگم نے پوتے سے نگاہیں جراتے ہوئے کہا۔

میجر صاحب چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

”اور یہ بابا کو کیا ہو گیا ہے دادو، اتنے خاموش خاموش رہنے لگے ہیں۔“ کاشان کے اس سوال پر سفینہ بیگم کچھ نہ بول سکیں۔

وہ جھجکا کر میجر صاحب کے کمرے میں آ گیا۔ وہ کمرے میں نہیں تھے۔ ہاتھ روم سے شاہر کی آواز آرہی تھی۔ وہ وہیں ان کے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ اہمل کے متعلق ان سے تفصیلی بات کرنا چاہ رہا تھا۔ وقت گزاری کے لیے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی کتاب اٹھالی۔ صفحے الٹتے پلٹتے اس کی نظر کتاب میں رکھے پنک کٹر کے ہارٹ شپ خوب صورت سے کارڈ پر پڑی۔ اس پر لکھا اہمل کا نام دیکھ کر وہ چونک گیا اور جب اس نے اندر لکھی تحریر پڑھی تو اسے اپنے آس پاس رکھی ہر چیز گھومتی محسوس ہوئی۔ وہ چپ چاپ

اٹھا اور کارڈ لے کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔



میرے دل میں ڈالا تھا۔ اگر آپ لہنو تھے تو میرا خیال اس کے دل میں کیوں نہیں ڈالا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے اس کے قریب آئے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

ڈنر کے دوران وہ بہت خاموش تھا۔ یہ بات سفینہ بیگم اور میجر جہاں زیب دونوں ہی نے محسوس کی اور نہ وہ تو چپ رہنا جانتا ہی نہ تھا۔ ہر وقت باتیں کرتا رہتا۔ گھر میں رونق لگائے رکھتا، کھانے کے بعد میجر جہاں زیب اپنے کمرے میں آئے تو وہ بھی ان کے پیچھے آگیا۔

”مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے بابا۔“
”یار! میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں، میں نہیں جانتا وہ کہاں ہے۔“ وہ مجھے شاید اب بھی وہ اہمل کے بارے میں پوچھنے آیا ہے۔

”میں اس کے متعلق پوچھ رہا ہوں، یہ کیا ہے۔“
اس نے کمر کے پیچھے ہاتھ میں پکڑا ہوا کارڈ ان کے سامنے کیا۔ کارڈ دیکھ کر سرگرمی سے لگا کر ان کے ہاتھ لائٹر بند کرنا بھول گئے۔

”یہ تمہیں کہاں سے ملا۔“ انہوں نے کانپتے ہاتھ سے لمبا کش لے کر سرگرمی سے نکالا۔

”اس بات کو چھوڑیں، یہ بتائیں کہ اگر آپ دونوں کے درمیان ایسا کچھ تھا تو آپ نے مجھے اندھیرے میں کیوں رکھا۔“ اس کی آواز میں شکوہ ہی شکوہ تھا۔ میجر صاحب نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

”میرے اور اس کے درمیان ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔“ وہ بیٹے کو جواب دینے پر مجبور تھے۔ کیونکہ اس کے دل میں اہمل کا خیال انہوں نے خود ڈالا تھا۔ ”یہ صرف اور صرف اس کے ایک طرفہ جذبات ہیں۔“

”اگر واقعی ایسا ہے تو اس کے جانے کے بعد سے آپ اتنے اب سیٹ کیوں ہیں؟ آپ کے لب خاموش ہیں، آپ کی آنکھوں میں دکھ ہے، آپ کی چال بھی ست ہے، کیوں بابا؟ آخر ایسا کیوں؟“ ان کا بیٹا حقیقت کے آئینے میں انہیں ان کی تصویر دکھا رہا تھا۔

”بابا اہمل میرے لیے وہ خیال تھی جو آپ نے

”وہ محبت میں بے وفائی کا دکھ اٹھا چکی تھی۔ خیالی محبت سے اسے ہلایا نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے اسے کبھی ایسا کوئی خواب نہیں دکھایا جس کی روشنی میں وہ میری محبت کے راستے پر چل پڑتی، وہ تنہا بے وقوف لڑکی، میری تھوڑی سی مسیحا کی کو بہت سمجھ بیٹھی۔“

”میں اس کے بارے میں سب کچھ جانتا چاہتا ہوں۔“ اس نے باپ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا اور اہمل کی ساری کہانی کا شان کو سنا دی۔



”میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔“ مسیج سینڈ کر کے وہ ان کے جواب کے انتظار میں تھی۔

”اوکے۔ کہاں؟“ جلد ہی اسے جواب مل گیا۔

اس نے آٹھ گھنٹے بعد انہیں اپنے مارگلہ ٹاور والے پارٹمنٹ میں ہی بلایا۔ وہ نیویارک جانے سے پہلے ایک بار ان سے ملنا چاہتی تھی۔ اس کے پارٹمنٹ میں آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی ڈور بیل بجی۔ دروازہ کھولا تو وائٹ شلوار قمیص پر براؤن مردانہ شال کندھوں پر ڈالے اپنی سنجیدہ شخصیت کے ساتھ وہ اس کے سامنے موجود تھے۔ اس نے انہیں اندر آنے کا راستہ دیا، کچھ دیر دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے، ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، پھر بات کا آغاز اہمل نے کیا۔

”میں نے آپ کو یہ بتانے کے لیے بلایا تھا کہ میں نیویارک واپس جا رہی ہوں۔ جانے سے پہلے آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ نے مجھے کیا سمجھا؟ ایک کٹھ پتلی کہ جس کی ڈور ہلائی اور جس کے ساتھ چاہا اس کے ساتھ کر دیا یا کوئی جذبات سے عاری کھلونا اٹھایا اور بچے کا دل بھلانے کے لیے اسے دے دیا۔“

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- سے بال آگاتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت - 150/- روپے

سوہنی ہیرائل 12 جزی بوتلیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری
کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تجویز مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں
یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک
بوتل کی قیمت صرف - 150/- روپے ہے، دوسرے شہروں والے منی آرڈر بھیج
کر جسرڈ پارسل سے منگوائیں اور جسرڈی سے منگوانے والے منی آرڈر اس
حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ----- 350/- روپے
3 بوتلوں کے لئے ----- 500/- روپے
6 بوتلوں کے لئے ----- 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آرڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں
سے حاصل کریں
بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

میر صاحب نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے، پھر سختی
سے سمجھنے لگے انہوں نے بہتر جانا کہ پہلے وہ اپنے دل کا
غبار نکال لے۔

”آپ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ آپ مجھے
قبول نہ کرتے تو شاید مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا، میں سمجھ لیتی
کہ میرے جذباتوں میں اپنا آپ منوانے کی صلاحیت
ہی نہیں ہے، پر خود ہی فیصلہ کر کے خود ہی مجھے کسی اور
کے ساتھ کیوں جوڑ دیا۔ میری اپنی ذات آپ کی نظر
میں کچھ بھی نہیں تھی۔ آپ تو سب کچھ جانتے تھے،
ایک لمحے کے لیے بھی آپ نے یہ نہیں سوچا کہ آپ
کی یہ بات میرے دل کو کتنا دکھائے گی۔“ شدت
جذبات سے اہل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
”بس کہہ چکیں جو کہنا تھا۔ اب جس طرح میں
نے تمہیں سنا، تم بھی مجھے سننا اور پھر صحیح اور غلط کا
فیصلہ کرنا۔“ انہوں نے اپنی جیب سے رو مال نکال کر
اہل کی طرف بڑھایا۔

”میں تمہارے لیے دکھ کا باعث بنا، مجھے افسوس
ہے، پر ابھی تم نے ایک بات کہی کہ میں نے تمہیں خود
ہی کسی کے ساتھ کیوں جوڑ دیا۔ تم مجھے بتاؤ، تم نے خود
ہی مجھے اسے ساتھ کیوں جوڑ لیا، میں نے کب کہاں
تمہیں خود تک آنے کی راہ دکھائی۔ جب میں نے
تمہیں پہلی بار دیکھا تو تمہاری آنکھیں اور مسکراہٹ
مجھے بالکل اس پری جیسی لگیں جس کی کہانی میں بچپن
میں کاشان کو سناتا تھا۔ اس پری کی آنکھیں سبز تھیں
اور وہ اپنی مسکراہٹ سے لوگوں پر سحر پھونکتی تھی۔
کاشان چھ سال کا تھا جب اس کی ماں کی ڈیلتھ ہوئی۔ وہ
رات میں ماں کے لیے بے چین ہوتا تھا۔ تب میں نے
اسے یہ کہانی سناتا شروع کی، وہ کہانی تمہاری ذات کو
شان سے متعارف کرانے کا بہانہ بن گئی۔ اس کے بعد
جب بھی میری شان سے بات ہوتی وہ تمہارا ضرور
پوچھتا تھا۔ تمہیں میں نے اس کے بارے میں کچھ
اسی لیے نہیں بتایا کہ میں چاہتا تھا تم اس سے مل کر خود
فیصلہ کرو، پر اس سے پہلے ہی تم میرے لیے سوچو گی یہ
تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، جبکہ میں تمہیں بتا

چکا تھا کہ میری محبت تمہیں کے ساتھ ہی مر گئی ہے۔
 ”پر آپ نے یہ بھی تو کہا تھا کہ کسی کی محبت آپ
 کے لیے پاؤں فل ہوئی تو اپنا آپ منوالے گی۔“
 انہوں نے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اب میں
 تمہاری اس بات کا کیا جواب دوں۔ کہیں ایک بار پھر
 تمہارا دل نہ ٹوٹ جائے۔“ ان کی اس بات نے اہمل
 کو سمجھا دیا کہ اس کی محبت اپنا بھرم کھو چکی ہے۔
 ”تم جارہی ہو میں تمہیں روکنے کا حق نہیں رکھتا،
 پر جانے انجانے میں جو تکلیف تمہیں مجھ سے پہنچی
 اس کے لیے میں معذرت چاہتا ہوں سوری۔“ یہ
 کہہ کر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے وہ بھی ان
 کے ساتھ ہی اٹھ گئی اور جب وہ دونوں اپارٹمنٹ سے
 باہر آئے تو اسی وقت لفٹ سے کاشان باہر آیا۔ ایک
 دوسرے کو دیکھ کر تینوں ہی اپنی جگہ کچھ لمحوں کے لیے
 جم سے گئے۔

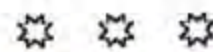
کاشان کو اپنا وجود وہاں انتہائی غیر ضروری لگا اور وہ
 تیز قدموں سے چلتا اپنے اپارٹمنٹ میں چلا گیا۔



مبصر صاحب اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو سفینہ
 بیگم سامنے ہی لاؤنج میں ان کی منتظر تھیں۔ جس وقت
 اہمل کا مسیج آیا تھا۔ مبصر صاحب سفینہ بیگم کے
 ساتھ ہی تھے۔
 ”جہاں زیب!“ مبصر صاحب کتر اکر نکل جانا چاہتے
 تھے۔

”جی ماں۔“ انہوں نے پیچھے مڑے بغیر جواب
 دیا۔

”تم نے بتایا نہیں بیٹے کیا بات ہوئی۔“
 ”وہ آج رات نیویارک واپس جا رہی ہے ماں ہمیشہ
 ہمیشہ کے لیے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے
 اور سفینہ بیگم کی نگاہیں بہت دیر تک بند دروازے پر
 جمی رہیں۔ مبصر صاحب کے الفاظ اپنے کمرے کے کھلے
 دروازے سے کاشان نے با آسانی سن لیے تھے۔



نہ جانے کتنی دیر سے وہ غیر مرئی نقطے پر نظر میں
 جمائے بیٹھے تھے۔ ان کے مخصوص سگاری خوشبو
 پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایک عجیب سا
 احساس ان کے پورے وجود پر چھایا ہوا تھا۔ وہ خود سے
 لڑ لڑ کر تھک گئے تھے۔ وہ اسے صاف صاف بتا آئے
 تھے کہ اس کی محبت میں وہ پاؤں نہیں ہے جو ان کا دل
 جیت لے، تو پھر اب دل اس کے لیے دکھی کیوں ہو رہا
 تھا۔ دروازے پر ہونے والی دستک نے انہیں چونکا دیا۔
 ”کاشان تم۔“ آؤ بیٹا۔ ”وہ دھیرے دھیرے چلتا آیا
 اور صوفے کے پاس ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔
 ”ارے یہ کیا کر رہے ہو یا۔ ادھر میرے ساتھ
 بیٹھو۔“ پر وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں نیچے بیٹھا رہا۔
 ”بابا۔ میں آپ سے کچھ مانگنے آیا ہوں، منع تو
 نہیں کریں گے۔“

”بیٹے میرے بس میں ہوا تو ضرور۔ بولو کیا
 چاہیے۔“ انہوں نے اس کے بازوؤں پر ہاتھ رکھتے
 ہوئے کہا۔

”بابا۔ آپ اہمل کو روک لیں۔“ اس کی بات
 سن کر انہوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ
 جلدی سے بول اٹھا۔ ”بابا یہ میں اپنے لیے نہیں کہہ
 رہا۔“ میں آپ کے لیے کہہ رہا ہوں بابا، آپ اپنے
 لیے اسے روک لیں۔“ اس کی آنکھوں میں التجا سی
 تھی۔

”بابا آپ کب تک تنہا رہیں گے۔ آپ کو ایک
 محبت کرنے والے ساتھی کی بہت ضرورت ہے اور وہ
 آپ سے بہت محبت کرتی ہے بابا، میرے دل میں اس
 کے لیے کچھ نہیں ہے بابا، کیونکہ یہ وہ فیری ہے ہی
 نہیں جس کی کہانی آپ مجھے سنایا کرتے تھے۔“

”تم غلط سمجھ رہے ہو بیٹے، شاید تم ہم دونوں کو
 ساتھ دیکھ کر بدگمان ہو۔ یقین کرو میں نے اہمل کو کبھی
 بھی خود سے جوڑ کر نہیں دیکھا۔“

”میں بدگمان نہیں ہوں بابا، مجھے آپ پر یقین ہے،
 پر آپ جو چاہ رہے تھے وہ نہیں ہو سکتا، تو پھر مجھے تو
 یہاں رہنا ہی نہیں ہے بابا! وہاں انگلینڈ میں میری

کر اپنے دائیں جانب بیٹھے شخص کو دیکھا تو پھر دیکھتی رہ گئی۔

”آپ...؟ یہاں...؟“ اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیے۔ تو اسے یاد آگیا کہ کس بے دردی سے وہ اس کا دل توڑ گئے تھے۔

”اب کیوں آئے ہیں یہاں...“ اس نے نم آنکھوں کے ساتھ شکوہ کیا۔

”میرا یہاں موجود ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ تمہاری پاور فل محبت اپنا آپ منوا چکی ہے۔ اب تم ایسی نیویارک نہیں جاؤ گے۔ ہم دونوں ساتھ جاؤ گے۔“ اسے لگا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔

”سچ...“ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ تو انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر یقین دلاتے ہوئے کہا۔

”بالکل سچ... لیکن ابھی نہیں کچھ دنوں بعد...“ انہوں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ کھل کر مسکرا دی اور پہلی بار میجر جہاں زیب کو لگا کہ سبز آنکھوں والی فیری کی مسکراہٹ ان کے دل پر سحر پھونک رہی ہے۔



خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھریلو انسائیکلو پیڈیا

کانیا ایڈیشن قیمت - 750/- روپے

کے ساتھ کھانا پکانے کی کتاب

کھانا کھانا

قیمت - 225/- روپے بالکل مفت حاصل کریں۔

آج ہی - 800/- روپے کا مٹی آڈر ارسال فرمائیں۔

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32216361

دوست میرا میری منتظر ہے، مجھے بہت چاہتی ہے۔ میں خود بھی اس میں انوالو ہو جاتا جو آپ اگر مجھے سبز آنکھوں والی فیری کے چکر میں نہ الجھا دیتے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو کاشان“ آج سے پہلے تم نے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا۔“ انہوں نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ایسا کوئی موقع ہی نہیں آیا یا کہ میں آپ سے ذکر کرتا، پر آج اس بات کو چھپا کر میں سیلفش نہیں ہو سکتا۔ آپ اہمل کو روک لیں بابا پلیز۔ اسے اس کی محبت ملنی چاہیے۔ پہلے وہ اپنی ماں کی وجہ سے محبت سے محروم ہوئی اور اب آپ کے بیٹے کی وجہ سے اس کی محبت نہیں چھنی چاہیے۔“ اس نے ان کے دونوں گھٹنوں پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

”پلیز بابا...“ اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انہوں نے سوچا اب وہ انکار نہیں کر سکیں گے۔ یہ سوچ کر وہ دھیرے سے مسکرا دیے۔

انگل اقبال سے اپنی پراپرٹی کے متعلق ہدایات اور اپنا خیال رکھنے کی نصیحت سن کر وہ رخسانہ آئی سے ملی۔ انہوں نے اسے اپنے سینے سے لگا کر ڈھیروں دعائیں دیں، پھر وہ شہرین کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر ایئر پورٹ کی طرف چل دی۔ راستے میں بارگاہ ٹاور کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ایئر پورٹ پہنچ کر اس نے اپنا سامان ٹرالی میں رکھا۔ آخری بار شہرین سے گلے ملی۔ شہرین نے جلد واپس آنے کا وعدہ لیا تو اہمل دکھی دل سے مسکرا دی۔ بورڈنگ پاس لے کر اس نے اپنا سامان ایئر لائن کے عملے کے حوالے کیا اور خود ہینڈ گیری لے کر ڈیپارچر لاونج کی طرف آگئی۔ فلائٹ کی روانگی میں ابھی وقت باقی تھا۔ وہ ایک سائڈ پر لگائی جانے والی کافی ساری سیٹوں میں سے ایک سیٹ پر بیٹھ گئی بڑے بڑے شیشوں کے پاررن وے کا منظر دیکھتے ہوئے اس کا ذہن نہ جانے کن سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ کوئی چپکے سے اس کے ساتھ آکر بیٹھ گیا ہے۔ مخصوص سگاری خوشبو پر ایک دم اس نے چونک

داستانِ الم

میں اپنے آگے ڈھیروں کاغذ رکھے ہاتھ میں پین
تھامے، کسی مزاحیہ کہانی کا پلاٹ سوچ رہی تھی۔

”آج میری ڈائجسٹ کی مدیرہ سے موبائل برسات
ہوئی تھی۔ وہ میری کہانی کی بہت تعریف کر رہی تھیں
کہہ رہی تھیں کہ آپ مزاحیہ کہانی لکھیں۔ آپ
میں مزاح لکھنے کی صلاحیت ہے۔“

میں نے قریب بیٹھے اپنے شوہر جلال کو سناتے
ہوئے کہا۔ ”بھئی! نہیں بھی تو معلوم ہو میری
صلاحیتوں کا بہت ناکارہ سمجھتے ہیں مجھے۔“

”اچھا!! ویسے شادی کے ان دس سالوں میں
ڈھیروں صلاحیتیں تو دیکھی ہیں تمہاری، لڑائی کی
صلاحیت، طنز کی صلاحیت، غصے کی صلاحیت، کام
چوری کی صلاحیت۔ نہیں دکھائی دی تو مزاح کی
صلاحیت ہی نظر نہیں آئی کبھی۔“ جلال کا لہجہ حد درجہ
مذاق اڑاتا ہوا تھا۔

”آپ کو کیوں میری کوئی خوبی دکھائی دینے لگی۔
خامیاں دیکھنے سے فرصت ملے تو خوبیوں کی طرف نظر
جائے گی نہں۔“

”تمہاری خامیاں ختم ہوں تو نہں۔ ابھی ایک خالی
پوری طرح عیاں بھی نہیں ہوتی مجھ پر کہ دوسری خالی
لیکھتی جھپکتی دکھائی دینے لگتی ہے۔“ اب جلال شیشے کے
آگے کھڑے اپنا معائنہ کر رہے تھے۔ یقیناً ”باہر جانے
کا ارادہ تھا۔“

”اتنی ہی بری تھی میں تو کیوں کی تھی مجھ سے
شادی۔“ مجھے شدید غصہ آیا۔

”ہماری پھپھو نے بتایا تھا رشتہ انہوں نے ہی
پھنسا دیا مجھے۔“ جلال نے میری معلومات میں قدرے

اضافے کی خاطر کہا۔

”ہاں آپ ہی کی پھپھو نے مجھے بھی پھنسا دیا۔
پھنسانے میں تو ماہر تھیں۔ اللہ جنت نصیب کرے
آپ کی پھپھو کو۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو پھپھو تو زندہ ہیں۔“ جلال کے
اپنے بال سنوارتے ہاتھ رک جکے تھے۔

”ارے زندہ ہیں تو کیا ہوا۔ کبھی تو مر سکی وہ۔ میں
تو مرنے کے بعد کے لیے دعا کر رہی ہوں۔“

میں نے حد درجہ اطمینان کا مظاہرہ کیا۔ دل میں
ٹھنڈک سی پڑ گئی تھی جلال کو تھتا دیکھ کر۔ تب ہی
جلال کی بھانجی پری وش میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ وہ
کچھ دنوں کے لیے ہمارے گھر رکنے آئی تھی۔

”مامی! کتنی بری بات ہے۔ آپ اپنی پھپھو ساس
کے لیے ایسی بات کر رہی ہیں۔ آپ کی کہانیوں کی
ہیروئن تو اتنی بالوب اور تمیز و تہذیب والی ہوتی ہے اور
آپ۔“

پری وش سترہ سال کی تھی اور ڈائجسٹ پڑھنے کی
میری ہی طرح شوقین تھی۔ تب ہی ہم دونوں کی
خوب بنتی تھی۔ اور وہ بہانے بہانے سے ہمارے گھر
رکنے چلی آتی تھی۔

”پری! وہ میری کہانی کی ہیروئن ہوتی ہے۔ تمیز و
تہذیب والی ہونا اس کی مجبوری ہے۔ جبکہ میں رائٹر
ہوں مجھ پر ایسی کوئی مجبوری لاگو نہیں ہوتی۔“

”کتنی کہانیاں چھپ چکی ہیں تمہاری۔“ جلال
نے پوچھا۔

”ایک۔“ میں نے فخریہ بتایا۔
”اچھا، باقی کی آٹھ کہانیاں کیا ناقابل اشاعت

Downloaded From Paksociety.com



تھیں۔ ”جلال نے کہا تو میں حق حق رہ گئی۔ انہیں
کس نے بتایا کہ میری بیٹی ہوئی تو کہانیوں میں سے
صرف ایک کہانی شائع ہوئی ہے۔
میں نے شک بھری نگاہ پر ڈالی۔ اس نے
اشارے سے کہا کہ ”میں نے نہیں بتایا ماموں کو۔“
”جی نہیں۔ وہ بھی آہستہ آہستہ شائع ہوں گی۔
اب ہر مہینے تو میری ایک کہانی شائع نہیں کر سکتیں
وہ۔“ میں نے بات منانے کی کوشش کی۔
”ہاں بھئی انہیں اپنا ڈائجسٹ بند تھوڑی کروانا
ہے۔ ویسے ایک سو کہانیاں لکھنے والی رائٹر کو بھی اتنا
غور نہ ہو گا جتنا تم اتراتی پھرتی ہو وہ بھی صرف ایک
کہانی لکھ کر۔“ وہ ہر وقت ”میری کہانی“ میری کہانی“
کی گردان سے تنگ آچکے تھے۔
”مائی اگر آپ مشہور رائٹر بن گئیں اور ڈائجسٹ
والوں نے آپ کا انٹرویو کیا اور آپ کی تعلیم پوچھی
تو؟“ ”پری کو انوکھی بات سوچھی۔
”تو تو۔“ میں نے تھوڑی دیر سوچا۔ ”تو کہہ دوں گی
کہ ایم ایس سی کیا ہے یا پھر ڈبل ایم اے یا پھر ایم بی
اے تک تعلیم بتا دوں گی۔“
”ہائے اللہ مائی! آپ جھوٹ بولیں گی۔“ پری نے
حیرت سے کہا۔
”تو کیا ہوا۔ انٹرویو پڑھنے والوں نے کون سا میری
ڈگری چیک کی ہے آکریا پھر شاہین رشید کہیں گی کہ پہلے
اپنی ڈگری دکھاؤ بعد میں انٹرویو شائع ہو گا۔“
”لیکن مائی! آپ تو میٹرک فیل ہو نا۔“ پری کے
کہنے پر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔
”آئے ہائے کس نے کہہ دیا تم سے۔ میں نے
میٹرک پاس کر لیا تھا۔“

آپ کی مامی سے شادی ہوئی تب مامی کو میٹرک کے ہوئے بھی سالوں ہو گئے تھے۔ ”پری نے جلال سے کہا۔

”اپنے ماموں کی بھی خوب کھی تم نے۔ یہ تو اس پوری دنیا میں ماسوائے اپنے کسی اور کو تو جوان سمجھتے ہی نہیں۔“ جلال کی بجائے میں نے پری کو جواب دیا۔

”مرو اور گھوڑا بھی بوڑھا نہیں ہوتا۔“ جلال نے کہا تو کے ذریعے اپنی جوانی ظاہر کرنا چاہی۔

”کاش آپ کے بجائے کسی گھوڑے سے ہی شادی ہو جاتی میری تو اچھا تھا۔ اتنے کیرے تو نہ نکالتا مجھ میں، بس ہنسنا ہی رہتا۔“ میں نے غصے میں بے سروپات کی۔

”زیدہ! شکر کرو کہ مجھ سے شادی ہو گئی تمہاری“ ورنہ گھوڑا تو کیا گدھا بھی منہ نہ لگاتا تمہیں۔“ جلال کے ہونٹوں پر شرارتی مسکراہٹ بکھری۔ پری بھی زیر لب مسکرا دی۔

”اب بھی جس سے شادی ہوئی ہے وہ کسی گدھے سے کم ہے کیا۔“ میں منہ ہی منہ میں بدبو لائی۔

”کیا کہہ رہی ہو۔“ جلال نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”مجھے برا بھلا کہہ رہی ہو۔“

”برا بھلا نہیں صرف برا ہی برا کہہ رہی ہوں۔“

شادی کے سالوں بعد بھی محال ہے جو ایک بھی اچھا لفظ آپ کے منہ سے اپنے لیے سنا ہو۔ آپ کہانی کے ہیروز کو تو دیکھیں، کیسے اپنی ہیروئن کی تعریفیں کرتے ہیں اور ایک آپ ہیں۔“

”وہ کہانی کی ہیروئن کا ہیرو ہوتا ہے۔ ہیروئن کی تعریفیں کرنا اس کی مجبوری ہے جبکہ میں کہانی کی رائٹر کا شوہر ہوں۔ مجھ پر ایسی کوئی مجبوری لاگو نہیں ہوتی۔“

جلال نے میری کئی بات ہی واپس مجھے لوٹا دی تو میں نے۔

”جلال آپ بھی نا۔“ کہہ کر رونے کی کوشش کی۔

”آنکھیں تھوڑی بھیگنے ہی لگی تھیں کہ جلال نے مجھے رونے کی تیاری کرتے دیکھ لیا سو جھٹ پٹ چپل پہنی

”مامی! مجھے تو ماموں نے بتایا تھا کہ آپ میٹرک میں فیل ہو گئی تھیں۔“ پری نے جلال کی طرف اشارہ کیا۔

”پری! تمہارے ماموں کا تو بس نہیں چلتا کہ مجھے انگوٹھا چھاپ ثابت کر دیں۔“ میں نے جل کر جلال کو دیکھا۔

”ہاں واقعی تم پر میرا بس نہیں چلتا ورنہ۔“ جلال کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”ہاں ہاں بولیں ناں دل کی بات کہ بس نہیں چلتا ورنہ بس تمہارے اوپر ہی چڑھاؤں۔“

”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“ جلال مسکرا دیے۔

”مامی آپ اپنا نام چھینج کر کے کوئی اچھا سا نام رکھ لیں۔ نیا اور یونیک۔“ پری نے بات بدلنے کی کوشش کی۔ اور واقعی وہ میرے غصے کو کم کرنے میں کامیاب بھی ہو گئی۔

”ہم“ میں بھی سوچ رہی ہوں کہ اپنا نام تبدیل کر لوں۔ زیدہ جلال نام سے ہی زیدہ طارق کا سرپا ذہن میں آتا ہے۔ سب قاری ہمیں مجھے بوڑھی سمجھتی ہوں گی۔ ایک تو امی ابو نے اتنا برا نام رکھا زیدہ پھر ابو کا نام بھی بشیر الدین اور شادی کر کے میاں دجی بھی قدیمی نام والے پلے باندھ دیے۔“

میں نے خفگی بھری نگاہ جلال پر ڈالی۔ ”میں سوچ رہی ہوں کہ رشک حنا یا پھر رشک صبا نام رکھ لوں۔“

”ہاں مامی، پھر سب آپ کو سولہ سترہ سال کی لڑکی سمجھیں گے۔ ویسے اتنی زیادہ عمر بھی نہیں ہے آپ کی۔“ پری خوش ہو گئی تھی میرے نام بدلنے کے فیصلے سے۔

”اتنی زیادہ کیا، کتنی بھی زیادہ عمر نہیں ہے میری۔“

بارہ سال کی تھی تب تو تمہارے ماموں سے شادی ہو گئی تھی میری۔“

”اتنا جھوٹ بھی نہ بولو۔ بارہ سال کی عمر میں کون سا میٹرک ہو جاتا ہے۔“ جلال مجھے جلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔

”اور ماموں آپ اس دن مجھے بتا رہے تھے کہ جب

میں ظہورن خالہ کی بے وقوفیوں اور حماقتوں کی داستان لکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہوں (یہ داستان ظہورن خالہ کی بہو نے مزے لے لے کر مجھے سنائی تھی) تو میں عفت سحر طاہر کی بے وقوف اور پاپور ہیروئن روجہ گل سے بھی زیادہ لوٹ پٹانگ ہیروئن ایجاو کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ مگر میرا اپنا ذاتی خیال تھا کہ اس عمر میں ظہورن خالہ کہانی کی ہیروئن بنی کچھ خاص اچھی نہیں لگیں گی۔

سو دو چار مزید محلے والیوں کی داستان سننے کے بعد میں نے یکے بعد دیگرے کئی کہانیاں ڈائجسٹ میں بھجوائیں مگر جب بہت مہینوں تک وہ شائع نہ ہوئیں تو ڈائجسٹ پر لکھا نمبر گھما دیا۔ جہاں سے مجھے یہ دل دہلا دینے والی اطلاع ملی کہ میری تمام کہانیاں ناقابل اشاعت ہیں۔

سب سے پہلے یہ بری خبر میں نے پری وش کوراز داری کی شرط پر سنائی۔

”مامی آپ ایسا کیجئے کہ مدیرہ کو ایک دھکی آہوں سے بھرا خط لکھیے۔ کہ آپ کے دل پر کیا کیا قیامت ٹوٹی ہے ان کے جواب سے۔“

میں نے پری کے مشورے پر عمل کرنے کی سوچا اور کاپی پین لے کر بیٹھ گئی اور خط لکھ کر پری وش کو دکھایا۔ خط پڑھ کر پری نے برا سامنہ بتایا۔

”اوہو ماما یہ خط ہے۔ اسے پڑھ کر تو وہ ہرگز آپ کی کہانی شائع نہیں کریں گی۔ لایے کاپی پین مجھے دیجئے میں لکھتی ہوں۔“

میرے ہاتھ سے کاپی پین لے کر پری نے لکھنا شروع کر دیا۔ خط مکمل کر کے اس نے میری طرف کاغذ بڑھایا۔ میں نے پڑھنا شروع کیا۔

”پیاری ڈائجسٹ والی بلائی۔ آداب عرض ہے۔“

دلکش اور خوب صورت بلائی گو کہ میں نے آپ کو دیکھا نہیں کبھی، لیکن خطوط لکھنے والی بہنوں کو دیے ہوئے آپ کے جوابات اتنے خوب صورت ہوتے

اور باہر کی طرف بھاگے۔
”تمہارے لیے اچھے الفاظ کہنے کے لیے تمہارا اچھا ہونا بھی ضروری ہے۔“

جاتے جاتے بھی تیرچھوڑ گئے۔ میں نے بھی اونہ کہہ کر رونے کا ارادہ ملتوی کر دیا کہ جس کو رو کر دکھانا تھا وہ تو جلے گئے سو میں پری کی جانب متوجہ ہو گئی اور پری سے اگلی کہانی کے بارے میں مشورہ کرنے لگی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں شاید بہت بڑی مصنفہ ہوں۔ جی نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ چلیے میں آپ کو سات آٹھ مہینے پیچھے لیے چلتی ہوں۔

کچھ مہینوں پہلے کی بات ہے کہ جانے دل میں کیا کہانی لکھنے بیٹھ گئی۔ مختلف کہانیوں میں سے مشکل مشکل الفاظ اور بہترین بہترین جملے منتخب کرے۔ سو ڈیڑھ سو کہانیوں میں سے جملے چوری کر کے ایک کہانی لکھی اور پری کو دکھائی۔ پری بھی چونکے میری طرح ڈائجسٹ لور بھی سو پری نے اپنے چھوٹے بھائی کے ذریعے میری کہانی رجسٹری کروادی۔ اور اتفاق دیکھیے کہ چند مہینے بعد وہ کہانی ڈائجسٹ میں شائع بھی ہو گئی۔ کہانی کا شائع ہونا تھا اور میرا دل ہی دل میں سمیرا

حمید اور عمیرہ احمد بننا تھا۔ پورے خاندان میں منادی کرا دی کہ میں ڈائجسٹ رائٹروں چکی ہوں۔

محلے میں بھی دھوم مچادی کہ میری کہانی چھپ گئی ہے۔ اب تمام محلے کی خواتین اپنی زندگی کی درد بھری داستان سنانے چلی آتی تھیں۔

تکڑوالی ظہورن خالہ کا خیال تھا کہ اگر میں ان کی داستان الم (جو کہ چار عدد مندوں، تین عدد دیویوں، ایک عدد ساس سسر اور ایک عدد نئی نئی بہو پر مشتمل تھی) لکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہوں تو میں ایک ہی جست میں اہل رضا کی پائے کی مصنفہ بن سکتی ہوں۔

جبکہ ان ہی ظہورن خالہ کی بہو کا خیال تھا کہ اگر

ہیں کہ میں نے اندازہ لگا لیا کہ آپ بہت خوب صورت ہیں۔

اچھی باجی آپ مجھ سے ناراض ہیں کیا؟ آپ میری کہانیاں اپنی ڈائجسٹ میں کیوں نہیں شائع کرتیں۔ میں اپنی محنت سے کہانی لکھتی ہوں۔ پہلے کہانی کو رف لکھتی ہوں۔ پھر فیشر کرتی ہوں۔ کیونکہ اگر رف کہانی آپ کو بھجوا دی تو ہو سکتا ہے کہ آپ میری کہانی کسی چائینز ڈائجسٹ میں بھجوا دیں کہ لیس جی آپ کی زبان کی کہانی غلطی سے کسی نے اردو کے ڈائجسٹ میں بھجوا دی۔ اس لیے خوب محنت کر کے فیشر کرس ہوں۔

کہانیاں لکھنے کے دوران مجھے کتنی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ آپ کو کیا معلوم چلیں جی آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے وہ قربانیاں بتا ہی دیتی ہوں آپ کو۔ قربانی نمبر ایک : میاں جی کے کپڑے استری نہ کرنے کی قربانی۔ ٹائم ہی نہیں کیسے کروں کپڑے استری۔ جس دوران میں کہانی لکھتی ہوں میاں جی پیچارے خود ہی کرتے ہیں استری بلکہ اپنے کپڑوں کے ساتھ ساتھ میرے اور بچوں کے کپڑے بھی وہ ہی استری کرتے ہیں پھر۔

قربانی نمبر دو : بچوں کی پٹائی لگانے کی قربانی۔ کہانی لکھنے کے درمیان بچوں نے شور شرابا کیا تو لگائے بچوں کی کمر پردہ تھپڑ۔

بچوں کو مارنے کا افسوس تو مجھے ہے۔ مگر کیا کرتی یہ قربانی نہ دیتی تو کہانی کیسے لکھتی کیونکہ اس قربانی کے بغیر تو چھوٹا والا ہرگز شرافت سے نہ بیٹھتا۔

تیسری اور اہم قربانی : کھانے پینے کی قربانی۔ کھانا پکاتی تو کہانی کیسے لکھتی اور کہانی نہ لکھتی تو عظیم مصنفہ کیسے بنتی سونہ کچھ کھایا اور نہ ہی پکایا اور میاں جی کو کھانا بازار سے لانا پڑا۔ کھانے پینے کے ساتھ یہ ہوئی میاں جی کی کہانی کی بھی قربانی۔

اتنی بڑی بڑی قربانیوں کے بعد بھی آپ کا جواب کہ ”کہانی ناقابل اشاعت ہے۔“ اللہ اللہ! کیا نہ بجلیاں

دل پر گرا گیا آپ کا یہ جملہ۔

کہانی لکھتے وقت تو میں اپنے آپ کو مستقبل کی مشہور مصنفہ سمجھ رہی تھی اور آپ کے اس ”دور فٹے منہ“ والے جواب کے بعد میں اپنے آپ کو جو سمجھ رہی ہوں وہ لفظوں میں نہیں بتا سکتی۔

ویسے ایک بات تو ہے۔ کہانیاں لکھنے کے دوران چاہے سب کچھ برا ہوا ہو۔ پر میری رائٹنگ اچھی ہو گئی۔ سچی اب تو میری رائٹنگ میرے میاں جی بھی پڑھ لیتے ہیں۔

دیکھیے باجی یہ کہانی جو میں آپ کو اب بھیج رہی ہوں یہ شائع کر دیجئے گا ورنہ میری ڈیڑھوں قربانیاں ضائع جائیں گی اور میری کہانی کے کردار انتم سنسکار نہ ہونے والی آتماؤں کی طرح مجھے بد روح بن کر تنگ کرتے رہیں گے۔ خاندان کی سب لڑکیوں کو محلے کی سب عورتوں کو سارے زمانے میں ڈھنڈورا پیٹ دیا ہے کہ ڈائجسٹ میں کہانیاں لکھ رہی ہوں۔ ان سب لڑکیوں اور عورتوں نے پوچھ پوچھ کر میرا دل کھا رکھا ہے کہ کب شائع ہوگی میری کہانی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ہم تھلا میں کیلا

فقط مستقبل کی ڈائجسٹ رائٹر! اگر آپ چاہیں تو زبیدہ جلال ”یہ کیسا خط ہے۔“ مجھے خط میں کچھ گڑبڑ محسوس ہوئی تھی۔

”ارے بس مائی آپ یہ خط اپنی رائٹنگ میں لکھ کر ڈائجسٹ والوں کو بھجوا دیں۔“ پری کی بات سن کر سوچا کہ پری کی بات ماننے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ ”پری! مدیرہ کو کہیں برا نہ لگ جائے۔“ میں کچھ متذبذب سی بھی تھی۔

”مائی! آپ کو نہیں معلوم میری اردو زبردست ہے۔ یہ خط پڑھتے ہی مدیرہ آپ کی کہانی شائع کروں گی۔ بتا ہے ایک بار میں نے ایک مشکل شعری آسان تشریح کی۔ وہ تشریح میری ٹیچر کو اتنی پسند آئی کہ انہوں

نے میرے لیے کلاس میں کلیننگ کروائی۔
 ”میں نے ایک شعر کی تشریح کا کہا وہ شعروں تھا۔
 آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
 کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک
 ”اچھا تم نے کیا تشریح کی۔“ میں نے اشتیاق سے
 پری سے پوچھا۔
 ”میں نے لکھا۔“

یہ شعر بہت ہی برے حالات میں کہا گیا ہے اور اس
 شعر کے خالق شاعر نہیں بلکہ شاعر ہیں۔ جی ہاں یہ
 ایک خاتون شاعرہ کے دکھی دل کی داستان ہے شاعرہ
 جس لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ اس لڑکے کو ٹائیفائیڈ
 ہو گیا۔ بیماری کے بعد اس کے بال تیزی سے گرنے
 لگے۔ اپنی امی کے مشورے پر وہ لڑکانائی کے پاس گیا اور
 ٹنڈ کرا کر آ گیا۔ گنجا ہو کر وہ بالکل گنجا کو تر لگ رہا تھا۔
 لڑکے کی ماں نے دیکھ کر کہا ”ماشاء اللہ چہرے سے
 اچھی تو ٹنڈ نکلی ہے میرے پتر کی۔“ اور اس کی ماں نے
 گنجنی ٹنڈ کا صدقہ اتار کر پیسے فقیر کو دیئے کہ کہیں
 میرے پتر کی چمکتی چندیا کو کس کی نظر نہ لگ جائے۔
 لیکن، لیکن، لیکن جب یہ ہی چمکتی چندیا لڑکی (شاعرہ)
 نے دیکھی تو اسے دس کروڑ والٹ کا جھٹکا لگا اور شاعرہ
 نے۔۔ اسی وقت اس لڑکے سے ترک تعلقات کا فیصلہ
 کر لیا۔

گنجنے کو تر نے شاعرہ کو بہت سمجھایا کہ میرے بال
 جلد ہی دوبارہ آجائیں گے لیکن وہ لڑکی ہرگز اپنی
 خزانہ سیلیوں کے سامنے مذاق بننے کا رسک نہیں
 لے سکتی تھی۔ اس لیے شاعرہ نے یہ شعر کہا اور ٹاٹا
 ہائے۔“

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
 کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک
 پری وش نے ترنم سے شعر پڑھ کر تشریح کا اختتام
 کیا اور میں منہ پھاڑے پری کی گئی تشریح سن رہی
 تھی۔ پری کے چپ ہونے پر کہے بغیر نہ رہائی۔
 ”پری اس تشریح پر تمہارے لیے کلاس میں

تالیاں بجاتی گئی تھیں تو یقیناً ”میجر نے تمہیں
 شرمندہ کرنے کے لیے ایسا کروایا ہو گا۔ لیکن تم ہو نہیں
 نہیں شرمندہ ہے نا۔“
 ”اوہو مای یہ چھوڑیں آپ۔“ پری وش بات
 بدلتے ہوئے بولی۔
 ”اور بس یہ تاریخی خط مدیرہ کو بھجوا دیجیے مای
 آپ۔“

”تاریخی؟“ میں حیران رہ گئی۔
 ”ہاں بھئی یہ خط تاریخ میں امر ہونے والا ہے۔“
 ”اچھا!“ میں کچھ بے یقین تھی پھر بھی پری کی بات
 ماننے میں حرج نہ تھا سو خط اپنی رائٹنگ میں لکھ کر
 پوسٹ کروا دیا۔

کچھ دنوں بعد ڈائجسٹ کی مدیرہ کا فون موصول ہوا
 جس میں مدیرہ نے ہنستے ہوئے خط کی تعریف کی اور
 ساتھ ہی مزاحیہ کہانی کی فرمائش بھی۔

اب یہ مسئلہ کہ مزاح کیسے لکھوں۔ سو جلال کی
 بہن یعنی اپنی منہ کو فون کیا اور اپنی بیماری کا بہانہ کر کے
 پری وش کو ایک ہفتے کے لیے بھیجنے کا کہا۔

پری وش کو تو ویسے ہی کلنج سے چھٹیوں کا بہانہ
 چاہیے تھا سو فوراً اپنے بھائی کے ساتھ چلی آئی۔ ہم
 دونوں نے مسئلے کے حل کے لیے سر جوڑ لیے۔ اور
 کہانی کے متعلق یہ فیصلہ ہوا کہ پہلے میں کہانی لکھوں
 گی۔ اس کے بعد کہانی کے بیچ بیچ میں پری مزاحیہ
 جملوں کا تذکار لگائے گی۔ پھر فہمو کر کے وہ کہانی پوسٹ
 کی جائے گی۔ اس فیصلے کے بعد مطمئن ہو کر میں کہانی
 لکھنا شروع کر چکی تھی۔



میں نے الماری سے کانڈات نکالے اور کہانی لکھنے
 لگی اتنے میں پری دوڑتی ہوئی آئی۔

”مای مای احمد کی رابعہ آنٹی کے بیٹے سے لڑائی ہو
 رہی ہے کلی میں۔“ پری نے آتے ہی نو سالہ حماد (میرا
 بڑا بیٹا) کی خبر مجھے پہنچائی۔

”ہونے دو لڑائی۔ کبخت سارا دن لڑائی جھگڑے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



ہی کرتا رہتا ہے۔ بہت لڑاکا ہے، بالکل اپنے باپ پر گیا ہے۔“ میں بے زاری سے بولی۔ میرا بڑا بیٹا حماو بہت تیز تھا سو دھیان کہانی پر ہی مرکوز رکھا۔

”مامی مامی بہت لڑائی ہو رہی ہے۔ دیکھو ناں رابعہ آنٹی کا اسامہ ہمارے حماو کو کیسے مار رہا ہے۔“ پری نے دروازے سے جھانک کر دیکھا پھر تمام صورت حال مجھے بتائی۔ ”ہمارے حماو“ پر خاص زور تھا۔

”ہونے دو لڑائی۔ تم چپ کرو۔ مجھے کہانی لکھنے دو۔“ میں نے پری کو جھڑک کر اپنی توجہ کہانی پر مرکوز کرنا چاہی۔ پری دوبارہ دروازے پر کھڑی ہو کر حماو اور اسامہ کی کشتی دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔

”پائے اللہ مامی! اسامہ نے کیسی بخنی ماری ہے حماو کو۔ اتنی زور سے سر پھوٹا ہے ہمارے حماو کا۔“

پری نے دوبارہ باہر کی ریلنگ کی کسٹری مجھے سنائی اور اس بار وہ میرے اندر کی ”مامتا“ جگانے میں کامیاب ہو گئی۔ میں نے کانٹوں کے پلندے ایک جسٹکے سے میز پر پٹختے اور اپنا دوپٹہ ڈھونڈھنے لگی۔ جو کہ صرف دروازے پر جاتے تاہم ہی میرے سر پر آتا تھا۔ ورنہ سارا دن وہ گھر میں ادھر ادھر لٹا رہتا تھا۔ بالآخر دوپٹہ صوفے کے پیچھے پڑا ہوا دکھائی دیا۔ دوپٹہ اٹھا کر سر

پر ڈالا، دونوں آستینیں اوپر چڑھائیں اور دروازے پر چنچی۔ باہر کا سین خاصا دردناک، بلکہ المناک تھا۔ سامنے والی رابعہ بھابھی کا بیٹا اسامہ، میرے راج دلارے، آنکھوں کے تارے حماو کو غالباً اسکوٹریا سائیکل سمجھ رہا تھا کیونکہ حماو کو الٹا لٹا کر اسامہ اس کی سواری کے لطف اٹھا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ حماو کے

اوپر اچھل بھی رہا تھا۔ تب ہی روتے ہوئے حماو کی نظر مجھ پر پڑی اور اس نے خوفناک چیخ مار کر ”مما“ بولا۔ بس پھر گیا تھا میرے اندر کا آتش فشاں جاگ اٹھا۔ ”اسامہ!“ میں با آواز بلند چیخی بلکہ دھاڑی۔

اسامہ میری آواز سن کر جلدی سے حماو کے اوپر سے ہٹ گیا۔ حماو نے موقع غنیمت جان کر ایک زور دار تھپڑ (عرف عام میں چمٹ) اسامہ کو رسید کیا اور

جلدی سے آکر مجھ سے لپٹ گیا اور اتنے زیادہ اونچے سروں میں رویا کہ کیا نصرت فتح علی اور کیا راحت فتح علی سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔

”اسامہ کیسے تیری ہمت کیسے ہوئی میرے حماو کو ہاتھ لگانے کی“ میں تیرے ہاتھ توڑ دوں گی منحوس مارے۔ ”میری آواز سن کر بلکہ میری چیخیں سن کر رابعہ بھابھی بھی دروازے پر چلی آئیں۔

”کیا ہو گیا زبیدہ بھابھی کیوں فزع ہوتی ہوئی بھینس کی طرح ڈکرا رہی ہو۔“ رابعہ بھابھی نے آتے ہی طنز کے تیر چلائے۔

”میں تو بھینس کی طرح ڈکرا رہی ہوں اور تمہارا یہ بھینسا جو میرے بیٹے کے اوپر چڑھ کر اسے مار رہا تھا اس کا کیا۔“ میں نے بھی تمام لحاظ بالائے طاق رکھ دیے۔

”تو حماو کون سا کم ہے پہلے اس نے ہی اسامہ کو دھکا مارا تھا۔ دیکھو کیسا موٹا گوڑا ہو گیا میرے بچے کے سر پر۔“ رابعہ بھابھی نے اسامہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”کون سا گوڑا“ مجھے تو کوئی گوڑا اس کے سر پر نظر نہیں آ رہا۔ ہاں یہ خود پورا کا پورا موٹا گوڑا لگ رہا ہے۔ کھا کھا کے گینڈا ہوتا جا رہا ہے۔“

”تو تم کیوں میرے بیٹے کے غم میں جل جل کر چھوڑا ہوئے جا رہی ہو۔“ رابعہ بھابھی بولیں۔ ”میں کیوں جلوں گی، وہ بھی تمہارے اس گولا کباب سے۔“ میں نے بھی تنک کر کہا۔

”اب چپ کر جاؤ۔ میں نے بہت لحاظ کر لیا زبیدہ بھابھی۔“

”خبردار جو مجھے بھابھی کہا تو۔ میری اماں سے بھی چار سال بڑی ہی ہوگی تم، ننھی بننے کے چکر میں، محلے

میں گھر لیتے ہی مجھے بھابھی کہنا شروع کر دیا تم نے۔ میں بھی لحاظ کر گئی ورنہ تو آنٹی ہی کہتی تمہیں۔“ میں نے جل کر دل کی بھڑاس نکالی۔

”آئے زبیدہ بھابھی کیا ہو گیا تمہیں۔ میں تمہیں آنٹی نظر آ رہی ہوں میرا بیٹا تمہیں گینڈا لگ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم اپنی آنکھیں ڈاکٹر کو دکھا کر آؤ۔ بلکہ

ایسا کرو کہ اپنا دل غچیک کروا کر آؤ۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ کوئی بڑی خرابی ہو گئی ہے۔“ اب کے راجہ بھابھی بھی چیخ کر بولیں۔

”ڈاکٹر کے پاس مجھے نہیں تمہیں جانے کی ضرورت ہے اور اپنے اس ہاتھی بیٹے کا چیک اپ کرواؤ کہ اس میں کون سی کیمیائی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو رہی ہیں جو یہ پھٹنے کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اور خود پھٹنے سے پہلے میرے حمل پر اچھل اچھل کر اسے بھی پھاڑنا چاہ رہا ہے۔“

میرے جومنہ میں آیا بولتی چلی گئی۔ دوسری طرف سے راجہ بھابھی نے بھی اپنی جوانی کا روائی کی۔ پری بھی وقتاً فوقتاً میرے کمن میں راجہ بھابھی کی بھولی بھری کوئی بات پہنچانی جا رہی تھی جو کہ میرے لیے اضافی گولہ بارود کا کام کر رہی تھی۔ راجہ بھابھی بھی میری تمام خوبیوں خاں سے واقف تھیں۔ اور اب بوقت ضرورت وہ ان تمام خامیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہی تھیں۔ نتیجتاً محلے کی تمام عورتیں اپنے گھر کے دروازے کھڑکیوں سے سر نکالے موجود تھیں اور ہم دونوں کی جنگ سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ بالآخر ہم دونوں لڑ جھگڑ کر تھک ہار کر واپس اپنے اپنے گھر میں گھس گئے۔

”آئے ہائے پری! ایک گلاس پانی تو دے دو۔ اللہ حلق خشک ہو گیا چیخ چیخ کر۔“ میرے کہے پر پری جھٹ سے ٹھنڈے پانی کا گلاس لیے چلی آئی۔ ”واہ ماں! کیا مقابلہ کیا ہے آپ نے راجہ بھابھی کا“ دل خوش کر دیا تھی۔

”مجھے پانی پلانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے پانی پر بھی چڑھایا جائے۔ انہوں نے بھی مجھے صحیح کی سنائی

ہیں پورے محلے کے سامنے۔“ میں جل ہی تو گئی پری کی بات پر۔

”لیکن ماں! ایک بات ہے راجہ بھابھی جب بھی اچھی چیز پکاتی تھیں تو آپ کے گھر ضرور بھجواتی تھیں۔ او، آپ جب بھی ٹنڈے گوبھی بمسندی پکاتی

تھیں تو میں راجہ بھابھی سے سالن لے لیتی تھی۔“ مجھ سے پانی کا گلاس واپس لیتے ہوئی پری کو راجہ بھابھی کی خولی یاد آئی۔ اپنے مطلب کی خولی۔

”پہلی بات تو یہ کہ تم ہی مجھے جوش دلا رہی تھیں۔ ماں! جلدی آؤ دیکھو ہمارے حمل کو کیسے مار رہا ہے۔“ میں نے پری کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

”ہاں تو میں تو آپ کو بتا رہی تھی۔ آپ جا کر اسامہ کو ڈانٹ دیتیں۔ راجہ بھابھی۔ مم میرا مطلب ہے کہ راجہ آئی سے لڑنے کی کیا ضرورت تھی۔“ پری نے معصوم بن کر کہا تو دل چاہا پری کو بھی کھری کھری سنا دوں۔ لیکن راجہ بھابھی سے اتنے خطرناک معرکے کے بعد دل غ اور زبان دونوں تھک چکے تھے سو خاموشی سے سوئے پر آنکھیں موند کر بیٹھی رہی۔

تب ہی دروازہ کھول کر پری والی پرنس کی بیٹی روا چلی آئی۔ وہ پری کی دوست تھی۔ پری سے حل احوال پوچھ کر میری جانب متوجہ ہو گئی۔

”بھابھی! وہ ٹائی امی کہہ رہی ہیں کہ اب جو آپ کہانی لکھیے گا نا تو اس میں ہیرو ہیروئن کے رومانٹک جملے زیادہ ڈالے گا۔“ روا کی بات پر میں گردن ہلا کر رہ گئی کہ آدھے گھنٹے پیچھے چلانے کے بعد مزید بولنے کا دل نہ تھا۔

”اچھا بھابھی! وہ کیا ہو گیا تھا۔ راجہ بھابھی سے کیوں لڑائی ہو گئی تھی۔“ روا میرے قریب ہو کر قدرے رازداری سے بولی تو مجھے تو گویا آگ لگ گئی۔

”پورے آدھے گھنٹے تک تمہارے گھر کی تمام کی تمام عورتوں کی منڈیاں کھڑکی میں سے جھانکتی رہیں۔ تمہیں نہیں معلوم۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

”وہ تو ٹائی پوچھ رہی تھیں۔“ روا میرے غصے سے ڈر کر منمنائی۔

”تمہاری ٹائی اپنا چھوٹا سا سر اور بڑے بڑے کان کھڑکی سے باہر نکالے سب دیکھ اور سن رہی تھیں۔ انہیں سب معلوم ہے پھر دوبارہ تصدیق کروا کر نیوز چینل پر خبر دی ہے کیا؟ اگر ہماری لڑائی کی خبر نیوز چینل

پر دینی ہی ہے تو تصدیق کی کیا ضرورت ہے ایسے ہی
دے دیں۔ ویسے بھی نیوز چینل والوں کو تو خبریں دینے
سے مطلب ہے۔ سچی جھوٹی سے کوئی سروکار نہیں۔“
میرے مزاج کی تیزی دیکھ کر ردا جلدی سے جانے کے
لیے کھڑی ہو گئی تو میں نے جھٹ سے کہا۔
”ردا! اپنی نانی سے کہنا یہ عمر ایسی کہانیاں پڑھنے کی
نہیں ہے۔ اپنی نانی سے کہنا ”موت کا منظر“ پڑھیں۔
میرے پاس رکھی ہے کتاب میں بھجوا دوں گی
انہیں۔“ میری بات پر ”اونہہ“ کر کے ردا باہر نکل
گئی۔

اور میں دیکھتے سر کو پکڑ کر بیٹھنے ہی لگی تھی کہ پری کی
چچ سن کر دوبارہ اٹھ گئی۔ دیکھا تو سامنے سے جلال آرہے
تھے۔ سر پر جوت کا نشان تھا۔

”آئے ہائے کیا ہو گیا۔ کہاں سے پھوٹ کر آ
گئے۔“ جلال کو لنگڑا تا دیکھ کر مجھے ہول اٹھنے لگے۔

”کہیں سے بھی پھوٹ کر آؤں تمہیں کیا۔ جب
نصیب ہی پھوٹے ہوں تو بس ہر جگہ ہی پھوٹا ہے
ہمیں۔“ جلال پر واقعی جلال آیا ہوا تھا آج۔

”یہ شلوار کا پائنچا پٹنا ہوا تھا۔ گاڑی سے اترتے
ٹائم بائیک کے کیریئر میں اٹک گیا۔ اٹنے منہ روڈ پر
گرا۔ سر پھٹ گیا میرا۔ پھوڑ عورت۔“

”عورت عورت نہیں لڑکی۔“ میرے دل کو کچھ
ہونے لگا۔ لفظ عورت سن کر۔

”پھوڑ کھلوانا گوارا ہے پر عورت نہیں۔“

”ہاں تو شادی سے پہلے امی ہر وقت پھوڑ کہتی رہتی
تھیں اس لیے برا نہیں لگتا پھوڑ۔ سننے کی عادت ہے
شروع سے بہت اپنا اپنا لگتا ہے یہ لفظ۔“ میں نے
بہت پیار سے کہا۔ امی کی یاد جو آئی تھی اس لفظ سے۔

”اب عورت سننے کی عادت بھی ڈال لو۔ لڑکی کی
حدود پار کر چکی ہو تم۔“ جلال بولے تو میں جل کر رہ
گئی۔

”پری! ایک گلاس پانی پلا دو۔“ جلال پری سے
مخاطب ہوئے تو پری پانی لینے چلی گئی۔

”کپڑے استری کرتے ٹائم پائنچا دکھائی نہیں دیا تھا

تمہیں۔“ جلال نے مجھے گھورا۔
”میں نے کپڑے استری کیے ہی نہیں تو دکھائی کیسے
دیتا۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔
”تم نے نہیں کیے۔ پھر کیا پری سے کروائے تھے؟“
جلال کے پوچھنے پر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
”کیوں پری سے کیوں کروائے؟ تم نے کیوں نہیں
کیے۔ تم کیا کر رہی تھیں اس وقت۔“
جلال نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔
”وہ میں میں میں کام کر رہی تھی۔“ میں نے سٹپٹا
کر جواب دیا۔

”کیا کام کر رہی تھیں۔ یقیناً“ کہانی لکھ رہی ہوں
گی ہے نا۔“ جلال پر اصلی والا جلال آیا ہوا تھا۔
”من من نہیں تو۔“ میں سچ بچاؤ کر گئی پر کوشش یہی
تھی کہ ظاہر نہ ہو اتنے میں پری پانی لے کر آگئی۔

”پری جب تم میرے کپڑے استری کر رہی تھیں تو
تمہاری مامی کون سی کہانی لکھ رہی تھیں۔“

جلال کے اس طرح پری سے پوچھنے پر میں حق حق
رہ گئی۔ امید نہ تھی کہ جلال واقعی وکیلوں کی طرح
سوال کو گھما پھرا کر پوچھیں گے۔

”وہ ڈائجسٹ والوں نے مامی سے مزاحیہ افسانے یا
ناول کی فرمائش کی ہے ہاں۔ وہی لکھ رہی تھیں۔“
پری میری آنکھوں کے اشارے نہ سمجھ پائی اور جلال
کے سامنے سچائی اگل دی۔

”اچھا“ تو تم یہاں مزاحیہ کہانی لکھ رہی تھیں اور
ادھر روڈ پر میرا مذاق بن رہا تھا۔ ایک لڑکا کہہ رہا تھا۔
دیکھو تو انگل کے سر پر ٹینس بال بن گئی۔ دو سرا کہنے
لگا۔ ٹینس بال نہیں پاگل نمٹ بال بنی ہے۔“ جلال
نے لڑکوں کی نقل اماری۔

”اوہو دو سرا لڑکا جھوٹ جبکہ پہلا سچ بول رہا تھا۔
بات کا جھگڑنا رہا تھا دو سرا لڑکا۔ یعنی کہ ٹینس بال کو فٹ
بال بننا رہا تھا۔“ میں نے کہا۔

”زبردہ! یہ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ جب سے
کہانیاں لکھنے لگی ہو تب سے گھر کے کاموں اور بچوں
میں دلچسپی کم ہو گئی ہے تمہاری۔ آخری بار کہہ رہا

”زبردہ! یہ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ جب سے
کہانیاں لکھنے لگی ہو تب سے گھر کے کاموں اور بچوں
میں دلچسپی کم ہو گئی ہے تمہاری۔ آخری بار کہہ رہا

ساتھ چلی گئی۔ میرے سر کا درد شدید اور شدید ہو رہا تھا۔

”حماد اُدھر آؤ۔“ جلال نے حماد کو آواز دے کر بلایا۔ ”دیکھو اگر اب تمہاری ماما کہانی لکھیں تو مجھے بتانا میں تمہیں دس روپے دوں گا۔“

”دس نہیں بیس لوں گا۔“ حماد بھی کاروبار پر آمادہ تھا۔

”ٹھیک ہے بیس دوں گا۔“ جلال فوراً راضی ہو گئے پھر پانچ سالہ رمیز کی جانب مڑے۔

”رمیز اگر ماما کاپی پر پین سے کچھ لکھیں تو مجھے بتانا میں آپ کو پیسے دوں گا۔“

رمیز نے پیسوں کا سن کر جھٹ سے ہاں میں گریں ہلا دی۔ ابھی رمیز کو دس اور بیس کی خاص سمجھ نہ تھی

ورنہ وہ بھی ضرور کہتا کہ بیس روپے لوں گا۔ ”جس طرح آپ بچوں کو پیسوں کا لالچ دے رہے ہیں۔ تو میں اگر نہیں بھی لکھوں گی تو بھی تو یہ آپ سے کہہ دیں گے کہ ماما لکھ رہی تھیں۔“ میں نے منہ بنا کر جلال سے کہا۔

”اسپتال جا رہا ہوں مریض پٹی کروانے۔“ میری بات سنی ان سنی کر کے جلال چلتے بنے۔

میرے سر میں درد کی وجہ سے دھماکے سے ہو رہے تھے۔ ابھی کچن میں برتنوں کا ڈھیر لگا تھا۔ جو کہ روزانہ

پری دھو دیتی تھی۔ کپڑوں کا بھی گٹھڑ رکھا تھا جسے کل دھونے کا پری کا پلان تھا۔ کھانا بھی بنانا تھا۔ جس میں

پری میری کٹنی بد کرواتی تھی۔

مگر اب پری جا چکی تھی۔ مجھ اکیلی کو ہی سارے کام کرنے تھے۔ مزاحیہ کہانی؟ اف ان حالات میں کیا

مزاحیہ کہانی لکھوں۔ اس وقت تو دکھی مظلوم اور افسردہ لڑکی کے درد بھرے افسانے ہی ذہن میں آ رہے ہیں۔

ویسے بھی جلال نے — کہانی نہ لکھنے کے تمام حفاظتی انتظام حماد اور رمیز کی صورت میں کر لیے تھے۔

سو میں نے بھی مزاحیہ کہانی لکھنے کا خیال دل سے نکال کر کچن کی راہ لی۔

ہوں۔ اب تم کہانیاں نہیں لکھو گی۔ ویسے بھی فائدہ کیا ہے۔ اتنی کہانیاں لکھتی ہو شائع تو ایک بھی نہیں ہوئی۔ خبردار جو اب کہانی لکھی تو۔“ جلال نے سختی سے حکم دیا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔“ میں نے اپنا سر ہاتھوں سے تھام لیا تب ہی پری کی آواز آئی۔

”مامی جلدی سے آئیں۔ دیکھیں حماد اسامہ کے ساتھ گلی میں کرکٹ کھیل رہا ہے۔“

پری نے پھر سے دروازے پر سے وہی فساد کی آواز لگائی۔ پری کی اس براہ راست نشریات کی کوریج کی وجہ سے ہی میری رابعہ بھابھی سے لڑائی ہوئی تھی اور یہ حماد کا بچہ بھی نا۔ لیکن میرے سر کا درد مجھے مزید غصے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ سو صرف اتنا ہی کہا۔

”حماد کو اندر بلا لو پری۔“

”تم رابعہ بھابھی سے بھی لڑی ہو آج بچوں کی وجہ سے۔“ یقیناً محلے کے لڑکوں نے گلی میں گھستے ہی یہ

بریکنگ نیوز جلال تک پہنچا دی تھی۔ میں نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا اس وقت۔

”یہ سب ان کہانیوں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ بچے بھی بگڑتے جا رہے ہیں اور اپنے ساتھ پری کو بھی فضول کاموں میں لگایا ہوا ہے زبیدہ تم نے۔“

بابی (میری نند) کا فون آیا تھا میرے پاس کہہ رہی تھیں پری کی کلج کی چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں۔ پری کو کب بھجواؤ گے؟ میں نے کہہ دیا کہ آج بلوالو۔“

جلال نے کہا تو مجھے جھٹکا لگا۔

”پری تیار ہو جاؤ۔ سلمان (پری کا بھائی) آ رہا ہو گا تمہیں لینے۔“

”جی ماموں اچھا۔“ پری نے تابعداری سے جواب دیا۔

”ارے اتنی جلدی۔“ میں نے منع کرنا چاہا تو جلال نے بچ میں ہی ٹوک دیا۔

”چپ کرو زبیدہ اپنے ساتھ ساتھ پری کو بھی خوار کر رہی ہو۔ اس کی پر بھائی خراب کروا رہی ہو۔“

تھوڑی ہی دیر میں سلمان آگیا اور پری سلمان کے

میرے ساتھ یہ کتنی حیران کن

درمیان ایک وہ بھی تھی۔ ارد گرد سے بے نیاز خود میں
گم ایک طرف بیٹھی تھی۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند
کیے شاید آنے والے برے وقت کی تکلیف سے خود
کو بچانے کی ایک فطری سی کوشش۔

بہت سارا وقت گزر جانے کے بعد اس نے اٹھ کر
باہر جھانکا۔ لندن پہ سایہ فگن بادل وسیع عریض نیلے
آسمان کی نیلاہٹ کو چھپا گئے تھے۔

نشال نے ایک نظر برسنے کو تیار خطرناک تیور والے
بادلوں بھرے آسمان کو دیکھا اور دوسری بے اختیار
نگاہ سے کلائی پہ بندھی گھڑی کو۔ جو پاکستانی وقت کے
مطابق چل رہی تھی۔ یعنی اس وقت پاکستان میں بارہ
بج رہے تھے تو اس کا مطلب یہاں لندن میں سات
بجے کا وقت تھا، مگر گھرے سرمئی بادلوں نے شام کو
گہری رات میں بدل دیا تھا، اس پر خوف سے لرزہ
طاری ہونے لگا۔

ڈیپارچر لاؤنج کے ونڈو سلائیڈز پر بڑے بڑے
موٹے شفاف پانی کے قطرے گرنے لگے تھے۔ پہلی
بار اپنے گھر وطن سے دور اس بارش کی دیوانی لڑکی کو
بارش سے خوف آیا اور بے طرح آیا۔ اس خوف میں
جانے کتنے ہی خوف شامل ہو گئے تھے۔

اس نے کتنا روکا تھا بی امال کو کہ اسے اکیلے لندن نہ
بھیجیں۔ صحاب احمد کو یہاں بلا لیں اور اسے اس کے
ساتھ وہاں اپنے گھر سے رخصت کریں، مگر بی امال کو نہ
جانے کیا ہوا تھا کہ وہ اس قدر سخت گیر اور اپنے ارادے
میں اٹل ہو گئیں، نہ اس کی آہ و فغاں پہ کان دھرے، نہ
ہی اس کی منت سماجت کو کسی خاطر میں لائیں۔ عرصہ
دراز سے جمع کیا اس کا سارا زیور ٹرنک سے نکالا اور

ہیتھرو ایر پورٹ پر حسب معمول گھما گھسی
تھی۔ شام چار بجے کی اس کی فلائٹ تھی۔ وہ پہلی مرتبہ
اکیلے سفر کر رہی تھی اور وہ بھی اتنی دور۔ طویل سفر
نے اس کی کمر تختہ کر دی تھی۔ ڈیپارچر لاؤنج کا وسیع
ہال اور اس میں بھرے بھانت بھانت کے لوگ جو
طرح طرح کے لباس میں مختلف ملکوں اور قوموں کی
نمائندگی کر رہے تھے۔ بھانت بھانت کے لوگوں کے

مکمل ٹائول





Downloaded From
paksociety.com

ستار کو فروخت کر کے اس کے پاسپورٹ ویزے اور ٹکٹ کا انتظام کیا۔

نشال بس اپنے پیری والے اس گھر میں گنتی کے دن شمار کرتی رہی۔ بی اماں نے اسے لندن بھیج کر ہی دم لیا تھا اور وہ بھی اکیلے۔ صحاب احمد کو خبر اس وقت دی جب اس کی ٹکٹ کنفرم کروادی گئی۔ جانے صاحب احمد نے انہیں کیا کہا، کیا نہیں۔ نہ بی اماں سے اس نے پوچھا، نہ انہوں نے خود بتایا، مگر نشال بے چینی اور اضطراب کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ ایک آخری حربہ و کوشش کرنے کی نیت سے وہ بی اماں کے پاس آئی تھی، وہ سبچ بڑھنے میں گم تھیں۔ نشال نے ایک نظر انہیں دیکھا، پھر ان کے قدموں پہ سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ بی اماں نے اسے بالکل بھی چپ نہیں کروایا۔ انہوں نے پہلے کی طرح اس کے آنسو بھی نہیں پونچھے، نشال جھگے چہرے سمیت انہیں حیرت سے دیکھنے لگی۔

”اپنے آنسو خود پونچھنے کی عادت ڈال لو نشی! کیونکہ جہاں تم جا رہی ہو وہاں کے لوگوں کے مزاج اس شہر کے سرد ترین اور بے رحم موسم ہی کی مانند سرد اور سخت ہوں گے۔ تمہیں وہاں کے لوگوں کے مزاج کو سمجھنے میں تھوڑی دشواری ضرور آئے گی۔ مگر تمہیں ان حالات کا مقابلہ کرنا ہے، ہمت کے ساتھ اور تم نے اپنی بی اماں کا سر جھکنے نہیں دینا۔“ وہ جیسے اس کی روح میں اتر گئی تھیں، کچھ بولنے کی خواہش میں اس کے لب بس پھڑپھڑا کے رہ گئے تھے، نشال نے اپنے حوالے سے ان کے چہرے پر بہت کچھ دیکھا، جس میں آس تھی، مان، بھرم، خواہش اور امید کے سب ہی رنگ تھے۔ نشال کے وسوسے اس کی پریشان کن سوچیں ان رنگوں کے نیچے دبے لگیں، پھر دم ہو گئیں، مگر کم نہیں ہو سکیں۔ راکھ میں چنگاریاں دب ضرور جاتی ہیں، مگر بجھتی نہیں۔ راکھ ہتے ہی ذرا سی ہوا ملنے پر وہ شعلے کی مانند چمکنے بھڑکنے لگتی ہیں۔

”صحاب احمد! بہت اچھا لڑکا ہے، پھر اپنے باپ کے جوڑے رشتے کا پاس بھی رکھے گا۔ آخر ہندوہ سال پرانا

رشتہ ہے۔ ایک جھٹکے سے تھوڑی نہ ٹوٹے گا۔ پرانے رشتوں کی ڈوریں وقت کے ساتھ مضبوط و مستحکم ہوتی ہیں، کمزور اور بے جان نہیں۔“ وہ اس کے بالوں میں ہولے ہولے انگلیاں پھیرتی اسے سمجھا رہی تھیں۔

”تمہیں بس اپنے گھر کو بچانے اور بنائے رکھنے کے لیے ہمت سے، صبر سے کام لینا ہو گا اور ہمیشہ صبر سے کام لیتے رہنا ہو گا۔ ساری زندگی عورت یہی تو کرتی رہتی ہے۔“

نہند کی وادی میں جاتی خاموشی سے سنتی نشال ایک دم چونکی، پھر جھٹکے سے اٹھ بیٹھی، ایک گہری نظری اماں کے چہرے پہ ڈال کر ان کی باتوں کا مطلب سمجھتی جیسے وہ حقائق اخذ کرنے کی کوشش میں تھی۔

”تو کیا کوئی خدشہ تھا۔ کیا اس کا گھر بسنے سے پہلے ہی آندھیوں کی زد پہ تھا۔“ وہ شل ہوتے دماغ کے ساتھ سوچتی رہی۔

”بی اماں۔ کیا کوئی مسئلہ ہے؟“ لفظ خدشہ منہ میں بمشکل دباتی وہ بظاہر پرسکون نظر آنے کی کوشش میں تھی۔ بی اماں جیسے دہل سی گئیں۔

”نہ۔ نہ میری بچی کوئی مسئلہ نہیں اور نہ ہی تو کسی خدشے کو دل میں جگہ دے۔ بس آنے والے وقت کی تیاری کر۔“ نشال خاموشی سے سر ہلا کر رہ گئی، مگر اس کے وجود میں سناٹے اترنے لگے تھے۔

”صحاب احمد کو میں نے فون کر دیا ہے۔ وہ ایر پورٹ پر تمہیں لینے آجائے گا، اگر بالفرض نہ آئے تو گھر کا ایڈریس میں نے تمہارے پرس میں لکھ کے رکھ دیا ہے تو خود چلی جانا۔“

وہ ہولے ہولے اسے سمجھا رہی تھیں۔ گلاس وندوز کے پار گرتی بارش کو ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتی نشال بل بھر کو چونکی، پھر ایک دم اس نے کندھے پر لٹکا ہینڈ بیگ کھول کر چٹ نکالی، جس پر صاحب احمد کے گھر کا پتا اور فون نمبر درج تھا۔ اسے اپنی بے وقوفی پر جی بھر کر غصہ آیا۔ انجان دیس میں تنہا ہونے کا تصور اس کی روح فنا کیے ہوئے تھا۔ ایسے میں وہ کیسے صاحب احمد کے گھر کا پتا یاد رکھ پاتی، جو جانے بی اماں نے احتیاطاً

رکھا تھا یا کسی انجانے خدشے کے تحت۔ نشال کی آنکھوں سے برسات کی جھڑی لگ گئی۔

”بی اماں آپ کو ہوتا تھا آپ کی نشی بہت کمزور اور دلو ہے، آپ نے کیوں اسے خود سے الگ کر دیا۔ کچھ تو سوچا ہوتا، مجھے تو آپ کے بغیر کہیں اکیلے رات گزارنے کی عادت تک نہیں ہے کجا اتنی دور۔ عمر بھر قیام کرنا۔“

نشال نے ہچکی لیتے جیسے تصویر میں ان سے شکوہ کیا اور نشال کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی واقعی میں بی اماں نے اسے خود سے اچانک یوں بے دردی سے الگ کیا تھا، جیسے ایک مرغی اپنے بچوں کو زمانے کے سرد گرم سے بچائے اپنے پروں میں چھپائے رکھنے کے بعد ایک دم اچانک کسی خونخوار بی کے سامنے لاکھڑا کرے اور یہ امید بھی رکھے کہ دشمن کے وار کا ہمت و جواں مردی سے مقابلہ کریں گے۔

اس نے بہت دیر گزر جانے کے بعد اٹھ کر ایر پورٹ پر بنے ٹیلی فون بوتھ سے صحاب احمد کے گھر کا نمبر ملایا۔ گھنٹی بج رہی تھی، مگر کوئی ریسپونس نہیں کر رہا تھا۔ نشال کو اپنی بے بسی پر پھر رونا آیا۔ آخر اس نے خود اس کے گھر جانے کا قصد کیا۔ صحاب احمد کے گھر؟ جو اب اس کا بھی گھر بننے والا تھا اور جس گھر کو آج سے پندرہ برس پہلے جب وہ محض دس سال کی تھی اور صحاب احمد پندرہ برس کا۔ اس کی بی اماں اور احمد نواب انکل نے مل کے چنا تھا۔ گھر اور گھر والا تو پندرہ سال پہلے ہی اس کے بن چکے تھے، گھر بیٹا نے اور اس میں رہنے تو وہ اب جاری تھی۔ دل میں خواہشوں کے دھبے روشن کیے، آنکھوں میں آنسو کی جوت جگائے وہ لندن کی بارش میں بھیکتے ہوئے ٹیکسی والے کو چٹ تھمائی تھی، جس پر اس کے ”اپنے گھر“ کا پتا لکھا تھا۔

بی اماں نے آتے وقت زبردستی۔ ریشمی کاپڑیانی جوڑا پہنانے کے بعد ہلکا ہلکا میک اپ کروا دیا تھا۔ یہ تھی اس کی رخصتی جس میں نہ گھر والے تھے نہ سسرال سے کوئی شریک ہوا تھا۔ نشال نے اپنے ڈوبتے دل کو

تینکے کی مانند صحاب احمد کے ساتھ گزرنے والی زندگی کے خوش گوار خواب کا سہارا دینے کی کوشش میں اپنے اندر اترتے سنٹوں کو کم کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس کا دل تو جیسے پاتال میں گر رہا تھا۔ ہاتھوں میں ٹھنڈے پسینے۔ اس نے تو آنکھ کھولتے ہی گھر میں صرف بی اماں کو ہی دیکھا تھا۔ نہ ماں، نہ باپ۔ بی اماں کی سمجھائی پڑھائی باتیں، زمانے کی اچھائی برائی سے متعلق اسباق اسے ازیر تھے، لیکن وہ خود میں ہمت کہاں سے لاتی۔ بی اماں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ لندن کا موسم واقعی۔ بہت سخت اور سرد تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنی ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑ کر گرم کرتے اس نے سوچا تھا۔ اس کے پاس کوئی رین کوٹ نہیں تھا، اسی لیے وہ ساری بھیگ چکی تھی۔

ایر پورٹ سے صحاب احمد کے گھر جانے میں اسے ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔ ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر اس نے کچھ ڈرتے جھجکتے گھنٹی پر انگلی رکھی تھی۔ ایک فطری حجاب نے اسے صحاب احمد کی نگاہوں کا سامنا کرنے کا سوچتے ہی سر جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔ یقیناً ”وہ اسے اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہو گا اور پھر اسے ایر پورٹ پر لینے نہ آنے پر بے حد شرمندہ و پشیمان ہو کے وضاحت کرے گا، پھر اپنی اس غلطی کے ازالے کے لیے اسے سارا گھر دکھائے گا، وہ پھر جواب اس کا تھا، جس گھر کی وہ بلا شرکت غیرے مالک تھی۔

”یس!“ اچانک دروازہ کھلا تھا اور سفید ہانی نیک کے ساتھ سرخ رنگ کی جینز پہنے ایک وجیہ سا آدمی باہر نکلا تھا۔ وہ اجنبی تاثرات اپنے چہرے اور آنکھوں میں سجائے اس کی آمد کا مقصد جاننے کو اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نشال کو صدمہ ہوا صحاب احمد اسے پہچان نہیں پایا تھا۔ وہ تو اسے آن واحد میں پلک جھپک کر دیکھنے کے سے تک میں پہچان گئی تھی۔

”ایکسکوز می۔ میں آپ کی کیا ہیلپ کر سکتا ہوں۔“ وہ برطانوی سرو لہجے میں محل سے پوچھ رہا تھا۔ نشال جیسے دکھ کے حصار سے نکلی، پھر خود کو تسلی دی۔ اتنے سالوں میں وہ دونوں پہلی بار مل رہے تھے، ہو سکتا

ہے وہ بھول گیا ہو، بچپن سے لڑکھن اور پھر جوانی میں شیطانی بدل بھی تو جایا کرتی ہیں۔

”مم۔ میں نشال عبید اللہ۔“ زندگی میں پہلی بار اسے اپنا تعارف کروانا بے حد مشکل لگا۔ خصوصاً ایسے شخص کو جو اس کا سب کچھ تھا۔ صاحب احمد کے چہرے پر یک لخت زلزلے کے آثار پیدا ہو گئے۔ ”تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟“ الفاظ تھے یا بھاری سول والے وزنی جوتے جو یک لخت نشال کو بڑی بے وردی سے اپنے چہرے پر پڑتے محسوس ہوئے۔ کم از کم یہ ایک ایسا جملہ تھا جسے سننے کا اس نے کبھی خواب میں بھی گمان نہیں کیا تھا۔ کیا اسے خبر نہیں تھی ہمنشال نے دھواں ہوتا اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور اسے دیکھا۔

”تمہاری یہاں آنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ مالی گاڈ!“ اس کی آنکھوں میں پتھر ملاسن تھا۔

”میں نے کہا بھی تھا ڈیڈ کو اس بروہیا کو منع کر دیں، مگر۔“ وہ غصے میں پھنکار رہا تھا اور نشال عبید اللہ اس کے طرز تخاطب اور اندازِ بیاں پہ یک لخت سن ہو گئی تھی۔ وہی اماں کو کس انداز میں پکار رہا تھا؟ ”اور۔ تم۔ تم کیوں آئیں؟ کیا میں نے تم سے کوئی وعدہ کیا تھا اس رشتے کو نبھانے کا؟“ وہ خطرناک تیور لیے اب اس سے پوچھ رہا تھا۔ نشال کا سر بے ساختہ نفی میں ہلا۔ رگوں میں گودا جمانے والی ٹھنڈ میں وہ لب بستہ کھڑی اس کی نفرت کا حساب کرتی رہی۔

”میں آپ کی بیوی ہوں صاحب!“ وہ کانپتے لہجے میں بولی۔ وہ یہاں کمزور پڑنے نہیں آئی تھی۔

”مگر میں تمہارا شوہر نہیں ہوں بی بی۔ خدا کے لیے میری جان چھوڑو اور جاؤ یہاں سے جس رشتے کو میرے باپ نے فقط صلہ رحمی کے چکر میں جوڑ دیا، اسے نبھانے کا میں کوئی ارادہ نہیں رکھتا ہوں۔“ وہ اسے اپنانا نہیں چاہتا تھا، مگر نشال کے پاس واپسی کے سارے راستے بند تھے۔ اس کی ساری گشتیاں بی اماں نے از خود جلا دی تھیں۔ یہ کیسی مشکل میں انہوں نے اسے ڈال دیا تھا۔ یہ کیسا امتحان تھا جس میں وہ اسے سرخرو کرنا چاہتی تھیں؟

”مگر میں اس وقت کہاں جاؤں۔ میں تو یہاں کسی کو جانتی تک نہیں۔“ نشال نے بے بسی سے اپنے لب کھلے۔

”میری طرف سے بھاڑ میں جاؤ، میں تمہیں یہاں ایک منٹ بھی برداشت نہیں کروں گا۔ سمجھیں تم۔“ وہ غرایا تھا نشال جیسے سم کے دو قدم پیچھے ہٹی۔ ”مگر میرا قصور کیا ہے صاحب احمد؟“ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ اس کے منہ پہ بند کرتا، نشال نے اپنی ہمت بجمع کرتے پوچھ ہی لیا تھا۔

”آئینہ دیکھ لیتا، جواب مل جائے گا۔“ اس کے لہجے میں تحقیر و ذلت تھی۔

”مجھے گھر کے اندر آنے دیں صاحب! مجھے بہت سردی لگ رہی ہے؟“ اس نے اس کی کڑوی کسبلی کو نظر انداز کیا اور جیسے گھر کے اندر آنے کی بھیک مانگی۔

”نہیں۔ میں ہرگز تمہیں اپنے گھر میں نہیں آنے دوں گا۔“ وہ یوں بد کا گویا نشال اس کے گھر پہ قبضہ جمالے گی یا پھر وہ گھر اس سے چھین لے گی۔

”آپ مجھے صرف آج کی رات یہاں رکھنے دیں، میں صبح ہوتے ہی واپس چلی جاؤں گی۔“ وہ حقیقتاً گڑ گڑائی۔ سردی سے اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو رہے تھے۔

”میں تمہیں ایک منٹ بھی اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہارے طلاق کے کاغذات میں وکیل کے ذریعے جلد ہی بھیج دوں گا اور ہاں اب دوبارہ یہاں آنے کی کوشش ہرگز مت کرنا، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ وہ اس کے منہ پر دروازہ بند کیے پلٹ گیا تھا، اپنے نرم گرم گھر میں۔ اور نشال جیسے حواس کھو بیٹھی تھی، تو کیا اماں بی کو خبر تھی۔ صاحب احمد کے ایسے رفتے کی۔

”گیوں کیا آپ نے ایسا بی اماں۔ جب آپ کو خبر تھی کہ صاحب احمد کی زندگی میں میری کہیں بھی جگہ نہیں۔“ جب ہی تو انہوں نے اس سے وہ سب کہا تھا۔ کڑی سے کڑی جوڑتے اپنا بڑا بھاری سوٹ کیس

دکن

دسمبر 2016 کا شمارہ شائع ہو گیا

اس شمارے کے ساتھ خوب کتاب

”شفیع النور خاتم الانبیاء علیہ السلام“

کران کے ہر شمارے کے ساتھ شیعہ سے ملت جوش خدمت ہے

گھنٹی وہ برستی بارش میں فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔
ذلت کی جو آگ صحاب احمد نے اس کے اندر دھکائی
تھی اس نے سردی کے احساس کو یک لخت ختم کر دیا
تھ۔ اہانت و بے عزتی کے احساس نے اسے بھڑبھڑ
جلانا شروع کر دیا تھا۔ چلتے چلتے تھک گئی تو فٹ پاتھ پر
ایک طرف پر بیٹھ کر رونے لگی تھی دھاڑیں مار مار
کے۔ سرد ہوا کی شوریدہ سری اس کے بال اڑائے
جا رہی تھی، مگر وہ اپنے حواسوں میں کہاں تھی حواسوں
میں ہوتی تو دیکھتی تا کہ اس کے رب نے اسے اکیلا
نہیں رہنے دیا تھا اس کی غیبی امداد کروی گئی تھی۔

اس نے گیٹ روم میں کمبل میں دبی نشال کو بے
خبر سوئے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ سرخ ریشمی کلدانی
جوڑے میں ملبوس۔ چہرے پر میک اپ کے مٹے
آثار والی اس لڑکی کو اس نے قدرے تاسف سے
دیکھا۔ یہ تو تقریباً ”ہر روز کا قصہ تھا۔

”کون ہے یہ؟“ رباح کے قریب آنے پر باصد نے
استفسار کیا تھا۔ کافی کانگ پکڑتے اس نے ہولے سے
کندھے اچکائے تھے گویا وہ خود بھی ابھی بے خبر تھی۔
”واش۔۔۔ داہیل از دوس رباح۔ تم کیسے اس طرح
کسی اجنبی کو گھر میں اٹھا کر لا سکتی ہو؟“ وہ جھنجھلا یا۔

میں اسے اٹھا کر نہیں لائی اس نے خود مجھ سے مدد
مانگی۔ اپنے لمبے بے حد چمکیلے ریشمی بالوں کو سہلاتے
اس نے وضاحت کی۔ باصد نے ایک نظر اسے دیکھا۔
”اور اگر یہ کوئی چور نکلی تو۔۔۔؟“ رباح اس کے
چہرے پر لکھی داستان بڑھ کے مسکرائی۔

”کیا تمہیں لگتا ہے کہ یہ کوئی چور ہے؟“ وہ الٹا اس
سے سوال کر رہی تھی۔ باصد نے کندھے اچکائے
گویا ایسا کر کے اپنی رائے کو محفوظ رکھا ہو۔

”نشال عبید اللہ نام ہے اس کا۔ پاکستان سے یہاں
اپنے شوہر کے پاس رخصت ہو کے آئی تھی۔ لندن
پہلی بار آئی ہے پھر یہاں کسی کو جانتی بھی نہیں۔“ وہ
اب اسے تفصیل سے آگاہ کر رہی تھی۔

✽ اداکار ”گوہر ممتاز“ سے شاپن رشید کی ملاقات،

✽ ”آواز کی دنیا سے“ اس ماہ مہمان ہیں ”مرزا ہالیوں“

✽ اداکارہ ”ایمن خان“ کہتی ہیں ”میری بھی سنئے“

✽ اس ماہ ”کنیر فاطمہ“ کے ”مقابل ہے آئینہ“

✽ ”من مور کھ کی بات نہ مانو“ آسیہ مرزا کا

سلسلے وار ناول،

✽ ”راہنزل“ تنویر ریاض کا سلسلے وار ناول،

✽ ”گل گہسار“ فرح بخاری کا مکمل ناول،

✽ ”دل تیری اسیری کا بہانہ ڈھونڈ لے“

صدف آصف کا مکمل ناول،

✽ ”عشق والا لو“ سباس گل کا دلچسپ ناول،

✽ ”سچائی کی منزل“ علیہ راشد کا دلچسپ ناول،

✽ ”بخت جاگ اٹھے“ حمیرا نوشین کا ناول،

✽ ”امید صبح بہار رکھنا“ شبانہ شوکت کا ناول،

✽ نظیر فاطمہ، صائمہ اقبال اور کنیر فاطمہ کے افسانے

اور مستقل سلسلے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ شفیع دسمبر 2016 177

”اس پر ستم یہ کہ اسے اس نے گھر میں قدم تک نہیں رکھنے دیا۔ بے چاری نے صرف ایک رات رکنے کی بات کی مگر۔۔۔ خیر میں اس لڑکی کی مدد ضرور کروں گی جتنا بھی اس کے لیے کر سکی۔“ وہ پر عزم تھی۔

میں بھی باصد کے بغیر رباح یہ کام کبھی نہیں سہرا انجام دے گی۔“ وہ ہولے سے مسکراتے بولا تھا۔
”اچھا اسے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرنا۔“ وہ اسے خبردار کر رہی تھی۔

”اچھا کیا واقعی مجھ میں یہ صلاحیت ہے؟“ فواد خان کے سے انداز میں اس کے لہجے و انداز کو نقل کرتے اس نے رباح صدیقی کو مسکراتے پر مجبور کیا تھا۔

”تم تو نہیں البتہ خود تمہاری شکل دیکھنے والوں کو دھوکا ضرور دیتی ہے۔“ اس نے اسے خوش فہم ہونے نہیں دیا۔

”لوگوں کو بے وقوف بنانے کے انہیں آٹو گراف دیتے ہو۔۔۔ خبریں جاری ہوں کلینک۔ نشال اٹھے تو پلیرز اسے مشتاکروا دیتا۔“
”اچھا۔۔۔ اچھا ڈاکٹر صاحبہ! انہیں کروں گا تنگ اور کچھ۔۔۔“

”اور ذرا خیال رکھنا زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں۔“

باصد نے اس بات پر اسے غصے سے دیکھا تھا۔
”تمہیں میرا ٹیسٹ اتنا خراب لگتا ہے؟“ رباح نے اس کے خائف چہرے کو دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ وہ پاکستان سے آئی ہے۔ وہاں کا ماحول مختلف ہے۔ وہ پریشان ہو جائے گی۔“

”اس کی فکر تم مت کرو۔ وہ خود ہی میرے پاس بیٹھنے میں فخر محسوس کرے گی۔“ تقاخر سے بول رہا تھا رباح بس مسکرا کے رہ گئی تھی۔



بی اماں ٹیلی فون کے پاس کل شام سے بیٹھی تھیں۔ نشال نے انہیں وہاں پہنچ کے فون نہیں کیا تھا۔ انہیں بے چینی کے باوجود بھی کہیں اطمینان سا تھا کہ وہ اسے محفوظ ہاتھوں میں پہنچا چکی ہیں۔ احمد نواب ان کا بھتیجا ہی تو تھا۔ عبید اللہ اور سائرہ کی حادثاتی موت کے بعد وہ لندن سے بطور خاص تعزیت کے لیے پاکستان آیا تھا۔ اس دن وہ بی اماں کے پاس رہا تھا۔ بڑے چاؤ سے احمد نواب نے اپنے تیسرے نمبر والے بیٹے کے لیے نشال کا ہاتھ بانگا کہ بی اماں انکار نہیں کر سکیں۔ بلڈ کیسز کی مریضہ تھیں اپنی بے یقین زندگی سے خوف زدہ انہوں نے نشال کو بہترین اور مضبوط پناہ گاہ مہیا کرنے کے لیے ہی اس کا اتنی چھوٹی عمر میں عقد کر دیا تھا۔ ان دنوں احمد نواب کو پیسوں کی ضرورت تھی۔ بی اماں نے اپنی ساری پر اپنی فروخت کر کے اسے رقم دے دی تھی کہ کل کو سب کچھ نشال کے ہی کام آئے گا، پچاس لاکھ کی رقم اپنے تئیں انہوں نے نشال کے محفوظ مستقبل کے لیے انویسٹ کی تھی۔ احمد نواب نے بھی ان کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ وقت پر پیسے بھی بھجوائے، مگر یہ شروع کے چند سال تک تھا، مگر پھر رفتہ رفتہ پیسے آنا بند ہو گئے، بی اماں نے شکایت نہیں کی، مگر احمد نواب کا رابطہ مسلسل رہا۔ بی اماں نے کتنی ہی مرتبہ رخصتی کی بات کی۔ احمد نواب نے کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیا، مگر ان کے بہانوں سے بی اماں کو کبھی کوئی شبہ نہیں ہوا اور ابھی فقط چھ ماہ پہلے ہی انہوں نے نشال کو لندن بھیجنے کی بات کی تھی۔

”کیسی بات کر رہے ہو احمد نواب! ایسے کیسے میں رخصت کروں اپنی بچی کو۔ میں دنیاوی رسوم و رواج کے مطابق اپنی بیٹی کو اپنے گھر سے وداع کروں گی۔ تم لوگ پاکستان آ جاؤ نا۔“ ان کے لہجے میں دکھ، حیرت اور افسوس تھا۔ انہیں احمد نواب کی یہ بات بالکل بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ بدیس جا کے وہ بھی بدیسی ہی ہو گیا تھا۔

”بی جان! میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ صحاب اور نشال کی شادی دھوم دھام سے پاکستان آ کر کروں، مگر

صاحب کو پاکستان کا ویزا نہیں مل رہا۔ ویسے بھی وہ شادی سادگی سے ہی کرنا چاہتا ہے اور میرا وعدہ ہے کہ میں یہاں شان دار ولیمہ کا اہتمام کروں گا اور جو پیسے پاکستان آنے میں ضائع کرنے ہیں انہی پیسوں سے میں انہیں ہنی مون پر کہیں باہر بھیج دوں گا۔ ان کی مرضی و منشا کے مطابق۔ نشال میرے لیے میری بیٹی جیسی ہے۔ آپ کو اس کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت بالکل بھی نہیں ہے۔ احمد نواب کے لہجے میں قطعیت کے ساتھ تھوڑی سی ناگواری بھی تھی جو ان کی خفگی کو ظاہر کر رہی تھی۔

”وہ سب تو ٹھیک ہے احمد نواب! مگر اپنی بچی کے حوالے سے میری بھی کچھ خواہشات ہیں اور کچھ ارمان۔ پھر اس کے والدین و بہن بھائی زندہ ہوتے تو اور بات تھی۔ اب مجھ پر دہری ذمہ داری ہے تم سمجھ کیوں نہیں رہے؟“ وہ جھنجھلا رہی تھیں۔

”لی جان! آپ کو خوف کس بات کا ہے۔ آپ کو نشال کی بہترین زندگی کا سوچنا چاہیے۔ جب وہ صاحب کے ساتھ خوش ہوگی تو آپ ساری فکریں بھول جائیں گی! آپ بس بچوں کی خوشی کا سوچیں۔“

”پھر تم ہی آجاؤ یہاں نشی تو بھی اسلی بازار تک نہیں گئی میں اسے اتنی دور لندن کیسے بھیج دوں؟“ ان کے لہجے کی پسپائی محسوس کر کے احمد نواب مسکرائے۔ ”لی جان! میں ضرور حاضر ہو جاتا اپنی بیٹی کو لینے کے لیے مگر آج کل میں یورپ کے دورے پر ہوں کچھ بزنس ڈیلز کرنی ہیں۔ آپ بے فکر ہو کر نشال کا پاسپورٹ بنوائیں اس کا ویزا میں خود لگوا دوں گا اور بے فکر رہیں ہم نشال کا خیال بہت اچھے سے رکھیں گے۔“

تسلی دلا سے دیتے انہوں نے فون رکھ دیا تھا۔ لی جان کو مانتے ہی بنی کہ اس کے سوا اب چارہ بھی کوئی نہیں تھا ویسے بھی نشال اسے بھی کم عمر لڑکیاں پڑھائی کی غرض سے بیرون ملک جایا کرتی ہیں۔ نشال تو پھر پچیس برس کی تھی۔ عاقل و بالغ وقت بر شادی ہو جاتی تو آج کم سے کم دو بچوں کی ماں ہوتی، لیکن صاحب احمد

کی پڑھائی ہی مکمل نہیں ہو پارہی تھی پڑھائی کے دوران وہ ایسے کسی بھی جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ احمد نواب کو انہوں نے نشال کی فلائٹ کاؤن اور تاریخ بتا کر صاحب احمد کو اسے ریسیو کر لینے کا کہا تھا۔

لی جان کل شام سے فون کے قریب بیٹھی تھیں کہ نشال ساتھ خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دے گی وہ اس کی خوش گوار زندگی کے لیے رات بھر دعا کر رہی تھیں۔ نشال تو ویسے بھی بہت سیدھی سادی اور کم گو سی لڑکی تھی۔ جس کا خمیر ہی نرم مہیاں منی سے گوندھا گیا تھا۔ ضد جھگڑا، خزا اس کی خصلت نہیں تھی۔ کچھ وہ اپنی تربیت سے بھی مطمئن تھیں۔ پھر احمد نواب نے جو خاکہ صاحب احمد کا ان کے سامنے پیش کیا تھا وہ بحیثیت انسان بہترین تھا۔

انہوں نے احمد نواب کے دیے گئے نمبر سے لندن صاحب احمد کے گھر فون کیا مگر کسی نے بھی کل ریسیو نہیں کی۔ احمد نواب یورپی دورے پر تھے اور وہ خود ہی فون کیا کرتے تھے ان کا نمبر لی جان کے پاس محفوظ نہیں تھا۔

”شاید وہ لوگ ابھی تک سو رہے ہوں یا پھر ڈومے پھرنے لگے ہوں اپنی خوشی میں نشی کو مجھے فون کرنا نہ یاد ہو۔ خیر کوئی بات نہیں، فرصت ملی تو ضرور سن کال کر لے گی، جیسی لوگوں کے درمیان جھجک رہی ہوگی۔“

وہ خود کو تسلیاں دیتی اب اس کی خیریت و سلامتی اور اس کی دائمی خوشیوں کے لیے دعا کرنے لگی تھیں مگر دل کے نہاں خانوں میں کہیں ایک آواز اور بھی تھی۔

”میری نشی ایسی لا پرواہ تو ہرگز نہیں تھی۔“



وہ سو کر اٹھی تو اس نے خود اجنبی مگر آرام دہ کمرے میں مقیم پایا تھا۔ گزشتہ رات اور صاحب احمد کا کیا گیا سلوک ذہن کے پردے پر نمودار ہوا تو ایک کڑواہٹ سی اس نے اپنے پورے وجود میں پھیلتی محسوس کی

تھی۔

”بی اماں۔۔۔ آپ نواب انکل اور ان کے بیٹے کو پہچاننے میں غلطی کر گئی ہیں۔“ اس نے سوچا تھا ان کے روبرو تو وہ اس حقیقت کو آشکار نہیں کر سکتی تھی۔ اسے تو سوچ سوچ کے خفقان ہو رہا تھا کہ وہ کیسے بی اماں کو اپنے ساتھ ہوئے ناروا سلوک کی بابت بتا پائے گی اور کیا وہ سہ پائیں گی؟ یہ بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔

بہت دیر خود پر ماتم کرنے کے بعد وہ اٹھی اس نے ہاتھ منہ دھو کر گرم سوٹ نکال کر پہنا اور انتظار کرنے لگی۔ اسے اس مہین لڑکی کا شکریہ ادا کرنا تھا جو اسے رات کو اپنے گھر لے آئی تھی۔ اگر وہ اس کڑے وقت میں اس کا ساتھ نہ دیتی تو نشال بھلا کہاں جاتی؟ جس کے لیے اتنی دور آئی تھی اس نے تو اس سے انسانیت کے ناتے بھی سلوک روا نہ رکھا تھا۔ اس کی عزت نفس اور خودی پر بڑا کڑا تازیانہ پڑا تھا جو اس کی رگ و جاں کو کسی تیز دھار برچھی کی مانند چیر رہا تھا۔ ان ہی سوچوں میں غلط وہ آئندہ کالا کچھ عمل ترتیب دے رہی تھی کہ اس کے کمرے کا دروازہ بجا۔ وہ دوپٹا پھیلاتی دروازہ کھولنے پر بھی اور ساکت رہ گئی۔ سامنے موجود ہستی نے اس کی ذات کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ وہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ جس شخصیت کو وہ فلموں میں دیکھتی تھی وہ مجسم اس کے سامنے کھڑا مسکرائے گا۔

”نواد خان“ لالی وڈ کا مشہور ہیرو اس کے سامنے کھڑا تھا وہ جتنا حیران ہوتی کم تھا اور اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا اسے جو بھی دیکھتا یونہی حیران ہوتا تھا۔ لوگوں کا جھکٹا آن واحد میں جمع ہو جایا کرتا، وہی لہجہ، انداز بیاں اور وہ چہرہ اور جسامت، وہ ہو ہوا نواد خان کی کاپی تھا۔ ہاں بہت سارے لوگوں کی طرح نشال کو یہ خبر نہیں تھی کہ وہ جان بوجھ کے نواد خان کی کاپی کرتا تھا۔

”ایکسکیموزی۔“ وہ دل ہی دل میں اس کی حیرت کو انجوائے کرتا اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجاتا اسے حال میں لوٹنے کو کہہ رہا تھا نشال فوراً چوکی۔

”آپ یہاں؟“ نشال نے اسے دیکھ کے تھوک

لگلا، حالانکہ یہ سوال باصد کو نشال سے کرنا چاہیے تھا مگر وہ اسے دیکھ کے کندھے اچکاتے بولا۔

”رباح۔۔۔ میری پھوپھی زاد ہے بہت بڑی ڈراماٹو لوجسٹ ہے۔ اور کرن میں جب بھی میں شوٹنگ کرنے آؤں تو اس کے گھر چند دن ضرور ٹھہرتا ہوں۔“ وہ اسے اپنی ریلی رٹائی کہانی سنارہا تھا۔

”رباح جیسے آپ کا خیال رکھنے کو کہہ کے گئی تھی۔ اپنی دے آمیں آپ کو اپنے ہاتھوں سے ناشتا بنا کر کھلاتا ہوں۔“ وہ اسے حق دیتی چھوڑے کچن کی طرف بڑھا تھا نشال اپنا کھانا منہ خود پر چار حرف بھیج کے بند کرتے اس کے پیچھے آئی۔ اتنا بڑا اشار اور خرقہ نام کو نہیں۔ وہ حیرانی سے سوچتی کچن میں چلی آئی تھی وہ بڑے انصاف سے اس کے لیے کافی بنا رہا تھا۔

”بھلا کوئی میری بات کا یقین کرے گا کہ سیف خان نے میرے لیے ناشتا خود اپنے ہاتھوں سے بنایا۔“ وہ اسے مگن انداز میں کافی پھینکتے دیکھ کے متاثر ہو رہی تھی۔ دوسری جانب باصد کمال اس کی حالت سے محفوظ ہوتے اداکاروں والا رویہ اپنائے بے نیاز نظر آ رہا تھا۔

”لیجیے۔ کیا یاد کریں گی کہ میں نے آپ کو مزے دار ناشتا کروایا تھا۔“ وہ اپنے سلی بالوں میں انگلیاں چلاتے بے نیازی سے کہہ رہا تھا۔ نشال کو اس کا یہ انداز اس کے خشکی کے مشہور اشتہار کی یاد دلا گیا۔

”میں یہ صبح کبھی نہیں بھولوں گی۔“ حیرت زدہ بس یہی کہہ پائی تھی۔

”تم ناشتا انجوائے کرو میں ذرا یوگا کر لوں۔ یوگا کا وقت ہو گیا ہے؟“ وہ اس کے سامنے سینکھے ہوئے توس مارجرین اور کافی کا گم رکھے بے نیازی سے کہتے ایک سرسبز میٹ اٹھائے باہر نکل گیا تھا۔

نشال نے زندگی میں کبھی ایسا ناشتا نہیں کیا تھا اور کافی تو اسے زہر سے زیادہ کڑوی لگتی تھی مگر اس روز اس ناشتے نے اسے جتنا لطف دیا تھا وہ شاید وہ کبھی بھی نہیں لے پائی تھی۔ ناشتا ختم کر کے اس نے کھڑکی سے جھانکا، وہ یوگا آسن جمائے آنکھیں موندے گیان میں

حلق میں گھٹ گئے، آنکھیں لبالب پانی سے بھر گئیں۔ باصد کمال نے اکتا کر اسے دیکھا۔ اس نے کبھی کسی لڑکی کو اتنا روتے اور وہ بھی چھوٹی چھوٹی بات روتے نہیں دیکھا تھا۔

وہ کارڈ لیس اس کے ہاتھ میں تھماتا بے نیازی سے کہتا اندر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا نشتال چند لمحے اس کی باتوں پر غور کرتی رہی۔

اگلے چند منٹوں میں وہ پاکستان بی ایس کو کال ملائے انہیں اپنی خیریت کی اطلاع دے رہی تھی بی ایس کے اندر جیسے زندگی کی سی لہروڑ گئی تھی وہ ایک دم پرسکون ہو گئی تھیں۔

”صحاب کیا ہے اس کا رویہ تمہارے ساتھ کیا ہے نشتی؟“ وہ دل دماغ میں پھل پھلتے وسوسوں کے پیش نظر اس سے پوچھ رہی تھیں۔ نشتال کے حلق میں نمکین پانی جمع ہونے لگا۔ ”وہ بہت اچھے ہیں بی ایس۔ اتنے اچھے کہ میں خود حیران ہوں کیا کوئی اتنا اچھا بھی ہو سکتا ہے اور وہ میرا بہت خیال رکھ رہے ہیں۔“

گزشتہ رات کی ذلت و بے ثباتی یاد کرتے وہ روتی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے بھرم رکھ رہی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا جھوٹ تھا جو وہ بی ایس سے بول رہی تھی مگر آخری نہیں۔



”سنئے مس۔“ تھوڑی ہی دیر میں وہ پھر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ نشتال کو اتنے بڑے اشار کا خود کو دیا جانے والا التفات تحیر میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ یکدم سیدھی ہو بیٹھی۔

”مجھے ایک حقیقت بتانی ہے آپ کو۔“

”کیسی حقیقت؟“ نشتال کا چہرہ لمحہ بھر میں فق ہو گیا۔

”یہی کہ میں فواد خان نہیں بلکہ اس کا ہم شکل ہوں۔“ وہ سر جھکائے شرمندہ سا بول رہا تھا۔ ”اور پلیرز تم یہ مت سمجھنا کہ میرے چہرے سے صرف تم ہی دھوکا کھا گئی ہو، ایسا تو بہت بار ہوا ہے یہاں۔ کسی بھی شاپنگ مال یا کسی بھی ہوٹل یا پکنک پوائنٹ پر۔“

فون کی مسلسل ہوتی گھنٹی بھی اس کے گیان میں خلل نہیں ڈال پائی تھی وہ آدھے گھنٹے سے سانس روکے آسن جمائے ہوئے بیٹھا تھا۔

فون تو اترے بچ رہا تھا نشتال نے فون نہیں اٹھایا، ظاہری بات تھی وہ اس گھر میں اجنبی تھی اور دوسری جانب جانے کون ہوتا وہ کون سا کسی کو جانتی تھی۔ وہ صوفے پر پاؤں پسار کے بیٹھی تھی بی ایس کے لیے پریشان ہو رہی ہوں گی۔ مگر وہ ان سے کیا کہتی۔ اپنی خیریت کی اطلاع دیتی یا سچ بتاتی اور سچ بھی ایسا گھناؤنا اور جان لیوا کیا اس کی بوڑھی بیمار دادی سن کے برداشت کر سکتی تھی۔ یقیناً نہیں۔

نشتال کی آنکھ سے آنسو موتیوں کی مانند گرنے لگے۔ اندر آتے باصد کمال نے اس کی بکھری بکھری حالت کو افسوس سے دیکھا۔

”ہیلو میڈم! فون بچ رہا ہے کیا سنائی نہیں دے رہا؟“ نشتال چونک کے سیدھی ہوئی وہ اس کے سامنے کھڑا نظر آ کر کہہ رہا تھا۔ فون سننے کے بعد باصد نے اس کی طرف جا چلتی نگاہوں سے دیکھا تھا اتنے بڑے اداکار کی خود پر جمی نگاہیں نشتال کو مضطرب کر رہی تھیں۔

”مگر تم اپنا تھوڑا سا وزن کم کرو تو تمہیں فلم انڈسٹری میں کام مل سکتا ہے؟“ وہ کسی ماہر ڈائریکٹر کی طرح آنکھوں میں کیمروفٹ کے اس کو جا بچ رہا تھا۔

”جی۔ جی! نشتال ہکا کر رہ گئی۔

”نیوے۔“ تم پاکستان کال کر کے اگر کسی کو اپنی خیریت کے ساتھ کچھ جاننے کی اطلاع دینا چاہتی ہو تو دے دو۔ یہ رباح کا میسج ہے تمہارے لیے۔“

اگلے ہی لمحے وہ بے نیاز بنا اس سے مطلب کی بات کر رہا تھا۔

”خیریت کی اطلاع۔“ نشتال نے دکھ سے دہرایا۔ ”میں کیا کہوں گی بی ایس سے؟“ الفاظ اس کے

”اچھا۔ حیرت ہے؟“ رباح مسکراتی واپس پلٹ گئی۔



”میں یہ سب نہیں کر سکتا۔ ہرگز نہیں۔“ باصد تو سنتے ہی ہتھ سے اکھڑ گیا تھا۔ نشال نے اسے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ رباح نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھانا چاہا۔ مگر وہ اکڑ کر کھڑا ہی رہا۔

”تمہیں ایکٹنگ کرنے کا اتنا اچھا موقع مل رہا ہے اور تم ہو کہ نخرے کر رہے ہو۔“ رباح نے اپنی مسکراہٹ چھپائے بظاہر ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا۔

”مجھے بالکل بھی نہیں چاہیے ایسا اچھا اور نادر موقع مجھے تو بخشو پلیز۔“ اس نے ترخ کر کہا۔

”باصد کمال! تم بھول رہے ہو کہ تم نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا؟“ رباح نے اسے یاد دلایا۔

”مگر میں اس کا شوہر ہونے کا ٹانگ کیسے کر سکتا ہوں۔“ وہ جھنجھلا ہی تو گیا تھا۔ ”افواہ یار! تمہیں کرنا کیا ہے مسئلہ صرف بی اماں کو مطمئن کرنے کا ہے۔“

”کیا مطلب۔۔۔ تم کیا کرنا چاہ رہی ہو؟“ وہ یک دم چونکا۔

”ہم صحاب احمد کو مجبور کر دیں گے کہ وہ خود نشال کو اپنانے پر مجبور ہو جائے گا۔“ رباح نے دھماکا کیا تھا۔

”وہ کیسے؟“ باصد نے طنز کیا تھا۔

”بہت آسان ہے سب۔ بس تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہے۔ نشال کی شخصیت کو ہم بالکل ایسے بدل دیں گے جیسے لندن کی ماڈ اسکوڈ لڑکی ہوتی ہے، پھر صحاب احمد کے پاس کوئی جواز ہی نہیں رہے گا نشال کو مسترد کرنے کا۔“ رباح نے اپنے تئیں بہترین آئیڈیا پیش کیا تھا۔

”پھر تو جیسے وہ پاگل ہی ہو جائے گا نا؟“ باصد نے طنز کیا۔ نشال کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

”بالکل ہو گا پاگل۔ نشال تم ہمارے لیے اچھی سی چائے بناؤ، ہم تب تک تمہارے لیے ڈائٹ چارٹ

میرے ارد گرد لوگوں کا جھگڑا لگ جاتا ہے لوگ مجھ سے آؤ گراف مانگتے ہیں اور میں اکثر انہیں دیتا ہوں اور میں ایسے فیک اشارڈم کو بہت انجوائے کرتا ہوں۔“ آخری جملے میں اس کے لہجے میں شرارت کھل گئی تھی، نشال بس اسے دیکھ کے رہ گئی۔

”آپ کو کیا ملا مجھے بے وقوف بنا کر؟“ وہ بے حد سنجیدگی سے استفسار کر رہی تھی۔

”مجھے مزا آتا ہے لوگوں کو بے وقوف بننا دیکھ کے؟“ وہ بھی جواباً اسی کے سے انداز میں بول رہا تھا۔

”کیا کسی کو دھوکے میں رکھ کر جی خوشی حاصل کی جاسکتی ہے؟“ نشال نے چونک کر تھوڑا سا جھپٹے ہوئے لہجے میں سوال کیا تھا۔ جواباً اس نے یوں کندھے اچکائے گویا کہہ رہا ہو مجھے تو آتا ہے مزا۔

دوسروں کی خبر نہیں۔ نشال خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی۔ جہاں لوگ دھوکا دے کر خوشی محسوس کرتے تھے۔

”آکر کھانا کھا لو نشال۔۔۔؟“ وہ اپنے کمرے میں گم صدم بیٹھی تھی جب رباح نے اسے آکر بلایا تھا۔

”آپ۔۔۔ کس وقت آئیں میم!“ وہ اسے دیکھ کے فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھی رباح اسے دیکھ کے ہولے سے مسکرائی۔

”میرا نام رباح ہے، تم بھی یہی کہو۔ اب جلدی سے آ جاؤ یا ہر۔۔۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ اپنے بے حد سیاہ ریشمی بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتے بہت اپنائیت سے بولی تھی۔ نشال نے اس کے خوب صورت بالوں اور چمکتی جلد کو رشک سے دیکھا۔

سلکی بال تو اس کی کمزوری تھے۔

”آپ کے بال کتنے خوب صورت ہیں رباح!“

نشال نے ساختہ تعریف کر گئی تھی۔ وہ ایک بہت پرکشش شخصیت کی حامل لڑکی تھی۔

”تھینکس۔۔۔ ویسے باصد نے تمہیں تنگ تو نہیں کیا؟“ اچانک یاد آنے پر اس سے پوچھا تو نشال کو صبح والا واقعہ یاد آگیا اس نے بے ساختہ سر کو نفی میں جھپٹ دی۔

پلان کرتے ہیں۔ "نشال کچھ کہے بغیر اٹھ گئی تھی۔
 "اور اگر میں پاگل ہو گیا تو؟" وہ اس کی آنکھوں میں
 معنی خیزی سے جھانکتے مسکرایا۔

"اس کا چانس نہیں ہے۔ کیونکہ تم آل ریڈی
 پاگل ہو۔ اور میں تمہیں پچھلے دس سال سے جھیل
 رہی ہوں۔" باصد کمال نے برا سامنہ بنایا۔ "تم کبھی
 سچ نہ بولنا۔" وہ تب اٹھا تھا۔

"کام کی بات گریں پہلے۔ بعد میں لڑ بھی لیں
 گے۔" رباح نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید مظلومیت
 جھاڑنے سے روکا۔ ان کی نوک جھونک سے محفوظ
 ہوتے نشال تین کپ چائے بنا کے لے آئی تھی۔

"آؤ نشال۔۔۔ کل سے تم ایک گھنٹہ روز یوگا کیا
 کرو گی۔ اور تمہاری اسکن اور بالوں کی ٹریٹ منٹ
 بھی کل سے ہی شروع ہو جائے گی۔ کوئی فیکیشن کیا
 ہے تمہاری؟"

"لی ایس سی آئرن۔" نشال نے آہستگی سے بتایا۔
 "رباح۔ میں یہ سب نہیں کر سکتی۔ میں واپس
 جانا چاہتی ہوں، آپ پلیز مجھے واپس بھجوانے کا
 بندوبست کر دیں۔" نشال آنکھی، مگر ہمت کر کے بول
 گئی۔

"تم حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے فرار کی راہ
 تلاش کر رہی ہو؟" رباح کے لہجے میں حیرت سے زیادہ
 صدمہ تھا۔

"جی۔ محترمہ رباح صدیقی تمہیں کچھ زیادہ ہی
 ہمدردی کے بخار چڑھ رہے ہیں۔" باصد کمال کا طنزیہ
 لہجہ اس کے چہرے کو بھی دھنکاتا تھا۔

"باصد۔ میں نشال سے بات کر رہی ہوں، مجھے
 اس سے بات کرنے دو پلیز۔" رباح نے سنجیدگی سے
 اسے ٹوکا تھا، جواباً وہ غصے سے واک آؤٹ ہی کر گیا۔

"نشال۔ میری طرف دیکھو اور بتاؤ مسئلہ کیا ہے۔
 کیا تم اس بے عزتی و ذلت کا بدلہ نہیں لینا چاہتیں جو
 صاحب احمد نے تمہارے ساتھ کیا ہے یا تم وہ سب
 بھول گئی ہو؟" وہ اس کے صاف و شفاف چہرے کی
 طرف اپنی سیاہ گھنی پٹکوں والی آنکھیں جھماکے پوچھ

رہی تھی۔
 "میں کچھ نہیں بھولی رباح۔ نہ ہی کبھی اس بات
 کو بھول سکوں گی۔" وہ جیسے تڑپ اٹھی تھی۔

"تو پھر فرار کی راہ کیوں چن رہی ہو۔ تمہیں تو اپنے
 جیسی ان تمام مجبور و بے کس لڑکیوں کے لیے رول
 ماڈل بننا چاہیے۔ تمہارا آج کا اٹھایا ایک قدم۔ بعد
 میں کتنی زندگیاں تباہ ہونے سے بچا سکتا ہے، اس
 بارے میں انکار سے پہلے سوچا تم نے۔" وہ آہستگی
 سے اسے سمجھا رہی تھی۔ نشال کی آنکھیں حد درجہ
 اپنائیت اور خلوص پر بھیگی سی گئیں۔

"میں آپ کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی اپنے
 حوالے سے۔ میں اپنے نصیب پر شاکر ہوں، جو کچھ
 میرے ساتھ ہوا، یہ تقدیر نے ایسا ہی رقم کیا تھا میرے
 لیے۔" وہ ضبط کرنے کے باوجود بھی رو پڑی۔

"ایسی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو زندگی میں کچھ کر
 نہیں سکتے، اسی لیے وہ تقدیر کو دوش دے کر خود بری
 الذمہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں، کیا تم بھی ان نا اہل
 اور نکتے لوگوں کی لسٹ میں شامل ہونا چاہتی ہو۔" وہ
 اس پر نگاہیں گاڑے بظاہر بہت نرمی اور سنجیدگی سے
 کہہ رہی تھی۔

"مگر اس سب کا نتیجہ کیا نکلے گا رباح۔ جس شخص
 نے مجھے گھر کے دروازے سے اندر نہیں آنے دیا، وہ
 کل کلاں کو کیا میری گروڈ پر سٹالٹی سے متاثر ہو کے
 مجھے اپنالے گا؟" رباح صدیقی کو اس کے لہجے میں
 عزت نفس کی ٹوٹی کرچیاں واضح محسوس ہوئیں۔ وہ اپنا
 غم چھپائے بظاہر نارمل نظر آنے کی کوشش میں تھی۔
 مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ وہ بے حس ہو چکی
 ہے۔

"وہ مجھے کبھی نہیں اپنائے گا رباح۔ جس شخص
 نے انسانیت کے ناتے سخت سردی میں مجھے بے یار و
 مددگار لڑکی سمجھ کر ایک رات اپنے گھر میں پناہ نہیں
 دی۔ اس سے میں کوئی اور امید کیسے رکھوں۔ وہ مجھے
 جلد یا بدیر چھوڑ دے گا رباح۔ اس کا مجھے یقین ہے۔
 پندرہ سال میں کیا ایک بھی دن اس نے مجھ سے

انہیں محسوس نہیں کی ہوگی اور اس بات کو بھی چھوڑ دو کہ ہمارے درمیان کوئی ایسا مضبوط تعلق ہے۔ لیکن میں اس کی کزن تو تھی نا۔ اس نے تو کسی رشتے کا پاس نہیں رکھا۔" وہ زار زار روتے بکھری حالت میں بہت خستہ حال دکھ رہی تھی۔ ریلج صدیقی نے اسے کھل کے رونے دیا۔

"اور محبت۔۔۔ محبت زور زبردستی یا پلاننگ سے نہیں حاصل کی جاتی ریلج۔ یہ ایک آفاقی جذبہ ہے جو اللہ کی مہربانی سے دلوں میں ودیعت ہوتا ہے۔"

"تم باتیں اچھی کر لیتی ہو نشال۔ مگر میں تمہاری باتوں سے متاثر ہونے کے موڈ میں بالکل بھی نہیں ہوں۔ کیونکہ جو میں نے سوچ رکھا ہے تمہارے لیے، میں اس پر ہر حال میں تم سے عمل کرواؤں گی۔ اب شاباش۔ تم جا کر سو جاؤ صبح تمہیں جلدی اٹھنا ہوگا۔ میں ذرا باصد کو دیکھ لوں۔" وہ اٹھ کر بلکے پھلکے لہجے میں اسے ڈپٹی باہر نکل گئی تھی۔ نشال ٹھنڈا سانس لے کے رہ گئی۔ اب ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ کیونکہ ہونا وہی تھا جو ریلج صدیقی نے سوچ لیا تھا۔



"چلیے میڈم۔ ورزش کا بہترین وقت صبح سویرے کا ہوتا ہے اور آپ یہاں پکن میں کسی ہیں۔" صبح سویرے جب نشال اپنے لیے چائے بنانے پکن میں آئی وہ ڈھیلے ڈھالے ٹراؤرز شرٹ میں بڑا فریش فریش سا کھڑا طنز کر رہا تھا۔ نشال ڈر کے پلٹی ہاتھ سے ساس پین چھوٹے چھوٹے بچا۔

"محترمہ۔ اگر زندگی میں کچھ بننا ہے تو ڈرنا چھوڑیں اور اگر اسماٹ ہونا چاہتی ہیں تو کھانا۔" وہ اس کے ہاتھ سے ساس پین لیتے ساتھ میں اپنا لیکچر بھی جھاڑ رہا تھا۔ نشال کو رونا آنے لگا وہ تو نہار منہ چائے پینے کی عادی تھی۔ نہ پیتی تو دن بھر سرور کی وجہ سے بھاری بھاری روتا طبیعت بندھال اور گری گری الگ رہتی۔

"مگر مجھے عادت ہے صبح سویرے چائے پینے کی۔"

وہ اس کے خوف ناک تیور دیکھ کے منمنائی۔

"اُنی عادات بدل ڈالنے محترمہ یہ لندن ہے اور یہاں کے لوگ چائے کے بجائے کافی پیتے ہیں۔ مگر آپ کو فی الحال وہ بھی نہیں ملے گی، کیونکہ پہلے آپ کو ایکسرسائز کرنا ہوگی۔"

"مگر میں نے زندگی میں کبھی کوئی ایکسرسائز نہیں کی۔" اسے کیا خبر تھی رات کو صفحہ چٹ جواب دینے والا صبح سویرے اس کے سر پر مسلط ہوگا۔

"خیر۔۔۔ وہ تو نظر آ ہی رہا ہے۔" باصد کمال نے اس کے فربہ مائل سراپے کو طنز سے دیکھتے کہا۔ نشال خود میں سمٹ کے رہ گئی۔

"اگر موٹاپے کا یہی حال رہا نا تو یاد رکھیے گا کہ آئندہ دس سال میں آپ بستر پہ ہوں گی، چلنے پھرنے سے بے زار۔" وہ اس کے موٹاپے پہ چوٹ کرتا اس کے مستقبل کا خوف ناک نقشہ کھینچ رہا تھا ایک لمحے کو تو نشال خود بھی دہل گئی۔

"محترمہ۔ میں کوئی فاسرغ بندہ نہیں ہوں، جلدی کیجیے مجھے جاب پر بھی جانا ہے۔" وہ اسے سوچوں میں غلطایا دیکھ کے پھر طنز کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

نشال بغیر کچھ کہے اس کے پیچھے لان میں چلی آئی تھی۔ سخت سرو پر فلی ہوا درختوں کے زرد پتوں کو اڑائے پھر رہی تھی۔ نشال کے بدن میں کپکپی طاری ہو گئی۔

"یہاں تو بہت ٹھنڈ ہے۔" نشال نے کپکپاتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"یہاں ہر روز یہی موسم ہوتا ہے اور یہاں کے لوگ اسی موسم میں کام کرتے ہیں اور آپ سے معمولی سی ورزش نہیں ہوتی اس ٹھنڈ میں۔؟" آف اس کے طنز نشال تو کسی مصیبت میں پھنس گئی تھی۔

"اپنا سانس اندر کھینچنے ساتھ ہی پیٹ بھی۔" وہ زمین پر چوکڑی مارے دونوں پیروں کو مہارت سے دائیں بائیں ٹانگ پر ٹانگ ٹکائے اسے پہلا بنیادی یوگا آسن سکھا رہا تھا۔

"اسے ہم پاور یوگا کہتے ہیں۔ جتنی دیر سانس روکے

دی تھی، ساتھ ہی ساتھ اسے انگلش کلاسز میں ایڈمیشن بھی دلا دیا تھا اور اس کے اسٹوڈنٹس ویزے کے لیے اپلائی بھی کر رکھا تھا۔

”بس میں چاہتی ہوں جب تم صاحب احمد کے سامنے جاؤ تو وہ تمہیں دیکھ کے اپنے ہوش ہی کھو دے۔“ رباح اکثر ہی اس سے کہتی رہتی۔

”تو پھر اسے بے ہوش کرنے کے لیے اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے، اس کے بال کھلوا کے اسے رات کے اندھیرے میں اس کے سامنے کر دو، وہ بے چارہ آپ ہی آپ بے ہوش ہو جائے گا۔“ باصد کمال کی زبان کی کھجلی اسے طنز کرنے سے باز نہ رکھ پاتی تھی۔

”شٹ اپ باصد۔“ رباح، نشال کی آنکھوں میں جج ہوتی نمی دیکھ کے اسے ٹوک دیتی۔

بی اماں بہت خوش تھیں، کیونکہ نشال نے انہیں حد سے زیادہ اپنے حوالے سے مطمئن کر رکھا تھا۔ کبھی کبھار باصد کمال بھی بی اماں کی خیریت پوچھ لیا کرتا، بی اماں اسے صاحب احمد سمجھ کر نشال کا ڈھیر سارا خیال رکھنے کی تاکید کرتے نہال سی ہو جاتیں۔ ان کی نشال کا مقدر ان کے رب نے سنہری روشنائی سے تحریر کیا تھا جو اسے اتنی محبت کرنے والا جیون سا بھی ملا تھا۔

اگر وہ اس کا برملا اظہار نشال سے کرتیں تو وہ بھیگی آنکھوں سے بمشکل ان کی تائید کرتی۔ مگر اس کے اندر سسکیاں دم توڑنے لگتیں، وہ خود ٹوٹنے لگتی۔

اس روز شام میں نشال نے چکن پلاؤ پکایا تھا، بالکل پاکستانی اسٹائل سے۔ جس طرح بی اماں پکایا کرتی تھیں، ساتھ میں راستہ اور کچومر بھی تھا۔ رباح صدیقی نے اسے لگن و محنت سے کام کرتے دیکھا تو مسکرا دی۔ وہ جب سے وہاں آئی تھی کچن کا سارا کام اپنے ذمے لے لیا تھا اس نے۔ وہ بہت اچھا کھانا پکاتی تھی اور یوں ان دونوں کو جو شروع سے ہی لندن میں ملے بڑھے تھے اور جنک فوڈ کھانے کے عادی تھے، ان کو بھی مزے دار پاکستانی کھانا کھانے کو مل جایا کرتا تھا۔

”اف کتنی مزے کی خوشبو آرہی ہے نشال۔“

رکھیں گی اتنا ہی آپ کے دل پاؤں میں اضافہ ہو گا۔ جتنے بھی گائیک ہیں وہ گلوکاری کے میدان میں اسی وجہ سے ابھی تک قائم و دائم ہیں، کیونکہ ان کی سانس عمر کے ساتھ صرف باقاعدگی سے یوگا کرنے کی وجہ سے نہیں پھولتی۔“ وہ آنکھیں بند کر کے ریٹیکل کر کے اسے سمجھا رہا تھا۔ نشال کو تو تین سیکنڈ کے بعد ہی سانس چھوڑنا پڑا۔ اس سے تو ایک منٹ بھی پورا نہیں ہو پایا تھا اور ایک منٹ میں ساتھ سیکنڈ ہونے ہیں اور ساتھ سیکنڈ میں سانس روک کر بیٹھنا قطعاً آسان نہیں تھا۔

”یہ تو بہت مشکل ہے، یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔“ اگلے ہی لمحے وہ انکاری تھی۔ باصد کمال کو اس پر بری طرح سے ناؤ آیا، مگر غصے سے بس وہ لب بھیج کر رہ گیا۔

”کبھی مادھوری ڈکٹ کو دیکھا ہے تم نے۔“ اگلے ہی لمحے وہ نہایت دوستانہ انداز میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ اس کو کون نہیں جانتا، میری تو فیورٹ ہے، آج بھی کیا کمال کی حسین اور جوان نظر آتی ہے۔“ نشال روانی سے اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئی۔

”اس وقت وہ سینتالیس سال کی ہے اور میں دعوے کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ وہ تم سے چھوٹی دکھتی ہیں عمر میں۔“ اس قدر مبالغہ آرائی پر نشال کا دماغ بھگ سے اڑ گیا، اس نے پٹ سے آنکھیں پھاڑ کے باصد کمال کو دیکھا۔

”اور تم یقین کرو گی اپنی ڈاکٹر رباح صدیقی۔ محترمہ اکتالیسویں سال میں قدم رکھ چکی ہیں، مگر پر اپریو گا کی وجہ سے دیکھو کتنی جوان نظر آتی ہیں۔“ وہ اسے یوگا سکھنے پر آمادہ کرنے کو مبالغے سے کام لے رہا تھا اور اس بات کا خاطر خواہ فائدہ آنے والے دنوں میں خوب ہوا تھا۔ نشال اس کے احکامات پر عمل کر رہی تھی۔ وہ بہت لگن اور توجہ سے خود پر توجہ دے رہی تھی۔ ایک ماہ کے اندر ہی اس میں بہت فرق آیا تھا۔ رباح نے اس کے بال سیدھے کروا کے کٹنگ کروا

کرتی تھی۔

”یہ بہت غلط کانسمپٹ ہے کہ ایک دن سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ایک نوالے سے بھی فرق پڑ سکتا ہے اور میں صاف کہہ دیتا ہوں کہ نشال چاولوں کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گی، یہ وہی کھانا کھائے گی جو اس کی ڈائٹ چارٹ مینیو میں درج ہے۔“ وہ قطعیت سے اکتامزید کچھ اور سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

نشال کی ساری بھوک ہی مر گئی۔ ابلا ہوا مرغی کا ٹکڑا اور سوپ کے پیالے کا سن کر۔ اس نے آج کتنے چاؤ سے پلاؤ بنایا تھا۔ سوچا تھا جی بھر کے کھائے گی، لیکن بھلا ہو باصد کمال کا۔ اس سے پہلے کہ رباح کچھ کہتی نشال نے بات ہی ختم کر دی تھی۔

”اٹس اوکے رباح۔ میں وہی کھانا کھا لوں گی۔ آپ لوگ پلیز شروع کریں۔“ بھیکے لہجے میں نہایت افسردگی سے اس نے ان دونوں کو کھانا شروع کرنے کو کہا تھا۔

”تم اتنی جلدی ہار کیوں مان جاتی ہو نشال۔“ چچہ پلیٹ میں بچتے رباح نے برا مناتے ہوئے کہا تھا۔

”جب مقابل کی طاقت اور فینک کا تین ہو تو پھر فائٹ کرنے کا فائدہ۔“ اس کے لہجے میں افسردگی رچ گئی، رباح نے اسے تاسف سے دیکھا۔

”یہ غلط ہے نشال۔ تمہیں کم از کم اپنے حق کے لیے بولنا چاہیے عیوں دوسروں کو خود کو انڈر اسٹیمپٹ کرنے کی اجازت مت دیا کرو۔“ وہ سخت برا مان گئی تھی۔ باصد کمال مزے سے سلاوا کھانے میں مگن تھا۔

”اگر یوں کسی کو اجازت نہیں دوں گی تو کیا کوئی مجھے انڈر اسٹیمپٹ نہیں کرے گا رباح؟“ وہ سر پیا سوال بن گئی۔ لہجہ و انداز میں افسردگی ٹوکھ کی لباس رچ گئی۔

”بالکل بھی نہیں۔“ رباح نے فوری تردید کی۔ نشال مرغی کا ابلا ہوا ٹکڑا اور کارن سوپ مائیکرو ویو سے نکال کر میز پر لے آئی۔ باصد کمال نے اس لمحے رباح کو جتانی ہوئی نظروں سے دیکھا گویا کہہ رہا ہو دیکھ لو آخر میں ہی جیتا۔“

”تمہاری ہار۔ تمام عورتیں کی ہار ہے اور تم جیسی

جلدی لاؤ یا ربا بہت بھوک لگ رہی ہے۔“

”ایک منٹ بس دم آجائے۔ باقی تو سب کچھ ریڈی ہے۔ آپ لوگ نیبل پر آجائیں۔“ نشال نے جلدی جلدی نیبل سیٹ کرتے کہا تھا، وہ جانتی تھی رباح بھوک کی کتنی کچی تھی۔

”باصد۔ کہاں ہو تم۔ اب کمپیوٹر کی جان چھوڑ بھی دو۔“ وہ چڑکے باصد کو آوازیں دینے لگی۔ جو شاید بلاوے کا ہی منتظر تھا۔ فوراً باہر آیا۔

”ارے جان من۔ تم کہو تو دنیا چھوڑ دوں، یہ کمپیوٹر کیا چیز ہے۔“ وہ والہانہ انداز میں رباح پر جھکتے وارفتی سے بول رہا تھا۔ نشال کو اب ان کی بے تکلفی برحیرت نہیں ہوتی تھی۔ شروع شروع میں تو اس کی آنکھیں حیرت سے اکثر پھٹ سی جایا کرتی تھیں، بلا کی بے تکلفی اور دوستانہ تھا دونوں میں۔

نشال نے چاولوں کی ڈش بھر کے ان دونوں کے سامنے رکھی۔ باصد کمال نے سلاوا کی پلیٹ اپنے سامنے رکھی کھانے سے پہلے وہ جی بھر کر سلاوا کھانا تھا۔

”تم بھی آجاؤ نشال!“ رباح نے اپنی پلیٹ میں چاول نکالتے اسے بھی بلایا تھا۔

”کیا مطلب ہے رباح۔ کیا نشال بھی چاول کھائے گی؟“ اچانک باصد کمال نے سلاوا کھاتے رک کر قدرے چونک کے پوچھا تھا۔

”ہاں۔ کیوں جس نے بنایا ہے اسی پر بین لگا رہے ہو؟“ رباح اس کی بات کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ تب ہی تھوڑا رخ ہوئی۔ نشال خاموش تماشائی بنی ان دونوں کی اپنے حوالے سے ہوئی بحث سستی رہی۔

”تم میرے کیے کرائے پر پانی کیوں پھیرنا چاہتی ہو رباح؟“ باصد کمال سنجیدہ ہوا۔ نشال کے پلے خاک بھی نہ پڑا۔

”ایک دن چاول کھالے گی تو کیا فرق پڑے گا باصد۔ اتنی کریش ڈائننگ اس کی صحت کے لیے اچھی نہیں ہے۔“ رباح مکمل بحث کے موڈ میں تھی۔ ویسے بھی باصد کمال کی بات سے اتفاق وہ بہت کم کیا

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار جہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

عورتیں ہی ہوتی ہیں جو عورت کا استحصال کرواتی ہیں، زبردستی مردوں کی باتوں کو اہمیت دے کے۔ ”رباح کو شاید نہیں یقیناً“ بہت غصہ تھا، نشال اسے غصے میں دیکھ کے مسکرائی، اس کی مسکراہٹ بہت بے ساختہ تھی۔

”غصہ تھوک دو رباح! کچھ پانے کے لیے ہمیشہ کچھ نہ کچھ کھوتا تو پڑتا ہے نا اور بی اماں کہتی ہیں کہ عورت کو ہمیشہ اپنا گھر بچانے کے لیے قربانی دینا ہی پڑتی ہے اور ہر عورت ایسا کرتی ہے، میں کوئی انوکھی تو نہیں۔“ نہایت عام سے لہجے میں وہ بہت خاص بات کہہ گئی تھی۔ باصد کمال نے چونک کے نشال کو متاثر کن انداز میں دیکھا۔ بظاہر دلو ڈر پوک اور کمزور نظر آنے والی یہ لڑکی بہت سمجھ دار اور حساس تھی، اس کا اندازہ اسے پہلی بار ہوا تھا۔

”تم باتیں بہت اچھی کرتی ہو نشال۔ مگر ضروری نہیں کہ اسی فلسفہ حیات پر عمل درآمد کیا جائے جو ہماری ماؤں یا ان کی ماؤں نے کیا۔ ہمیں اپنی زندگی کی اس سترنجی کو بدلنا ہو گا۔“ رباح اور آسانی سے متفق ہو جائے دو الگ باتیں تھیں۔

”اس بحث کو اب بند کرو رباح۔ کھانا جلدی ختم کرو، پھر یاہر چلتے ہیں۔ نشال نے اتنا مزے دار کھانا کھلایا ہے تو اس کی ٹریٹ تو جتنی ہی ہے۔“ باصد کمال نے اچانک کہہ کے ان دونوں کو حیران کیا تھا۔

”جلدی کرو نشال۔ آج اس موقع سے فائدہ اٹھا ہی لیں۔ آج جناب باصد کمال صاحب حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے ہی والے ہیں۔“ رباح نے باصد کو چڑایا، وہ بہت سنجوس تھا رباح کے مقابلے میں، جبکہ رباح بہت کھلے دل کی لڑکی تھی۔

”بالکل۔ اپنی شاگردی فرماں برداری کے لیے آج کی ٹریٹ ہوگی۔ اور ٹریٹ بھی ایسی جو میری اسٹوڈنٹ کی صحت پر برا اثر نہ ڈالے، اس لیے مابدولت آپ کو کافی پلائیں گے۔“

”جی نہیں۔ ہمیں نہیں چاہیے ایسی ٹریٹ، کروانی ہے تو پھر شاپنگ کرواؤ، وہ بھی اچھی سی۔“

رباح نے میز بجا کے باقاعدہ احتجاج کیا۔ نشال کا موہا نہیں تھا، مگر وہ اسے پھر بھی لے کر گئے تھے۔ کیونکہ وہ جب سے لندن آئی تھی، گھر سے باہر نکلی ہی نہ تھی۔ اس روز انہوں نے اسے لندن بھیڑ میں شو دکھایا تھا۔ لندن کی ٹھنڈ میں لانگ کوٹ پہنے وہ تینوں ہاتھیوں میں ہاتھ ڈالے چل رہے تھے۔ درمیان میں رباح تھی اور اس کے دائیں بائیں نشال اور باصد۔ ان دونوں کی دوستی ٹکون میں بدل گئی تھی اور اتنی مضبوط تھی کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ کبھی ٹوٹے گی۔ فواد خان کا ہم شکل ہونے کے باعث باصد کو واقعی بہت پروٹوکول مل رہا تھا۔ وہ دونوں اس کی نام نہاد شہرت کو دیکھتے ہنس ہنس کر لوٹ لوٹ ہو رہی تھیں، جہاں وہ لوگ کھڑے تھے وہاں لوگوں کی بہت بھیڑ تھی، نشال نے تو زندگی میں پہلی بار اتنے لوگ دیکھے تھے اور ان ہی لوگوں کی بھیڑ میں نشال نے اسے دیکھا تھا اور۔

وہ سن ہو گئی تھی۔ اس کی مسکراہٹ یک لخت سمٹ گئی تھی۔ آنکھوں میں اس رات اس شخص کا کیا گیا سلوک کرچیوں کی مانند چبھنے لگا تھا۔ اتنے لوگوں کی بھیڑ میں کھڑی نشال عبید اللہ اکبری رہ گئی تھی۔ جی دامان سی، لٹی لٹی سی۔ رباح نے اس کی غیر ہوتی حالت کو دیکھا تو فوراً اس کے پاس آئی۔

”میں نے ابھی اسے دیکھا رباح۔“ وہ پسینہ پسینہ ہوتی بس اتنا ہی بتلائی۔

”تو تمہیں جاگے اس سے ملنا چاہیے تھا نشال۔“ رباح نے کہا تو نشال نے اسے خوف زدہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔ اور نفی میں سر ہلا گئی۔

”میں اس کے سامنے کبھی نہیں جاؤں گی رباح۔“ رباح کی سمجھ سے بالاتر تھا اس کا ڈر، خوف؟

”مگر میں اس کے سامنے گئی تو وہ مجھے طلاق دینے میں لمحہ بھی نہیں لگائے گا، پندرہ سال پرانا تعلق آن واحد میں ٹوٹ جائے گا اور اس تعلق کے ٹوٹنے کے ساتھ ہی بی اماں کی زندگی کا دھاگا بھی۔ وہ اپنی زندگی میں مجھے بے آسرا ہوتا کبھی نہیں دیکھ پائیں گی۔“ رباح لا جواب ہو گئی تھی اور نشال کو لا جواب اس کی

تقدیر نے کر دیا تھا۔

”تو خوش تو ہے نا لشی۔“ بی اماں کے لہجے میں چھپا خوف نشال کے اندر اضطراب جگا گیا۔

”میں بہت خوش ہوں بی اماں۔“ نشال نے اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹا۔

”اچھا۔۔۔ پتا نہیں کیوں مجھے ہی وہم سار مٹا ہے جیسے تو خوش نہیں وہاں میں تو دن رات تیرے لیے دعائیں کرتی ہوں لشی۔ اللہ تمہیں ہمیشہ صحاب احمد کے ساتھ خوش رکھے دو دھول نہاؤ پوتوں پھلو۔“

”آپ کی دعائیں میرا قیمتی سرمایہ ہیں میری طاقت ہیں بی اماں اور آپ بالکل بھی فکر نہ کریں میں بالکل ٹھیک ہوں یہاں۔ اتنا دل لگ گیا ہے میرا یہاں کہ لگتا ہی نہیں کہ اب کبھی واپس پاکستان بھی آؤں گی۔“ بھگی آنکھوں سے مسکراتی وہ لڑکی صحیح معنوں میں باصد کمال کے دل میں اپنے لیے درد جگا گئی اس نے اس لمحے غور سے دیکھا۔

”اللہ کرے کہ تو ہمیشہ اتنی ہی شاد و آباد رہے کہ کبھی واپس آنے کو دل نہ کرے۔ لیکن بیٹا ہمیشہ دھیان رکھا وہاں کا ماحول اور ہے ہمارے ماحول سے آزاد اور کھلا۔ شوہر کو اپنی محبت سے رام کرنا کہ زور زبردستی سے۔ زور زبردستی مرد کو ضد دلاتی ہے اور ضدی عورت مرد کے دل سے جلدی اتر جاتی ہے۔ تو اپنی محبت کے رنگ دھیمے مزاج سے گہرے کرنا۔“ وہ اسے ہمیشہ کی طرح سمجھا رہی تھیں۔

”جی بی اماں۔۔۔“ اور وہ بھگی آنکھیں صاف کرتے بمشکل اقرار کر رہی تھی۔

”اچھا سن! یہ احمد نواب آگیا واپس؟“ انہیں جیسے اچانک یاد آیا تھا۔

”بی اماں تو نہیں بی اماں! وہ وہاں بزنس کرتے ہیں نا اتنی آسانی سے کیسے آسکتے ہیں۔“

”نواہ تو ہو گئے اسے کہتے کہ جلدی واپس آ رہا ہوں کم بخت جب سے تیری رخصتی کی ہے تب سے رابطہ

ہی نہیں کیا اس نے۔ بہت ہی غیر ذمہ دار ہے یہ احمد نواب۔“ بی اماں کو اس کے فون نہ کرنے پر غصہ تھا اور اگر جو انہیں یہ پتا چل جائے کہ اس سے بڑی غیر ذمہ داری ان کا بیٹا کر چکا ہے تو ان پر کیا گزرتی۔ نشال نے سوچ کر جھرجھری سی لی۔

”تیرے ساتھ فون بات تو کرتا ہے نا؟“

”جج۔۔۔ جی بی اماں! فون پر تو تقریباً روز ہی بات ہو جایا کرتی ہے۔“ وہ ہٹکائی۔

”پھر آنے کا کچھ بتایا۔ وہ لندن آئے گا تو تم لوگوں کے ولیمہ کی رسم ہوگی نا۔“ وہ پھر بھی مطمئن نہیں ہوئی تھیں۔ سوالات کا گویا انبار تھا جو ان کو ذہنی طور پر پریشان کر رہا تھا۔

”اب ایسا سوال میں ان سے کس طرح پوچھ سکتی ہوں بی اماں!“ نشال نے آنسو پونچھتے لہجے کو ہموار کرتے بات بتائی۔

”ہاں یہ بھی ہے میری بچی تو ویسے بھی لالچ اور شرم و حیا میں پلی بڑھی ہے تو بھلا کیسے اتنی دیدہ ہوائی ہو سکتی ہے۔“ بی اماں فوراً ہی اس کی تائید کر رہی تھیں۔

”اچھا لشی! ایک کام کرے گی۔ دیکھ نالنا بالکل بھی نہیں۔“ بی اماں نے اچانک ہی لجاجت سے کہنا شروع کیا۔

”کیسا کام بی اماں!“

”مجھے اپنی اور صحاب احمد کی تصویر بھیج دونا۔ میں نے تو تیرے دولہا کو دیکھا تک نہیں۔ اتنی حسرت تھی کہ شادی دھوم دھام سے کروں گی اور جی بھر کر تم دونوں کی نظر اتاروں گی مگر جو اللہ کو منظور۔“ بی اماں کے لہجے میں حسرتیں ٹھکن بننے لگیں وہ ٹھکن نشال نے اپنی رگ و پے میں اترتی محسوس کی بھلا جس شخص کو خود اس نے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی تصویر کہاں سے لاتی۔

”بی اماں۔۔۔ آپ اپنی صحت کا بہت خیال رکھا کریں۔ مجھے آپ کی بہت فکر رہتی ہے ایک تو آپ نے مجھے اتنی دور بیاہ دیا۔ میں آپ کے پاس ہوتی تو کم از کم آپ کا خیال تو رکھ لیتی۔“ نشال نے فوراً ہی بات

اے لھرے اندر ہمیں نے دیا تھا وہ اپنی تصویریں بھلا
کیوں دے گا۔ شام کو ریلح آئی تو سارا معاملہ اس کے
سامنے رکھا گیا۔ چٹکیاں بجاتے ہی حل اس کے پاس
تھا۔ وہ بھاگ کر اندر سے اپنا جدید ڈیجیٹل کیمرہ نکال
لائی۔ ان دونوں کو کاؤچ پر ایک ساتھ بٹھایا بالکل گھریلو
حلیے۔ میں عام سے لباس میں وہ انہیں بتائے بغیر
ان کی تصاویر بنانے لگی تھی۔ جب نشال اور باصد سمجھ
پائے وہ ان کی کتنی ہی تصاویر لے چکی تھی۔
”ڈش اسٹ۔“ ان دونوں کے درمیان بیٹھتے
تصاویر دیکھتے وہ پر جوش تھی۔

”کل ہی اسے ڈیو لپ کروا کے پوسٹ کر دیں
گے۔ انٹرنیٹ تو بی اماں کے پاس ہو گا نہیں، ورنہ پانچ
منٹ میں تصویریں ان کے پاس ہوتیں۔“ وہ مزے
سے تصاویریں آگے پیچھے کرتی بول رہی تھی۔
”تھینک یو سوچ ریلح۔ جو کچھ تم میرے ساتھ
کر رہی ہو اس اچھائی کا بدلہ تمہیں میرا رب دے گا۔
تم سچ میں بہت اچھی ہو۔“ رات اپنے کمرے میں
جانے سے پہلے وہ ریلح سے کہنا نہیں بھولی تھی۔
”جس نے تصویریں کھینچیں اس کا تو شکریہ ادا
کر دیا۔ جس نے شوہر کی بھاری ذمہ داری پوری کی اس
کا تو جھوٹے منہ بھی شکریہ نہیں ادا کر رہی تم۔“ وہ
اچانک درمیان میں بولا تھا۔ نشال کو حسب عادت
شرمندہ کیا اور یہ جاہوہ جا۔ نشال اس کی چوڑی پشت پر
نگاہیں جمائے تاویر کھڑی ہی رہی۔

باصد کی سال گرہ تھی اور ریلح آج جلدی سے
کلینک سے آگئی تھی۔ اور اب اس کے لیے بہت
محنت توجہ اور محبت سے یک تیار کر رہی تھی۔ نشال کو
پیکنگ کرنا نہیں آتی تھی جبکہ ریلح اس میں ماہر
تھی، ریلح پائن اہل یک بنا رہی تھی اور یہ باصد کا
پسندیدہ یک تھا۔ نشال اس کی مدد کو پائن اہل کے
چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھی۔
”کیا تمہیں یقین ہے ریلح۔ کہ باصد ہمیشہ کی

بدل دی تھی۔“ تو میری فکر مت کرنی! میں اب ٹھیک ہوں بلکہ
میں اب ہی تو سکون میں آئی ہوں، تیرا فرض بھاری تھا
وہ اب ادا ہو گیا اب میں سکون سے مر سکوں گی۔“
”بی اماں۔!“ نشال سنائے میں رہ گئی تھی۔

”اچھا بس اب تو پریشان مت ہو جانا۔ میں نے تو
فقط ایک بات کی تھی۔“ اور نشال جانتی تھی یہ محض
ایک بات نہیں تھی۔ وہ کینسر کی مریضہ تھیں۔
فون بند ہوا تو باصد کمال جو بظاہر یوگا میں مصروف
تھا۔ اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا۔

”کیا مسئلہ ہے نشال۔ تم کچھ پریشان نظر آرہی
ہو؟“ وہ جو اپنی سوچوں میں تھی چونک اٹھی۔
”نہیں۔ تو میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے بلاوجہ ہی
صفائی دی جبکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں
ہے، باصد کمال اگلوانی لے گا۔

”تم جتنی ٹھیک ہو۔ نظر آرہا ہے مجھے۔“ اس کا
طنزیہ لہجہ نشال کو نگاہیں جھکانے پر مجبور کر گیا۔ وہ اس پر
نگاہیں جمائے اس کے جواب کا منتظر تھا۔
”بی اماں نے میری اور صحاب احمد کی تصویریں
بھجوانے کی فرمائش کی ہے؟“ نشال نے بالآخر تھک
کے گہرے سانس لے کے بتا دیا تھا۔

”بس اتنی سی بات۔“ باصد کمال نے فریج سے
پانی کی بوتل نکال کر منہ سے لگاتے بات کو چٹکیوں میں
اڑایا۔

”یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔ کم از کم میرے لیے؟“
نشال نہ چاہتے ہوئے بھی جتلا گئی۔ باصد کمال نے
اسے اب کی بار حیرت سے دیکھا۔

”بہر حال۔ یہ کوئی ایسی بھی بات نہیں جسے سر پہ
سوار کر لیا جائے۔“ اس کا انداز ہنوز لا پرواہ تھا۔
”خیر۔ اس کی فوٹوز بھیج دیں گے بی اماں کو۔“
اب بی اماں کی اتنی چھوٹی سی خواہش کو ہم رد تو نہیں
کر سکتے ہیں ناں۔“

”مگر صحاب احمد کی تصویر آئے گی کہاں سے؟“
نشال کو حقیقتاً سمجھ میں نہیں آیا تھا جس شخص نے

طرح آج بھی اپنا برتھ ڈے بھول گئے ہوں گے۔“
نشال نے اسے اس قدر انہماک سے کام کرتے دیکھا تو
پوچھ لیا۔ باصد ابھی تک آفس سے نہیں لوٹا تھا۔ وہ
لندن کی سب سے بڑی ملٹی نیشنل فرم میں اکاؤنٹنٹ
تھا۔ اس کی نوکری شیڈول خاصا مشکل تھا۔

”نہ بھی بھولا تو بھولنے کی شان دار ادکاری کرے
گا۔ تم نہیں جانتیں کیا شے ہے وہ۔“ رباح
کھکھلائی تو نشال بھی مسکرا دی۔

”کیا وہ شروع سے ہی ایسے ہیں۔“ نشال نے دلچسپی
سے پوچھا تھا۔

”دس سال ہو گئے ہمیں ایک ساتھ رہتے۔ اب تو
یاد بھی نہیں کہ یہاں آنے سے پہلے کیا تھا، مگر
ایکٹنگ کا کیرئیر اس میں پیدا کی ہے۔“ رباح کے لہجے و
انداز میں ہمیشہ ہی اس کے لیے بہت محبت ہوا کرتی
تھی۔ رباح صدیقی کا انداز فکر، باصد کا خیال رکھنا،
اسے توجہ دینا، اس کے دل کی بات کو واضح جتلاتا تھا۔
یہی حال باصد کمال کا بھی تھا۔

”ایک دوسرے کو اتنا جاننے کے باوجود بھی ابھی
آپ لوگ سنگل ہیں، کیوں؟“ نشال نے ڈیڑھ دو ماہ
سے دل میں کلبلا تا سوال بالآخر آج پوچھ ہی لیا۔

”میرا بس چلے تو ایک دن کی بھی دیر نہ کروں، مگر
باسد کو ابھی کچھ وقت چاہیے خود کو اسٹیبل کرنے کے
لیے۔“ رباح نے بے فکری سے کہتے کندھے
اچکائے۔

”اور یہ واحد ایسا کام ہے جس میں۔۔۔ میں زور
زبردستی سے کام نہیں لینے والی۔“ رباح کا قہقہہ بڑا
جان دار اور بے ساختہ تھا۔ نشال بھی اس کی بات سمجھ
کے کھکھلا کے ہنسی۔ گھر کے اندر داخل ہوتے
باسد کمال نے اس کی کھکھلاہٹ کو دلچسپی سے دیکھا۔
ایک زندگی سے یایوس دکھی لڑکی بہر حال زندگی کی
طرف لوٹ رہی تھی۔ اس کا خوش ہونا فطری سی بات
تھی۔

”ہائے یوری باڈی! پنا لپ ٹاپ بیگ کاندھے
سے اتار کر صوفے پر رکھتے اس نے ان دونوں کو اپنی

جانب متوجہ کیا۔

”کیا پکایا ہے آج۔ بہت بھوک لگ رہی ہے؟“ وہ
اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے پلٹا۔

”تمہاری پسند کا ہی ہے سب کچھ، تم بس چیخ
کر کے آجاؤ جلدی سے۔“ رباح نے وہیں کچن سے
آواز لگائی تھی وہ جیسے ہی اندر گیا اسی تیزی سے باہر
نکلا۔

”رباح۔ میرے کپڑے تم نے دھوئے ہیں۔“ وہ
اب دروازے پر کھڑا چلا رہا تھا۔

”نہیں تو۔ کیا ہوا؟“ سنک پر ہاتھ دھوتی رباح کی
آواز مصروف سی تھی۔

”یار میرا ریڈ اور بلو ٹراؤزر شرٹ نہیں مل رہا۔ میں
صبح لنکا کے گیا تھا ہاتھ میں۔“

”وہ۔۔۔ وہ تو میں نے دھو دیا۔“ نشال بے ساختہ بول
گئی۔ رباح نے اسے تشکر آمیز نظروں سے دیکھا۔ وہ
جب سے آئی تھی۔ غیر محسوس طور پر گھر کا سارا کام
اپنے کندھوں پر لے چکی تھی، حالانکہ رباح بہت روکتی
تھی۔ ان لوگوں نے اسے اپنے گھر میں پناہ دے رکھی
تھی، اس کا اتنا ساتھ دے رہے تھے اس کا اتنا خیال رکھ
رہے تھے تو کیا وہ ان کو اتنا سا آرام نہیں پہنچا سکتی تھی؟
”لا دو یار ڈراپر رباح نے باصد سے پہلے ہی کہہ دیا تھا،
وہ فوراً لینے بھاگی۔

”یار۔ مزہ آگیا نشال کے روپ میں، ہمیں تو ایک منہ
مل گئی ہر کام وقت پر کیا ہوا یا آسانی مل جاتا ہے۔“
باسد کمال نے اس کے جانے کے بعد کہا تھا۔

”شٹ اپ۔ اس کے منہ پر مت کہہ دینا
اب۔ ہرٹ ہو گی۔“ رباح نے اسے فوراً ٹوکا تھا۔

”اوہ!“ باصد نے سر پینا۔ ”میں محض مذاق کر رہا
ہوں یار! تم بھی اسی کی طرح ہوتی جا رہی ہو۔“ وہ بالوں
میں انگلیاں پھنساتا چلا یا۔

”مجھے پتا ہے کہ تم مذاق کر رہے ہو اور تمہارے
مذاق کا دائرہ بہت وسیع ہے مگر ضروری نہیں کہ بندہ اس
بات کو سمجھ سکے۔ سو بی کیئر فل۔“ وہ اسے خبردار
کر رہی تھی۔

”اوہ گاڈ۔ تم لوگوں کو یاد تھا۔“ رات بارہ بجتے ہی جب وہ دونوں اس کے کمرے میں یکے کے کمرے میں تو فرط جذبات میں گھرا باصد بس اتنا ہی کہہ پایا نшал اندازہ نہیں کر پائی کہ وہ بھول جانے کی اداکاری کر رہا تھا یا سچ میں اسے اپنی سالگرہ یاد نہیں تھی۔

”آئی مین وائٹ۔ اس امیزننگ۔“ وہ کیک پر لگی موم بتیاں بجھاتے بولا تھا۔ رباح نے اسے بہت خوبصورت نیو برائڈ کا آئی فون گفٹ کیا تھا جسے پا کر وہ بہت خوش ہوا تھا تب ہی وہ نшал کی جانب مڑا تھا۔ رباح ہلہلوں میں کیک نکالنے لگی۔

”لاؤ نکالو میرا گفٹ۔“ وہ اپنے ہاتھ کی جوڑی ہتھیلی پھیلائے منتظر تھا۔ نшал سٹپٹا گئی۔

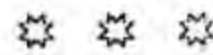
”باصد۔ نшал! نکالو تمہارے ہر تھوڑے کے بارے میں معلوم نہیں تھا یہ جب شام کو کلاسز لے کر آئی تو میں نے اسے بتایا تھا۔“ رباح نے نшал کی حمایت کی۔

”ٹھیک ہے اگر ان کے پاس میرے لیے کوئی تحفہ نہیں ہے تو پھر انہیں کیک بھی نہیں ملے گا۔“ وہ بڑے آرام سے نшал کے ہاتھ سے کیک کی پلیٹ تھامتے بولا تھا نшал تو چکرا کر رہ گئی۔

”باصد۔ دس از ناٹ فلیو۔ تم زیادتی کر رہے ہو۔“

”پہلے یہ وعدہ کریں کہ صبح ہر حال میں میرا گفٹ لائیں گی۔ تب کیک کھلاؤں گا ورنہ میں اپنی سالگرہ کا کیک کسی کو بغیر تحفے کے ہرگز نہیں کھانے دوں گا۔“ وہ بچوں کی طرح ضد کر رہا تھا۔ رباح اپنا سر پیٹ کے رہ گئی۔

”بولیں مس۔ لائیں گی میرا گفٹ؟“ نшал بے بسی سے گردن ہلا کر رہ گئی تھی۔



اس روز رباح کو کچھ شاپنگ کرنا تھی۔ اسے دو دن کے لیے ایل ای (امریکہ کا شہر) جانا تھا۔ ایل ای بہترین کاسمیٹک سرجری کے لیے پوری دنیا میں مشہور تھا۔ رباح کو وہاں ایک پر ایک سیسی نار میں شرکت کرنا تھی

اس سیسی نار میں دنیا بھر کے نامور اور قابل ڈراماٹوجسٹ اور سرجن شرکت کر رہے تھے انوٹیشن کارڈ ملتے ہی وہ پورے جوش و خروش سے تیاریوں میں مگن ہو گئی تھی۔ رباح زیادہ ترجیز شرٹ ہی استعمال کیا کرتی تھی۔ کبھی کبھار ٹاپ کے ساتھ لانگ اسکرٹ بھی پہن لیا کرتی تھی۔ اس کے بال ریشمی اور سیاہ تھے۔ بے حد شفاف، بے داغ، گوری رنگت، بڑی بڑی غرائی آنکھیں جن پر گھنی پلکوں کا غلاف تھا۔ کانوں میں ہمہ وقت پہنے ڈائمنڈ کے نفیس ٹاپس، ہاتھ کی انگلی میں ایک ڈائمنڈ کی انگوٹھی تھی جو بہت سال پہلے باصد کی مہی نے اس کے ہاتھ میں پہنائی تھی تب سے اب تک وہ اس کے ہاتھ میں تھی رباح کو اس سے ایک عجیب طرح کی انسیت محسوس ہوتی تھی۔ شاید اس کے پیچھے باصد کمال سے کی جانے والی محبت تھی جو وہ انگوٹھی اسے اپنے اور باصد کے تعلق کی مضبوطی ظاہر کرتی تھی وہ دونوں ایک دوسرے کا پرفیکٹ میچ تھے۔ حد سے زیادہ ایک دوسرے کو سمجھنے والے، حیران کن حد تک ذہنی ہم آہنگی رکھنے کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے کی کمزوری بن چکے تھے۔

اس وقت وہ ایک ایمین بوتیک میں آئے تھے خریدنا تو وہاں سے انہیں کچھ بھی نہیں تھا، لیکن بس یونہی وینڈو شاپنگ کی غرض سے تب ہی باصد کی نظر ایک ساڑھی پر گئی تھی اس کی آنکھیں کسی اچھوتے احساس سے چمکنے لگی تھیں وہ فوراً ”رباح کی جانب پلٹا تھا۔

”ہے۔ رباح کیا ہی اچھا ہو، اگر تم اس مرتبہ سیسی نار میں اسکرٹ کے بجائے یہ ساڑھی پہن کر جاؤ تو۔“ نшал نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ ساڑھی واقعی میں بہت خوب صورت تھی گہرے جامنی پیور شیفون پر نفیس کڑھائی والا بارڈ تھا۔ رباح پلیٹ کر ڈی کے قریب آئی۔

”آریو میڈ باصد! مجھے سیسی نار میں شرکت کرنی ہے کسی شادی میں نہیں۔“

”کیا فرق پڑتا ہے رباح۔ تم اپنے لباس سے اپنے

ملک اور اس کی ثقافت کو پرزنت کرو گی۔“ باصد
حسب عادت اپنی ہی کہہ رہا تھا۔
”مگر یہ انڈیا کا قومی لباس ہے پاکستان کا
نہیں۔“ بحث کرنے کو ہمہ وقت تیار رباح نے ترنت
کہا تھا۔

”تو ٹھیک ہے پھر طے ہوا تم اس بار شلوار قمیص اور
دو پٹالے کے جاؤ گی۔“ باصد نے فیصلہ سناتے ہوئے
بات ختم کی تھی۔
رباح شلوار قمیص پر راضی ہو گئی تھی۔

”اپنی دے۔ تم لوگ باقی کی چیزیں خریدو۔ میں ذرا
سانے والی مارکیٹ سے اپنے لیے کچھ پسند کر لوں۔
فارغ ہو کے ادھر ہی آجانا تم لوگ“ وہ تیزی سے کہتا
باہر کی جانب بڑھا تھا۔ رباح نے نشال کو بھی اپنے لیے
کچھ خریدنے کے لیے بہت اصرار کیا مگر وہ نہیں
مانی۔ اس کے پاس چیز کے نام پر بنائے کپڑوں کا ڈھیر تھا
اور رباح پر مزید بوجھ ڈالنا نہیں چاہتی تھی ٹی اماں نے
چلتے وقت اسے کچھ رقم دی تھی وہی رقم وہ اپنی
ضرورت کے لیے استعمال کر رہی تھی۔ تاحال اسے
جیب کی ضرورت نہیں پڑی تھی ویسے بھی اس کے
انگلش کورسز کی فیس رباح نے ہی ادا کی تھی۔

یہ ایک بہت بڑی دکان تھی جس میں مردانہ چیزوں
کی بہتات تھی۔ باصد کمال نے اپنے لیے دو شرٹس
اور ایک ٹائی خریدی تھی ساتھ میں نفیس کرشل
ڈائمنڈ والی ٹائی پن بھی۔ رباح سامنے نظر آئی ری فوم
یکلیم کشن کی جانب بڑھ گئی تھی نشال کو نے میں کھڑی
تھی۔

”یہ دیکھو نشال یہ کیسی ہے؟“ ٹائی اور ٹائی پن اسے
دکھاتے باصد خاصا رجوش تھا۔ نشال نے اس سلک
کی پستی رنگ کی ٹائی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔
”بہت زبردست!“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا
تھا۔

”ہاں واقعی زبردست ہے۔ اسے تم مجھے گفت
کر رہی ہو۔“ وہ مزے سے بولا تو نشال کا منہ کھل گیا یہ
آفر بھلا اس نے کب کی تھی۔

”میرا ہر تھ ڈے گفت ادھار تھا ناں تم پر۔“ وہ اسے
یاد دل رہا تھا۔ نشال نے سمجھ کر سر ہلایا۔
”وہاں کاؤنٹر پر بے منٹ کرو۔“ وہ اسے ہدایات
دیتا وہاں سے چلتا بنا آیا تو ہاتھ میں ایک خوب صورت
ساکارڈ تھا۔

”اسے فل کر کے مجھے مسکراہٹ کے ساتھ دو“
گفت ایسے روکے دیا جاتا ہے کیا؟“

وہ اسے پین اور کارڈ پکڑا نا حیران کر رہا تھا۔ نشال دم
بخودی کارڈ پر دعا لکھ رہی تھی۔ باصد کمال کا ہر انداز ہی
چونکا نے والا تھا۔ نشال نے کارڈز لکھ کے احتراما اسے
ہلکا سا سر کو خم دے کروش کرتے تحفہ پکڑایا جسے اس
نے اوائے بے نیازی سے تھمنکس کہتے ہوئے تھام
لیا۔ نشال بس اسے حیران ہو ہو کے دیکھتی ہی رہی تب
ہی رباح چلی آئی باصد کمال نے بے ساختہ کارڈ کو پیچھے
کیا تھا۔ یہ ایک غیر شعوری سی کوشش تھی شاید رباح
کی ناراضی کے خوف سے۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ رباح خوش خوش سی ان کے
قریب چلی آئی۔

”تمہارا انتظار۔ اب چلو در ہو رہی ہے۔“ جلدی
جلدی کا شور مچاتے انہیں گھر لے آیا تھا۔

مگر اسی رات عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد نشال
ابھی بیٹھی تھی کہ باصد چلا آیا۔ نشال نے یوں رات
کے پہر اسے اپنے کمرے میں حیرت سے دیکھا اس کے
ہاتھ میں کچھ تھا۔

”یہ تمہارے لیے۔“ وہ پیکٹ اس کی طرف
بڑھاتے بولا۔ نشال نے بے ساختہ اس میں سے جھلک
دکھلائی ساڑھی کو دیکھا اور دھک سے رہ گئی۔ یہ وہی
ساڑھی تھی جو آج شام وہ رباح سے خریدنے کو کہہ رہا
تھا۔

”یہ۔ تو۔“ مارے حیرت کے اس سے بات مکمل
کرنا مشکل ہو گئی۔

”تمہارے لیے ہے۔ تمہیں یہ پسند آئی تھی ناں
ویسے بھی جو مجھے تحفہ دے اسے جواباً“ تحفہ دینا باصد
کمال کا نیچر ہے آئی مین عادت۔“ وہ کاندھے اچکاتے

بولتا تھا یہ بھی اس کا انداز ہی تھا۔

”مگر میری برتھ ڈے تو نہیں ہے؟“ نشال تذبذب کا شکار ساڑھی پکڑنے میں متاثر تھی۔

”کبھی نہ کبھی تو آئے گا ناں کیا پتا تب تک تم کہاں ہو اپنے شوہر کے گھر یا پاکستان اپنی بی اماں کے گھر خواہ مخواہ تمہارے دل میں خیال آئے گا کہ باصد کمال تمہاری سالگرہ کا تحفہ کھا گیا۔“

نشال کہہ نہ سکی کہ اس کی ایسی سوچ نہیں ہے مگر کہہ نہیں پائی باصد کمال کی زبان کی تیزی کے سامنے وہ یونہی گنگ ہو جایا کرتی تھی اس نے وہ پیکٹ تھام کے خاموشی سے اسے الماری میں رکھ دیا۔ اس کا ارادہ اسے رباح سے تذکرہ کرنے یا دکھانے کا بالکل بھی نہیں تھا جانے کیوں۔ باصد کمال کا ایک نیا روپ اس پر آشکار ہوا تھا نرم نرم مہربان سائبین کے جان لینے والا یعنی وہ اتنا انجان نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا پہلی بار وہ نشال کو اچھا لگا۔



رباح دو روز کے لیے ڈھیر ساری ہدایات دے کر رخصت ہو گئی۔ نشال اس کے جاتے ہی اداس ہو گئی گھر میں سارا دن بولائی سی پھرتی رہی۔ باصد کمال اسے ایئر پورٹ چھوڑنے گیا تو رات گہری ہونے پر بھی نہ لوٹا تھا۔ نشال کچھ دیر پڑھتی رہی پھر پی وی دکھا اور اس کے بعد جی بھر کر بی اماں سے باتیں کیں۔ انہیں نشال اور صحاب احمد کی تصاویر مل گئی تھیں محسب توقع وہ ان دونوں کو خوب سراہتے ہوئے دعاؤں سے نواز رہی تھیں۔

”تو کتنی بخت والی ہے نشی۔ تیری پسند کے ہیرو کی طرح سے تیری زندگی کا ہیرو بھی ہے اس کی شکل کتنی ملتی ہے اس سے ایک لمحے کو تو میں حیران ہو گئی مجھے لگا کہیں میرے ساتھ تم لوگوں نے مذاق تو نہیں کر بھیجا۔ مگر پھر مجھے تجھ پر یقین تھا کہ تو اپنی بی اماں کے ساتھ ایسا دھوکا کبھی مرے بھی نہیں کر سکتی۔“

انجانے میں وہ اس کے زخموں کے کھرندے نوح گئی

تھیں۔ نشال کی جان سولی پہ اٹک گئی جب اس کھیل کا اختتام ہو گا تو وہ بی اماں کا سامنا کسے کر پائے گی اور پھر انہوں نے تو اب تک جانے اپنی گنتی محلے دار عورتوں کو تصاویر دکھا کر داد حاصل کر لی ہوگی۔ تھکن نشال کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ دکھ انسان کو تھکن کے سوا اور دیتے ہی کیا ہیں بھلا ایک درد مسلسل سوچوں کی شوریدہ سری تکلیف، تھکن اور بے بسی کے سوا کیا اس کی آزمائش کبھی ختم ہو پائے گی؟ کیا کبھی وہ خوش گوار زندگی جی پائے گی۔ اس کے سامنے ایک بند گلی تھی جس میں کوئی روزن نہیں تھا۔ آج اس کا جی بری طرح سے گھبرا رہا تھا۔ عشا کی نماز تو وہ ادا کر چکی تھی مگر وہ دو رکعت نفل پڑھ کے سجدے میں گر کے پھوٹ پھوٹ کے روئی تھی۔ وہ اپنا دکھ کسی سے نہیں کہتی تھی مگر اپنے رب سے اس کی بہت دوستی تھی۔

وہ سجدے میں ہی تھی جب اسے گھر کے مرکزی دروازے کے کھلنے کی آواز آئی تھی گھر کی ڈپلی کیٹ چابی ان تینوں کے پاس ہوا کرتی تھی۔ اس نے سر سجدے سے اوپر اٹھایا تو اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ مگر وہ خود بہت ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ اس نے جائے نماز تک کر کے میز پر رکھی اور خود باہر لاؤنج میں نکل آئی۔ باصد اپنے لیے کافی بنا رہا تھا شاید وہ کھانے کھا کے آیا تھا۔ آہٹ پہ چونک کے مڑا۔

”کافی پیوگی۔ میں بنا رہا ہوں۔“ اس نے نماز کے اشائل میں دوپٹا اوڑھے نشال کو دکھا اور ٹھنک گیا اس لمحے اس کے چہرے پر اس قدر ملاحظت اور چمک تھی جیسے نور کا ہالہ اس کے چہرے کے اطراف میں پھیلا ہو۔

”آپ کھانا نہیں کھائیں گے کیا؟“ وہ اثبات میں سر ملاتی اس سے پوچھنے لگی تھی۔

”تم نے کھا لیا؟“ وہ الٹا اس سے پوچھنے لگا تھا۔ اچانک ہی اسے یاد آیا تھا کہ وہ تینوں ایک ساتھ کھانا کھانے کے عادی تھے اور یقیناً نشال باصد کے انتظار میں ابھی تک بھوکی تھی اور اس وقت رات کے

”یہی کہ۔ اگر تمہارے سوچنے کا یہی حال رہا تو بہت جلد تمہارے چہرے پر جھریاں پڑ جائیں گی۔“
وہ اپنے احساسات چھپاتا کافی کا نمک اٹھا کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا، بے اختیاری کا وہ ایک مختصر ساہل تھا جو باصد کمال پر بہت کچھ عیاں کر گیا تھا اور وہ سب بہت سخی اور مشکل تھا۔ نشال کافی کے بھاپ اڑاتے مک میں اپنا دھندلا مستقبل تلاشتی وہیں بیٹھی رہ گئی۔ آنکھوں سے سیل رواں بڑی خاموشی اور تیزی کے ساتھ ایک بار پھر جاری ہو گیا تھا۔



وہ اسے لندن گھمانے لایا تھا۔ اپنی پسندیدہ جگہوں پر، جہاں وہ جانا پسند کرتا تھا۔ جہاں اسے بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ آج پہلی بار وہ اسے اپنے بارے میں بتا رہا تھا اس سے پہلے تو سب کچھ رباح کی مرضی کے مطابق ہوتا تھا۔ اور نشال کو لگتا تھا جیسے باصد کمال کی اپنی کوئی پسند ہے ہی نہیں مگر ان تین ماہ میں اسے پہلی بار الگ احساس ہوا تھا۔

”آؤ۔ آج تمہیں لندن ایک الگ نظر سے دکھاؤں“
چلتے سے اس نے گہرے کعبے میں کہا تھا۔ وہ اسے ایسٹن ڈاؤنز لایا تھا۔ یہ ایک بہت اونچی پہاڑی پر بنی جگہ تھی اس پر کھڑے ہوتے ہی سارا لندن اسکرین کی مانند واضح ہو جاتا تھا۔ جس وقت وہ لوگ وہاں پہنچے شام گہری ہو رہی تھی۔ ایسٹن ڈاؤنز کے ساتھ ہی بالکل نزدیکی ریس کورس کا بہت بڑا میدان تھا۔ نشال نے وہاں کھڑے ہو کے لندن کو مسحور و مبسوط ہوتی نگاہوں سے دیکھا۔ پورے لندن کا نظارہ اسی قدر حسین اور منفرد تھا کیا اس سے زیادہ حسین منظر بھی کوئی ہو سکتا تھا؟

”کون کہتا ہے کہ لندن ایک دن میں نہیں دیکھا جاسکتا۔“ وہ اس کے نزدیک آتے بولا تھا نشال نے مڑ کر دیکھا باصد کے سلکی بال ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں سے اڑ رہے تھے۔

”یہ میری فیورٹ جگہ ہے، اکثر ہی یہاں آتا رہتا

بارہنچ رہے تھے گویا وہ دوسری بھوک تھی۔
”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ نشال نے آہستگی سے کہہ کر جانا چاہا مگر باصد کی عقابانی نگاہ سے بچ کے نکلنا آسان کہاں تھا۔

”تم روئی ہو نشال؟ کیا کچھ ہوا ہے میری غیر موجودگی میں؟“ وہ یکدم پریشان ہو گیا تھا۔ ایک سادہ بے ریا زمانے کی چالاک سے بے خبر لڑکی، اجنبی دیس میں کس مشکل سے دوچار ہو گئی تھی، باصد کا دل لمحہ بھر کو اس کی تکلیف محسوس کر کے سکڑ کر پھیلا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ لائیں میں کافی بنا دیتی ہوں آپ بیٹھیں۔“ وہ اس کے ہاتھ سے کافی کا مک تھامتے بولی جس میں وہ دو کیوں کے لیے کافی پھینٹ رہا تھا۔ نشال کافی خود پھینٹنے لگی تو باصد نے الیکٹرک کیتلی میں دو دو گرم کرنا شروع کر دیا دونوں کے درمیان خاموشی کا طویل وقفہ آیا اس دوران باصد کمال نشال کے چہرے کو بغور پڑھتا رہا، جس پر اس وقت گہرے تفکرات کا جال بکھرا تھا۔ کیا کبھی اس لڑکی نے اتنی دور آنے سے پہلے لمحہ بھر کو بھی سوچا ہو گا کہ اس کے ساتھ تقدیر ایسا مذاق بھی کر سکتی ہے اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے اس نے دکھ سے سوچا تھا۔

”آخر والدین بیٹیوں کو اتنی دور بیاہنے سے پہلے اچھی طرح سے چھان بین کیوں نہیں کرواتے کہ جن کے ہاتھ وہ اپنی بیٹیوں کا ہاتھ دے رہے ہیں۔ وہ اس قابل ہیں کہ اپنے جگر گوشے انہیں سونے جائیں۔“
”کچھ ملا پھر؟“ کافی کا مک باصد کمال کے سامنے رکھتے اس نے پوچھا تھا۔ اب حیران ہونے کی باری باصد کی تھی۔

”کہاں سے؟“ نشال اس کا سوال سن کے دھیرے سے مسکرائی اور پوچھا۔

”میرے چہرے سے۔؟“

”بہت کچھ ملا ہے نشال عید اللہ! اس کا لہجہ گہیر ہو گیا نشال ٹھم سی گئی۔

”کیا۔ کیا ملا؟“ ٹوٹے کانچ کی چھین کا احساس جگاتا لہجہ تھا۔

”وہ ہاتھ تو آئے سارے بدلے گن گن کے لوں گی۔“ اس کا جواب خاصا برحسہ تھا۔
 ”تم باتیں تو بڑی کمال کی کرتی ہو۔ پھر اتنا کم کیوں بولتی ہو؟“ اس سے پہلے کو وہ کوئی جواب دیتی اسے کسی نے پکارا تھا۔ بھڑ میں بھلا وہ کیسے جان سکتی تھی پھر لندن میں اسے ابھی جانتا ہی کون تھا۔ اس کی تو اپنی کسی کلاس فیلو لڑکی تک سے بھی دوستی نہیں تھی یہ تو اواز تو مردانہ تھی۔

”نشال۔ رکو بیٹی۔ میری بات سنو پلیز۔“ آواز اس کے قریب سے ہی کہیں سے ابھری تھی۔
 وہ چونک کے پلٹی تھی باصد کمال نے بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا وہاں ایک ویل ڈرسلڈ اویٹر عمر آدمی کھڑا تھا۔ باصد کمال نے اسے تعجب سے دیکھا پھر نشال کو جو کم صدم کھڑی تھی۔
 ”یہ کون ہیں کیا تم انہیں جانتی ہو۔“ پھر اس نے حیرت سے نشال سے پوچھا تھا۔
 ”یہ نواب انکل ہیں۔ صحاب احمد کے پاپا۔“ نشال نے دھماکا کیا تھا۔



”میں بہت معذرت خواہ ہوں بیٹی اور بہت شرمندہ بھی ساری غلطی میری ہے جو اپنے بیٹے پر اندھا اعتبار کر بیٹھا۔“

اگلے ہی دن وہ اس کے پاس رباح کے گھر آئے تھے تب تک رباح بھی گھر پہنچ گئی تھی رباح کے واپس آتے ہی نشال اور باصد نے اسے ساری بات کہہ سنائی تھی۔ رباح نے ساری صورت حال اسے کہہ سنائی تھی۔ نشال تو بس خاموش بیٹھی آنسو ہی بہاتی رہی تھی۔ اس میں تو اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ خود پر ہنسنے والی اذیت کو دہرایا۔

”اگر آپ کا بیٹا راضی ہی نہیں تھا انکل تو آپ کو نشال کو ملانا ہی نہیں چاہیے تھا۔“ وہ کہہ رہی تھی۔
 ”آپ نے ایک ساوہ معصوم لڑکی کی ساوا کی کافائدہ اٹھایا ہے انکل! بی اماں نے اس کی ذمہ داری آپ کے

ہوں، خصوصاً تب جب رباح سے ناراض ہوتا ہوں تو؟“

”کیا رباح آپ کو اتنی دور منانے آتی ہے۔“ اس کے حیرت سے کہے گئے استفسار پر وہ دھیرے سے ہنسا۔
 ”اسے اس جگہ کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔“ اس کے انکشاف پر نشال کا منہ حیرت سے کھلا، کیا کوئی ایسی جگہ تھی جس سے رباح واقف نہیں تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ کیا باصد کمال کا کوئی ایسا راز بھی ہو گا جو رباح صدیقی کو معلوم نہیں ہو گا؟

”تو پھر آپ لوگوں کی صلح کیسے ہوتی ہے؟“ نشال نے ہنوز حیرت سے استفسار کیا تھا۔

”جب ہمارا ایک دوسرے پر آیا غصہ ختم ہوتا ہے تو خود ہی مان جاتے ہیں۔“ اور نشال جانتی تھی کہ وہ بات گولی کر گیا ہے رباح تو ویسے ہی اس کے پیچھے خوار رہا کرتی تھی اگر ناراض ہو جائے تو رباح کی توجان پر بن آتی ہوگی۔

”انیسویں۔ آؤ میں تمہیں ایک اور جگہ دکھاؤں وہ آگے بڑھ گیا۔“

یہاں دنیا کا سب سے بڑا لکڑی کا جھولا نصب ہے اور یہ لندن کا مشہور پکنک پوائنٹ ہے۔ اس جھولے کو ملینیم ویل بھی کہتے ہیں اس میں بیٹھ کر پورے لندن کو اپنی آنکھ سے چکر کھاتا اور گھومتا بھی آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔

”تم بیٹھو گی اس جھولے میں؟“ باصد کمال نے نشال سے پوچھا تھا۔

”کیوں آپ بھی مجھ پر اپنا غصہ نکالنا چاہتے ہیں کیا؟ ویسے اگر ایک دوسرے پر غصہ ہو تو اسے نکالنے کا اس سے بہترین حل اور کوئی نہیں ہو سکتا اسے اس جھولے میں بٹھانا چاہیے غصہ بھی اتر جائے گا اور اس کا کام بھی پورا ہو جائے گا۔“ وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔ پہلی بار وہ اس طرح باتیں کر رہی تھی۔

”آئیڈیا برا نہیں ہے۔ اس پر سوچا جاسکتا ہے۔ اپنے اس نام نہاد شوہر کو بٹھانا اس میں۔“ وہ اسے چھیڑ رہا تھا نشال قہقہہ لگا کے ہنسی۔

سپردگی تھی اور آپ کو یہ ذمہ داری پوری کرنی چاہیے
تھی نہ کہ یوں اس طرح سے صحاب احمد کی رضا جائے
بغیر اسے اس کے سر پہ مسلط کر دیتے۔
نشال نے اسے ممنون نگاہوں سے دیکھا۔

”تمہاری ہر بات اپنی جگہ درست ہے بیٹی! مگر میں
وہاں نیا بزنس سیٹ کر رہا تھا میرا آنا مشکل تھا مگر میرا
رابطہ مسلسل ہی صحاب احمد سے رہا ہے۔ اس نے
مجھے ایک دن بھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ میری غیر
موجودگی میں وہ کیا کارنامہ سرانجام دے چکا ہے میرے
پاس اپنی صفائی کے لیے کوئی الفاظ نہیں ہیں۔ کیونکہ
تصویر گوجس رخ سے بھی دیکھا جائے۔ غلطی میری ہی
ہے مگر میں اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔“ ان کے
شرمندہ جھکے سروالے چہرے کو اس لمحے سب نے
حیرت سے دیکھا تھا۔

”ازالہ۔ وہ کیا کرنے جارہے ہیں؟“ نشال کے
چہرے پر سوالات تیرنے لگے، باصد کمال نے اسے
ایک نظر دیکھا اس کے چہرے پر آنے والے وقت کے
حوالے سے کوئی خوش کن احساس رقم نہیں تھا۔
”اب کیا کرنا چاہتے ہیں آپ۔“ رباح صدیقی نے
پر اعتماد مضبوط آواز میں کہا۔

”میں نشال بیٹی کو اپنے ساتھ لے جانے آیا
ہوں۔ جو کچھ ہوا میں اس پر بہت شرمندہ ہوں۔ اب
میں نشال کو اپنی ذمہ داری پہ لے جاؤں گا اب اسے
کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“ وہ برامید تھے۔

”مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ صحاب احمد کا
رویہ اب نشال کے ساتھ اچھا ہوگا۔“ بہت دیر سے
خاموش بیٹھے باصد کمال نے پہلی بار لب کھولے اس
کے لہجے آنکھوں میں نشال کے لیے فکر اور پریشانی
تھی۔

”کیسے نہیں ہوگا اچھا۔ اسی نے تو مجھے یہاں بھیجا
ہے نشال بیٹی کو لینے کے لیے۔“

”تو پھر وہ خود کیوں نہیں آیا نشال کو لینے اسے
نشال کا خیال تین ماہ بعد کیوں آیا۔“ باصد نے اب کی
بار چبھنے ہوئے لہجے میں سوال کیا تھا۔ اس کے لہجے

میں اتنی درشتی تھی کہ نواب انکل ٹوکیا رباح صدیقی
بھی ٹھنک گئی تھی۔ اس کی فکر کا یہ انوکھا اظہار تین ماہ
میں پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ رباح کی حیرت بجا تھی۔
”وہ شرمندہ تھا بیٹا! اسی لیے مجھے بھیجا ہے اس
نے۔“ احمد نواب نے تھوک نکلا۔

”پھر تو جو کچھ اس نے کیا ہے اس کے بعد تو وہ نشال
کے سامنے عمر بھر سر اٹھانے کے قابل نہیں
رہا۔“ باصد کمال نے طنز سے بھرپور وار کیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ اس بات کا فیصلہ نشال بیٹی ہی کو
کرنا چاہیے، یہ ان دونوں میاں بیوی کا معاملہ
ہے۔ میں اور آپ کون ہوتے ہیں بھلا۔“ بہت نرمی
سے بولتے احمد نواب نے اسے جتا دیا تھا کہ اسے نشال
کی زندگی کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

”ہم کون ہیں نشال کے یہ آپ بھی اچھے سے
جانتے ہیں انکل جی! آپ کے بیٹے نے تو اسے نکال دیا
تھانں دیر پر پھرنے کو۔ اور اگر ہم نہ ہوتے تو آج آپ
کو اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کے لیے نشال کو ڈھونڈنا
ممکن کبھی نہ ہوتا؟“ اپنے طنز پر انداز میں چپا چپا کر الفاظ
ادا کرتے اس نے احمد نواب کا منہ بند کر دیا تھا اسے ان
کی باتوں نے شدید تاؤ دلایا تھا۔

”ریلیکس باصد!“ رباح نے بات کو بگڑا دیکھ کر
نرمی سے باصد کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر دیا۔

”انکل۔ قانونی طور پر نشال ابھی تک صحاب کی
بیوی ہے اور میرا خیال ہے کہ صحاب احمد اگر شرمندہ
ہے تو پھر اسے ایک موقع لازمی دینا چاہیے، نشال آپ
کے ساتھ جائے گی اور میں امید کرتی ہوں کہ آپ اس
کا ہر طرح سے خیال رکھیں گے۔ نشال۔ تم اٹھ کے
اپنی پیکنگ کرلو۔“

رباح نے نشال سے کہا تو وہ فوراً ”وہاں سے اٹھ گئی
تھی اس کے جاتے ہی باصد کمال بھی معذرت کرتا
وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ رباح نے برسوچ نگاہوں سے
اسے وہاں سے جاتا دیکھا تھا۔ اس کا رویہ رباح کی سمجھ
سے بالاتر تھا۔ نشال نے کمرے میں آکر خاموشی سے
اپنا سارا سامان پیک کر لیا تھا ہاں البتہ اس نے کچھ

چیزیں وہاں الماری میں پڑی رہنے دی تھیں۔ اس گھر میں اس نے اپنا بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ جتنی اپنائیت اور محبت اسے اس گھر کے مکینوں سے ملی تھی۔ اتنی شاید کبھی کہیں سے نہ حاصل کر پاتی۔ سامان سمیٹتے اس نے اس ساڑھی کو وہیں پڑا رہنے دیا تھا۔ جانے کیوں مگر اسے لگتا تھا کہ اس ساڑھی یہ اس سے زیادہ رباح کا حق ہے۔ سو اس نے اس ساڑھی کو وہیں رہنے دیا تھا۔

”چلیں بیٹی۔“ سارا سامان پیک کر لینے کے بعد وہ لاؤنج میں آئی تو احمد نواب انکل نے شفقت سے پوچھا تھا۔ نشال نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

”اپنا بہت سارا خیال رکھنا نشال اور خود کو کبھی اکیلا مت سمجھنا اور آتی جاتی رہنا۔ بہت یاد آؤ گی تم ہمیں۔“ رباح نے جلتے سے اسے گلے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے کہا تھا نشال کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”تمہارا بہت شکریہ رباح۔ تم لوگ بہت اچھے ہو اور میں آپ لوگوں کو بہت مس کروں گی۔“

رباح کا شکریہ ادا کرتے نشال نے باصد کی طرف دیکھا تھا۔ جس کے خوب صورت چہرے پر برہمی کے تاثرات بڑے واضح تھے۔



راستے بھر وہ مختلف سوچوں کا تانا بانا بنتی رہی تھی۔ اس کے لیے غنیمت تھا کہ احمد نواب انکل کو دیر سے ہی سہی مگر اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا وہ اپنے گھر واپس جا رہی تھی۔ بالآخر صحاب احمد نے اس کے اور اپنے رشتے کو قبول کر لیا تھا۔

نشال! صحاب دل کا بہت اچھا ہے، بس وہ ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اس رشتے کو نبھانے کے لیے۔ تم تھوڑا دل بڑا کر لینا بیٹی میں جانتا ہوں وہ شرمندہ ہے۔ مگر اقرار نہیں کرتا۔“

نشال خاموشی سے سر جھکا کے رہ گئی تھی اس نے کوئی بات نہیں کی تھی مگر اس نے نواب انکل کی بات کا یقین کر لیا تھا اگر انہوں نے ایسا کہا تھا کہ صحاب احمد

شرمندہ ہے تو اس نے مان لیا تھا وہ اس کے باپ تھے یقیناً ”سچ کہہ رہے ہوں گے۔ ایک باپ سے زیادہ اپنے بیٹے کو اور کون جان سکتا ہے مگر وہ غلط تھی اس کا اندازہ اسے گھر جانے پر ہوا تھا۔

”آپ اسے پھر لے آئے ڈیڈ! میں نے آپ کو منع بھی کیا تھا؟“ دروازہ کھولتے ہی وہ اسے اپنے باپ کے ساتھ کھڑی نظر آئی تو وہ چلا اٹھا تھا۔

”لی ہو یو ر سیلف صحاب! یہ تمہاری بیوی ہے۔“ انہوں نے اسے ڈپٹ دیا تھا کتنی عجیب بات تھی جب وہ سیکھنے کی عمر سے نکل چکا تھا تو اس وقت اسے اخلاقیات سکھا رہے تھے۔

”یہ میری بیوی بالکل بھی نہیں ہے ڈیڈ۔ میں اس کے وجود کو اور نہ ہی اس رشتے کو تسلیم کرتا ہوں۔“ جواباً اور بھی زور سے چلایا تھا۔

”کام ڈاؤن صحاب! بیٹھ کہ بات کرتے ہیں۔“ وہ اسے ساتھ لیے اندر بڑھ گئے تھے اور وہ دروازے میں ہی کھڑی رہ گئی تھی۔ ایک بار پھر وہ دروازے پر ہی کھڑی تھی اسے اندر نہیں بلایا گیا تھا خود وہ جائیں سکتی تھی کیا خبر اپنی مرضی سے داخل ہونے پر اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا۔

”آہم سوری ڈیڈ۔ مگر میں اس رشتے کو ہرگز نہیں نہا سکتا آپ کو قربانی کا بکرا میں ہی ملا تھا اس ماسی کے لیے۔ کبھی آپ نے اس کا حلیہ دیکھا ہے ڈیڈ۔ کیا وہ میرے ساتھ چل سکتی ہے کیا یہ اس قابل ہے کہ صحاب احمد اسے اپنے ساتھ کہیں لے جا سکے رشتہ بتانا اور بتا کر نہا ہنا تو دور کی بات کی ہے۔“

اس کے لمبے میں اس قدر توضیح و نفرت تھی کہ لمبے بھر کے لیے تو نواب انکل بھی سن پڑ گئے تھے۔

”نشال اچھی بچی ہے صحاب! وہ تمہاری پسند میں ڈھل جائے گی، تم اسے ایک بار موقع دو۔“ نواب انکل کے لمبے کی تھکن اور پسائی باہر کھڑی نشال کی ٹانگوں میں اتر آئی، بے ساختہ وہ سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ کیا وہ اتنی ارزاں تھی۔

”تو وہ ڈیڈ۔ آج سے پندرہ برس پہلے میں بچہ

بھگی آنکھوں سے مسکراتی رہی۔ نشال کو ان کے شفیق وجود میں اپنے باپ کی محک محسوس ہوئی۔
اس روز نشال نے نواب انکل کی فرمائش پر کھانا بنایا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ کام کرواتے رہے۔
صحاب احمد گھر سے باہر تھا۔ کچھ بنا کر بھی نہیں گیا تھا۔
اس نے بھی نواب انکل سے نہیں پوچھا تھا۔ پھر ان دونوں نے بی اماں کو کال کی تھی۔ نواب انکل پر سکون انداز میں بی اماں سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ انہیں صحاب احمد اور نشال کے متوقع دلچسپ کے بارے میں بتانے لگے تھے۔

انجانے میں ہی سسی، مگر نشال نے ان کا بھرم رکھ لیا تھا۔ بی اماں کے ان کی ذات پر جو احسانات تھے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ انہیں دکھ دیں۔ ان کے بڑے بیٹے کا ایک سیٹلٹ ہو گیا تھا، ایسے میں وہ لندن نہیں آسکتے تھے۔ انہیں آفس کا سارا کام سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ مگر انہیں فکر تھی، صحاب احمد سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھے۔

جس روز نشال کی فلائٹ تھی۔ صحاب احمد کا نمبر مسلسل آف جا رہا تھا۔ لینڈلائن نمبر پر آنسرنگ مشین لگی تھی۔ انہوں نے اس کے لیے جانے کتنے ہی پیغامات ریکارڈ کرا دیے تھے۔ انہیں اپنے خون پر یقین تھا کہ صحاب جتنا بھی غصیل ولا پروا سہی، مگر وہ اتنا خود غرض اور گستاخ نہیں ہو سکتا کہ باپ کی نافرمانی کرے۔

اصل خبر تو انہیں تب ہوئی جب ایک روز ان کی کال صحاب احمد کی غیر موجودگی میں ایک آرش لڑکی نے ریسیو کی تھی۔ انہوں نے فوری طور پر نشال کا پوچھا تھا تو جواباً۔

”کون نشال! کہہ کے پوچھا گیا سوال انہیں چونکا گیا تھا۔ وہ لندن پہنچے تھے۔ صحاب احمد انہیں دیکھ کر چونکا ضرور تھا، مگر گھبرایا نہیں تھا۔ پھر انہوں نے اس سے نشال کا پوچھا تھا تو اس نے۔ ڈھٹائی سے اس کے ساتھ کیے گئے سلوک کی داستان سنا۔ جس پر وہ شرمندہ تھا نہ ہی پشیمان، بلکہ پر سکون اس قدر کہ نواب

تھا۔ آپ کے زیر سایہ پل رہا تھا۔ مجھے آپ کے پیسے کی ضرورت تھی اور اس وقت آپ کی بات مان لینے کے علاوہ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا، مگر اب میں آپ کا محتاج نہیں، اس لیے آپ مجھے اس رشتے کو نبھانے کے لیے مجبور ہرگز نہیں کر سکتے نور۔“
نشال کے دل پر گھونسا سا بڑا کیا وہ اتنی حراں نصیب تھی کہ صحاب احمد نے محض اپنے فائدے کے لیے اسے اپنایا تھا اور اب جب اسے ضرورت نہیں تھی تو وہ اس تعلق کو بوجھ تصور کرتے توڑ کے پھینک دینا چاہتا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد جانے انہوں نے صحاب احمد کو کیسے منایا تھا، مگر وہ اسے لینے آئے تھے، وہ اسے گھر کے اندر بلا رہے تھے۔ نشال نے اپنے آنسو اندر اتار کر ضبط کر لیا اور خاموشی سے اندر بڑھ آئی۔ زندگی اپنے دامن میں ابھی کتنی اذیتیں سمیٹے ہوئے تھی۔ اس کا اندازہ ابھی قبل از وقت تھا اور ناممکن بھی۔ وہ خاموشی سے اپنا سامان گھنٹی اندر بڑھ آئی۔ صحاب احمد نے ایک قبر بھری نگاہ اس پر ڈالی اور وہاں سے چلا گیا۔ نشال نے اس نگاہ سے خود کو جھلٹا محسوس کیا۔
”بیٹی۔ تھوڑا حوصلہ کرو گی تو وقت بہت جلد تمہارے لیے ہموار ہو جائے گا۔ صحاب احمد کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں تم سے۔“ نواب انکل کے چہرے پر صدیوں کی جھکن تھی، یوں لگتا تھا جیسے صحاب احمد کے رویے نے انہیں بھی توڑ دیا ہے۔
”آپ کو میری طرف سے کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا انکل۔ باقی جو میرا نصیب، آپ پلیز شرمندہ نہ ہوں۔“

وہ تو بچپن سے دکھ سننے کی عادی تھی، سواب بھی تقدیر پر شا کر ہو کے اس برے وقت کے لیے خود کو تیار کرنے لگی، نواب انکل نے اس کے سر پر بے ساختہ پیار سے ہاتھ رکھا تھا، پھر انہوں نے اسے گھر دکھایا تھا۔ اس روز انہوں نے نشال کے ساتھ بہت باتیں کی تھیں۔ اس کے پاپا کی باتیں۔ اپنی اور ان کی دوستی کے قصے۔ بی اماں کے لاڈ پیار کے واقعات۔ نشال

اور پیشانی کی رگ ہنوز پھولی تھی گویا وہ ابھی تک ذہنی تناؤ میں تھا۔

”میں نے غلط نہیں کیا باصدا۔ نشال شادی شدہ ہے، جلد یا بدیر اسے اپنے شوہر کے گھر لوٹنا ہی تھا۔“ وہ اسے کچھ جتلا نہیں رہی تھی، مگر باصدا کمال کو پھر بھی اس کی بات چبھ گئی تھی۔

”میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس حقیقت کو، مگر رباح۔۔۔ وہ ہماری دوست ہے، ہم نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے، تو ہمیں اس ذمہ داری کو بخوبی نبھانا بھی چاہیے، تمہیں یوں اسے اس کے انکل کے ساتھ نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔“ وہ بالوں میں انگلیاں چلاتا پریشانی سے کہہ رہا تھا۔

”ہم اس کے ساتھ ہیں ابھی بھی۔ نشال اکیلی بالکل بھی نہیں ہے، تم پریشان مت ہو۔ ہم خدا نخواستہ اس کا ساتھ چھوڑ تو نہیں رہے۔ پھر وہ اسی شہر میں ہے، اگر کوئی مسئلہ ہو گا تو ہمیں پتا چل جائے گا۔“ رباح نے اسے تسلی دی تھی۔

”مگر میں مطمئن نہیں ہوں یا۔ مجھے نہیں لگتا کہ نشال وہاں خوش رہائے گی۔“

”اس کی تم فکر مت کرو۔ نشال بہت سمجھ دار ہے، وہ ہینڈل کر لے گی۔ اب آجاؤ مجھے بہت زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔“ رباح نے اٹھتے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تھا۔ باصدا بھی اٹھ آیا تھا، کیونکہ اس کی بھوک بھی چمک اٹھی تھی۔



رات کے دو بجے کا وقت تھا، جب صاحب احمد کمرے میں آیا تھا۔ نشے میں دھت وہ جھوم رہا تھا۔ اس کے منہ سے بدبو کے بھکے اٹھ رہے تھے۔ اپنے کمرے میں بے سدھ سوئی نشال کو اس نے ایک جھٹکے سے اٹھایا تھا۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ چند لمحے تو صورت حال سمجھنے میں ڈالک گئے۔ وہ اس کے بازو کو اتنی شدت سے دبوچے ہوئے تھا کہ نشال کو لگا اگر چند لمحے اور وہ اس کے بازو کو تھامے

انکل کو حیرت ہوئی، کیا کوئی اتنا بے حس بھی ہو سکتا ہے؟ پھر انہوں نے نشال کی تلاش شروع کر دی تھی، کیونکہ اتنی تو انہیں خبر بھی کہ نشال واپس نہیں گئی۔ اگر واپس جاتی تو بی اماں کا فون لازمی ان کے پاس آتا۔ انہیں اس بات کی خبر نہیں تھی کہ بی اماں کے پاس ان کا کوئی نمبر نہیں تھا۔ انہوں نے لندن کے ہر ہوٹل، موٹل، ڈارالایان، ویمن ہاسٹلز ہر جگہ اس کی تلاش جاری رکھی تھی۔ غرض انہوں نے ہر اس جگہ کو چھانا جہاں اس کی موجودگی کی توقع کی جاسکتی تھی اور پھر وہ انہیں مل گئی تھی۔ وہ اسے پہلی نظر میں ہی پہچان گئے تھے۔

آخری بار جب وہ پانچ سال پہلے پاکستان گئے تھے تو نشال نے ان کی خوب خدمت کی تھی اور ان کا بھرپور خیال رکھا تھا۔ پہلی بار انہیں واپس آکر بہت اچھا لگا۔ انہوں نے صاحب احمد کے لیے ایک اچھی لڑکی کا انتخاب کیا تھا۔ اس فیصلے نے انہیں دنوں مطمئن و شاد رکھا تھا۔ مگر وہ اپنے بیٹے کو مطمئن و شاد نہیں کر سکے تھے، یہ ان کی غلطی تھی، ایک فاش غلطی۔



”کھانا کھا لو باصدا!“ رباح نے اس کے کمرے میں آکے جانے کتنی ہی آوازیں دے ڈالی تھیں، مگر وہ تکیے پہ اوندھے منہ لیٹا سس سے مس نہیں ہوا تھا۔

”باصدا۔۔۔ میں تم سے کہہ رہی ہوں۔“ رباح زنج ہو گئی تھی تب ہی چیخ مچی تھی۔

”مجھے بالکل بھی بھوک نہیں ہے رباح۔ پلیز تم کھا لو۔“ اس نے معذرت کر لی تھی اور رباح کو حیرت ہوئی تھی، اسے حیرت ہونی بھی چاہیے تھی، باصدا کے موڈ کو ایک دم سے کیا ہوا تھا رباح سمجھ رہی تھی۔

”تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا باصدا۔“ وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی، نرم نرم لہجے میں بولنے والی رباح ذہنی خلفشار کا شکار تھی۔

”تم نے نشال کو بھیج کر اچھا نہیں کیا رباح!“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے سلکی بال ماتھے پر بکھرے تھے

نکال کر ہی دم لیا تھا۔ ناچار نشال کو رات باہر لاؤنج میں گزارنا پڑی تھی بغیر کسی کمبل یا گرم چادر کے۔



دوسرے دن وہ علی الصبح ہی اٹھ گئی تھی۔ رات بھر کی سردی اس کی ہڈیوں کو چٹکار رہی تھی۔ اس نے کچن میں جا کے اپنے لیے ایک کپ کافی بنائی تھی کافی پی کر اس نے اپنے جسم میں کچھ حرارت ہوتی محسوس کی تھی پھر اس نے از خود ہی ویکيوم کلیئر سے سارا گھر صاف کرنا شروع کر دیا تھا۔ ڈانگنک ایریا، لاؤنج اور کچن۔ ہر جگہ ہر کونہ اس نے چمکا دیا تھا۔ نواب انکل جب سو کر اٹھے تو گھریلو سے حلیے میں اسے کام کرتا دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے تھے۔

”تم اپنا سامان کمرے میں سیٹ کر لو نشال۔“ اس کا سامان وہیں لاؤنج میں بڑا دیکھ کے وہ اس سے کہہ رہے تھے۔ نشال انہیں بتا نہیں سکی کہ اسے تو صحاب احمد نے رات کمرے سے کس قدر بے عزت کر کے نکالا تھا۔ سامان کو تو وہ آگ لگا دے گا۔

”ناشتا بنانے کے بعد رکھ لوں گی انکل۔ آپ بتائیں کیا لیں گے ناشتے میں؟“ وہ ان سے ان کی پسند پوچھنے لگی تھی مقصد صرف ان کا وہ بیان بنانے کا تھا۔ وہ اسے اپنی پسند بتانے لگے تھے تب ہی وہاں تروتازہ صاحب احمد چلا آیا تھا۔ اس کی سبز کالج سی آنکھیں اب سرخ نہیں تھیں۔ گویا رات کا نشہ اتر چکا تھا اور اب وہ ایک الگ مزاج کے ساتھ ان کے درمیان بیٹھا تھا ہل والے غصے انداز کی جھلک تک نہیں تھی اس کے رویے میں۔

”نشال۔۔۔ میرا ناشتا بھی بنا دینا پلیز۔“ اس نے بہت نارمل اور خوش گوار موڈ میں نشال کو مخاطب کیا تھا۔ نشال تو نشال خود نواب انکل نے بھی اسے حیرت سے دیکھا تھا۔

”اور ہاں میں ناشتے میں کافی پیتا ہوں۔ براؤن بریڈ کے دو سلاٹس۔ ایک ہاف بوائٹل انڈے۔ جلدی بنا دینا“ مجھے آفس ذرا جلدی پہنچنا ہے۔“ وہ کس قدر دوستانہ

رکھے گا تو اس کے بازو میں سوراخ ہو جائیں گے۔ ”تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے کمرے میں آنے کی۔“ وہ اس کے منہ پر جھکا سرخ ڈوروں والی آنکھیں پوری کھولے چلا رہا تھا۔ وہ کہہ نہیں سکی اس فلیٹ نما اپارٹمنٹ میں فقط دو بیڈ رومز ہیں ایک نواب انکل کے زیر استعمال اور دوسرا صاحب احمد کا تھا۔ اصولاً ”شرعاً“ اور قانوناً ”تو اسے صاحب احمد کے کمرے میں ہی سونا چاہیے تھا مگر وہ بھول گئی تھی ابھی صحاب احمد نے اسے محض گھر میں رہنے کی اجازت دی تھی اپنے بیڈ روم تک پہنچنے کی نہیں۔

”میرا بازو چھوڑ دس پلیز۔“ تکلیف کی شدت سے نشال کی آنکھیں پانی سے بھیگ گئیں۔

”نفرت ہے مجھے رونے والی عورتوں سے۔“ وہ اسے پوری قوت سے دھکا دیتے ہوئے غرایا تھا۔ نشال بیڈ پر اونڈھے منہ جا گری۔

”آؤٹ!“ وہ اسے بازو سے جکڑ کر کمرے سے نکال رہا تھا۔

”تم اس قابل بھی نہیں کہ صحاب احمد کی نوکرائی بن سکو۔ کجا میرے کمرے میں میرے ساتھ بیوی بن کر رہنا۔“ وہ نفرت سے کہتا اس کی تضحیک کر رہا تھا۔ کس قدر ہلک آمیز لہجہ تھا اس کا اس سے اور وہ کتنے غرور و تکبر سے کہہ رہا تھا۔

”اگر تمہیں یہ لگتا ہے کہ میرے ڈیڈ کو بے وقوف بنا کر تم میری زندگی میں زبردستی جگہ بنا لو گی تو تمہاری بھول ہے۔“ وہ اس کے سامنے کھڑا نفرت کا زہرا نڈیل رہا تھا۔ نشال کا پورا جسم نیل و نیل ہو گیا۔

”اب معصوم بن کے آنسو مت بہاؤ تم۔ میرے اوپر تمہارے ان سوؤں کا کوئی اثر نہیں ہونے والا جاؤ میرے کمرے سے۔ وہ دھاڑا تھا نشال بے ساختہ دیوار سے جا لگی ہو نہ۔“ اس نے حقارت سے کہا۔ ”میرے بڑھے باپ کو لگتا ہے کہ نشال عبید اللہ میرے لیے ایک بہترین ہم سفر ثابت ہو سکتی ہے ہا ہا ہا۔“ وہ قہقہہ لگا کے ہنس رہا تھا دوسرے لفظوں میں اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ پھر اس نے اسے اپنے کمرے سے

صحاب احمد تو آفس چلا گیا جبکہ نواب انکل تیار ہونے کی غرض سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے انہیں کسی سے ملنے کے لیے جانا تھا، نشال گہری سانس لے کر ناشتا کرنے لگی۔ اس گھر میں اس کے پہلے دن کی شروعات ایک اچھے انداز سے ہوئی تھی۔ اس پر تھوکتا بھی پسند نہ کرنے والے صحاب احمد نے اس کے ہاتھ سے پینا ناشتا کیا تھا۔ نشال کے لیے یہ ایک خوش آمد بات تھی اور وہ مطمئن بھی ہو گئی تھی فی الحال یہی بہت تھا۔



اس روز وہ اسے لندن گھمانے لایا تھا۔ احمد نواب نے اسے زبردستی نشال کے ساتھ بھیجا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک بھاری چیک بھی۔ گویا رشوت دی گئی تھی۔ اسے نشال کو باہری ڈنر بھی کروانے کا آرڈر تھا۔ اس روز بھی لندن میں بہت سردی تھی وہ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی ضرور تھی۔ مگر اس نے سارا راستہ اس سے کوئی بات نہیں کی تھی سو اسے اس قابل گردانتا ہی کہاں تھا؟

راستہ بھر وہ گانے گنگنا تا رہا تھا اس کی آواز بہت دلکش تھی۔ انگریزی لب و لہجے میں گاتا اور بولتا بہت اچھا لگتا تھا اس کے نقوش اور سبز آنکھیں اسے پہلی ہی نظر میں مغرور ظاہر کرتی تھیں۔

”چلو اترو نیچے!“ اچانک ہی اس نے ٹاور برج کے پاس گاڑی روک دی تھی اور اسے نیچے اترنے کو کہا تھا۔ نشال کو ٹاور برج پر اثر وہام کی مانند بل کھاتی چکتی گاڑیوں کے درمیان گھومنے پھرنے کے لیے کوئی پکنک اسپاٹ نظر نہیں آیا۔ لندن کا یہ مشہور میل جو دریائے تھامس پر بنا ہوا تھا۔ دنیا بھر میں اپنے منفرد طرز تعمیر کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔

”لندن کے سب سے پہلے تمہارے جیسے پینڈو اس برج کو ہی دیکھتے ہیں۔ تم بھی دیکھو اور انجوائے کرو۔“ وہ بے تحاشا ہنس رہا تھا۔ نشال کو ہنک محسوس ہوئی وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

انداز میں اسے اپنی پسند تیار رہا تھا۔ نرم نرم لہجے میں بولتا ہوا وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ نشال کے دل نے بے ساختہ دعا کی وہ سدا یوں ہی بولے نرم نرم اور میٹھا سا۔ ”اور ڈیڈ! آپ کا آگے کا کیا پلان ہے؟“ کل کی ناراضی کا شائبہ تک ڈھونڈے سے نہیں مل رہا تھا۔ احمد نواب نے اس کے غصے کے اتر جانے کا دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔ وہ جتنی جلدی غصہ میں آتا تھا اسی طرح اس کا غصہ اتنی ہی تیزی سے اتر بھی جایا کرتا تھا۔ سو وہ مطمئن ہو گئے تھے۔

”کچھ خاص نہیں۔ دس روز کے لیے آیا تھا لندن۔ جس میں سے چھ روز تو گزر ہی چکے ہیں“ انضال کی کال آ رہی ہے بار بار۔ واپسی کے لیے بلارہا ہے مگر میں سوچ رہا ہوں کہ تم لوگوں کا ولیمہ کروا کے ہی جاؤں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔“ احمد نواب کو واپس ہالینڈ جانا تھا جہاں ان کی تیسری بیوی ان کی منتظر تھی۔ ”شادی کے پندرہ سال بعد آپ کو ولیمہ کا خیال آ رہا ہے ڈیڈ۔ اب تو ہماری شادی پرانی ہو چکی آپ ولیمہ کی رقم ہمیں دے دیں نا، تاکہ ہم کہیں گھومنے جاسکیں، ویسے بھی آپ کی لاڈلی بیویگم کو گھمانا پھرانا ہے نا۔ ایسا نہ ہو کہ یہ آپ سے شکایتیں لگائے اور آپ مجھے جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دے دیں۔“ وہ مسکرا کر تاک تاک کر وار کر رہا تھا۔ احمد نواب کے مسکراتے لب یکھت سمٹ گئے انہیں اس کا مطالبہ یاد آیا وہ مسکرا بھی نہیں سکے۔

”نشال! شکایتیں لگانے والی لڑکی نہیں صحاب! تم اس کے ساتھ رہو گے تو خود پر رشک کرنے لگو گے۔“ انہوں نے آہستہ سے کہہ کے اسے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”میں ابھی بھی خود پر رشک ہی کر رہا ہو ڈیڈ۔ اور میں اچھے سے جانتا ہوں کہ آپ کی بیو بہت اچھی لڑکی ہے۔“ وہ کسی خوش کن خیال کے تحت مسکرا رہا تھا۔ نشال کو اس کی مبہم سی باتیں سمجھ میں نہیں آ سکیں۔ اس نے خاموشی سے ناشتا لگایا اور انہیں آواز دی۔ دونوں نے خوب سیر ہو کے مزے سے ناشتا کیا اور

”ویسے بھی یہاں خود کشی کر کے مرنا کسی اعزاز سے کم نہیں ہے۔ تمہارے لواحقین کو فخر ہو گا کہ ہماری نшал ٹاور برج سے چھلانگ لگا کر دریائے تھامس میں گری۔ کیسی اچھی موت نصیب ہوئی اس بھاگوان کو۔“

وہ بوڑھی خواتین کی نقل اتارتے ہنستے ہوئے اس کا دل جلا رہا تھا۔ نшал کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس شخص کے ساتھ کیا ساری زندگی اسے ایسے ہی بھانپڑے گی؟“

”اب اترو بھی یا میں خود اتاروں تمہیں؟“ اسے حیرت سے اپنی جگہ منجمد دیکھ کر وہ یکلخت سنجیدہ ہوا تھا۔ اس کے کبجے کا سر دپن نшал کی ریڑھ کی ہڈی میں سسٹنا ہٹ دوڑا گیا۔

”مگر میں یہاں اکیلی کروں گی کیا؟“ نшал نے پہلی بار لب کھولے انداز ڈر اسما سنا تھا۔

”انجوائے!“ اس نے یک لفظی بات ختم کر دی، اب بھلا نшал اس قدر ٹھنڈ اور بارش میں کیا انجوائے کیا پاتی۔

”مجھے گھر چھوڑ دیں پلیز۔“ مجھے نہیں جانا کہیں بھی۔ وہ منمناتے ہوئے بول گئی کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

”نو کر ہوں تمہارا“ ہے نا۔ جو تمہارے احکامات پر عمل کرتا پھوں، اترو نیچے۔ ورنہ ابھی پولیس کو بلوا کے تم پر نور زبردستی کا الزام لگا کر تمہیں اندر بھی کروا سکتا ہوں، پھر سڑتی رہنا جیل میں۔“ وہ پولا نہیں غرایا تھا۔ نшал سسم کے گاڑی سے اتر گئی تھی۔ اب کی بار وہ اسے اترتے دیکھ کے دلکشی سے مسکرایا۔

”اس سیٹ پر میرے ساتھ وہی بیٹھے گی جو اس سب کی حق دار ہے۔ جو صحاب احمد کے دل کے قریب ہے۔“

وہ اسے اس کی اوقات یاد دلاتا زن سے گاڑی بھاگا کے لے گیا تھا۔ ٹاور برج کے پاس وہ اکیلی کھڑی بیٹھ گئی تھی۔ دریائے تھامس کی سطح پر بارش کے قطرے موتیوں کی مانند گر رہے تھے۔ ان موتیوں میں نшал

کے آنسو بھی شامل ہو گئے۔ وہ برف سے ٹھنڈی تھی۔ مگر اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ آج تو وہ اپنا برس بھی گھر بھول آئی تھی۔ بارش کی وجہ سے سب لوگ گاڑیوں میں ہی سفر کر رہے تھے۔ ورنہ تو زیادہ تر لوگ واک کرتے ہی نظر آیا کرتے تھے۔

ایک گھنٹہ وہ وہاں کھڑی روتی اور بھیکتی رہی۔ دفعتاً اسے ایک خیال آیا تھا۔ اپنے نصیب پر ڈھیر سارا روچکنے کے بعد اس نے اپنے سوئٹری جیب میں ہاتھ ڈالا تو خوش قسمتی سے اسے اپنا موبائل مل گیا تھا، یہ موبائل اسے رباح نے لے کر دیا تھا، تاکہ کسی بھی مشکل یا پریشانی میں وہ انہیں کال کر سکے اور اکثر یونی ورٹی جاتے، اگر وہ بھی راستہ بھول جاتی یا اسے کہیں اور جانا ہوتا تو وہ رباح سے رابطہ کرتی تھی۔ وہ اسے فون پر سارا راستہ سمجھا دیا کرتی تھی۔ رباح اور باصد دونوں کے نمبرز اس میں محفوظ تھے۔ اس نے جلدی سے رباح کا نمبر ملایا تھا۔ مگر اس کا نمبر بند تھا۔ وہ اس وقت اپنے کلینک میں ہوا کرتی تھی۔ اسی لیے اس کا موبائل آف ہوا کرتا تھا۔ پھر اس نے باصد کو کال ملائی تھی، مگر وہ اٹھا نہیں رہا تھا۔

نшал کو جی بھر کر رونا آیا، اسے لگا آج وہ ایک بار پھر سخت سردی میں یونہی کھڑی رہے گی، اس روز تو اسے رباح نے بچا لیا تھا، مگر اب اسے کوئی بچانے نہیں آئے گا۔ روتے روتے وہ اسی برج کے پاس سائڈ پر نیچے زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ آتی جاتی گاڑیوں میں محو سفر لوگ اس دیوانی سی لڑکی کو حیرت سے دیکھتے گزر رہے تھے۔ پھر آگے بڑھ جاتے کہ ایسے نمونے لندن میں ہزاروں کی تعداد میں تھے شاید وہ بھی یہی سمجھے ہوں کہ ایک چوبیس، پچیس سالہ لڑکی بارش میں بیٹھی کتنی دیر زندہ رہنے کا ورلڈ ریکارڈ بنا رہی ہے۔ تاکہ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اپنا نام شامل کر سکے۔ مگر کے ہی سہی۔

آدھا گھنٹہ مزید گزر گیا تھا، جیسی اس کا سیل فون بجا تھا۔ بارش تو ختم چکی تھی، مگر سر دپن خہوا ابھی چل رہی تھی۔ نшал پر پکپی طاری ہو گئی تھی۔ اس نے

نعمت غیر حرقہ کے طور پر پیل کو جلدی سے نکال کر دیکھا۔ باصد کی کالی آ رہی تھی۔ غم سے اس کی آواز حلق میں ہی دم توڑ گئی۔ کال ختم ہو گئی، مگر وہ پھر بھی روتی ہی رہی۔ کال پھر دوبارہ آنے لگی۔

نشال نے خود کو سنبھالتے اسے ساری بات کہہ سنائی تھی۔ باصد اپنا سر پکڑ کر رہ گیا تھا۔ پھر اپنے آنے کا کہہ کے فون بند کر دیا تھا۔ پندرہ منٹ کی ریش ڈرائیونگ کے بعد وہ اس کے سامنے تھا۔ اس نے سب سے پہلے اپنا رین کوٹ اسے پہنایا، پھر اسے گاڑی میں لے جا کے بٹھایا۔

سرودی سے اس کے ہونٹ نیلے ہو رہے تھے۔ بارش میں مکمل طور پر بھیگی وہ کانپ رہی تھی۔ وہ اس کی حالت کو افسوس سے دیکھتا اب بھیجے خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا تھا۔ وہ اسے اپنے اپارٹمنٹ لے آیا تھا، وہ اسے دوبارہ صاحب احمد کے گھر چھوڑنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اس نے اسے کپڑے تبدیل کرنے کو کہے تھے۔ وہ رباح کے کمرے میں چلی گئی تھی۔ تب تک باصد نے چائے کے ساتھ انڈے ایل لیے تھے۔ اسے ہیئر کے سامنے بٹھا کے کبل اوڑھا کے اسے چائے کے ساتھ دو ایلے انڈے کھلانے کے بعد اس نے اسے پین کلروڈی تھی، تاکہ اسے بخار نہ ہو اور سرودی کا اثر زائل ہو سکے۔

گرم گرم چائے پی کر اس نے خود کو کچھ بہتر محسوس کیا تھا۔ اس پر غنودی طاری ہونے لگی تھی۔ پھر اسے نیند آگئی تھی۔ نہ جانے وہ کتنا سوئی تھی، جب اٹھی تو رباح اور باصد کو اپنے سامنے پریشان بیٹھے دیکھا۔

”تم ٹھیک ہو نشال۔“ رباح نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھتے پوچھا تو اس نے آہستگی سے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”گندہ میں نے تمہارے لیے سوپ بنایا ہے تمہو پی لو۔ پھر کچھ مزید بہتر محسوس کرو گی۔“

”رباح!“ وہ اٹھ کر جانے لگی نشال نے تو رباح کا ہاتھ پکڑ کر تھام لیا تھا۔ وہ بے ساختہ رک گئی تھی۔

”مجھے گھر جانا ہے؟“ وہ جھجکتے ہوئے بمشکل

تمام بول پائی۔

”بھی بھی وہاں جانا چاہتی ہو۔ اس سب کے بعد بھی؟“ رباح پلٹ کر اس تک آئی تھی۔ نشال نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

”میں جاؤں گی رباح۔ اپنے گھر کو بچانے کے لیے میں کچھ بھی کروں گی۔ اس کا ہر ظلم و ستم برداشت کروں گی میں۔“ نشال کے کنبے میں مضبوطی تھی۔

”کیا تم صاحب احمد سے محبت کرتی ہو جو اس کا تشدد سننے پر مجبور ہو تم؟“ رباح نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”نہیں۔۔۔ اسے لگتا ہے کہ میں ایک کمزور لڑکی ہوں اور اس کے ساتھ نبھائیں۔ سکتی میں اس کے

اس خیال کو غلط ثابت کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ بے آواز رو رہی تھی تب ہی باصد چلا آیا، ان کی گفتگو کا آخری حصہ اس نے سن لیا تھا۔

”وہ ایک نفسیاتی مریض ہے نشال! اور پاگلوں کے ساتھ مقابلے نہیں کیے جاتے۔“ وہ بڑا اسے شدید

تاؤ آ رہا تھا دل کرتا تھا صاحب احمد کا جاکے منہ توڑ دے، جس نے ایک کومل اور معصوم لڑکی کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کیا تھا۔

”تم باہر چلو باصد۔ نشال تم اگر بہتر محسوس کر رہی ہو تو ٹھیک ہے، میں تمہارے لیے سوپ لے آتی ہوں۔ تمہیں باصد چھوڑ آئے گا۔“ رباح نشال سے

کہتے باصد کا ہاتھ تھام کے باہر نکل گئی تھی۔ باہر آ کے باصد رباح پر چلا اٹھا تھا۔

”تم اس کی حالت دیکھنے کے باوجود بھی اسے بھیج رہی ہو صاحب احمد کے گھر۔ حیرت ہے رباح۔“ رباح نے اس کے برہم تاثرات کو سنجیدگی سے سنا۔ پھر سینے پر دونوں بازو لپیٹے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”وہ خود وہاں جانا چاہتی ہے باصد کمال! میں اسے مجبور نہیں کر رہی اور تم پلیز ریلیکس رہو۔ تمہیں

نشال کی زیادہ ٹینشن نہیں لینی چاہیے کیونکہ مجھے وہ دقت بھی یاد ہے جب تم اسے اس گھر میں رہنا ہی نہیں دینا چاہتے تھے۔“ وہ الفاظ چبا رہی تھی۔ رباح صدیقی کو

شدید غصہ آ رہا تھا۔ باصد کمال پر۔ اچانک اس کی

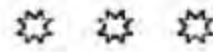
ساری ہمدردیاں نشال کے ساتھ کیوں ہو گئی تھیں وہ بہت کچھ سمجھ کے بھی نہیں سمجھتا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ ایک مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی، ہار ماننا اس کی سرشت نہ تھی اور اپنے حق کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔

”اس وقت بات اور تھی رباح۔ اب وہ میری دوست ہے اور ایک دوست ہونے کے ناتے مجھے اس کی فکر ہونی ہی چاہیے۔“ یہ کہہ کے وہ وہاں رکا نہیں تھا، بلکہ غصے سے پیر پختا وہاں سے چلا گیا تھا۔ رباح صدیقی اس کی پشت پر نگاہیں جمائے اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔ رباح اسے خود چھوڑنے آئی تھی۔ باصد نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ رباح نے اسے صاحب احمد کے دروازے پر اتار دیا تھا۔

”تم اندر نہیں آؤ گی رباح!“ نشال نے اترتے سے پوچھا تو رباح نے نفی میں گردن ہلا دی تھی۔

”بہتر ہے میں اندر نہ ہی آؤں نشال۔ خواہ مخواہ میں اگر میں غصے میں صاحب کے سامنے کچھ بول گئی تو تمہارے لیے مسئلہ ہو جائے گا۔ اپنا خیال رکھنا اور خود کو اکیلا مت سمجھنا۔ صاحب کبھی نہ کبھی تمہارے صبر کے سامنے گھٹنے ٹیک ہی دے گا۔“

نشال نے رباح کو حیرت سے دیکھا، کیونکہ اس نے پہلی مرتبہ صاحب احمد کے حوالے سے کوئی اچھی بات کہی تھی۔ امید افزا، حوصلہ کن، نشال نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔



”آگئی ہو نشال۔ بیٹا بہت دیر لگا دی۔“ وہ جیسے ہی اندر آئی نواب انکل کو لاؤنج میں متفکر بیٹھا دیکھ کر وہ ان کی طرف چلی آئی۔ کیا صاحب احمد نے اپنی حرکت اپنے باپ کو بتا دی تھی؟

”آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں انکل؟“ وہ ان کی طرف بڑھ آئی، کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔

”ہاں بس۔ ابھی تک صاحب بھی نہیں آیا۔ کل مجھے چلے جانا تھا تو سوچا کچھ دیر آپ لوگوں کے ساتھ

گزار لوں۔“ انہوں نے اپنے جاگنے کی وجہ پیش کی، نشال سر ہلا کے رہ گئی تھی۔

”تمہیں کون چھوڑ کے گیا ہے یہاں؟“ نشال کے بڑھتے قدم رک گئے۔ وہ ٹھٹھک کے پیچھے مڑی۔

”کیا مطلب۔۔۔ آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔“

وہ رکی پھر پلٹی۔

”صاحب احمد کا فون آیا تھا کہ ڈنر کے بعد اس نے تمہیں رباح اور باصد کے گھر چھوڑ دیا ہے، تمہارے کہنے پر۔ اور خود وہ دوستوں کے ساتھ کہیں چلا گیا ہے، لیٹ آئے گا، اسی لیے میں نے سوچا کہ تمہیں کون چھوڑ کے گیا ہے۔“ نشال اس غلط بیانی پر ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی، ویسے بھی وہ نواب انکل کو کچھ بھی بتانا نہیں چاہتی تھی، کل انہیں واپس چلے جانا تھا، سو وہ انہیں خواہ مخواہ میں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا فائدہ بھی تو کوئی نہیں تھا۔ وہ جوایا، اسے ہی صبر کی تلقین کرتے جو نشال بہت کر رہی تھی۔

”رباح چھوڑ کے گئی ہے مجھے۔ آپ نے کھانا کھا لیا کہ نہیں؟“ دل تو اس کا چاہ رہا تھا کہ جا کے بستر پر لیٹ جائے، مگر اسے نواب انکل کا احساس تھا، ان کا بیٹا بے سروت و بے حس تھا، مگر وہ نہیں بن سکتی تھی۔

”میں اپنے دوست کے ساتھ تھا۔ ڈنر اسی نے کروا دیا تھا۔ رباح بیٹی اندر نہیں آئی۔ کیا جلدی میں تھی؟ وہ شاید گفتگو کے موڑ میں تھے۔“

”اسے کچھ جلدی تھی، اسی لیے وہ نہیں آئی۔ مگر آپ کو سلام کہہ رہی تھی وہ۔“

”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ مجھے تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی، تم جا کے آرام کرو اب۔“ نشال نے انہیں ممنون نگاہوں سے دیکھا۔ بالآخر انہوں نے خود ہی احساس کیا تھا۔

”آپ بھی اب آرام کریں انکل۔ صاحب احمد تو لیٹ آئیں گے۔“ نشال گزشتہ راتوں کو دھیان میں رکھتے انہیں کہہ گئی تھی۔

رات بہت دیر سے صاحب احمد کمرے میں آیا تھا۔ نشال کمرے میں دبی صوفے پر لیٹی تھی۔ صاحب احمد

اس نے یہ خریدی کب اور مجھے نہیں دکھائی اس نے؟“ رباح نے اسے تفصیل سے آگاہ کیا۔
”یاد نہیں رہا ہو گا نا اسے۔ پریشان بھی تو بہت رہتی تھی بے چاری۔ خیر تمہیں کیوں برا لگ رہا ہے۔“ باصد دل کا درد چھپائے بظاہر نارمل انداز میں پوچھ رہا تھا۔
”مجھے برا کیوں لگے گا۔ میں تو محض ایک بات کر رہی ہوں۔“

یہ کہہ کے وہ واپس پلٹ گئی تھی، مگر باصد کمال کے دل میں نیزے کی اپنی گڑ گئی، نشال نے اس کا تحفہ قبول نہ کر کے اسے دکھی کر دیا تھا۔



یہ احمد نواب انگل کے جانے کے پندرہ دن بعد کی بات تھی۔ اس دوران صاحب احمد کا رویہ نشال کے ساتھ لیا دیا سا تھا۔ ان دونوں کے درمیان بات چیت مکمل طور پر بند تھی۔ نواب انگل کے جانے کے بعد نشال از خود ہی ان کے کمرے میں شفٹ ہو گئی تھی۔ صاحب احمد جو دکھاوا نواب انگل کے سامنے کر رہا تھا، اب وہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ نشال کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

ایک مرتبہ اس کے دوست آئے تھے نشال کو اس نے اپنے سب دوستوں کو مشروب پیش کرنے کو کہا، اس نے اس کے دوستوں کے سامنے انکار کر دیا تھا۔ صاحب احمد کو اس کا انکار بری طرح سے کھلا تھا۔ اس نے بھری محفل میں اسے تھپڑ مارا تھا۔ نشال اونیدھے منہ ان سب دوستوں کے درمیان میز پر جا گری تھی۔ اس کے گرنے سے کلچ کے گلاس کا ایک کونہ نشال کی ناک میں چبھا تھا۔ خون کا فوارہ سا بلند ہوا تھا۔

”بناؤ سب کے لیے۔“ وہ اسے مارنے کو لپک رہا تھا۔ جب ہی اس کے ایک انگریز دوست نے اسے تھام لیا تھا۔ وہ اس کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا، بلکہ ان کے جانے کے بعد اور بھی زیادہ نکلا تھا۔ اس نے سزا

اسے دیکھ کے غصہ سے پاگل ہو گیا۔ اسے نشال سے اس قدر دھٹائی کی امید نہیں تھی۔ اس کی اتنا پر نشال کی اس حرکت سے تازیانہ بڑا اٹھا۔ وہ بلبلا اٹھا تھا اور اس کا بلبلانا نشال کے حق میں کسی طور بھی اچھا نہیں تھا۔ نشال اس کے عزائم سے بے خبر گری نیند میں گم سو رہی تھی۔



رباح کی اس روز چھٹی تھی، وہ پورے گھر کی صفائی میں مگن تھی۔ باصد اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ بہت عرصے بعد ان کا معمول درست ہوا تھا، ورنہ تو نشال نے ان کی عادتیں بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ رباح نے نشال کے کمرے کی صفائی کی تھی۔ تب ہی اس کی الماری میں اس کی ضرورت کی چند دوسری اشیاء کے ساتھ اسے وہ ساڑھی نظر آئی تھی۔

گہرے جامنی رنگ کی پیور شیفون کی ساڑھی اسے اچھے سے یاد تھا کہ باصد نے وہ ساڑھی اسے خریدنے کا کہا تھا، مگر اس نے وہ ساڑھی نہیں خریدی تھی، لیکن شلوار قمیص ضرور خرید لی تھی۔ اور وہ اس روز سیمینار میں وہی پہن کر بھی گئی تھی۔ تو کیا یہ ساڑھی نشال نے اپنے لیے خریدی تھی، مگر کب۔ اور اس نے رباح کو وہ ساڑھی دکھائی کیوں نہیں تھی؟ وہ الجھ گئی تھی اور غلط نہیں الجھی تھی، وہ ساڑھی اٹھائے باہر لاؤنج میں چلی آئی۔

”باصد تمہیں یہ ساڑھی یاد ہے، ہم نے کہاں دیکھی تھی؟“ باصد نے سر اٹھا کر دیکھا تو منجھد ہو گیا، اس کا دیا تحفہ نشال نے قبول نہیں کیا تھا۔ اسے دکھ ہوا تھا۔

”باصد۔ میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔“ وہ اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”ہاں۔ شاید۔ دیکھی دیکھی سی لگ رہی ہے؟“ اس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

”یہ مجھے نشال کے کمرے سے ملی ہے، اس کی چیزوں کے درمیان رکھی ہوئی۔ مگر مجھے حیرت ہے کہ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف ایڈفرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- Open Paksociety Page.
- Click Liked.
- Select Get Notifications.
- Select See First.

All Done

کے طور پر ساری رات ننگے پیر نشال کو گھر سے باہر رات گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نشال سر دھندلی زمین پر ساری رات بیٹھی روتی ہی رہی۔ مگر صاحب احمد کو اس پر ترس نہیں آیا تھا۔ دوسری صبح وہ خاصی دیر سے اٹھا تھا۔ ایک لڑکی صبح ہی صبح گاڑی میں ان کے گھر آئی تھی۔ وہ گولڈن بالوں والی بے حد سفید رنگت والی بہت نازک سی خوب صورت لڑکی تھی۔ چند لمحے کے لیے نشال بھی اسے دیکھ کے مبسوت رہ گئی تھی۔ اس نے بڑی بے نیازی سے جا کے بیل بجائی تھی۔ صاحب احمد نے دروازہ کھولا اور اسے بے اختیار گلے سے لگایا تھا، مگر اس نے ایک نگاہ غلط بھی نشال کے وجود پر ڈالنا گوارا نہیں کی تھی۔ شاید وہ صاحب احمد کی کوئی بہت خاص اور قریبی دوست تھی۔ اس کے لیے صاحب احمد کا التفات دیدنی تھا۔ صاحب احمد اس کے کندھوں کے گرد بازو حائل کرتے اسے اندر لے گیا تھا۔ نشال نے اس وقت کو موقع غنیمت جانتے گھر کے اندر قدم رکھ دیا تھا۔



مزید کچھ روز گزرے جب وہ لڑکی پھر ان کے گھر آئی تھی۔ اسی روز نشال کو پتا چلا وہ صاحب احمد کی وکیل تھی اور شاید گرل فرینڈ بھی۔ وہ اس کے پاس کچھ کاغذات لائی تھی۔ صاحب احمد ان کاغذات کو دیکھ کے جھوم اٹھا تھا۔ بے پایاں خوشی اس کے انگ انگ سے پھولی پڑ رہی تھی۔

بے ساختہ وہ اس آئرش لڑکی کو گلے لگا کے جھوم رہا تھا۔ وہ لڑکی بھی بے تحاشا خوش تھی۔ یوں لگتا تھا گویا انہیں ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی اور انہیں واقعی میں ہفت اقلیم کی دولت ہی ملی تھی۔

”تمہارا بہت شکریہ نشال۔ تمہاری وجہ سے ڈیڈ نے میرا مطالبہ اتنی جلدی پورا کر دیا۔“ وہ نشال کا شکریہ ادا کر رہا تھا اور نشال کم ختم اس کے اطوار دیکھتی خاموش کھڑی رہی تھی۔

”پوچھو گی نہیں کہ میرا مطلب کیا تھا، مگر ٹھہرو۔“

پہلے تمہیں اس کا انعام دے دوں؟“ وہ خباثت سے ہنسنے لگا۔ اسے الجھا رہا تھا۔ ”اچھا تم بتاؤ پہلے اپنا انعام لو گی یا میرا مطالبہ سنو گی۔“ وہ بہت دوستانہ انداز میں پوچھ رہا تھا، یوں لگتا تھا دونوں میں صدیوں پرانی آشنائی ہو جیسے؟ وہ خاموش ہی رہی۔

”بے چاری شاگ کی کیفیت میں ہے۔ تم اسے خود ہی بتاؤ؟“ آئرش لڑکی نے چیخے والے انداز میں کہتے اس کے ساتھ ہمدردی جتائی تھی۔ صاحب احمد نے اس لڑکی کو محبت پاش نظروں سے دیکھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو ڈار لنگ۔ میں اسے خود ہی بتا دیتا ہوں، تم مجھے نشال عبید اللہ کا انعام پکڑا دو ذرا۔“ وہ اس کے نام کے الفاظ چباتے بظاہر مسکرا رہا تھا۔

”میرا مطالبہ ڈیڈ کی جائیداد میں میرا حصہ تھا۔“ نشال کے سر پر دھماکا ہوا اور وہ دھماکا ہی تو کرنا چاہتا تھا۔ ”مگر ان کی شرط تھی کہ میں تمہارے ساتھ شادی کر لوں، تب وہ مجھے یہ جائیداد میں حصہ دیں گے۔ میں نے اپنے پلان کے مطابق تمہیں گھر میں پناہ دے دی، ان کے کہنے پر۔“

نشال کو یاد آگیا اس روز جب وہ پہلی بار نواب انکل کے ساتھ گھر آئی تھی، تو صاحب احمد کس قدر غصے میں تھا، تو کیا یہ وہی مذاکرات و مطالبات ہوئے تھے ان باپ بیٹے کے درمیان۔ وہ ایک سفید لافا ہاتھ میں تھامے اس تک پہنچ آیا۔

”مجھے تمہیں کبھی بھی نہیں اپنانا تھا نشال عبید اللہ! اس کے لیے تمہیں اتنی محنت کی ضرورت بہر حال نہیں تھی۔“ وہ اس کے سر اے کو طنز کے نشانے پر رکھتے بولا۔ نشال کا سر شرم سے جھک گیا۔

”صاحب احمد صرف ظاہر سے متاثر نہیں ہوتا اور اگر وہ ایک بار کوئی فیصلہ کر لے تو پھر اس سے مکرنا اس کی مردانگی کے خلاف ہے۔ چاہے اس میں اس کا کوئی نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ خیر بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں بتا رہا تھا کہ ڈیڈ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر ایک ماہ بھی میں تمہارے ساتھ رہا تو وہ مجھے دوسرے مہینے کے پہلے ہی ہفتے میں میری جائیداد کی پاور آف

طلاق کے کاغذات اور برواشت کی بات صحاب احمد کر رہا تھا اس نے کیا برواشت کیا تھا۔ بھلا اس نے تو اسے ہر طرح سے ایذا دے کر اپنی انا کو تسکین پہنچائی تھی، کیا انصاف تھا اور یہ کیا منصف تھا۔ جو تکلیف و اذیت دینے کے باوجود صبر کی بات کر رہا تھا۔



باصد نے دروازہ کھولا تھا۔ سامنے کا منظر اس کے وجود کو زلزلوں کا جھٹکا دیتے گہری پاتل میں گر آیا تھا۔ اس کے سامنے نشال کا بت کھڑا تھا لٹا ہوا۔ مجروح سا۔ باصد کمال کا دل کٹ کٹ کے گرا۔ باصد کمال سامنے سے ہٹ گیا، مگر نشال گھر کے اندر نہیں آئی وہیں کھڑی رہی، غائب و ماغی سے، کسی غیر مرئی لفظ پر نگاہیں جمائے باصد کو لگا وہ اپنے ہوش کھو چکی ہے اور شاید بیچائی بھی، کس قدر مشکل تھا اسے اس حالت میں صبر کی تلقین کرنا اسے جو سراپا صبر کا پیکر تھی اور شاید جس نے زندگی میں صبر کرنے کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر کام کیا ہی نہ تھا۔ ایک وقت آتا ہے جب الفاظ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، پھر الفاظ کے پیچھے بھاگنے کے باوجود بھی وہ ہاتھ نہیں نکلتے۔ تسلی کے محض دو حروف زبان کا ساتھ نہیں دیتے، ذہن صاف سلیٹ کی مانند ہو جاتا ہے۔ جیسے باصد کمال کا نشال عبید اللہ کو دیکھ کے ہوا تھا۔ مگر کچھ نہ کچھ تو کہتا تھا۔ ہوش تو نشال کھو رہی تھی، باصد کمال کو کم از کم حوصلے سے کام لینا تھا۔

”اندر آؤ نشال۔ باہر بہت ٹھنڈ ہے؟“ باصد نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اندر لانا چاہا تو وہ چونکی، غائب و ماغی سے باصد کو دیکھا، جیسے اپنے وہاں کھڑے ہونے کی توجیہ سوچ رہی ہو۔

”آؤ۔“ وہ اسے اندر لے آیا تھا، نشال نے غائب و ماغی سے اس کی تقلید کی اور الفاظ ترتیب دینے لگی، مگر حروف کی آنکھ پھولی نے اسے جلد ہی تھکا ڈالا تھا۔

”کچھ لوگ۔ چائے کافی؟“ وہ آداب میزبانی بھار رہا تھا۔ شاید انہونی خبر سے کچھ دیر کے لیے فرار حاصل کرنے کے لیے کیونکہ وہ جانتا تھا، پھر کچھ نارمل نہیں

اٹارنی میرے حوالے کروں گے اور دیکھو دل پر جبر کر کے ہی سہی، مگر میں نے تمہارے ساتھ اس گھر میں ایک ماہ گزار ہی لیا۔ اب کاغذات میرے ہاتھ میں ہیں، سوڈیٹ وائف اب ہمارا ایک ساتھ رہنا ضروری نہیں۔ تم ایک اچھی لڑکی ہو، ان فیکٹ کافی سخت جان بھی۔ سو مجھے یقین ہے تمہیں کوئی بھی تمہارے جیسا مل جائے گا، مگر صحاب احمد کا ساتھ اور اس کی محبت تمہارے نصیب میں نہیں ہے، یہ محبت خوش قسمت لوگوں کو ملتی ہے اور وہ خوش نصیب لڑکی جیڑ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔“ اس نے محبت سے مسکرا کے اس آئرش لڑکی کی طرف دیکھ کے کہا تھا۔ نشال پتھر کا بت بنی تھی۔

”اب یہ رہا تمہارا انعام۔ اس میں تمہارے طلاق کے کاغذات ہیں، ساتھ ہی پاکستان جانے کے لیے ٹکٹ اور کچھ پیسے بھی۔ میں شام کو لوٹوں گا۔ امید ہے اس وقت تک تم اس گھر سے جا چکی ہو گی، ہے ناں؟“ وہ اس کا گال آہستگی سے تھپتھپاتے سفید لفافہ اس کے ہاتھ میں تھا، کے جیڑ کا ہاتھ پکڑ کر چلتا بنا تھا۔ نشال کے وجود سے خون کی ایک ایک بوند نچر گئی۔ اس نے تو صبر کی انتہا کر دی تھی، پھر صحاب احمد کا دل کیوں نہیں موم ہوا تھا؟ اس کے اندر سوالات کر لانے لگے۔

اس نے تو صحاب احمد کا ہر ظلم و ستم سہا تھا۔ فقط اچھے دنوں کی امید میں۔ اس کے نصیب میں وہ اچھے دن کیوں نہیں تھے؟ اس نے سسکی لی۔

اس نے کتنی کوشش کی تھی گھر بچانے کی۔ اس گھر کو بچانے کی جو کبھی اس کا تھا ہی نہیں جس کی بنیاد شروع ہی سے کھوکھلی تھی۔

لی اماں۔ کو بڑھپے میں ان کے غلط فیصلے کا اور اک نہ ہو، اس نے اس پچھتاوے سے انہیں بچانے کو کیا، کیا نہیں برواشت کیا تھا۔ صحاب احمد کا ناروا ہتک آمیز رویہ۔ اس کے آئے مہمانوں کی طنزیہ باتیں، صحاب احمد کی گرل فرینڈ کی طنزیہ باتیں، ان کے مقصد۔ کس کس بات پر اس نے صبر نہیں کیا تھا، مگر نتیجہ کیا نکلا۔ یہ

رہائے گا۔

”تھوڑا سا زہر دے دو مجھے باصد!“ نشال نے اپنی ہنسی کا گلا دیا۔

”تمہاری موت سے کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوگا نشال اور اسے تو بالکل بھی نہیں جس کی خاطر تم یہ قدم اٹھاؤ گی۔“ وہ پلٹ کر اس تک آیا تھا نشال نے بھیگی نگاہیں اس کے خوب صورت چہرے پر نکا دیں۔

”اس نے مجھے طلاق دے دی ہے باصد! اس کا مقصد پورا ہوا تو اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ اس نے کہا وہ مجھے برداشت کرتا رہا ہے۔ میں نشال عبید اللہ اتنی ارزاں ہستی ہوں۔ اتنی قابل نفرت کہ مجھے برداشت کیا جائے۔ میں محبت کے قابل نہیں ہوں باصد۔“

وہ ڈبڈبائی نگاہوں سے باصد کی طرف دیکھتی اس سے پوچھ رہی تھی اس کے ٹوٹے لہجے میں کالج کی چیبن تھی جو باصد کمال نے اپنے دل پر بڑی محسوس کی وہ ایک لمحہ جس میں باصد کمال قید ہو گیا باصد کمال اسے تسلی بھی نہیں دے پایا۔ اس نے اسے سکون آور دوا کے ساتھ چائے کا کپ دے کے کچھ دیر کے لیے زبردستی سلا دیا اور خود رباح کو کال کرنے لگا۔

رباح بھی فوراً ہی آگئی تھی۔ باصد نے اسے مضطرب سے انداز میں تمام صورت حال کہہ سنائی تھی۔ رباح کا وجود سناٹوں میں گھر گیا تھا۔ دونوں ہی نشال کے لیے دکھی و غم زدہ تھے کیونکہ وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ نشال نے نباہ کرنے کی آخر کردی تھی۔

”اب اس کا مستقبل کیا ہو گا باصد؟“

”کچھ وقت تو لگے گا اسے سنبھلنے میں۔“ باصد کے لہجے میں تھکن سے زیادہ صدمہ نہاں ہو گیا۔ رباح اور باصد اپنے اپنے طور پر اسے سنبھالنے کی کوشش کرتے نشال بس فکر فکر انہیں دیکھے۔ جاتی۔ ایک ماہ اس کی یہی حالت رہی مگر باصد کمال جلد ہی آگیا مینوں دوستوں کی مثلث اب اپنی اپنی جگہ اجمعی اور پریشان سی تھی باصد کمال کو یہ سب گوارا نہیں تھا تب ہی ایک دن وہ صبح ہی صبح اس کے سر پہ پہنچ گیا تھا۔ نشال اپنے کمرے میں بیٹھی تھی اسے خطرناک تیور لیے دیکھ

کے حیران رہ گئی۔

”چلو اٹھو جلدی سے۔“ وہ آتے ہی چنگی بجا کے حکم دے رہا تھا۔

”کہاں؟“ نشال نے تعجب سے استفسار کیا تھا چند دنوں میں وہ کمال کے رہ گئی۔ دودھ اور گلاب کی گوندھ تو وہ پہلے بھی نہیں تھی مگر اب تو رنگت سنولا کے رہ گئی تھی۔

”میں تمہارا ایکسرسائز انسٹرکٹر ہوں اور زیادہ سوال جواب نہیں پہلے ہی بہت چھٹیاں کر چکی ہو تم اب سیدھی طرح سے اپنا ایکسرسائز میٹ اٹھا کے باہر لان میں آؤ میں تمہارے ساتھ کر رہا ہوں۔“

آ۔۔۔ کوئی سوال جواب نہیں جو کہا ہے اس پر عمل کرو پہلے۔ اس کو بولنے کے لیے لب کھولتے دیکھ کر وہ پہلے ہی اسے ٹوک گیا تھا ناچار نشال کو اس کی تقلید کر پڑی۔

”گڈ۔“ اگرچہ وہ ایکسرسائز کرتی رہوں تو ہمیشہ جوان اور اسماٹ رہو گی۔“ باصد کمال پھر واپس اپنی جون میں لوٹ چکا تھا اس کی لن ترانیاں شروع ہو چکی تھیں۔

”جیسے رباح ہے یا ماہووری ڈکشت۔“ نشال نے شرارت کو لبوں میں دیوچے سوال کیا۔ باصد کمال بے ساختہ ہنس دیا اسے اپنی غلط بیانی یاد آگئی اور اگر رباح کو معلوم ہو گیا کہ اس نے نشال کو اس کے بارے میں کیا بتا رکھا ہے تو وہ یقیناً اس کی جان لے لیتی۔

بھلے وہ عمر کے بارے میں حساس نہیں تھی مگر اس قدر مبالغہ آرائی کون برداشت کر سکتا ہے بھلا۔

”اب اسے نہ بتا دینا ورنہ میں بے چارا مارا جاؤں گا۔“ باصد نے ڈھٹائی سے نشال کو اسے بتانے سے باز رکھا۔

”کیا چھپایا جا رہا ہے مجھ سے؟“ اچانک ہی وہاں رباح آگئی تھی اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا تھا جب سے نشال واپس آئی تھی باصد کمال کی شوخی عروج پر پہنچی ہوئی تھی مگر اسے نجانے کیوں تاؤ آنے لگتا۔

”کچھ خاص بات نہیں ہے۔“ نشال نے باصد کی کچھ دیر پہلے کی گئی سفارش کو ذہن میں رکھتے سرسری لہجہ اپنایا مگر رباح کو اس کا یہ انداز بے جا کھلاؤ ذہن میں جاملی ساڑھی والی بات پھر سے تازہ ہوئی۔

”آریو شیور کہ ایسا کچھ نہیں ہے؟“ تب ہی اس نے سلگتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا ان دونوں میں ایسی گاڑھی کب سے چھنے لگی تھی کہ وہ لوگ اب رباح صدیقی سے رازداری برتنے لگے تھے۔

”تم آج کلینک نہیں جاؤ گی کیا؟“ باصد کمال نے تو ویسے ہی پوچھا تھا مگر رباح کو شاید آج کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا تب ہی یہ سوال بھی اسے دہکا گیا۔

”ہاں۔۔۔ کیوں تمہیں اس گھر میں اچھی نہیں لگ رہی کیا۔ یا تمہاری پرائیویسی میں خلل پڑتا ہے میری وجہ سے؟“ نشال اور باصد نے تحیر سے رباح کو دیکھا وہ اس انداز میں تو کبھی بھی بات نہیں کرتی تھی۔

”رباح! باصد کا یہ مطلب نہیں تھا۔“ نشال نے اس کا غصہ کم کرنے کی کوشش کی۔

”میں اس کا مطلب اچھی طرح جانتی ہوں نشال! تم بچ میں دخل مت دو۔ اپنی دے میں تم سے کچھ بات کرنا چاہ رہی تھی۔“

”جی! نشال سیدھی ہوتے اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔“

”تم نے آگے کا کیا سوچا ہے نشال؟“ باصد کمال نے چونک کر رباح کو دیکھا تھا جو آج اور ہی تیور دکھا رہی تھی۔

”میں واپس جانا چاہتی ہوں پاکستان۔“ نشال بولی تو اس کا لہجہ دھیمّا اور کمزور سا تھا۔

”مگر بی اماں سے کیا کوئی تم۔ پاگل ہو گئی ہو نشال، جن کی وجہ سے تم نے اتنا کچھ کیا اب ایک دم سے انہیں ساری حقیقت سے آگاہ کر دو گی تو سوچو ان پر کیا گزرے گی۔“ باصد غصے سے بولا تھا۔

”کام ڈاؤن باصد کمال۔ بی اماں سے یہ بات ساری زندگی چھپی نہیں رہ سکتی۔ کبھی نہ کبھی تو انہیں یہ سب معلوم ہو گا ہی۔ بہتر ہے کہ پتا چل جائے مگر وہ

نشال کے لیے کچھ اور سوچ سکیں۔ میں تمہاری واپسی کا انتظام کرتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر جانے لگی تو باصد نے روک دیا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔ نشال اکیلی واپس نہیں جائے گی۔ میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔ اور میں نشال کو خود اپناؤں گا کیونکہ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ نشال کا خیال کوئی اور بہتر انداز میں نہیں رکھ سکتا۔“

الفاظ تھے یا پکھلا ہوا سیمس۔۔۔ رباح تو رباح۔ نشال نے بھی حیرت سے اسے دیکھا تھا اور رباح کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ایک عام سی شکل و صورت کی لڑکی نے اسے مات دے دی تھی۔ باصد کمال کے ساتھ وہ دس سال سے تھی وہ اس سے محبت کرتی تھی اور اس نے کیا کیا۔ رباح نے نشال کے ساتھ نیکی کی تھی اور نشال نے اسے کیا صلہ دیا تھا اس سے اس کا منگیتر چھین لیا تھا؟

رباح کو اتنا غصہ آ رہا تھا کہ دل چاہتا تھا کہ ساری دنیا کو آگ لگا دے۔ اس نے باصد کمال سے بات کی تھی۔

”یہ کیا بے وقوفی کی بات کی ہے تم نے باصد۔ تم جانتے بھی ہو کہ ہم کھٹیل ہیں ایک دوسرے سے؟“

”میں سنجیدگی سے یہ فیصلہ کر چکا ہوں رباح! نشال کو جیسے ہم سفر کی ضرورت ہے اس کے لیے سب علاوہ اور کوئی موزوں نہیں ہو سکتا اور پھر تم ہر لحاظ سے نشال سے مضبوط اور الگ ہو تمہیں تو بہت سے ہاتھ تھامنے والے مل جائیں گے مگر نشال کو نہیں ملے گا۔“ باصد نے آہستگی سے اعتراف کر کے اسے سمجھایا تھا۔ مگر رباح تو پھٹ پڑی تھی۔

”دس سال سے میں تمہارے ساتھ رہ رہی ہوں باصد۔ تو کیا اس وجہ سے کہ ایک دن میں کسی سے ہمدردی کر کے اس پر ترس کھا کے اس کی مدد کی غرض سے چند دن اسے اپنے گھر میں رکھوں اور تمہیں ساری زندگی کے لیے اس کے حوالے کروں۔ کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں اتنا ظرف دکھا پاؤں گی۔“ وہ صدمے سے چور تھی۔

”مجھے خود بھی نہیں معلوم رباح۔ مگر میں نشال سے محبت کرنے لگا ہوں کب سے؟ مجھے خود بھی پتا نہیں مگر جیسے وہ میرے اندر رہا ہر سانس تک ہے۔ اس کے بغیر میرے لیے جینا بے معنی ہو گا۔“ اس کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔ رباح نے خود کو عرش سے فرش پر گرتے دیکھا۔

”نشال تم نے اچھا نہیں کیا۔ میں نے تمہارے ساتھ برا تو نہیں کیا تھا؟ وہ بڑی ملائی تھی اس کی ذہنی حالت اس وقت بے حد مخدوش ہو رہی تھی۔“

”نشال کو دوش مت دو رباح۔ اس بے چاری کو تو اس بات کی خبر تک نہیں ہے۔“ باصد نے فوراً نشال کی حمایت کی مگر رباح اپنے ہوش میں نہیں تھی اسے تو یہ سوچ سوچ کر ہی وحشت ہو رہی تھی کہ باصد کمال نے اس کی محبت پر نشال کو ترجیح دی ہے۔ ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی ساری زندگی محنت سے پائی پائی جوڑ کے رکھے اور ایک دن کوئی غاصب اس محنت کی کمائی لے اڑے۔ اور نشال غاصب ہی تو تھی جس نے جانتے بوجھے رباح کی محبت پر شب خون مارا تھا۔ وہ انجان تو نہیں تھی وہ تو اچھے سے جانتی تھی کہ رباح صدیقی کتنی پاگل ہے باصد کمال کی ذات کے لیے باصد کمال کی خاطر وہ ڈبل ڈیوٹی کر رہی تھی تاکہ جب ان دونوں کی شادی ہو تو ان کی بچت۔ ان کے کام آسکے۔ ان دونوں کو زیادہ محنت نہ کرنا پڑے بلکہ وہ ایک دوسرے کو وقت دے سکیں۔ جب باصد لندن آیا تھا تو اس کے پاس اکثر سمسٹرز کی فیس بھرنے کے پیسے نہیں ہوتے تھے وہ نو ساؤتھ ویلز کی یونیورسٹی آف ویلز سے ایم بی اے کر رہا تھا۔ ایسے میں رباح اسے پیسے دے کے اس کے سمسٹر کئے نہیں دیا کرتی تھی۔

رباح کبھی پاکستان نہیں گئی تھی۔ والدین وفات پا چکے تھے اور دوسرا کوئی خونی رشتہ تھا نہیں۔ رباح کا ہر رشتہ ہر نانا باصد کمال سے وابستہ ہو گیا تھا اس کی ساری دنیا وہ ایک شخص تھا۔ رباح کے ایک ایک انداز سے اس بات کا اظہار ہوتا تھا۔ پھر باصد کمال سمجھ کیوں نہیں پایا تھا۔ اسے تین چار ماہ میں نشال کی دکھ بھری زندگی کی آزمائشیں نظر آئی تھیں۔ نو دس سال

سے رباح کی محنت نظر کیوں نہیں آسکی تھی؟ اس نے تو نشال کی مدد کی تھی اس کے رشتوں کو اپنا مان کے بی اماں کو دکھ سے بچانے کے لیے باصد کو صاحب احمد بننے پر مجبور کیا تھا وہ سچ سچ اس کی جگہ لے لے گا اسے یہ خبر کیوں نہ ہو سکی تھی۔ وہ تو بہت سمجھ دار تھی چہرے و آنکھوں کی زبان پڑھ لیا کرتی تھی پھر وہ نشال اور باصد کا اصل چہرہ کیوں نہیں دیکھ پائی تھی۔ کہاں غلطی ہوئی تھی اس سے اور کہاں کی رہ گئی تھی اس کی محبت میں۔ جو اسے آج یہ دن دیکھنا پڑ رہا تھا۔



نشال اپنے کمرے میں تھی وہ ابھی ابھی نماز پڑھ کے اٹھی تھی۔ تین دن سے رباح اور اس کے درمیان بول چال بند تھی۔ نشال ایک دو مرتبہ اس سے بات کرنے کی غرض سے گئی بھی تھی مگر اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا تھا۔ نشال تصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو مجرم تصور کرنے لگی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی صفائی نہ دے سکی حالانکہ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ باصد کمال اب بھی اسی کا ہے۔ اس نے کبھی اسے رباح سے چھیننے کی کوشش نہیں کی۔ وہ تو اس کی محسن تھی اس کی وجہ سے اسے یہاں لندن میں اپنا پن اور سہارا ملا تھا اور وہ ہرگز بھی خود غرض اور غاصب نہیں تھی کہ اپنے آنسو پونچھنے والی ایک مخلص اور بے ریا لڑکی کی آنکھوں میں آنسو سجائی۔ مگر وہ اسے یہ سب کیسے کہہ پاتی وہ تو اس کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی۔ اس لیے اس نے ایک حل ڈھونڈ لیا تھا اور اس پر ہی عمل کر رہی تھی۔ مگر اسی شام جب وہ اپنی پیکنگ کر رہی تھی وہاں رباح چلی آئی تھی۔ اس کی رت جھگمے کی غماز آنکھوں میں درد ہلکورے لے رہا تھا اس کی اجڑی حالت نشال کا دل چیر کے رکھ گئی تھی۔ محبت نے اسے محض تین روز میں صحرا کی مانند اجاڑ دیا تھا۔ تو کیا محبت کے پھڑنے کا غم اتنا جان لیوا ہوتا ہے؟ نشال نے اسے دیکھ کے سوچا تھا۔

”نشال کہاں ہے؟“ باصد کمال کڑے تیور لیے بے حد سنجیدگی سے سوال کر رہا تھا۔

”کھانا لگاؤں۔ میں نے تمہارے انتظار میں ابھی تک نہیں کھایا۔“ رباح نے اس کا سوال شاید غور سے سنا ہی نہ تھا۔

”میں تم سے نشال کے بارے میں پوچھ رہا ہوں رباح۔“ وہ درشت انداز میں دھاڑا تھا۔

”وہ چلی گئی واپس۔“ رباح نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

”کیا؟“ باصد کمال پر ساتوں آسمان ایک ساتھ گرے۔

”تم نے اسے جانے دیا رباح؟“ باصد کمال کے لہجے میں تحیر تھا یوں جیسے اسے امید نہیں تھی کہ وہ یوں نشال کو جانے دے گی۔

”تو اسے روک کے کیا کرتی۔ اس کے ساتھ ہم روپی کا نتیجہ بھگت تو رہی ہوں اس وقت۔“ اس نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں جتلیا یا۔ باصد کمال اپنا سر پکڑ کے رہ گیا۔

”تم نے اس کی ذمہ داری لی تھی تو اسے نبھایا تو ہوتا رباح صدیقی۔ بس اتنی ہی ہمت تھی تم میں۔ دعوے تو بڑے بڑے کیے تھے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کے۔“

”اس کی خوشی تو پھر تم تھے باصد کمال اور میری محبت کا ظرف اتنا وسیع نہیں کہ تمہیں خود اپنے ہاتھوں سے اسے دے دیتی۔“ رباح کے حلق میں ٹھمکین پانی جمع ہونے لگا اس کی محبت کس قدر برگشتہ و بدگمان ہو رہی تھی اس سے۔

”یہ تمہاری محبت نہیں خود غرضی ہے رباح صدیقی۔ تمہیں اچھا لگتا ہے کہ ہر بندہ تمہارے ماتحت رہے خصوصاً“ باصد کمال کیوں کہ اسے تو تم نے خرید رکھا ہے نا اپنی عنایات کے عوض۔“

وہ چلا رہا تھا، سچ رہا تھا ایک ایسی لڑکی کی خاطر جو کسی بھی لحاظ سے رباح صدیقی کے ہم پلہ نہیں تھی۔

”میں جتنا اس کے لیے کر سکتی تھی۔ میں نے اس

”میں نے تم پر ترس کھایا تھا نشال!“ رباح کا ٹوٹا بکھرا لہجہ اس کا مان ٹوٹ جانے کا شکوہ کر رہا تھا نشال اسے بس دیکھ کے رہ گئی۔

”میں واپس جا رہی ہوں رباح۔ تم فکر مت کرو۔ میں نے تم سے تمہارا کچھ نہیں چھینا۔“ نشال اس کے پاس آئی اس کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر رباح نے ہاتھ نہیں برہمایا۔

”بہتر بھی یہی ہے نشال کہ تم یہاں سے اب چلی جاؤ۔“ اتنا کہہ کے وہ پلٹ گئی تھی۔

نشال نے باصد کمال کا دیا تحفہ ایک خط کے ساتھ اس کے کمرے میں رکھا اور لوٹ آئی۔

دوسرے روز وہ روتی ہوئی اس گھر سے نکلی تھی۔ جاتے سے وہ رباح سے ملنے گئی تھی مگر رباح کا سرد رویہ اسے کچھ بھی کہنے سے روک گیا حالانکہ وہ اس سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہتی تھی مگر رباح کی بے رخی اس کے حوصلے کو پسا کر گئی تھی وہ روتے ہوئے اس گھر سے پھر کبھی نہ لوٹنے کے لیے نکل گئی کتنی حیرت کی بات تھی وہ روتے ہوئے ہی اس گھر میں آئی تھی۔ آج روتے ہوئے ہی جا رہی تھی۔ لندن کا موسم اسے راس نہیں آیا تھا۔ لندن کا موسم بہت سرد اور سفاک تھا۔

گھر میں ہولناک سناٹا چھایا ہوا تھا نورے گھر پر اس قدر گہری خاموشی تھی جیسے دور افتادہ کسی جنگل کے ویرانے میں ہوا کرتی ہے۔ باصد کمال کے دل میں انہونی کا احساس یکنخت جاگ اٹھا وہ پری طرح سے پورا گھر چھان رہا تھا مگر وہ کہیں بھی نہیں تھی؟

رباح اپنے کمرے میں تھی۔ اسے اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑا دیکھ کے مسکرائی۔ اب سب کچھ پہلے کی طرح ہو گیا تھا۔ درمیان کے چھ ماہ کبھی آئے ہی نہ تھے مگر اب کچھ بھی ویسا نہیں تھا۔ اس بات سے نظریں چرانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

کی مدد کی۔ میں نے ہر طرح تمہاری مدد کی، مگر تم دونوں نے کیا کیا میرے ساتھ۔ تمہیں کھانا کھانا ہو تو آجانا مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ نارمل انداز میں بولی۔

”ڈیم اس۔“ وہ غصے سے دروازے کو ٹھوکر مارتا وہاں سے چلا گیا تھا۔

”باصد۔ باصد پلینز۔ میری بات تو سن لو پلینز۔“ رباح صدیقی اس کے پیچھے بے تابی سے لپکی تھی، مگر وہ اپنے کمرے میں جا کے بند ہو گیا تھا۔

باصد کمال صاحب! سوکھی گھاس میں ہمیشہ مری ہوئی قندیلیاں ہی ملا کرتی ہیں اور جو خوشنما تیلیوں کے پیچھے بھاگنے کے عادی ہوں، انہیں مری ہوئی تیلیوں کے اڑے رنگ زیادہ دیر بھاتے نہیں ہیں۔ میں جارہی ہوں۔ امید ہے میرا جواب آپ کو مل گیا ہو گا۔ ایک اچھے دوست کی طرح آپ دونوں کی شادی کے بلاوے کی منتظر ہوں گی اور میرا وعدہ ہے کہ اگلی بار میں لندن بہت خوش خوش آؤں گی آپ دونوں کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے۔ آپ کا دیا تحفہ رکھے جارہی ہوں کیوں کہ اس کی اصل حق دار میں نہیں بلکہ رباح ہے۔ امید ہے میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔

باصد کمال کے ہاتھ میں خط لرزے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ نشال کے لیے رو رہا تھا۔ اس سادہ بے ریا لڑکی کے لیے جس نے زندگی میں کوئی خوشی نہیں دیکھی تھی۔

ان دونوں کے درمیان بات چیت بند ہو گئی تھی۔ رباح ناشتے کھانے پر اس کا انتظار کرتی، مگر وہ نظر بچا کے گزر جاتا۔ رات کو دیر سے گھر لوٹا۔ رباح بات کرنے کی کوشش کرتی، وہ اسے نظر انداز کر رہا تھا اور رباح صدیقی مسلسل اذیت سہ رہی تھی۔

”میں نے یہ سب ہماری خوشی کے لیے کیا تھا باصد۔!“ رباح صدیقی کا ضبط کا پیمانہ جھلک گیا۔

”میری خوشی صرف نشال عبید اللہ تھی۔ اور اسے تم نے میری زندگی سے نکال دیا۔ اب میری زندگی ایک

ویرانے سے زیادہ نہیں ہے۔“ اس نے انتہائی سرو اور کٹیلے لہجے میں جواب دیا۔ ستم بالائے ستم کہ اس کے پاس تو نشال کے گھر کا اتنا پتا بھی نہیں تھا۔ ورنہ وہ اسے خود ہی تلاش کر لیتا۔

”مگر میری خوشی تو تم تھے باصد کمال!“ رباح کا لہجہ ٹوٹا بکھرا تھا۔ اپنے آشیانے کو اس نے خود اپنے ہاتھوں ہی شعلہ دکھادیا تھا، نیکی تو اس کے گلے ہی پڑ گئی تھی۔

”تمہیں مجھ سے محبت ہے رباح صدیقی۔؟“ وہ اس تک پلٹ آیا رباح نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر تمہیں اپنی خوشی کی فکر کیوں ہے؟ تمہیں میری خوشی عزیز کیوں نہیں ہے؟“

وہ اس سے سوال نہیں کر رہا تھا اس کی جان نکال رہا تھا۔ رباح صدیقی نے اس سے اس کی آنکھوں میں بخوننا نہ کیفیت دیکھی اور ڈر گئی۔ یہ وہ باصد کمال تو رہا ہی نہ تھا جو شوخ و شنگ سا زندگی سے بھرپور تھا، یہ تو عشق کی بھٹی میں جل کے کندن ہوا کوئی مجذوب کھڑا تھا۔



لندن میں گزرے چھ ماہ میں اس نے وہ سبق سیکھے تھے جو عمر کی ریاضت کے بعد بھی شاید وہ سیکھ نہ پاتی۔ واپسی کا سفر ہمیشہ ہی تکلیف دہ ہوتا ہے اس کے لیے تو روزی ہوتا تھا۔

نشال نے تھک کر کتاب بند کر دی۔ دن سے رات اور رات سے صبح کرنا بہت مشکل ہوتا تھا اس کے لیے۔ بی اماں کے بغیر اس کی زندگی بس ایسے ہی گزر رہی تھی۔ نشال کا خدشہ سچ ثابت ہوا تھا بی اماں اس کا دکھ سہ نہیں پاتی تھیں۔ وہ جب بے سرو سامانی کی حالت میں واپس لوٹی تھی اور بی اماں کی پر حدت آغوش میں آتے ہی اس نے اپنا غم انہیں سنایا تھا وہ تو غم سنا کے ہلکی پھلکی ہو گئی تھی، مگر بی اماں اس دکھ کا بار نہیں جھیل پاتی تھیں۔

اتھتے بیٹھتے وہ احمد نواب پر اندھا اعتماد کرنے پر پشیمان ہو تیں۔ کبھی نشال سے معافی مانگنے لگتیں

”کون ہے؟“ نشال کو پوچھا ہی پڑا یہ جانتے ہوئے بھی کہ آنے والا کوئی اجنبی ہی ہوگا اس کا اپنا تو کوئی تھا ہی نہیں۔

”میں ہوں نشال۔ دروازہ کھولو۔“ آنے والا اس کا نام لے کر بولا تو بحرِ تحریر میں گھرے اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔

آنے والا ویسا ہی ہینڈ سم، اسمارٹ اور خوش باش تھا۔ نشال نے بہت تعجب سے اسے دیکھا درمیان میں آیا ایک سال کہیں کتاب زیست سے محو ہو گیا۔

”کیسی ہو۔“ وہ ایسی بشارت سے پوچھ رہا تھا کہ نشال کو حیرت ہوئی نشال نے اس کے عقب میں دیکھا وہ اکیلا آیا تھا۔ رباح اس کے ساتھ نہیں گئی۔ نشال کی آنکھیں کسی انجانے دکھ کے تحت بھیک گئیں ان آنسوؤں میں کئی رنگ شامل ہو گئے۔

”تیری حیران کیوں ہو رہی ہو مجھے دیکھ کے نشال۔ کیا تمہیں یقین نہیں تھا کہ میں تمہیں لینے آؤں گا۔“

وہ اس سے یوں کہہ رہا تھا گویا وہ کوئی وعدہ ایفا کرنے لوٹا ہو اور وعدہ ایفا کرنے تو وہ آیا تھا وہ وعدہ جو اس نے خود سے کیا تھا اور رباح بھی اس کی محبت کے آگے ہار گئی تھی۔ اس نے اسے اپنی محبت سے آزاد کر دیا تھا۔ نشال کا پتا دیتے سے وہ اسے آخری بار ایرپورٹ چھوڑنے بھی آئی تھی۔ بہت مشکل سے ہی سہی، مگر اس نے اپنی محبت پر حرف نہیں آنے دیا تھا۔

”میں لوٹ آیا ہوں نشال۔ تمہیں اپنانے کے لیے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھوں گا تمہاری آنکھ میں کبھی آنسو نہیں آئے گا میری وجہ سے۔“

نشال کی ہنسی آنسوؤں کی زد پر آگئی تو کیا وہ رباح کو چھوڑ آیا تھا جو دس سال سے اس کی محبت میں گرفتار تھی اور جس کی محبت کا وہ خود بھی دم بھرتا تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا تو نشال ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”یہ کیا مذاق ہے؟“ وہ غرائی۔

”یہ مذاق نہیں محبت ہے نشال۔ جو تمہارے در پر ایک بار پھر دستک دے رہی ہے اور جسے ٹھکرا کر تم

انہیں اس بات کا غم کھائے جارہا تھا کہ وہ روز قیامت بیٹے اور بہو کو کیا منہ دکھائیں گی۔ انہوں نے تو بیٹے سے نشال کا ہمیشہ سے خیال رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ تو کسی طور بھی اپنے کیے پر پورے اتر سکی تھیں نہ ہی وعدہ ایفا کر سکی تھیں اور ایک روز وہ ایسا سوئیں کہ پھر دوبارہ اٹھ نہ سکی تھیں۔

نشال ایک بار پھر اکیلی ہو گئی، ایک سال ہو گیا تھا اسے لندن سے لوٹے۔ صحاب احمد کے طلاق دینے کے بعد دوبارہ۔ احمد نواب انکل نے بھی کبھی رابطہ نہیں کیا تھا۔ نشال بھی سمجھ نہیں پاتی کہ وہ شرمندہ تھے یا اپنے بیٹے کے ساتھ ملے ہوئے یا پھر اس کے سامنے مجبور ہو گئے تھے۔ بہر حال نشال کے صبر نے ہی اس کو اتنی ہمت عطا کر دی تھی۔ اتنا بلند طرف کہ وہ انہیں معاف کر سکتی اور شکوہ تو اس کی سرشت میں شامل ہی نہیں تھا۔



اس نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب کر لی تھی وہیں پر اس کی ملاقات فراز سے ہوئی تھی۔ وہ اچھی شکل و صورت کا حامل ایک دردمند دل رکھنے والا نفیس طبیعت کا تھا اول روز سے ہی نشال کو پسندیدگی کی سند عطا کر دینے والا۔ اور اب تو اس نے اسے پروپوز بھی کر دیا تھا، مگر نشال اب مزید کوئی تجزیہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے خود کو اپنے نصیب کی تنہائی پر شاکر کر لیا تھا اور خود کو مطمئن کرنے کی کوشش میں بھی رہتی تھی۔

باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ نشال ٹھٹک گئی۔ دن کا آغاز تو عام سے انداز میں ہی ہوا تھا پھر غیر معمولی بات کیا ہوئی تھی جو رات گئے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ وہ چادر سنبھالتی برآمدے میں آئی۔ دروازہ متواتر بج رہا تھا ٹھنڈی ہوا کے سرد جھونکے اس کے وجود سے لپٹ گئے، مگر اب اسے ٹھنڈ نہیں لگتی تھی سردی کا وہ سرد برقیلا موسم اس کی زندگی پر حاوی ہو گیا تھا اب زمانوں کی تیز دھوپ درکار تھی اس احساس کو پکھلانے کے لیے۔

پاکستان واپس چلی آئی تھیں، میں جانتا ہوں کہ رباح نے تمہارے ساتھ غلط کیا اور میں تمہارے لیے اس وقت کچھ نہیں کر سکا اور تم بھی تو یوں بغیر بتائے چلی آئی تھیں، کم از کم میرا انتظار تو کیا ہوتا تم نے۔“

وہ اس سے شکوہ کر رہا تھا۔ نشال نے اسے ڈبڈبائی نظروں سے دیکھا۔ زندگی اس سے ہمیشہ ہی عجیب طرح کے امتحان لیتی تھی۔ بھلے اس کے دل کی خوشی کہیں نہ کہیں یہ ہنستا مسکراتا شخص بن گیا تھا، مگر وہ اسے اپنا نہیں سکتی تھی۔ رباح نے اسے اس وقت سہارا دیا تھا جب وہ شکستہ دل، بے سہارا، بے گھر، خالی ہاتھ تھی۔ وہ رباح کا دل کیسے توڑ سکتی تھی۔ اپنی محسن کا۔ وہ اتنی خود غرض نہیں ہو سکتی تھی اور یہ شخص جو اتنا مطلبی اور خود غرض تھا۔ رباح سے فائدے اٹھاتا رہا اور جب اسے دوسری لڑکی پسند آئی تو اس نے رباح کو خدا حافظ کہتے ہوئے ایک پل کے لیے بھی نہ سوچا ان دس سالوں کا کوئی ایک بھی پل اسے نہ روک پایا۔ کسی نے اس کا ہاتھ نہ پکڑا۔ رباح کی کوئی قربانی، نیک دلی اسے یاد نہ آئی۔

”میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں نشال۔ بولو کیا میری شریک سفر بنو گی؟“ وہ اس کے قدموں میں بیٹھا اسے پروپوز کر رہا تھا۔ نشال کے دل پر کسی نے آری چلا دی، دل کی خوشی سے نظریں چرا کر کسی اور کے دامن میں خوشیاں بھرنا بہت جاں بلب احساس ہوتا ہے۔ رباح نے بھی باصد کو بھیجتے سے یقیناً ”ایسا ہی درد محسوس کیا ہو گا اور احسان کا بدلہ چکانے کا اگر زندگی مہلت، موقع دے تو نقصان حاصل کر کے بھی بدلہ چکا دینا چاہیے۔ نشال نے سوچا اور اپنا فیصلہ سنایا۔

”میری شادی تو ہو چکی ہے باصد۔ اور ایک شادی شدہ عورت کو پروپوز کرنا نہایت غیر مناسب ہے۔“ اس نے آہستگی سے کہتے ہم پھوڑا تھا۔

”کیا۔۔۔ تم نے شادی کر لی نشال؟“ وہ دم بخود تھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

”میرا انتظار تو کیا ہوتا کم از کم۔“ وہ دکھی و آزرہ تھا۔ نشال طنز نہی۔

”کس لیے۔ کیا میں نے کوئی وعدہ کیا تھا آپ سے یا آپ مجھے اپنے انتظار کی ڈور میں باندھ گئے تھے اور پھر آپ نے یہ کیوں سوچ لیا باصد کمال۔ کہ میں رباح کی خوشی اور حق پر ڈاکہ ڈالنے کا سوچوں گی بھی۔ ایک ایسی پیاری لڑکی کے حق پر جس نے میری اس وقت بدد کی جب میرے سر پہ چھت تھی نہ ہی پیروں تلے زمین۔ جس نے مجھ جیسی بے آسرا لڑکی کے لیے جنگ لڑی، اپنا سکون تیاگ دیا۔ آپ کو ایسا کیوں لگا باصد کمال کہ میں احسان فراموش ہوں۔“

”نشال۔ فار گاڈ سیک۔ رباح نے خود اجازت دی ہے مجھے کہ میں تم سے شادی کر لوں۔ اسی لیے تو آیا ہوں میں۔“ وہ جیسے جھنجھلایا۔

”تو وہ اور کیا کرتی۔ ایک بات آج ضرور کہوں گی میں آپ سے باصد! کہ آپ بہت خود غرض انسان ہیں۔ ہمیشہ اپنا سوچتے ہیں۔ رباح سے فائدے اٹھاتے رہے کیا آپ نہیں جانتے تھے وہ آپ سے محبت کرتی ہے۔ اگر اسے نہیں چاہتے تھے تو آپ نے اس کی غلط فہمی کیوں نہیں دور کی؟ آپ کس رشتے سے اس کے ساتھ رہتے تھے؟ کیا حق تھا آپ کو اس سے فائدے اٹھانے کا۔ کبھی سوچا؟ ویسے بھی اگر آپ چند دنوں کی شناسائی کے عوض اپنا پرانا سا گھی اور محبت بھول سکتے ہیں تو چھ ماہ تو یقیناً بہت قلیل عرصہ ہے اور آپ کو مجھ سے محبت ہے بھی نہیں بس ذرا سی ہمدردی اور انیسیت جو ایک ساتھ رہنے سے اکثر پیدا ہو جایا کرتی ہے اور زندگی صرف خود کے لیے جینے کا نام نہیں ہے، اسے دوسروں کے نام کر کے جینے میں ہی مزہ ہے کاش کہ یہی سبق آپ رباح کی قربانی سے سیکھ لیتے۔“

”اوہ!“ وہ جیسے ساری کہانی سمجھ گیا تھا۔ ”تو یہ سب تم رباح کی خاطر کر رہی ہو۔ تم اپنی شادی کا بھی جھوٹ بول رہی ہو، لیکن نشال اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے رباح اب مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ جس سے بدگمان ہوئی ہے پھر اس کے لیے دل صاف نہیں کرتی۔“

”میں اس کی جگہ ہوتی تو میں بھی معاف نہ کرتی باصد! تم جیسے نفس پرست اور خود غرض شخص کو، لیکن مجھے اپنے ضمیر کے مدد پر سرخرو ہونا ہے۔ ویسے بھی

میں اپنے دل پر یہ بوجھ لے کر نہیں جی سکتی کہ میں نے کسی کی محبت پر اپنا تاج محل بنایا ہے۔“
وہ دروازہ بند کرنے لگی مگر باصد نے روک دیا۔
”تم مجھے اندر آنے کو بھی نہیں کہو گی کیا؟“ اس کے لہجے میں آس تھی۔

”نہیں۔ نہ میں آپ کو اندر بلاؤں گی نہ ہی آپ پیچھے مڑ کے دیکھیں گے کیوں کہ یہ جگہ نہ تو آپ کی منزل ہے نہ ہی آپ یہاں پڑاؤ ڈال سکتے ہیں مان لیں باصد کمال کہ اگر میں آپ دونوں کی زندگی میں نہ آتی تو آپ دونوں ایک خوش و خرم زندگی گزارتے آپ کو کبھی بھی اور اک نہ ہو پاتا کہ آپ رباح سے محبت کرتے بھی ہیں یا نہیں اور زندگی اب بھی ویسی ہو سکتی ہے۔“

”مگر نشال۔!“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا نشال نے دوبارہ ٹوک دیا۔

”رباح کو میری طرف سے بہت پیار اور دعائیں دیجئے گا۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو باصد کمال! آپ دونوں کی شادی کی خبر سننے کی منتظر ہوں گی جو کہ مجھے امید ہے کہ جلد ہی سننے کو ملے گی۔“ اس نے باصد کمال کو بات کا موقع دے بغیر ہی دروازہ بند کر دیا تھا۔ دروازہ بند کر کے اس نے گہری ٹھنڈی سانس لی۔ یوں جیسے وہ بہت لمبا سفر پیادہ طے کر آئی ہو۔ پتا نہیں اس نے صحیح کیا تھا یا غلط اور جانے باصد کمال رباح کی محبت کی طرف لوٹے گا بھی یا نہیں مگر وہ جانتی تھی اس کا دل مطمئن تھا کہ اس نے رباح کی آنکھوں میں اپنی وجہ سے آنسو نہیں آنے دیے تھے اور اسے یقین تھا کہ گزرتے وقت کے ساتھ رباح کی بدگمانی بھی دھل جائے گی اور وہ بھی پوئیں ہی کسی نہ کسی دن اچانک اس کو ڈھونڈتے ہوئے پہنچ جائے گی۔

اس نے کمرے میں آکر اپنا موبائل اٹھایا۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے اور ایک جانا پہچانا نمبر ملایا۔ تیسری بیل پر فون اٹھالیا گیا تھا۔ نیند میں ڈوبی گنبیر آواز سن کر نشال بے ساختہ مسکرائی کچھ یوں کہ آنکھوں سے آنسو موتیوں کی مانند ٹوٹ ٹوٹ کے گرے۔

”خیریت ہے نشی۔ تم ٹھیک تو ہو۔“ فراز کی نظر آمیز آواز نشال کے اندر سکون کی لہر دوڑا گئی۔
”ایک بار تم نے ایک سوال کیا تھا فران۔ میں نے اسی کا جواب دینے کے لیے فون کیا ہے۔ وقت اور جگہ کا حساب میں نے نہیں رکھا مگر اتنا ضرور کہو گی کہ مجھے لگتا ہے کہ اب میرے پاس یہ حق ہے کہ رات کے کسی بھی پہر تمہیں جگا سکوں۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔“

اس نے شرارت سے کہتے لیوں کو دانتوں میں دبایا تھا۔ فراز پر تو شادی مرگ طاری ہو گئی تھی۔
”میں آ رہا ہوں ابھی۔“ وہ کھٹکتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ابھی نہیں صبح آ جانا۔ ابھی تم سو جاؤ۔“
”مگر اب نیند کیسے آئے گی یا پھر تم مجھ سے باتیں کرو۔“ اس نے جیسے ضدی بچے کی طرح سے فرمائش کی تھی۔ نشال بے ساختہ قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گئی۔ اسے یقین تھا فراز ہی وہ ایسا شخص ہے جس کے ساتھ وہ خوش رہ سکتی ہے اور جو عمر بھر اس کی ذات کو سرد گرم سے بچا سکتا ہے۔ صحاب احمد کا حساب کتاب اس نے اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی تقدیر پر شاکر تھی جس نے اس کے مقررہ کردہ وقت پر اسے نواز دیا تھا۔ اس کے اندر سکون اتر رہا تھا۔ اس نے وضو کر کے دو نفل شکرانے کے پڑھے اور دو حاجت کے پڑھ کے باصد اور رباح کے لیے دعا کی کہ۔۔۔ دونوں ہی اس کے برے دنوں کے اچھے ساتھی تھے اور دونوں ہی اسے بہت عزیز تھے۔

اور باصد کمال نے بھی نشال عبید اللہ کی بات مان لی تھی اس نے محبت کو سرنگوں نہیں ہونے دیا تھا۔ آج لندن میں رباح اور باصد خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں ان کے دو پیارے پیارے بچے ہیں اور نشال بھی فراز کے ساتھ بہت خوش ہے مگر وہ دوبارہ لندن کبھی نہیں گئی۔ اس کے اندر یہ خوف کنڈلی مارے ہوئے ہے کہ لندن کا موسم بہت سرد اور سفاک ہے اور لندن کا موسم اسے راس نہیں آ سکتا۔!

شہرِ حلیا

بیہ، عنایہ کے کمرے میں گئی تو اس نے دیکھا، عنایہ نزع کے الم میں تھی۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ اس نے بیہ سے کہا کہ تمہاری خاموش اور صبر جیت گیا اور میری فرماں برداری ناکام ہوئی۔ میرا دل اور ہاتھ دونوں خالی ہیں۔ مجھے اس سے محبت تھی۔ وہ میرے اندر رہتا تھا۔ میں جان ہی نہ سکی۔ تم اسے بتا دینا کہ مجھے اس سے کتنی محبت تھی۔ بیہ کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اسے ”فاح“ سے عشق تھا، بیہ ساکت رہ گئی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ دیا کو عنایہ کی موت کے بارے میں بتانے لگی۔

دیا کا کمرہ خاص بہ خانے میں تھا۔ جہاں وہ عبادت کرتی تھی۔ وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ بیہ پہلی بار وہاں گئی۔ کمرے میں داخل ہو کر وہ پتھر ہو گئی۔

دیا بھی مرنے کے قریب تھی۔ وہ بری طرح چلا رہی تھی۔ بیہ جو اس سے گزرے برسوں کا حساب لینے آئی تھی۔ کچھ نہ کہہ سکی۔ دیا نے دم توڑ دیا تھا۔ وہاں کچھ تصویریں تھیں ایک ہی بندے کی تصویریں اور دیا کی ڈائریاں۔ ان ڈائریوں کے ساتھ ایک رقعہ تھا جس پر لکھا تھا۔ ”انہیں پڑھ لیتا۔ تمہارا تجسّس دور ہو جائے گا۔“

بیہ نے کچھ قریبی لوگوں کو ان دونوں اموات کی اطلاع دی تھی اور فاح کو بھی فون کر کے عنایہ کی موت کے بارے میں بتایا تھا۔ فاح نے سر دلجے میں کہا تھا کہ تم یہ اطلاع رافع کو دے دو۔ بیہ کے جتانے پر کہ رافع اس کا شوہر ہے اس نے سر دھری سے کہا کہ وہ اب اس کا شوہر نہیں ہے۔

بیہ نے رافع کو اطلاع نہیں دی تھی۔ افسون مشہدی ایک بزنس ٹائیکون کی اکلوتی بیٹی تھی رافع ابراہیم ایک مزدور تھا۔



Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ناؤلیٹ



WWW.PAKSOCIETY.COM

افسون مشدی نے اس کو دیکھا اور اس کی اسیر ہو گئی۔ لیکن رافع ابراہیم نے اس پر توجہ نہ دی۔ افسون نے اسے اپنے باپ کی آئل کمپنی میں ملازمت دے دی۔ وہ اسے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ تب ہی ایئر پورٹ پر افسون پہنچ گئی تھی اور اس نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جب رافع ابراہیم نہ مانا تو اس نے اسے روکنے کے لیے انتہائی قدم اٹھالیا تھا۔

مدید نے اپنے دوست حریر کو اپنی منگنی میں آنے کی دعوت دی تھی اور کہا اپنے ساتھ ایک اور ”دوست“ کو بھی لے آنا۔ مدید کا یہ دوست پائلٹ ہے۔ وہ انتہائی وجیہ ہے لیکن ساتھ ساتھ بد دماغ اور غصیل بھی ہے۔ اناویہ بہت حسین دل کش تھی۔ اس کی کلاس فیلو روپا اس کے لیے اپنے بھائی کا رشتہ لے آئی۔ اناویہ نے اس کو ناراضی سے منع کر دیا اور کہا اس رشتہ سے انکار کی وجہ خود روپا ہے۔

روپا جب اناویہ کے گھر گئی تو اس نے اناویہ کے تایا زاد ابراہیم کو دیکھا۔ اس کی گہری محبت بھری نظریں روپا کو ڈسٹرب کر گئی تھیں۔

فوزان مشدی کے آئل پلانٹ پر کام ہو رہا تھا۔ فوزان مشدی اپنے ایک ایک ورکر سے بخوبی واقف تھے۔ پچھلے چھ ماہ سے ان کے پلانٹ پر ایک ورکر کام کر رہا تھا۔ اسے افسوں کی سفارش پر رکھا گیا تھا۔ یہ ورکر بہت غیر ذمہ دار اور لا پرواہ تھا۔ یہ لڑکا رافع ابراہیم تھا۔ فوزان مشدی کو بتایا گیا کہ وہ معاہدہ توڑ کر ظہران سے فرار ہو رہا ہے تو فوزان مشدی کو غصہ آگیا اور اس نے خروج لگا کر اسے جیل بھجوا دیا۔

افسون مشدی کی اپنی سوتیلی ماں آجکے سے بہت اچھی دوستی تھی۔ اس کے سوتیلے بھائی حمیرا اور عمیر بھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ افسوں کا اپنا سگا بھائی ناراض ہو کر گھر چھوڑ گیا تھا۔ رافع ابراہیم کے جیل جانے سے افسون بہت پریشان تھی۔ وہ اسے باہر نکالنا چاہتی تھی۔ وہ اسے چھڑانے کے لیے جیل چلی گئی جس کی وجہ سے اس کا باپ بہت پریشان ہو گیا۔

حریر اپنے پائلٹ دوست کے ساتھ ڈین ہیک پہنچا تو مدید قاضی انہیں لینے نہیں آیا تھا۔ حریر نے اسے بتایا کہ مدید نے اپنی منگنی میں شرکت کے لیے بلا پایا ہے۔ یہ سن کر اس کا پائلٹ دوست سخت باہو گیا تھا۔ وہ مدید کی منگنی میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا، لیکن مدید نے اسے زبردستی روک لیا۔

مدید نے زندگی میں بہت برے دن دیکھے تھے۔ امید اس کی خالہ زاد بھی جس سے اس کی منگنی ہونے والی تھی۔ اس کے خالو خوش حال تھے۔ رانیہ کی شکل میں مدید کی لائری نکلی تھی۔

افسون نے پہلی بار جب رافع ابراہیم کو دیکھا تھا تو وہ ایک معمولی مزدور تھا۔ اس کی تباہ حالی کے باوجود افسون اسے دل

دے بیٹھی وہ اس کی منت سماجت کر کے اسے اپنی کمپنی میں لے آئی۔ رافع ابراہیم ماضی کے کسی واقعہ کی وجہ سے شدید پشیمانی اور اذیت کا شکار تھا۔ اس نے افسون کی محبت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی ہر ممکن مزاحمت اور انکار کے باوجود افسون نے ہار نہیں مانی تھی اور بالآخر رافع نے ہتھیار ڈال دیے، لیکن اس کا کمزور دل یہ برداشت نہ کر سکا اور اس کی سانس بند ہونے لگی۔ افسون یہ منظر نہیں دیکھ سکی اور خوف زدہ ہو کر ہٹاگ نکلی تھی، لیکن وہ پہنچ گیا تھا۔

فوزان مشدی کو پتا چلا کہ وہ جیل سے رافع کو نکال لائی ہے تو انہوں نے افسون کو بتایا کہ وہ رافع کے متعلق ساری معلومات کراچے ہیں۔ وہ اپنے خاندان کا دھتکارا ہوا ہے۔ اس نے اپنے بھائی کی بیوی پر بری نیت رکھنے کا گناہ کیا تھا۔

۴ چوتھی قسط

”مڑے مڑ گئی تھی۔ میں شاید ڈر گئی۔“ اس نے سر جھکا کر ضبط کرتے ہوئے بتایا تھا۔ اس کی سانس نے گلے لگا کر تسلی دی۔ ”لائٹ آف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ بلکہ کچن کی بجلی جلتی رہے تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ رات کو اندھیرے میں بچوں کا دودھ گرم کرنے آتی ہو۔ اب چلو اپنے کمرے میں۔“ وہ روپا کو بازو کے

گھیرے میں لیے اندر چلی گئی تھیں اور متفکر سا افرایم کچھ اور مضطرب ہو گیا۔

جب وہ واپس کمرے میں آیا تو روبا بستر پر کم صم بیٹھی تھی۔ اماں جا چکی تھیں۔ اور تینوں بچے سکون کی نیند میں کم تھے۔ افرایم نے بچوں کے اوپر کبل درست کیا۔ بیٹر بند کیا اور کھڑکیوں کے سامنے سے پردے ہٹائے تو روبا بے ساختہ چیخ اٹھی۔

”مردے نہ ہٹائیں“

”لیکن سلائڈ تو بند ہیں۔“ افرایم نے نرمی سے کہا۔

”نہیں پھر بھی۔“ اس نے اصرار کیا۔

”اوکے“ نہیں ہٹاتا۔ اب خوش۔“ وہ ملاحت سے کہتا اپنی جگہ پہ لیٹ گیا۔

سوئے ہوئے افرایم کی موجودگی نے اس کا خوف کم کر دیا تھا اسے بھی نیند آرہی تھی مگر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کمرے میں ان کے علاوہ بھی کوئی اور ہے؟ اسے کسی کی ہموار سیانسوں کی آواز بڑی شدت کے ساتھ محسوس ہو رہی تھی۔

کوئی تھا جو افرایم اور روبا کے پاس موجود تھا۔ آخر کون؟

باہر نیلگوں اجالا پھیلا ہوا تھا۔ روبا نے اٹھ کر غسل کیا۔ اور جلدی سے نماز کی تیاری کرنے لگی۔ اماں تہجد کے بعد معمول کے وظائف اپنے کمرے میں رضائی کے اندر بیٹھ کے کرتی تھیں۔ افرایم مسجد میں نماز ادا کرنے گیا تھا۔ اور واپسی پہ اتنا ہمیشہ دیر

ہو جاتی تھی۔ کبھی کوئی مل جاتا کبھی کوئی۔ ہزاروں سلام دعا والے لوگ تھے۔

وہ نماز ادا کر کے کچن میں آئی۔ ناشتا بنانے کے اس نے سب سے پہلے اماں کو ناشتا دیا تو انہوں نے بے ساختہ اسے روک لیا تھا۔

”افرایم ابھی تک نہیں آیا؟“

”نہیں اماں۔ کوئی کام تھا کیا؟“

”نہیں بیٹی! ایسے ہی افرایم کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ وہ میرے کمرے میں جھانک کر آگے جاتا ہے۔ نا۔ تو نفل پڑھتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے افرایم نے دروازہ کھولا ہے۔ شاید مجھے نیت باندھے دیکھ کر پلٹ گیا ہے۔“ وہ بڑی سلوگی کے ساتھ روبا کے حواس اڑا رہی تھیں۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھال کر کہا۔

”آپ کا وہم ہو گا اماں۔ افرایم تو ابھی آئے ہی نہیں۔“ اس کے منہ سے پھنسی پھنسی آواز نکلی تھی۔ ”کیا خبر ایسے ہی ہو۔ پر دروازہ تو کھلا تھا۔“ اماں بھی ابھی ابھی سی تھیں اور روبا حواس باختہ۔ پھر ان کا دھیان ہٹاتے ہوئے ملاحت سے بولی۔

”ہر وقت افرایم کی طرف ذہن انکار رہتا ہے آپ کا۔ یوں ہی خیال آگیا ہو گا۔“

”ایسی سٹھیائی تو نہیں ہوں۔ اگر تم کہتی ہو تو مان لیتی ہوں۔ ایک ہی تو بیٹا ہے کیا کروں؟ دھیان اس کی طرف نہ جائے تو کہاں جائے؟“ انہوں نے تسبیح اٹھا کر چومی اور روبا کے ہاتھ سے پکڑ لی۔ ”معا“ انہیں خیال آیا۔ کہنے لگیں۔

”روبا بیٹی! ذرا اتنا بیہ کی خبر گیری بھی کر لیا کرو۔ بن ماں کی بچی کا کیا حال ہے؟ اتنا بیہ تو اس قاتل نہیں جو بچی کا دھیان رکھ سکے۔ اتنا کہا تھا میں نے کہ اتنا بیہ کو مجھے دے دو۔ جہاں تین بچے مل رہے ہیں۔ وہاں ایک اور سہی۔ مگر اس لڑکی کی انا اور خود پسندی جانے کس پہ اس کا مزاج چلا گیا ہے۔“ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری تو باہر سے آتا افرایم ان کا جملہ اچک کر بولا تھا۔

”داوی حضور پہ۔ بھول گئیں کیا؟ اللہ بخشے وہ ایسی ہی تھیں۔ ظالم اور سنگ دل۔ تین دن جان حلق میں اٹکی رہی تھی۔“

”اللہ معاف کرے۔“ ساس بھو دو نوں نے دل کر کہا۔

”کسی نہ کسی نے تو داوی پہ جانا ہی تھا۔“ وہ مسکراتا

روبا تیزی سے کچن کی طرف بڑھی وہ تو بے پروا تھا ڈال کے آئی تھی اور یہاں تو ایسے ہی باتوں میں لگ گئی تھی۔ کچن کی طرف جاتے ہوئے بے ارادہ اس کی نگاہ نماز والے کونے کی طرف اٹھی۔

یہ نماز والا کونٹا مخصوص تھا۔ یہیں پہ جائے نماز پچھی رہتی۔ اس کونے میں کوئی بھی نہیں جاتا تھا۔ تو پھر وہاں کون گیا تھا؟ جبکہ افرایم باہر تھا اور اماں اپنے کمرے میں۔

جائے نماز کا مڑا کونٹا سیدھا تھا۔ جیسے کسی نے اس پر نماز پڑھی ہو۔

کس نے؟ روبہ کی جیسے جان۔ بن آئی تھی۔ نہ صرف جائے نماز کا مڑا کونٹا سیدھا تھا بلکہ کھونٹی پہ تنگی تسبیح بھی جائے نماز کے اوپر رکھی تھی۔ حالانکہ روبہ نے آج تسبیح اتاری ہی نہیں تھی۔ تو پھر کس نے؟ وہ چکراتے سر کو تھامتے ہوئے بمشکل کانپتی ٹانگیں کھینچی کچن میں آئی تو جلتا چولہا بند تھا۔ اور تو بے پروا تھا غائب؟



روبا کے پورے وجود پہ ایک نامعلوم خوف کا اثر تھا۔ گھر میں اس کی دلچسپی کم ہوتی جا رہی تھی۔ اسے ہر چیز سے خوف آتا تھا۔ اکیلے کمرے میں جانے سے۔ کچن میں کام کرنے سے۔ صحن میں مشین لگانے سے۔ پھر روبہ نے کچھ اور ہی محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ ایسا جس نے اس کی وحشت کو دوچند کر دیا تھا۔ اس دن اماں کے پاس محلے کی کوئی عورت آئی بیٹھی تھی۔ روبہ ان کے لیے چائے بنانے کچن میں آئی۔ جب وہ واپس صحن میں آئی تو خالہ بلقیس اماں سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ روبہ بھی بیٹی کو دلیہ کھلائی ان کے پاس بیٹھ گئی۔

”کچھ نہ پوچھیے آپا جی۔ یہ آپ کے جیٹھ کی بیٹی تو بڑی ظالم ہے۔ پورا دن بچی کو ناجو کی ماں کے پاس پھینک کر خود نجانے کہاں نکل جاتی ہے۔ سارا دن لور لور باز اربوں میں یا اس بدنام زمانہ ناجو کے ہمراہ۔ بچی

ہو اماں کے قریب بیٹھ گیا تھا۔“
”انا دیہ تو نہ جاتی۔ کوئی اور چلا جاتا۔ ایسی حسین صورت اور ایسی بدترین سیرت۔“ اماں نے ہاتھ ملتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھری۔

”اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔“ روبہ نے افسردگی سے سر ہلایا۔

”انسان ساری عمر غلطیاں کر کے نصیب کے کھاتے میں اپنے گناہ نہیں ڈال سکتا۔“ افرایم کے سنجیدگی بھرے لہجے پہ اماں قائل ہوتی نظر آئی تھیں۔ پھر انہوں نے موضوع بدل دیا۔

”ناصر کی کوئی خبر؟“

”اچھے حال میں ہے۔ سرالیوں سے صلح کر لی۔ اسے پکڑوانے کا سارا ڈر اٹا تھا۔ اپنی مرضی سے نکاح کیا بیٹی کا۔ بعد میں کسی لین دین پہ لڑائی ہو گئی وہ لالچی لوگ ہیں۔ تایا جی کی دکان تھینا چاہتے تھے۔ ناصر کو جیل میں بند کر دیا۔ اغوا کا کیس بنوا کے بات کھلی تو خاصی چھترول ہوئی سب کی۔“ افرایم نے قصہ مختصر سنایا تو اماں ہکا بکا رہ گئیں۔

”پھر گھر کیوں نہیں آیا؟“

”مرضی کا مالک ہے۔ ایک بیٹے کے ساتھ وہیں ہے۔ دکان کے کرائے میں سے آدھا حصہ وصول کرتا ہے۔“ افرایم کے انکشاف پہ اماں بے چاری ساکت تھیں۔

”اور گھر نہیں آیا؟ حد ہے۔“

”گھر آئے تو دو بہنوں کی ذمہ داری اٹھائے؟ چلیں ایک تو بیاہ کے قاتل ہے۔ اس کا بوجھ تو اترا ہی سمجھیں۔ دوسری چھٹانک بھری بچی کو کون سنبھالے؟ اس کی بیوی تو کبھی نہ اس عذاب میں پڑے۔“ افرایم نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے بتایا تو اماں مٹھکوک ہو گئی تھیں۔

”ناصر سے تیری ملاقات ہوتی ہے کیا؟“

”پہلے سے کچھ سدھر گیا ہے۔ اکثر دفتر میں ملنے آ جاتا ہے۔ پھر کیا کروں؟ ملنا تو پڑتا ہے۔ تایا زاد جو ٹھہرا۔“ افرایم اور اماں کو باتوں میں مصروف دیکھ کر

اس کے گھر میں بلکتی رہتی ہے۔ کبھی کوئی بچہ گھسیوں سے بھری دودھ کی بوتل چوسنی تھما دے تو تھیک ورنہ پورا دن بھوک اور مار سے بلبلاتی رہتی ہے۔ ناجو کے گھر بچوں کی منڈی لگی ہے۔ کوئی ادھر سے دھکا دیتا ہے کوئی ادھر سے طمانچہ مارتا ہے کوئی چٹکی تو کوئی مکا۔ بچی بے چاری تڑپ تڑپ کر کھلا گئی ہے۔ پیٹ اس کا خراب ہے۔ بخار اس کا جاتا نہیں۔ سوکھ کے کانٹا بن گئی پھول سی بچی۔ ”خالہ بلیقہس نے ایسا درد ناک نقشہ کھینچا تھا کہ اماں کے ساتھ ساتھ روبہ کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر گئے تھے۔

”ایسی سنگ دل؟ بچی کو ناجو کے گھر کیوں پھینک رکھا ہے؟“ اماں کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔ بچی کے ساتھ اس کی رحم دل ماں بھی یاد آگئی تھی۔ ”اے پھر کہاں بغل میں دبائے پھرے۔“ خالہ بلیقہس نے ننھی سے کہا تھا۔ ”ذرا خوف خدا اسے چھو کر نہیں گزرا۔ بچی سے جانے کسی گناہ کا بدلہ لے رہی ہے۔“

”ہم بات کریں تو مجرم نہ کریں تو مجرم۔ میں نے کہا بھی تھا۔ تم اتاڑی ہو۔ بچوں کو کہاں سنبھالنے کا تجربہ ہے۔ اتنا ہیہ مجھے دے دو میں خود اس کی دیکھ بھال کر سکتی ہوں۔ پھر روبہ بھی ہے مگر وہ لڑکی۔“ ”اے نہیں رہ کر اتاڑیہ پہ غصہ آ رہا تھا۔ جس نے بچی کو اوروں کے رحم و کرم پہ چھوڑا ہوا تھا۔ اور ان سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ ماکہ اس کی خفیہ سرگرمیاں کسی کی نگاہ میں نہ آجائیں۔

”افراہیم آتا ہے تو بات کرتی ہوں۔ ذرا اتاڑیہ کو سمجھائے۔“ وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولتی چپ سی ہو گئیں۔ دراصل انہیں یاد آگیا تھا۔ روبہ کے ساتھ ہونے والے حادثے پر حال احوال پوچھا اور نہ ہی اپنے کیے پر شرمندہ تھی۔ جتنا بڑا اس نے جرم کیا تھا۔

تین تین انسانی جانوں کے قتل کا ارادہ۔ اس پہ تو چند تھپڑ اور دو جوتے ناکافی تھے۔ مگر وہ اسی بات کا فسانہ بنائے ان سے ہمیشہ کے لیے خفا ہو گئی تھی۔

اماں کا دل بو بھل تھا تو روبہ کا شدید غم زدہ۔ روبہ چائے کی خالی پیالیاں اٹھا کر بچن کی طرف بڑھی تو اچانک سے بچوں کے کمرے سے عجیب سی کھلکھلاہٹوں کی آواز آئی تھی۔ وہ تیزی سی ٹرے سلیب پہ بیٹھ کر بچوں کے کمرے کی طرف بھاگی۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خوفناک خیال آرہے تھے۔ کمرے میں کون تھا؟

اس نے دروازہ — کھولا تو کیا دیکھتی ہے کہ دونوں بچے کات میں قلعاریاں مار رہے تھے اور کسی چیز کو دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی مضحکہ خیز کرتب دکھا کر بچوں کو ہنسا رہا ہے۔

روہ کا دل مٹھی میں آگیا۔ اس نے تیزی کے ساتھ دونوں بچوں کو بازوؤں میں دوچا اور پاہر بھاگتی ہوئی آگئی۔ اس نے آج خوف کی انتہا پہ پہنچ کر اماں کو بتایا تھا۔

”اماں! گھر کے اندر کوئی ہے۔“ یہ سن کر اماں بھی سفید پڑ گئی تھیں۔ روبہ کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔



سروا کی بارشوں نے عاجز کر رکھا تھا۔ سارا دن مینہ برستا۔ باہر سردی، ٹیکس ندارد، میشر کی جگہ انگٹھوں میں کوئلے دھکائے جاتے تھے۔ سردی ہڈیوں کے گودے میں گھسی چلی جاتی تھی۔ اماں سارا دن لحاف میں گھسرتی رہتی تھیں۔ بچے ان کے پاس کمرے میں لیٹے ہوتے۔

دن خطرناک حد تک خوف زدہ کرنے والے تھے اور راتیں انتہائی بے سکون ہو چکی تھیں۔ یوں لگتا تھا کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو جائے گا۔ افراہیم بھی اب تو چوکنا ہو گیا تھا۔ روبہ کا بار بار بے ہوش ہونا، ڈرنا، خوف زدہ ہونا بہت معنی رکھتا تھا۔ اب وہ مذاق میں بھی اس مسئلے کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

روہ بہت چپ رہنے لگی تھی اور انتہائی بے یقین بھی۔ وہ بچوں کے معاملے میں بے حد حساس ہو چکی

تھی۔ اس کے دل میں وہم بیٹھ گیا تھا۔ جیسے کوئی اس کے بیٹوں کو نقصان پہنچا دے گا۔

افراہیم نے ایک برگزیدہ ہستی سے اپنے گھر میں دم درود بھی کرایا تھا اور انہوں نے اتنا یقین دلایا تھا کہ ان کے گھر میں کوئی نپاک چیز نہیں ہے۔ اگر کوئی ہے بھی تو وہ نقصان نہیں کرے گی۔ ان ہی دنوں اس کے بیٹوں کی پہلی سالگرہ آگئی۔ اس سالگرہ میں افراہیم نے سب

کو بلایا تھا۔ ناصر اور اس کی بیوی بیٹے کو۔ اپنی سسرال تو تھی ہی۔ انادیہ کو بھی پیغام بھیجا اور وہ حیرت انگیز طور پر انادیہ کو ساتھ لے کر آگئی تھی۔ یہ بڑی ہی حیران کن صورت حال تھی۔ اتنی تو وہ اچھی نہیں تھی سب کچھ بھلا کر آجاتی، لیکن اس کا آجانا معمولی بات نہیں تھی۔

انادیہ کو دیکھ کر چچی ابدیدہ ہو گئیں۔ انہیں انادیہ کی ماں فرزانہ یاد آگئی تھی۔

”کیسی اچھی عورت تھی۔ منٹوں میں چل بسی۔ اس پھول سی بچی کو بے سائمان کر کے۔“ انہوں نے تین سالہ انادیہ کو گود میں لے کر بے ساختہ چوما تھا۔ انادیہ خون کے گھونٹ بھر کے رہ گئی تھی۔

”چچی نے ایسا پار مجھے تو کبھی نہ کیا؟“ اس کے دل میں جوار بھانا اٹھنے لگا۔ کسی کو دوسرے سے انیسیت رکھتے یا الفت کا مظاہرہ کرتے تو انادیہ دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔

”کتنی پیاری ہے ماشاء اللہ۔“ روبانے بھی انادیہ کے گل پہ پیار کیا تو وہ شرما کر چچی کی گود میں منہ چھپا گئی تھی۔ ایسے ہی باتوں باتوں کے دوران ہنستے کھلتے خوش گیتیاں کرتے میک کٹا اور دونوں شہزادوں کو بڑوں کے بیچ میں لا بٹھایا گیا۔

اس وقت گہری سوچوں میں ڈوبی چچی کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا تھا۔ جانے وہ کیا سوچ رہی تھیں؟ پھر اچانک ہی انہوں نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر کچھ نٹولا۔ پھر اپنے ہاتھوں کو دیکھا اور ایک مرتبہ پھر اپنی گردن میں ہاتھ بھیرنے لگی تھیں۔ بعد ازاں

انہوں نے اپنے گلے سے موٹی سی سونے کی زنجیر نکالی اور اپنی گود میں بیٹھائی انادیہ کے گلے میں ڈال دی۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک، غیر متوقع اور حیران کن تھا کہ ہر کوئی چچی کی اس کارروائی کے پیچھے وجہ ڈھونڈنے جانے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ ناصر، اس کی بیوی، صداقت، بھٹی اور ان کی بیگم، روبانے، افراہیم اور انادیہ تک۔ سب ایسے ششدر تھے جیسے دنیا کا کوئی انوکھا واقعہ رونما ہو گیا تھا حالانکہ یہ واقعہ دنیا کا انوکھا نہ سی ان کے لیے بڑا ہی اچھوتا، منفرد، غیر متوقع بلکہ کسی میزائل سے کم نہیں تھا۔

اور چچی بڑے رعب اور مان کے ساتھ کہہ رہی تھیں۔

”میرا بڑا اچھا وقت گزرا، بیوگی کے بعد اپنے جیٹھ جنت مکانی قاضی صاحب اور ان کی بیوی فاطمہ خاتون کے ساتھ۔ ان کی وفات کے بعد فرزانہ سے بھی بہنوں جیسا سلوک رہا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ افراہیم کی شادی اس کے تایا قاضی صاحب کے گھر کرتی، مگر ان بچوں کے ستارے کسی طور نہ ملتے تھے نہ نصیب ملتے تھے۔ اب میں اپنے بچوں کی رضامندی جانے بغیر ایک فیصلہ کر رہی ہوں۔ میں اپنے پوتے فالح کے ساتھ اپنے جیٹھ کی یتیم بچی انادیہ کی منگنی کرتی ہوں۔ یہاں پہ موجود سب لوگ میری بات دھیان سے سن لیں۔ آج سے یہ رشتہ پکا۔“ انہوں نے حاضرین محفل کے سروں پر بم بلاسٹ کیا اور انہیں ہکا بکا چھوڑ کر افراہیم کا ہاتھ پکڑ کر بولیں۔

”جھے کوئی اعتراض تو نہیں؟“ انہوں نے افراہیم کو اعتراض کرنے کے قابل کہاں چھوڑا تھا۔ وہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں نفی میں سر ہلاتا ان کا مان اور حوصلہ بڑھا گیا۔

جب کہ بہت سے چہرے حیرت و بے یقینی سے دم بخود رہ گئے تھے۔ ان میں ایک چہرہ انادیہ کا بھی تھا۔ نفرت و غم غصے میں سنورنا بکڑتا۔ اس کا دل چاہا کہ کیک میں پیوست چھری اٹھا کر اس تین سالہ انادیہ کے وجود

میں کھونپ دے یا پھر افرایم کے ایک سالہ فاتح کا گلا اتار دے۔

ایسے خونی اور قاتلانہ قسم کے جذبات لیے وہ نفرت کی آگ میں بھل بھل جلتی انابیہ کا بازو دو بوجے گھر آنے کی بجائے تاجو کے گھر کی طرف چل پڑی تھی۔ اس حال میں کہ اس کا ایک قدم کہیں پڑتا تھا اور دوسرا کہیں۔

”مکار، کنٹی۔۔۔ افرایم کی دفعہ باہر سے ”گند“ اٹھالائی اور اب اسی افرایم کے بیٹے سے انابیہ کی منگنی کی کرے گی۔ میرے ہوتے ہوئے تو قیامت تک ایسا نہیں ہوگا۔ فاتح اور انابیہ۔ ہونہ کبھی نہیں۔ میں ایسا مر کے بھی نہیں ہونے دوں گی۔“

اس نے نفرت و حقارت سے زمین پہ تھوک دیا تھا۔ جیسے ہر چیز کا اختیار رکھتی ہو۔ نعوذ باللہ۔



دوسرے دن بادل سورج کی اوٹ میں منہ چھپا کر بیٹھ گئے تھے۔ دھوپ بھلی معلوم ہوتی تھی۔ مالٹوں کا موسم تھا۔ چچی ڈھیر سارے بالے نوکری میں رکھ کر صحن میں دھوپ سینک رہی تھیں۔ بچے ان کے قریب ہی کھیلتے تھے۔ عزہ، فاتح اور رافع۔

ساتھ والے گھر سے انابیہ جانے کس طرح چپکے سے آگریٹ میں اکھڑی ہوئی تھی۔ روبانے کچن کی کھڑکی میں سے سہمی سہمی کچی کو گیٹ سے جھانکتے دیکھا تو فوراً ”کفگیر اٹھائے باہر آگئی تھی۔ کچی اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی۔ شاید اس نے یہی سمجھا تھا کہ یہ باجی بھی انابیہ باجی کی طرح اسے مارنے کے لیے آرہی ہے۔ قریب تھا کہ وہ ڈر کر بھاگ جاتی۔ روبانے اسے جالیا تھا۔ اور وہ سم کر رونے لگی۔

”میں کھانے کے لیے نہیں آئی۔“ وہ بچوں کے ہاتھوں میں قیمتی کھلونے دیکھ کر نفی میں سر ہلانے لگی تھی۔ روبانے اچھی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”تو پھر؟“ روبانے ملانمت سے پوچھا۔ انابیہ کی بڑی

بڑی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ ”بھوک لگی ہے باجی! انابیہ نے روٹی کھائی ہے۔“

دوسرے ہی بل اس کی پیاری سی سہمی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح ٹوٹ کر گالوں پہ گرے اور روبا کا سارا غصہ سارا غبار اپنے ساتھ بہا کر لے گئے۔

اماں کے ”آنا“ ”فانا“ کیے گئے فیصلے کی وجہ سے وہ افرایم سے بھی اکھڑی اکھڑی دکھائی دیتی تھی۔ بس اسے یہ اعتراض تھا کہ اماں نے اسے اعتماد میں کیوں نہیں لیا۔ اور اب یہ سارا غصہ خود بخود جاتا رہا تھا۔ بلکہ انابیہ کے آنسوؤں میں بہہ گیا تھا۔ اس نے انابیہ کو اپنے سینے میں بھینچ کر پیار کیا تو اماں یہ منظر دیکھ کر آبدیدہ ہو گئی تھیں۔ روبا، انابیہ کو گود میں اٹھا کر اماں کے پاس لے آئی۔

”اور تمہاری باجی کدھر ہے؟ اس نے کھانا نہیں بنایا؟“ اماں کو جی بھر کے انابیہ پہ ماؤ چڑھاتا تھا۔

”ابھی تک منحوس سو رہی ہوگی۔ کچی، بھوک سے بلکتی پھر رہی ہے۔“ اماں کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ انابیہ کی بے حسی انہیں ایسے ہی تاؤ دلاتی تھی۔ ”باجی تو تاجو کے ساتھ چلی گئی۔ برقعہ پہن کر۔“ اس نے اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا تھا۔ اماں کے سینے سے سل آن گری۔

”ظالم، تجھے اکیلا چھوڑ گئی؟ اتنی سی کچی گھر میں ڈر جاتی تو۔۔۔؟“ اماں کو بڑا ہی غصہ آ رہا تھا پھر وہ بول بول کر خود ہی تھک گئیں۔ بھلا یہاں انابیہ تھی جو سنتی۔ روبانے گندی سندھی، میلی کچیل، کچی کو پہلے نہلایا، دھلے ہوئے کپڑے پہنائے اور پھر کھانا کھلایا۔ وہ سم کے کھارہ ہی تھی۔ جیسے کھانا اس کے سامنے سے اٹھالیا جائے گا۔ انابیہ نے کچی کو سخت ہراساں کر کے رکھا تھا۔ روبانے چند لمحوں میں ہی جانچ لیا۔ کچی کچھ دیر تک فاتح اور رافع، عزہ کے ساتھ کھیلتی رہی اور پھر روبا کا پلو پکڑ لیا۔

”باجی بوت مارے گی۔ انابیہ کو گھر جانا ہے۔“ ”مارے تو سہی ہم بھی اسے ماریں گے۔ اب انابیہ ہماری ہے۔“ روبانے اس کے گال پہ پیار کیا تھا

میرے دائیں اور بائیں چلتے ہوئے مسجد جائیں گے۔

”ان شاء اللہ جلدی آئے گا۔ جتنی تیزی کے ساتھ یہ زندگی کے اگلے مراحل میں داخل ہو رہے ہیں۔ تجھے امید ہے، جلد ہی آپ دادا بھی بن جائیں گے۔“ روبانے ہنستے ہوئے اس کی بات آگے بڑھائی تھی۔

افراہیم سمجھ کر ہنس پڑا تھا۔

”واقعی، میرا شہزادہ تو ممکن شدہ ہو چکا ہے۔“ اس نے فلاح کی ناک سے اپنی ناک رگڑ کر شرارت کی تو پچھ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”دیکھو تو اس کی مگیترو دیوار کے پار ہے۔ بڑا ہو کر مجھے دعا میں دے گا۔ کتنا اچھا میں نے اس کے لیے برتلاشا۔“ افراہیم کالر کھڑے کرتے ہوئے سارا کریڈٹ خود لیتا چلا۔

”آپ نے نہیں اس کی دادی نے۔ آپ ذرا کم ہی اترائیں۔“ روبانے اسے آنکھیں دکھائی تھیں۔

”ہم ماں بیٹے کا مشترکہ فیصلہ تھا۔“ افراہیم نے فوراً جواب دیا تھا، لیکن یہ کہہ کے پچھتایا۔ کیونکہ روبانے اس کی بات پکڑ لی تھی۔

”اچھا۔ اچھا تو یہ آپ دونوں کی ملی بھگت تھی۔ مجھے بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔“ اسے آنکھیں دکھاتے دیکھ کر افراہیم نے اپنے کان پکڑ لیے تھے۔

”میری کیا مجال تھی یا رباب۔ یہ تو اماں نے اچانک دھماکا کیا۔ سچ پوچھو تو مجھے یہ فیصلہ قبل از وقت لگا تھا۔ پر مجھے اماں کا مان توڑنا اچھا نہیں لگا۔“ افراہیم نے بچے دل سے کہا تھا۔

”اور مجھے بھی۔ اچھا پریشانی کی کیا بات ہے؟ ہمیں جو تیاں چٹکائے بغیر لڑکی مل گئی۔“ روبانے بات کو مذاق کا رنگ دیا تو افراہیم بھی ہنس پڑا۔

”دو سال بڑی بھی ہے۔ میرے بیٹے کو بہت مارے گی۔“ افراہیم کا انداز مصنوعی فکر مندی لیے ہوئے تھا۔ روبانے غیر اراداً ہی کہہ دیا۔

”اگر اپنی بہن کا مزاج پالیا تو میرے بیٹے کی خیر

پھر وہ سارا دن بچوں کے ساتھ کھیلتی رہی، نیکن باجی کا خوف اس کے سر پہ کسی ہوئے کی طرح ہی سوار تھا۔ شام کو اناد یہ غصے میں بھری آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے انابیہ کو روٹی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔

”سارے محلے میں تجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہوں ذلیل! یہاں گھسی بیٹھی ہے۔“

”سوچ سمجھ کے بچوں ساتھ بات کرتے ہیں۔ بچے

پھر وہی زبان سیکھتے ہیں جو ان سے بولی جاتی ہے یا انہیں سکھائی جاتی ہے۔“ اماں کو بیچ میں بول کر اسے ٹوکنا پڑا تھا اور پھر روباب بھی سہولت کے ساتھ اسے جتا گئی تھی۔

”آج کے بعد کچی پہ اس طرح ہاتھ مت اٹھانا۔ یہ بچی اب ہماری امانت ہے۔“ روباب کے اگلے الفاظ نے انادیہ کو آگ ہی لگا دی تھی۔ وہ انابیہ کو کھینچتی ہوئی گھر لے گئی اور کمرے میں بند کر کے خوب غصہ اتارا تھا۔

”کھینچی، میرے دشمنوں کے گھر میں گھس کر بیٹھی تھی۔ مجھے ہی ذلیل کروانے میں تیرا منہ توڑ دوں گی۔“ اس نے انابیہ کو خوب ہی مارا۔

”بڑی آئی تجھ سے رشتے بنانے والی۔ تیرا گلاباؤں گی، مگر اس رشتے کو کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔“ انادیہ نے جیسے خود سے یہ عہد دہرایا تھا۔ وہ اپنے اس عہد کو آخری سانس تک نبھانے والی تھی۔

دوسری طرف روباب کا دل بڑا ہی بے چین رہتا تھا۔ وہ انابیہ کی حالت زار پہ کڑھتی تھی۔ تین سال کی ہو چکی تھی، مگر انادیہ نے اسے اسکول میں داخل نہیں کروایا تھا۔ کسی قریبی سرکاری اسکول ہی میں بھیج دیتی۔ اس کی پڑھائی کا سلسلہ شروع کروائی۔

جمعہ کا دن تھا۔ اس دن افراہیم کے گھر میں رونق کا سماں ہوتا۔ اس کے گھر میں جمعہ خوب منایا جاتا تھا۔

جمعہ کی تیاری سے پہلے افراہیم غسل کے بعد کمرے میں آیا تو روباب اس کے کپڑے نکال کر اب اپنے پل سلجھا رہی تھی۔ افراہیم نے سید براق سوٹ زیب تن کیا اور بیڈ پہ کھیلنے بیٹوں کو پیار کرتے ہوئے بولا۔

”پتا نہیں وہ دن کب آئے گا جب یہ دونوں جوان

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



نہیں۔ ہائے، میرا حل۔“ روبانے قلعاریاں مارتے
 فاتح کو جھپٹ کر اٹھایا اور چناٹ چومنے لگی۔
 ”تمہیں رافع سے زیادہ فاتح سے محبت ہے؟“
 افرایم نے ایسے ہی برائے بات پوچھ لیا۔
 ”دونوں سے ہے بلکہ تینوں سے۔“ روبانے
 خالصتاً ”ماؤں والا جواب دیا تھا۔ افرایم نے نفی میں سر
 ہلایا۔
 ”اوں ہوں۔ فاتح سے زیادہ ہے۔ کیا میں نہیں
 جانتا۔“
 ”ہاں ہے۔ ہے تو۔“ وہ اسے آنکھیں دکھانے
 لگی تھی۔
 ”اس کی وجہ؟“ افرایم نے حیرت سے پوچھا۔ وہ
 تسلیم کر لے گی؟ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔
 ”فاتح آپ سے ہے۔ اس لیے مجھے فاتح میں آپ کی
 صورت دکھائی دیتی ہے۔ رافع اور عرہ مجھ سے ہیں۔“
 اس نے صاف گوئی سے کہا۔ افرایم اس کی بے تحاشا
 محبت پر دنگ رہ گیا۔ وہ ایسی ہی تھی۔ بے تحاشا چاہنے
 والی۔ ایک وفا شعار بیوی۔ افرایم کو خود پر رشک آیا
 تھا۔
 ”چلو، اگر میں نہ ہوں۔ تو فاتح کو دیکھ کر اپنا دل شاد
 کر لیا کرتا۔“ افرایم نے اپنی خوب صورت آنکھوں
 میں ڈھیر ساری محبت سمو کر روبانے کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ وہ
 ایسے ساکت ہوئی جیسے کوئی مجسمہ۔
 ”کیا کہا۔؟“ روبانے کی جان نکل گئی تھی۔ ”آئندہ
 ایسی بات بھی نہیں کرنی۔ زندگی کا یہ سفر اگر اکٹھے
 شروع کیا تھا تو اکٹھے ہی ختم کریں گے۔ ایک ساتھ اس
 گھر میں آئے تھے، ایک ساتھ اس گھر سے جائیں
 گے۔ یہ بس طے ہے۔“ وہ عجیب جنونی سی ہو کر بولی
 تھی۔ اب ساکت ہونے کی باری افرایم کی تھی۔ وہ
 اس کی جنونی محبت کو دیکھ کر محسوس کر کے دنگ رہ گیا
 تھا۔
 وہ اپنے جذبوں میں ایسی شدت پسند نہیں تھی۔
 اظہار کے معاملے میں بھی اتنی فراخ دل نہیں تھی۔

پھر اسے اچانک کیا ہوا تھا؟ اس نے اتنی بے رحمانہ سی
 بات کر دی۔ ایک ساتھ کیوں جاتے؟ اور ان کے یہ
 پیارے سے بچے؟ افرایم کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ اس
 نے آگے بڑھ کر روبانے کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے
 لیا۔
 ”تم نے بھی آئندہ ایسی بات نہیں کرنی۔ وعدہ
 کرو۔“ وہ اس کی پیشانی سے اپنی پیشانی ٹکرا کر ایک
 وعدہ لے رہا تھا۔ یہ جانے پنا کے کاتب تقدیر نے اول
 روز سے ہی سب کچھ طے کر رکھا ہے۔ اس میں کسی
 تبدیلی کی گنجائش نہیں تھی۔ نہ کچھ بدل سکتا تھا۔
 ”آپکا رومینس پریڈ لمبا ہوتا جا رہا ہے۔“ روبانے
 اسے گزرتے وقت کا احساس دلایا تھا۔ افرایم نے
 ٹھنڈی آہ بھری۔
 ”تم ہاتھ کب آتی ہو۔“ وہ معصومیت سے بولا تھا۔
 منہ لٹکا کر۔ روبانے پڑی تھی۔
 ”سارا وقت آپ کے آس پاس تو ہوتی ہوں۔“
 ”خوشبو بن کر۔ وہ بھی لہسن اور ک کی۔“ افرایم
 نے اسے چھیڑا تھا۔ وہ اسے گھورنے لگی تھی۔
 ”کھانا بھی تو آپ کو میرے ہاتھ کا بنا چاہیے۔“ اس
 نے افرایم کے کندھے پر چپٹ لگائی تھی۔ ”آخر
 معدے کے رستوں سے گزر کر دل پہ قبضہ بھی جمانا
 ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں اتنی شرارت سمجھ گیا
 تھا۔
 ”تمہیں اتنی الٹی سیدھی پگڈنڈیوں سے گزرنے
 کی ضرورت نہیں تھی۔ جناب تو پہلی نگاہ میں ہائی
 جمپ کے ساتھ ہی ”یہاں“ براجمان ہو چکی تھیں۔“
 افرایم نے اسے دل کے مقام پر اس کا ہاتھ رکھا تھا۔
 روبانے کا دھڑکتا دل گھبرا گیا۔ اس محبت پہ غار ہو گیا۔
 ”اب جائیے۔ جمعہ کی نماز نہ رہ جائے ان ڈانڈلا گز
 کے بچ۔“ روبانے اسے دروازے کی طرف دھکیلا
 تھا۔ وہ ہنستا ہوا ایک کوئی شرارت بھرا اشارہ کرتا باہر
 نکل گیا تھا۔ روبانے بھی بال سمیٹ کر وضو کرنے چل دی
 تھی۔

بڑھایا تھا۔ ”لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ اللہ کی طاقت سب سے بڑی ہے۔ تمہارے آنگن کے چراغ ہمیشہ جلتے رہیں گے کوئی طوفان آئے یا آندھی برے۔“ وہ سر جھکائے کسی روشنی کے مرغولے میں گم ہوتا چلا گیا تھا۔ غائب ہو گیا تھا۔



اور اس دن فلاح کی سالگرہ کے بعد انادیہ اس کے سر پر پھٹ پڑی تھی اور تاجو ہکا بکا رہ گئی۔ انادیہ کا غصہ آسمان پر تھا اور نخوت اس سے بھی اوپر۔ وہ مارے غیض کے کف اڑا رہی تھی۔

”اس بڑھیا نے سارا ڈرامہ رچا رکھا ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے اس کے پاس۔ نہ کوئی جادو، نہ کوئی ٹونانہ کوئی موکل۔ سب ”ٹوٹے“ کا بہانہ ہے۔ میں نے اٹھارہ

ہزار کی منگنی والی انگوٹھی چڑھاوے میں دے ڈالی۔ اماں کی پورے تولے کی سونے کی موٹی والی زنجیر بھی اور اس نے یہ میرا کام کیا؟ الٹا اس مکار چچی نے بالشت بھر کی چھو کر کے اپنے پوتے سے رشتہ پکا کر دیا۔ میں گئی تھی وہاں۔ اپنے ”عمل“ کا کوئی ”رد عمل“ دیکھنے، مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں۔ کوئی جنات اس کے پاس نہیں۔ نہ کوئی مجھے برابر والے گھر میں کسی آسیب کا اثر دکھانی دیا۔ وہ لوگ خوش باش دعوتیں کھلاتے اور اڑاتے پھرتے ہیں اور چچی اپنے پوتوں کے بیچ ملکہ عالیہ بنی بیٹھی تھیں۔ وہ لڑکے جن کی وجہ سے چچی نے میرے منہ پر جوتے مارے۔ نفرت ہے مجھے ان لڑکوں سے۔ جن کی وجہ سے میں نے اتنی ذلت اٹھائی تھی۔“ انادیہ آگ بگولہ ہوئی چیخ رہی تھی اور تاجو کو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ بمشکل اسے ٹھنڈا کر کے گھر بھیجا اور دوسرے ہی دن برقعہ اوڑھ کر مانگہ کیا اور اماں دیوانی کے آستانے پہ جان لی تھی۔

تاجو نے بھی انادیہ کے سارے الفاظ ہو ہو اماں دیوانی تک پہنچا دیے تھے۔ ساتھ دل پہ ہاتھ رکھ کر انگوٹھی اور زنجیر بھی پیش کر دی۔ جسے وہ خود ہضم کرنے کا پکا ارادہ رکھتی تھی۔ اور ادھر اماں دیوانی انادیہ کے

جب وہ وضو کر کے باہر آئی تو بچے کھیل رہے تھے۔ اس نے بچوں کو قالین پر بٹھایا مانگہ بیڈ سے گرنہ جائیں اور کھلونے ان کے سامنے رکھ کر اماں کے کمرے میں جھانکنے لگی۔ اماں نماز ادا کر رہی تھیں۔ وہ اطمینان سے اپنے نماز والے کونے میں آگئی۔ پھر اس نے بڑے سکون کے ساتھ نماز کی نیت باندھی تھی اور جب وہ نماز کے بعد سلام پھیر رہی تھی تو اسے وہی بھولا بسرا احساس ایک دم ہراساں کر گیا تھا۔

اس نے دروازے کی سمت دیکھا۔ دروازے کا چوکھا خالی تھا، لیکن پھر بھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہاں کوئی کھڑا ہو۔ دروازے کے فریم میں۔ کوئی سانس لیتا ہوا وجود۔ روبا کا دل بری طرح سے خوف زدہ ہو رہا تھا اور جب وہ نماز کے بعد دعا کر رہی تھی تو اس

کے اٹھے ہوئے ہاتھ کلب رہے تھے۔ دعا کر کے اسے سکون ملا تھا۔ اس نے مگر سانس بھرا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ اور خواب میں روبانے کچھ عجیب منظر دیکھا تھا۔ اتنا عجیب جس نے اسے خواب میں بھی ہراساں کر دیا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے قریب آ رہا تھا۔ پھر وہ قرآن سے کچھ فاصلے پر دوڑا تو ہو کے نماز کے اشیاں میں بیٹھ گیا۔ اس نے سفید براق سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور کالے سیاہ ریشمی چمکتے بال۔ اس کے چہرے پر اتنی کم عمری میں نورانی مائر انسانی عقل کو حیران کر دینے والا تھا۔

”تم نے اس کا کچھ چھین لیا تھا۔ اب وہ تمہارا قیمتی سرمایہ چھیننا چاہتی ہے۔“ وہ دھیمی آواز میں روبانے کے حواس معطل کر رہا تھا۔

”وہ تمہارے چراغ بجھانا چاہتی ہے۔ تمہارے آنگن کے چراغ، لیکن اسے خبر نہیں۔ خدا چاہے تو اپنے پیاروں کے تیز آندھیوں میں بھی چراغ بجھنے نہیں دیتا۔ تمہارے آنگن کے چراغ جلتے رہیں گے۔“ اس کی بوجھل آواز معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ ”تمہارے آنگن کے چراغ۔ تمہارے بیٹے۔“ وہ

پیروں تلے سے زمین ————— نکل گئی۔

”دیکھ نابجو! مجھے چچی اور افرام سے بدلہ ضرور لینا ہے۔ ان جوتوں اور پھپھروں کا“ مگر میں انہیں جانی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی۔“ وہ رونے لگی تھی۔ آخر وہ کس سمت نکل گئی تھی؟ اس نے کس رستے کا انتخاب کر لیا تھا؟ جو کرنا تھا۔ اسے بھرنا بھی تھا۔ آگے کنواں تھا۔ پیچھے کھائی؟ وہ کرتی تو کیا کرتی؟

وہ اس ”عمل“ پر عمل درآمد نہ کرتی تو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑتے اور اپنی جان کے پیاری نہیں ہوتی؟ اپنی جان بچانے کی خاطر اس نے آنکھیں بند کر کے کئی اور انسانی جانوں کو عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے بہت بعد میں سمجھ میں آیا تھا کہ اماں دیوانی کو عذاب ناک جلال میں مبتلا کر کے اس نے اپنا کتنا بڑا نقصان کیا تھا؟ اس نے اپنی جلد بازی، زبان درازی اور

نفس کی سرکشی میں اپنا کتنا بڑا نقصان کر لیا تھا۔ یہ تین راتوں پہ مشتمل عمل تھا۔

تین طاق راتیں۔ تین خطرناک راتیں۔ تین دہشت ناک راتیں۔ تین بیت ناک راتیں۔ جو تین دن اور تین راتوں پہ مشتمل تھیں اور اگلے تیس سالوں پر محیط ہو چکی تھیں۔ تیس سالوں کی ریاضت ان تین راتوں نے چاٹ لی تھی اور تین حرفوں کے ایک لفظ ”حسد“ نے اس کے اندر سے پوری انسانیت اکھاڑ لی تھی۔

یہ پہلی رات تھی۔ بو جھل، شرانگیز۔ گناہوں کی دعوت نگارہ دیتی ہوئی۔ اپنی طرف ہنکاتی ہوئی۔ یہ پہلا عمل تھا جسے رات کے تیسرے حصے میں کھلے آسمان تلے کرنا تھا۔ ایک بڑی گنگال کے اندر گائے کی ران اور مونڈھے کی ہڈی کے اوپر۔ چند الفاظ تھے جنہیں پھونکنا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور گنگال پر اسم پھونکتی رہی۔ ایک، دو، تین، چار۔

رات منحوس تھی۔ کسی جوان اُجڑی ابھانگن کی طرح۔

الزامات پر جلال میں آگئی۔ اس کا کرہ سر چہرہ بگڑ گیا اور غصے میں اس کے منہ سے جھاگ گرنے لگے تھے۔

”جلد باز ناری دے۔ تیزی دکھاوے دے۔ سرسوں جماوے دے۔“ اماں دیوانی وحشت کے عالم میں جھومنے لگی۔ اس کی آنکھیں چڑھ گئیں اور غیض کے عالم میں نقوش مسخ ہو گئے۔

ادھر نابجو پہ کپکپی طاری تھی۔ پیسے کے لالچ میں آتو جاتی تھی، مگر جان ہتھیلی پہ رکھ کر۔ اور اب خوف سے ٹھہر رہی تھی۔ اماں دیوانی کو جلال آگیا تھا۔ اس نے سارے شیطان اکٹھے کر لیے تھے اور ان پہ اپنا حکم چلا رہی تھی اور نابجو کان دیا کر ہاں کہہ رہی تھی۔

اماں دیوانی کا جلال ایسے نہیں عود آیا تھا۔ وہ ایک تباہی بھی ساتھ لایا تھا۔ نابجو جب آستانے سے نکل رہی تھی تب اماں دیوانی کے ایک چیلے نے بہت سارا

سلمان ایک چری تھیلے میں نابجو کو تھمایا تھا جسے وہ انادیہ کے سامنے کھولے اسے سمجھا رہی تھی۔

”پکی پکائی کے انتظار میں نہ بیٹھو۔ کچھ حیلہ بھی کرو۔ اماں دیوانی نے عمل شروع کر دیا ہے۔ جیسے سمجھاؤں گی ویسے ہی کرتی جانا۔ عمل درست کرنا اور انکار کی گنجائش بھی نہیں۔ ورنہ سارا عمل الٹا ہو کر تمہارے سر آ پڑے گا۔“ وہ جو کچھ سمجھ کے آئی تھی۔ انادیہ کو اسی طریقے سے سمجھا رہی تھی اور انادیہ کی آنکھیں وحشت سے پھٹنے لگیں۔ اس نے تھیلے میں سے برآمد ہوئی چیزوں کو ہاتھ سے پرے کھسکایا۔

”یہ بہت خوف ناک عمل ہے۔ میں نہیں کر سکتی۔ تم وہاں سے کیوں اٹھا کر لائی ہو؟“ وہ نابجو سے الجھ پڑی تھی۔

”تو پہلے سوچتا تھا۔ کالا جادو ایسے ہی ہوتا ہے۔ اب بغیر ڈر کھائے عمل ضرور کر لینا۔ ورنہ وہ شیطانی چیزیں تیرا گلا گھونٹ جائیں گی۔ عمل الٹا پڑے تو جان سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں یا ان شیطانی چیزوں کا غلبہ ہو جاتا ہے۔“

نابجو نے اس کی مزید آنکھیں کھولیں تو اس کے

اسان ساروں سے خالی۔ چاند اور بس بھیا ناک
سیاہی کے علاوہ کچھ بھی کہیں نہیں تھا۔ صیاد اپنے صید
کے پیچھے تھا اور کہیں دور جنگلوں میں گھوڑے
بہناتے تھے۔ صید گاہ میں وہ اکیلی تھی اور شکار قطعاً
بے خبر اپنے مستقبل سے نا آشنا۔

نازبو کے ساتھ لوہان کے جلنے کی ”بو“ آتی تھی اور
رہٹھے کی شاخوں پر کوئی گھری چلاتی تھی۔
اس کے سامنے ایک مٹی کی کنوری رکھی تھی۔
خوناب سے بھری ہوئی۔ کسی جانور کا تازہ کٹا ہوا گوشت
اور خون۔ چمڑے کے تھیلے سے ایک سوکھی خشک اور
خوف ناک سی کھوڑی برآمد ہوتی تھی۔ جسے ہاتھ
لگاتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا، لیکن ایسے کام بے خوف
لوگ کرتے ہیں۔ جو نڈر ہوتے ہیں۔ بے حس ہوتے
ہیں۔ کنز ظالم اور بے حس وحشی۔ اور جو اٹھکر اس کے
دل کی انگلیٹھی میں دبک رہی تھی اس کی شدت ایسی کم
نہیں تھی جو وہ اتنے سے عمل پہ ٹل جاتی۔ وہ نہ ڈری
نہ سہی بلکہ شیطانی عملیات کرتی رہی۔ وہ ایسی راہ پر
چل نکلی تھی جہاں کہیں بھی خیر نہیں تھا۔



آج اس کی آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ جب وہ اٹھی تو
افراہیم اپنے دفتر چاچکا تھا۔ سرکاری جیب —
گیراج میں نہیں تھی۔

اماں نے اسے اٹھتے ساتھ ہی پیغام دیا تھا۔ ”افراہیم
کا افسر اپنی بیوی کے ساتھ آئے گا۔ دعوت کا انتظام
کر لیتا۔“

اماں کے پیغام نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ افرہیم
کو ایسی سربراہان جنگ دعوتوں — کا برا شوق تھا۔
اب مرنا کیانہ کرنا کہ مصداق اس نے کمر کس لی۔ اور
صفائی میں جُت گئی۔ دوپہر تک کھانا بھی تیار کرنا
تھا۔ اماں نے پاز لسن اور اورک چھیل کاٹ دیا تھا۔
باقی کا کام وہ خود کر لیتی۔ افرہیم کو اس کے ہاتھ کا کھانا
بہت پسند تھا۔

ابھی وہ صفائی کر کے ہٹی ہی تھی کہ افرہیم کا فون
آگیا۔ ”میری جان کو کھانا پکانے میں کوئی مشکل تو پیش

نہیں آئے گی؟“ وہ بڑی لکاوٹ سے پوچھ رہا تھا۔ روبا
نے اندر رائڈ تاغصہ بمشکل ہی دیا۔

”مشکل کیوں پیش آئے گی؟ شاہی خانسائے موجود
ہیں۔ جھٹ پٹ دعوت کا انتظام کر لیں گے۔“

”او۔ ہو۔ یہ تو میں جانتا ہوں۔ تب ہی تو بے فکر
تھا۔“ افرہیم نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔

”تو پھر بے فکر ہی رہے۔ دعوت کا انتظام
ہو جائے گا۔“ روبا نے اسے تسلی دی تھی۔ افرہیم
شانت ہوا۔

”تمہارے ہوتے ہوئے مجھے کس بات کی فکر؟ یہ
بتاؤ مینیو میں کیا ہوگا؟“ افرہیم نے وہ سوال پوچھا
جس کے لیے کال کرنے کی زحمت کی تھی۔

”میرا کلیجہ۔“ وہ کسل کر بولی تھی۔
”ساتھ ایک ڈش مغز کی بھی کر لیتا۔“ افرہیم نے
اسے چھیڑا تھا۔

”سب کچھ سربراہان جنگ ہوگا۔ جیسے مجھے اچانک
دعوت نامہ سنا کر سربراہان زدیتے ہیں۔“ اس نے چبا چبا
کر حتمی طور پر افرہیم بے ساختہ ہنس پڑا۔

”جی یا ر۔ بتانا یاد نہیں رہا۔ رات کو تم سو گئی تھیں
اور صبح اٹھی نہیں تھیں۔“

”جگا نہیں سکتے تھے۔ سوئی تھی مری تو نہیں
تھی۔“ وہ تپ اٹھی۔ افرہیم دہل گیا تھا۔

”مرس تمہارے دشمن۔“ وہ دلار سے بولا تھا۔
”دشمن؟ یعنی پڑوسی۔“ روبا ہنسنے لگی۔ آپ

بھی نا۔ اس نے ہنسنے ہوئے سر جھٹک کر کہا ”میرے
بھائی کو شادی سے پہلے رنڈا تو نہ کریں۔“ اس کے
ٹوکنے پر افرہیم نے کانوں کو ہاتھ لگایا تھا۔

”میری ایسی مجال۔ اسے تو فرشتے بھی ہاتھ لگاتے
ہوئے سوچیں گے کس کو ہاتھ لگادیا۔ نارے نارے۔“ وہ
اپنے دھیان میں بول رہا تھا۔ روبا ذرا سا چونکی تھی۔
اسے کسی بچے کی رونے اور جھنجھنے کی آواز آئی
تھی۔

”اچھا جناب، پھر ملاقات ہوگی۔ میں ذرا بچوں کو
دیکھوں اور کچن کو بھی۔“ اس نے فون کھناک سے

بڑی سی پتیلی کے اندر گوشت اور چاولوں کے ساتھ
باریک سوت سے کیڑے سرسراہے تھے۔
افراہیم نے چکراتے سر کے ساتھ یہ منظر دیکھا اور
پتیلی اٹھا کر پچھلے صحن کی دیوار پارلٹ آیا، لیکن جب وہ
واپس آ رہا تھا تو اس کا ذہن کسی بھاری چیز کے اثر سے
بو جھل ہو رہا تھا۔ جیسی کسی نے دماغ کے اوپر وزنی بوجھ
لا دیا ہو۔



اور یہ تیسری اور آخری رات تھی۔ چند رات کی
رات۔ چاند کبھی بادلوں کی اوٹ میں ہوتا۔ کبھی دھرتی
پہ چھا جاتا۔ وہ کسی ابھارکن کی طرح پچھلے صحن میں
بنائے قبر نما گڑھے میں لیٹی تھی۔
تیسرا اور آخری وہشت ناک عمل۔

یہ گڑھا کدال سے کھودا گیا تھا۔ اسے ناجو نے کھود
کر دیا تھا۔ وہ پورا دن پچھلے صحن میں یہ کام کرتی رہی
تھی۔ شام تک گڑھا تیار تھا۔

اور اس کے بعد اناویہ کی باری تھی۔ وہ رات کے
دوسرے پہر کا انتظار کرتی رہی۔ جیسے ہی دوسرے پہر
میں رات ڈوبی اس کا شیطان اس کے اندر انگڑائی لے
کر جاگا۔ اسے گڑھے میں لیٹے ہوئے اس بات کا ہرگز
اندازہ نہیں تھا کہ ان عملیات کے بعد افراہیم اور چچی پہ
کیا گزرے گی؟ یہ عملیات ان پہ کیسی نحوست
چھوڑے گئے؟ اس کے ذہن میں صرف ایک بات
کانٹے کی طرح بھی تھی۔ افراہیم اور چچی کو تکلیف
دے کر ان جوتیوں اور تھپڑوں کا بدلہ لینا ہے۔

وہ جب بھی اماں دیوالی کا بتایا ہوا عمل پڑھتی اس کا
دھیان بننے لگتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے افراہیم
اور روبہ کی خوش گوار عائلی زندگی آتی۔ ان کے پھول
سے بچے۔ اس کا دل الٹنے لگتا۔ قریب ہوتا کہ اسے
ترس آجاتا اور وہ دل میں بڑھتی وحشت سے گھبرا کر
بھاگ اٹھتی، لیکن کوئی طاقت ور چیز اسے بھاگنے سے
روکتی تھی اس کے قدموں کو باندھ لیتی۔

افراہیم کے بھاری ہاتھ سے بڑنے والے تھپڑ۔ منہ
لگتی چچی کی جوتیاں۔ ذلت، ذلت، ذلت۔ اس کے

رکھا اور باہر بھاگی۔ جہاں پر اماں رافع کو بیسن کی طرف
لے جاتی دکھائی دیں۔ اس کا پورا منہ خون سے بھرا
تھا۔ ہونٹ پھٹا ہوا۔ روبہ کی جان نکل گئی تھی۔ وہ بھاگتی
ہوئی اماں تک آئی۔

”کیا ہوا میرے بچے کو۔“ روبہ اتنا بھل بھل گرتا
تازہ خون دیکھ کر رونے لگی۔ اماں نے رافع کا منہ
دھویا۔ خون تھا کہ رک ہی نہیں رہا تھا۔ اماں نے روتی
ہوئی روبہ سے کہا۔

”برف کی ٹکڑیاں نکال لاؤ۔“ وہ بھاگتی ہوئی سر ہلا کر
برف نکال لائی۔ اماں نے بلکتے ہوئے بچے کو بازوؤں
میں دوچا اور روبہ اس کے پھٹے ہونٹوں پر نکلور کرنے لگی
تھی۔ کافی دیر کی مشقت کے بعد بچے کا خون رکاوٹ
دونوں ساس بسو کی جان میں جان آئی تھی۔

”یہ کیسے گرا۔؟“ روبہ کو خیال آیا۔ وہ رافع کو
کندھے سے لگا کر تھپک رہی تھی۔ اماں اس کے لیے

دودھ کی بوتل بنالائیں۔ بچہ سما ہوا اماں کے کندھے
سے لگا تھا۔ دودھ پینے سے بھی انکار کر دیا۔

”ایسے ہی۔ نہ کسی نے دھکا دیا نہ چھیڑا۔ بیٹھے
بیٹھے الٹ گیا۔“ اماں خود پریشان تھی۔ روبہ چونک گئی۔
”یوں ہی تو نہیں گر سکتا۔ کیا قافح نے دھکا دیا؟“

”قافح تو تھا ہی نہیں۔ وہ کمرے میں ہے۔“ اماں
کے بتانے پہ وہ خاموش ہو گئی تھی، لیکن اندر ہی اندر
پریشان ضرور تھی۔

”یہ گھر بھاری ہے۔ میں افراہیم سے کہوں گی۔
ہمیں کہیں اور شفٹ کریں۔“ کھانا بناتے ہوئے وہ
سوچ رہی تھی۔ اماں بچوں کے پاس تھیں اور اب
انہیں اکیلا چھوڑنے والی نہیں تھیں۔

اس نے اگلے چار گھنٹوں میں کھانا بنالیا۔ کباب
فرائی کیے۔ فرنی ٹھنڈی ہونے کے لیے رکھی اور بریانی
کو دم دیا۔ خود وہ نہانے کے لیے چلی گئی تھی اور جب وہ
نہا کر بریانی کا دم کھولنے کے لیے پچن میں آئی تو اس کی
بھیانک چیخوں نے اماں کو ہی نہیں گیٹ سے اندر
آتے افراہیم کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔

روبا بریانی کو دیکھ کر اونچی آواز میں چلا رہی تھی۔

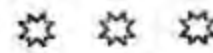
اتھتے قدم جم جاتے تھے۔ ہر مزاحمت دم توڑ دیتی۔ اسے تب خبر نہیں تھی کہ یہ کون سی طاقت ور چیز ہے جو اسے بھاگ جانے سے روکتی تھی۔

اور اس وقت قبر نما اس گڑھے میں لیٹ کر وہ چچی اور چچی کے بیٹے کو ان جوتوں اور پتھروں کے بدلے میں دی جانے والی "ذیت" اور "تکلیف" پہنچانے کی انتہا پہنچا رہی تھی۔ اس نے چری تھیلے سے زنگ آلود ایک لوہے کا چھوٹا سا گھرنکلا اسے مٹی، دھول اور کنگروں سے بھر کے بڑا سا زنگ آلود تالا لگایا اور اسی گڑھے کے اندر دفن کر دیا۔ اب وہ گڑھے سے اٹھ رہی تھی۔ پھر چری تھیلے سے ایک آخری چیز نکالی اس وقت وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ اس نے تھیلے کو لالٹین پر رکھ کر آگ دکھائی۔ ادھر تھیلہ جل رہا تھا اور ادھر اس نے تھیلے سے نکالی ہوئی چیزیں دیکھیں۔

یہ دو کپڑے اور روئی سے بنے گڑیا اور گڈا تھے۔ ایک عورت ایک مرد۔ روبہ اور افرایم۔ اس کا دل پہلی مرتبہ خوف کے عالم میں لرزا تھا۔ اس کے ہاتھ میں عورت اور مرد کا یہ بت کپکانے لگا، مگر ہدایات سخت تھیں۔ اب اس کی مرضی پسند کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اسے ہر حال میں ہدایات پہ عمل کرنا تھا۔ دوسرے ہی پل وہ کپڑے کے ان دونوں پتلوں کو گڑھے کے اندر دفن کر رہی تھی۔ پھر اس نے نیچے سے مٹی برابر کی اور لوٹ آئی۔

وہ روبہ اور افرایم کا سارا چین، سکھ، سکون اور ان کا وجود اس مٹی تلے دفن کر آئی تھی۔ وہ خود کو جہنم کا ایندھن بنا آئی تھی۔ انادیم کے وجود کے گرد جو نپاک حصار قائم تھا۔ ناری وجود اسے توڑنے سے قاصر تھا۔ وہ اٹھ قدموں پلٹ گیا تھا۔

"اے خاکی! ہائے افسوس اور تجھ پر لعنت۔"



افرایم اور روبہ کی زندگی سے راحت لفظ ہمیشہ کے لیے روٹھ گیا تھا۔

افرایم نے اماں اور روبہ کا خوف کم کرنے کے لیے

بہت سی دلیلیں سوچ لی تھیں۔ وہ پتیلہ الٹ کر آیا تو روبہ اماں کے گلے سے لگی رو رہی تھی۔ افرایم نے بمشکل اسے چپ کرایا۔

"چاولوں میں کپڑے ہوں گے۔ تم نے دیکھ کر نہیں ڈالے؟"

"چاولوں میں کپڑے ایسے نہیں ہوتے، اگر ہوتے بھی ہیں تو زندہ ہرگز نہیں رہتے۔ وہ تازہ ڈالے گئے کپڑے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ڈھکن اٹھا کر ڈالے گئے ہیں۔" روبہ روتی ہوئی بے ساختہ چیخ کر پڑی۔

"عزہ نے شرارت نہ کی ہو۔" افرایم کا لہجہ نرم تھا۔ اسے اپنی بات خود ہی بہت کھوکھلی لگ رہی تھی۔ افرایم بریانی باہر سے لے آیا تھا۔ دعوت تو نبٹ گئی تھی، مگر اپنے پیچھے ایک "ہراس" چھوڑ گئی تھی۔

افرایم چپ تھا۔ روبہ خاموش گم صم اور اماں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی۔

اس دن کے بعد پھر کوئی اور ناگوار واقعہ پیش نہ آیا تو افرایم ایک مرتبہ پھر مطمئن ہو گیا تھا۔ روبہ بھی کام کاج میں لگی رہتی تھی، لیکن اس کے پیچھے ایک خوف ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گیا تھا۔ اسٹور میں چھت سے کمروں میں کچن میں۔ وہ جس جگہ بھی۔ جاتی تھی۔ ڈر اس کے پیچھے رہتا۔ وہ چیخنے لگی، رونے لگی اور پھر اکثر بے ہوش بھی ہونے لگی۔

اس صورت حال نے افرایم کو سخت متوحش کر دیا تھا۔ اس نے اپنے تئیں کچھ سدباب بھی کیا۔ دم در دم بھی کروائے۔ روبہ کو ڈاکٹرز کے پاس بھی لے کر گیا۔ دوائیاں ٹھیکے علاج۔ مگر کوئی افادہ نہ ہوا۔

گھر کے اندر عجیب و غریب واقعات ہونے لگے تھے۔ کئی بکائی ہانڈی کے اندر خون بڑا ہوتا۔ اکثر بستر کے اوپر گچے گوشت کی بوٹیاں نظر آتیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے بیچ کیلیں بکھری پڑی ہوتیں۔ واش روم کے اندر ایسی چھریاں ملتیں جن کے اوپر تازہ لہو جما ہوتا۔ رات کو چھت سے آوازیں آواز میں روتے تھے۔ اور ایک دن روبہ کے کماری میں رکھے کپڑوں کو آگ لگ گئی تھی۔ اگر فوری طور پر آگ نہ بجھائی جاتی تو بورا

کمرہ اور پورا گھر جل جاتا۔ روبہ جونیا لباس پہنتی بیویوں لگتا تھا جیسے کسی نے فیچہ کے ساتھ کتر دیا ہے۔ روبہ کو دورے پڑنے لگے اور پھر یہی صورت حال رافع اور فاح کے ساتھ پیش آنے لگی۔

بچے سوتے میں ڈر جاتے۔ کبھی کبھی بھوت بھوت چلانے لگتے تھے۔ کبھی بچہ کہیں سے کرتا کبھی کہیں سے۔ بچوں کی کتابوں پہ خون کے چھینٹے پڑنے لگتے۔ یہی خون بعد ازاں افرایم کے کپڑوں پہ بھی بوندوں کی مانند گرنے لگا تھا۔ حتیٰ کہ اماں بھی محفوظ نہ رہیں۔ بلکہ اماں روبہ سے زیادہ تکلیف میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ وہ کنگھی کرتیں تو ان کے سر میں سے زرد کیرے اور سنڈیاں گرنے لگتیں۔ جسم کا درد ان کی جان نکال کے رکھ دیتا۔ رات کو انہیں یوں لگتا تھا۔

جیسے روبہ ان کے بال کھینچتی ہے اور انہیں مارنے کی کوشش کرتی ہے۔

اماں کے ساتھ ایسے واقعات تسلسل سے ہونے لگے تھے۔ انہیں روبہ قافلہ کے روپ میں نظر آنے لگی تھی اور ان کے دل میں روبہ کی طرف سے ڈر بیٹھ گیا تھا۔

وہ اسے دیکھ کر چیخنے لگتیں۔ ”افرایم! مجھے پچالو۔ یہ میرے منہ پہ جوتی مارتی ہے۔“

کپڑے دھوئی روبہ ہلکا بکارہ جاتی تھی۔ افرایم پریشان تھا۔ آخر اس گھر میں کیا ہو رہا تھا؟

اور آخر کار افرایم نے اپنا گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دفن شدہ لوہے کے گھر کو لگا تالا حقیقت میں لگ گیا۔ وہ سرکاری ہنگامے میں آگیا۔ اپنا مکان چھوڑ دیا۔

اور انادیا حیران تھی کہ افرایم اپنا گھر کیوں چھوڑ رہا ہے؟ اسے تو اپنا گھر بہت پیارا تھا۔ وہ ان تین خوف ناک راتوں کے عمل کو کسی بھیانک خواب کی طرح بھول چکی تھی۔ اسے یاد ہی نہیں پڑتا تھا کہ اس نے کوئی خطرناک سفلی عمل بھی کیا ہے؟ بھلا وہ اتنا خوف ناک ترین کام کر سکتی تھی؟ یہ تین راتیں اس کے ذہن سے ہمیشہ کے لیے مٹ چکی تھیں۔

اس سفلی عمل کی ایک یہ بھی خوبی تھی کہ عمل کرنے والا بھول ہی جاتا کہ اس نے کبھی کچھ سفلی عمل کیا بھی تھا۔

اور ان ہی دنوں کاشف اپنا کورس مکمل کر کے واپس آگیا تھا۔ کاشف کے آتے ہی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے۔ اور انادیا نے شکر ادا کیا تھا کیونکہ افرایم کے جانے سے اسے گھر کا کرایہ ادا کرنا۔

پہاڑ بن گیا تھا۔ اسے تو خبر ہی نہیں تھی کہ اماں کے مرنے اور ناصر کے چلے جانے کے بعد گھر کا کرایہ کون دیتا تھا۔ راشن کون بھجواتا تھا؟ افرایم گیا تو پتا چلا کہ دکان سے آنے والا کرایہ ناصر ہتھیالیتا تھا۔ وہ ہینوں کا حصہ بھی نہ دیتا اور پھر اس نے دکان بھی بیچ دی تھی۔ ساری رقم لے کر وہ ایسا فرار ہوا کہ واپس ہی نہ آیا۔

انادیا کو اتنا عرصہ افرایم نے بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ وہ اسے تکلیف سے بچاتا تھا۔ اور اگر انادیا کو یاد رہ جاتا کہ اس نے افرایم کے ساتھ کیا کیا تھا؟ تو خود کو آگ لگا کے جنگلوں میں نکل جاتی، لیکن اصل مصیبت یہ تھی کہ اسے کچھ یاد ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی ذہن کی سلیٹ سے سب کچھ مٹ گیا۔ وہ بدلہ، انتقام، غصہ، ذلت اور تین بھیانک راتیں۔ جو افرایم کی زندگی پہ اماں بن کر چھا گئی تھیں۔

ناجوانے کہا تھا۔ ”یہ عمل تین دن پہ محیط ہے“ ”اثر“ بھی تین دن رہے گا۔ زیادہ سے زیادہ تین دن تک۔ پھر جادو کا اثر ٹوٹ جائے گا۔ ناجوانے یہ تو بتادیا تھا، لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ تین دن کی ”تکلیف“ کے بعد جادو کے اثر کا توڑ کیسے کیا جائے گا؟

یہی بھول ناجوانے ہوئی تھی اور اسی بھول میں انادیا پڑ گئی۔ وہ تو اپنی شادی کے ہنگاموں میں کھو کر سب کچھ بھول چکی تھی۔ شادی کے بعد اس نے آسانشات سے بھری ایک شاندار زندگی کا تصور کیا تھا، جو اسے مل بھی گئی تھی۔

وہ کاشف کے دل، گھر اور ہر چیز کی بلا شرکت غیرے مالک تھی۔ کاشف کا دل اس کے قبضے میں تھا اور انادیا کا اپنا دل؟ وہ بھی انادیا کے اپنے ہی قبضے میں تھا۔ وہ

تھیں۔ روبا کے ساتھ ان کے اب۔ ملا وجہ اختلافات چلتے تھے۔ جن پر شروع شروع میں افرایم برہم ہوتا تھا۔ روبا یہ غصہ بھی کرتا اور اب اس نے ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

افرایم پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو چکا تھا۔ زندگی میں کامیابیاں بڑھیں تو خوشحالی بھی دو قدم آگے چلی گئی تھی۔ ایک روبا بھی جو اسی مقام پر ٹھہر گئی تھی۔ وہی سادگی وہی خاموشی وہی متانت۔

اور ایک اناویہ تھی۔ جو روبا کی طرح ہی اسی مقام پر ٹھہری ہوئی تھی۔

وہی حسن وہی نخرہ وہی اداوہی نخوت اور غرور۔ کاشف پہلے سے کچھ فرہبی مائل مگر اناویہ کی محبت میں اول روز کی طرح مگن۔ اور اس سیل رواں میں

پہلا کنکر اماں کی خواہش نے مارا تھا۔ وہ حیران حیران سا ماں کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

”یہ کس کے لیے اتنی محنت کرتا ہے تو؟ یہ دھن دولت کس کام کی؟“ اماں کی دھیمی آواز سن کر غسل خانے سے نکلتی اناویہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹھکی گئی تھی۔

اماں کی اس گفتگو کا مقصد کیا تھا؟ کاشف جانتا یا نہ جانتا۔ وہ اچھی طرح سے جانتی تھی۔ اور اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

”آف کورس اماں! آپ کے لیے ابا کے لیے اور اس جیل کے لیے۔“ کاشف نے ہنستے ہوئے اناویہ پر چوٹ کی تھی۔ وہ غسل خانے سے باہر آرہی تھی۔ دوہنا نادر۔ کھلے بال۔ زلفوں سے چپکتی کمی۔ ہمیشہ کی طرح اماں کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

اسے شوہر کے ساتھ ہی دن چڑھے سو کر اٹھنے کی عادت تھی۔ کاشف فیکٹری کے لیے دیر سے نکلتا تھا۔ رات دیر سے گھر آتا تو صبح آنکھ بھی جلدی نہیں کھلتی تھی۔ وہ کاشف کی اسی عادت کو یہاں بنا کر اماں کی سرزنش کا بڑا ٹھٹھک کے جواب دیتی تھی۔

”اماں! کاشف اٹھنے ہی نہیں دیتے۔“ شادی کے

صرف کاشف کے دل پر ہی حکومت نہیں کر رہی تھی اس کی رعایا میں اس کی مسکین بہن اور ساس سسر بھی شامل تھے۔

شادی کے بعد چچی کے بے تحاشا اصرار پر بھی اناویہ نے اپنی بہن کو ان کے حوالے نہ کیا تھا۔ اسے حکومت کرنے اور حکم چلانے کی عادت تھی۔ اناویہ چلی جاتی تو وہ کس پر حکم چلاتی؟

روبا اب پہلے جیسی روبا نہیں رہی تھی۔ بہت کم گو، خاموش اور چپ چاپ رہنے لگی تھی۔ میکے بھی زیادہ آتی۔ پہلے افرایم اسے آنے ہی نہیں دیتا تھا اور اب افرایم اسے لینے ہی نہ آتا۔ وہ سرکاری جیب میں ڈرائیور کے ساتھ بڑے ٹھاٹ سے آتی تھی مگر یہ ٹھاٹ اس کی شخصیت میں کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے آتی۔ اماں کے کمرے میں قیام کرتی اور یہیں سے واپس لوٹ جاتی۔ اور بعد میں اماں کی ٹھنڈی آہیں اسے ”چونکا“ ضرور دیتی تھیں۔ وہ اپنی خوشیوں میں مگن روبا کی زندگی کے نشیب و فراز سے قطعاً ناواقف تھی۔



ایک دو تین چار اور پورے چھ سال گزر گئے۔ ان چھ سالوں میں بڑی تبدیلیاں آئی تھیں۔ چھوٹے بچے قد نکالنے لگے اور بڑے اپنی عمر میں چند سال اور آگے نکل گئے۔ کاشف ان سالوں میں جاب کے ساتھ بزنس بھی کرنے لگا تھا۔ اس کا کاروبار وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ ابا کا کارخانہ اب فیکٹری میں بدل گیا تھا۔ اور کاشف نے اپنے لیے الگ بنگلہ بھی بنوایا تھا۔

افرایم علاقے کا کمشنر ہو گیا تھا۔ عہدہ بڑا تھا اور مصروفیت بھی زیادہ تھی۔ معیار زندگی بھی بدل گیا تھا۔ اب افرایم کی زندگی میں گلیمر پارٹیز اور ہانا گلا آچکے تھے۔ اس کی کلب، جم اور دوستوں سے میل ملاقات کی مصروفیت۔ بچے اعلا اسکولوں میں زیر تعلیم تھے۔ اماں حد سے زیادہ وہمی اور ضعیف ہو چکی

ابتدائی ایام میں وہ منہ بھر کے اماں کو شرمندہ کر دیتی تھی۔

وہ بے چاری اپنا سامنہ لے کر رہ جاتی تھیں۔ وقت آگے بڑھتا تب بھی انادویہ کی یہ ہی روئین تھی۔ ایک دن روپا اور بچے بھی یہیں تھے۔ اور انادویہ گیارہ بجے کمرے سے نکلی تو اماں کہے بغیر نہ رہ سکیں۔

”آج تو جلدی اٹھ جاتی۔ گھر میں نند آئی ہوئی ہے۔ اور بچے بھوک بھوک چلا رہے تھے۔ یہ نے مجھے سلمان رکھ دیا چولہے کے پاس اور میں نے پرائے بنائے۔ روپا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“ اماں نے اک ناگوار نگاہ اس کے گلے سر آپے سے جھلکتے چاندی جیسے وجود پر ڈالی اور چیخ کر بولی تھیں۔

انادویہ نے ایک لمبی جمہای روک کر وہی رٹا رٹایا جملہ کہا۔ ”کاشف نے کہا۔ سوئی رہو۔ اتنے دنوں بعد تو میں آیا ہوں۔“

کاشف نے یہ ضرور کہا تھا کہ اسے وقت دویہ نہیں کہا تھا کہ میری ماں اور بہن کے سامنے بھی نشر کرو۔ سوئے اتفاق کاشف بھی اسی وقت کمرے سے باہر نکلا اور اس نے انادویہ کا جملہ سن لیا۔ اور پھر وہ عزت افزائی ہوئی کہ انادویہ کو زمین کا چھٹانک بھر کلزانہ ملا منہ چھپانے کے لیے۔

روپا اور اماں کے سامنے اس بے عزتی نے انادویہ کو خونخوار بنادیا اور تب ان کی پہلی زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ جس کا اختتام کاشف کے ہاتھ اٹھانے پر ہوا۔ انادویہ کی زبان اتنی چل رہی تھی کہ کاشف برداشت نہ کر سکا تھا۔

”کنواری بہن تھی تمہاری۔ جو اس کے سامنے بے شرمی کا مظاہرہ ہو گیا؟ کیا وہ اپنے شوہر کے ساتھ۔“ انادویہ کی چلتی زبان کو کاشف کے بھرپور پھپھر نے روک دیا تھا۔ اور انادویہ ایسی چپ جیسے ریل گاڑی کے چھکا چھک چلتے انجن میں اچانک کوئی خرابی ہو جائے۔ اور وہ اچانک ایک جھٹکے سے بند ہو جائے۔ ”بیویوں کا کوئی ادب لحاظ بھی ہوتا ہے۔ تمہاری

زبان نہ کوئی بچہ دیکھتی ہے نا کوئی بڑا۔“ کاشف کا غصہ سوانیزے سے تھا۔

چونکہ غلطی انادویہ کی تھی۔ سو ایک ہفتہ کاشف سے بول چال بند کرنے کے بعد اس نے کاشف سے خود ہی صلح بھی کر لی۔ ویسے بھی موسم بدل رہا تھا۔ ایک بھاری رقم کی ضرورت تھی شاپنگ وغیرہ کے لیے۔

اس کے ”سوری“ یہ کاشف کا دل صاف ہو گیا اور اس نے نوٹوں کی ایک گڈی بغیر گئے اسے پکڑا دی تھی۔ وہ دینے کے معاملے میں اتنا ہی سختی تھا۔

انادویہ کی تلخ سوچیں اسے کہاں سے کہاں لے گئی تھیں۔ وہ چونکی تو تب جب کاشف کی نگاہوں کا احساس ہوا۔ کاشف اسے اشارہ کر رہا تھا تاکہ وہ ”دوپٹہ اوڑھ کر آئے۔“ اماں کو کھلے بال اور بنا دوپٹے کے لڑکیوں کا گھر میں پھرنا پسند نہیں تھا۔

اور انادویہ اماں کی گفتگو کے اثر میں کھڑی تھی۔

”اللہ تجھے صاحب اولاد کرے میرے بچے، ہم بڑھیا بڑھے کو نعمتوں کے ان انبار کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تو بس تیری اولاد کی خوشی دیکھنا چاہتے ہیں۔ کوئی ہمارے دل بھلانے کا بھی سلمان ہو۔“ اماں آبدیدہ ہو گئی تھیں اور انادویہ تلخ۔

”ہونہ نہ یہ ہی چالاکیاں آتی ہیں ان مکار کنینوں کو۔ کوئی اور بات نہیں ملتی تو کاشف کو اس طرح میرے خلاف کرتی ہیں۔“ وہ ستون کے پیچھے بیج و تاب کھاتی کمرے میں چلی گئی تھی۔

”آپ کے دل بھلانے کو یہ ہے نا۔ کیوں یہ! اماں کا دل نہیں بھلاتیں تم؟“ کاشف نے اماں کو افسردگی کے حصار سے نکالنے کے لیے پاس بیٹھی ہوم ورک کرتی بیہ کو چھیڑا تو وہ بری طرح سے شرما گئی۔

”بیہ تو میری بیٹی ہی ہے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک۔ سنتا ہے کاشف؟ بیہ رات کو میرا سر دبا دیتی ہے۔ پیروں میں مالش کرتی ہے۔ اور تیرے ابا کو اخبار پڑھ کر سناتی ہے۔ دوائیوں کی ساری سمجھ بوجھ ہے اسے۔ وقت پہ دوائی لے کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور چائے پینا بھی سیکھ

لی۔" اماں کا دھیان بٹ گیا اور وہ انابسیہ کی تعریفوں میں رطب اللسان ہو گئیں۔

اندر بیٹھی انابسیہ کے اندر "بل" پڑنے لگے تھے۔ انابسیہ کی تعریف اسے غصہ دلاتی تھی۔ اور وہ بھی کاشف کے سامنے پھر کاشف کا دلچسپی لینا تو وبال ہی بن جاتا تھا۔

"اچھا تو یہ! ہمیں چائے نہیں پلاؤ گی؟"

"بھی بناؤں کیا کاشف بھائی؟" وہ مارے خوشی کے کھل اٹھی۔ کاشف بھائی جب بھی اسے وقت دیتے توجہ سے اس کی بات سنتے وہ اسی طرح خوشی سے مسرور ہو جاتی تھی۔

"اب تو لی چکا سوٹ ہارٹ۔ اپنی باجی کو پلاؤ۔ ذرا اس کا موڈ ٹھیک ہو۔" وہ پھولے منہ کے ساتھ کمرے سے باہر آتی انابسیہ کو دیکھ کر چھیڑ رہا تھا۔ انابسیہ موڑھا گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ مگر نوز موڈ آف تھا۔

"باجی کو کیوں؟ اماں کو پلائے گی۔ ایوارڈ تو اماں سے ملے گا۔" وہ جل کر بولی تھی۔ کاشف اس کا گلابی ہوتا چہرہ دلچسپی سے دیکھتا رہا۔

"تمہارے ساتھ پتا ہے مسئلہ کیا ہے۔" انابسیہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔ اور یہ بھی۔ اماں اٹھ کر کچن میں دودھ ابالنے چلی گئی تھیں۔ سو رانی کو تو احساس ہی نہیں تھا۔ دودھ پڑے پڑے ہی پھٹ جاتا۔

"کیا؟" انابسیہ نے نیلی آنکھوں میں ذرا تجسس بھر کر پوچھا تھا۔

"نہی کہ تم جلنا نہیں چھوڑ سکتیں۔" کاشف کے غیر متوقع جواب پہ انابسیہ کا منہ توہین سے سرخ ہو گیا تھا۔ جبکہ بیہ کی دبی دبی تھی۔ انابسیہ نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

"کتا بیس سمیٹو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

وہ انابسیہ کے غصے سے گھبراتی ہوئی تیزی سے چیزیں سمیٹ کر اندر بھاگ گئی تھی۔ کاشف نے تاسف سے سر نفی میں ہلایا۔

"اور دو سروں پر بلاؤچہ غصہ بھی کرتی ہو۔" کاشف

نے گہری نگاہ سے اسے دیکھتے ہوئے احساس دلایا تھا۔ انابسیہ نے آنکھیں ذرا کی ذرا میچ کر کاشف کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"اس کے علاوہ؟"

"غلطی کرتی ہو۔ پھر اس کی اصلاح نہیں کرتیں۔ بلکہ غلطی کے بعد اکڑ جاتی ہو۔" کاشف کے اگلے الفاظ نے اس کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔ اس نے چائے کی پیالی پیچ دی تھی۔

"کچھ اور یا بس؟" انابسیہ کا چہرہ لال بھبھو کا ہو چکا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہے نہ۔" کاشف نے اس کا ملائم ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھایا۔

"پھر بھی مجھے اچھی لگتی ہو۔ کیونکہ میری "دیا" جو ہو۔ انابسیہ۔" اس نے "یا" کو لمبا کرتے ہوئے مخمور لہجے میں کہا تو انابسیہ کا غصہ جاتا رہا۔ چہرے پر وہی نخوت اتر آئی تھی۔ جو اس کی شخصیت کا خاصا تھی۔ اس نے کاشف کی تعریف اپنا حق سمجھ کر وصول کی تھی۔

"سنو دیا!۔" کاشف نے اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے نرمی سے کہا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"براعرصہ" اکیلے پن کا مزہ لے لیا۔ اب اپنے جیسا ایک اور "دیا"۔ پیدا کر کے ہم پہ ایک اور احسان فرما دو۔" کاشف کے کجابت سے کہنے پر انابسیہ ہنس پڑی تھی۔ یہ ہنسی شاذ ہی اس کے لبوں پہ کھلتی تھی۔

"اور اس کا نام کیا ہو گا؟" انابسیہ نے اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے دلچسپی لی تھی اور یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا جو اس نے بچہ پیدا کرنے کے معاملے میں دلچسپی لی تھی۔ کاشف کو ایک گونا گونا طمیننا ہوا۔

"اگر تم پہ ہوا تو انگارہ یا شرارہ۔" کاشف کے الفاظ نے انابسیہ کو بری طرح سے ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی ہنسی کے جھرنے کی آواز نے کچن میں کام کرتی اماں کو حیران کر دیا تھا۔ "اللہ خیر کرے۔ آج بہو ہنس رہی ہے۔"

وہ دن بڑا ہی منحوس تھا۔ جب ایک ماں میں جاتے ہوئے ناچو کسی جو تک کی طرح اندوہ سے چٹ گئی تھی۔ اس نے لاکھ جان چھڑائی چاہی مگر وہ اس کا پتہ لے کر ہی ملی تھی۔

دیا کو اس کا دوبارہ ملنا کوئی نیک شگون نہ لگتا تھا۔ وہ اس دن کو بچھتا تھی جب وہ خواہ مخواہ کاشف سے جھگڑ کر شاپنگ کرنے چلی گئی تھی۔ ایک تو چیرس اور زیورات خریدنے کی ہوس اس کے اندر سے ختم ہی نہیں ہوتی تھی اور اس دن ناچو کھوئی سے ٹاکرا ہو گیا۔ اور وہ بد بختی کی طرح اس کے گھرائی نحوست پھیلانے کا سچ گئی تھی۔ بات یہاں تک بھی ہوتی تو ٹھیک تھا۔

لیکن ناچو کا مڑے مڑے اکھاڑنا، پرانی باتوں کو دہرائنا یاد کرنا اور اونچے اونچے بین۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ ناچو کو کسی غلاطت کی طرح کوڑے کے ڈھیر میں الٹ آئے۔

اوپر سے اس کی شکستہ حالت، پسماندگی اور اہلی پڑتی مفلسی۔ ٹوٹی جوتی، پٹے کپڑے اور بد حالی۔

اندوہ کو تو بڑی ہی وحشت ہوئی۔ یہ اس ناچو سے بڑی مختلف تھی جسے اندوہ جانتی تھی۔ ناچو کو تو ہر وقت کنگھی پٹی کرنے کی فکر ہوتی تھی۔ سیل کی چٹکی، سستی سرخیاں، پاؤڈر۔ ہر وقت بنی سنوری رہتی تھی۔ مگر اب؟

اندوہ کو اس سے عجیب سی کراہیت محسوس ہوئی۔ ”اور تو دیالی بی! ملکہ عالیہ بنی کیسے شان سے جی رہی ہے۔ لگتا ہے سارے کفارے میرے سر آ پڑے۔“ ناچو نے حسد و رشک بھرے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا تھا۔

”تجھ پر تو مکافات عمل کا ذرا بھی پھیر نہیں آیا۔ اور میرا تو ”رگڑا“ نکل گیا۔“ اب وہ منہ پہ دوپٹہ لیے پھپک پھپک کر رو رہی تھی۔ اور اندوہ ہکا بکا۔ ناچو کا یہ ڈراما اس کی عقل سے باہر تھا۔

”دیکھ دیا! میرا حال۔“ وہ روتی رہی۔ اور اندوہ کا جی چاہا ایک پھٹر جڑ کے اس کا بھونپو بند کروادے۔

اور وقت سبک خراہی سے گزرتا جا رہا تھا۔ اور اسی گزرتے وقت نے اندوہ کو ایک دور ہے۔ لاکھڑا کیا۔ یا اس کی بدنصیبی کا کوئی الٹا پھیر چل پڑا تھا اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ اور وقت کا پیسہ دوسری طرف گھوم گیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب اماں کی دعا میں رنگ لے آئی تھیں۔ اور ابا کو زندگی کا کوئی مقصد دکھائی دینے لگا تھا۔ اندوہ اتنے سالوں بعد امید سے ہوئی تھی۔

اس خبر نے روپا کو بھی بڑا مسرور کیا اور اماں تو بے انتہا خوش تھیں یہاں تک کہ بیہ بھی۔ وہ اپنی ”دیا“ کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ کاشف بھائی نے اندوہ کو ”دیا“ کا نام دیا تو سب ہی دیا بکار نے لگے حتیٰ کہ عرہ، رافع اور فاح بھی۔ یہ کی دیکھا دیکھی ”دیا“ ہی ملاتے۔ یہ ایک منفرد اور اچھوتا طرزِ خطاب تھا۔ کسی بھی رشتے کا حصہ ساتھ لگائے بغیر۔

کاشف نے اندوہ کو تھیلی کا چھالنا بنا رکھا تھا۔ ٹھیک ہے، اماں بھی بہت خوش تھیں مگر کاشف کی ناز برادریوں پہ اکثر ٹو کے پرانہ رہتی تھیں۔

”ہم نے بھی بچے جنے ہیں۔ یہ کوئی دنیا کا انوکھا کام تو نہیں کر رہی؟“

”جو دیا کرے، وہ کام انوکھا ہی ہوتا ہے۔“ کاشف ان کی بات نہی میں اڑا دیتا تھا۔ اور اکثر روپا کو ”دیا“ پہ رشک آتا۔ ایک اس کا بھائی اور ایک اس کی ”دیا“۔ ”یہ تو شروع سے سی بھاگوان تھی۔“

وہ دل ہی دل میں سوچتی تھی۔ اور ایک وہ تھی۔ جس کے پاس سب کچھ تھا۔ حتیٰ کہ افرایم بھی۔ اس کے باوجود جانے خلا۔ کہاں تھا؟ اور یہ کی کیوں تھی؟ زندگی میں سکون اور ”دم“ کیوں نہیں تھا۔ افرایم اتنا مصروف کیوں ہو گیا تھا؟ اس نے باہر اتنی دلچسپیاں کیوں ڈھونڈ لی تھیں؟

اور دیا کی قسمت کا ستارہ ایسے ہی تاروں کی مانند تا عمر ہی جگمگا تا رہتا اگر جوان کی زندگیوں میں ناچو ایک طوفان بن کر نہ آتی۔ ناچو کا آنا ایک بھونچال کا آنا تھا۔

”سات سالوں میں سات ٹولے“ کانے اندھے بچے جنہ ”وہ رورو کر اپنا حال سناتی رہی۔“ پر میں ہی کیوں؟“ وہ چلانے لگی تھی۔ انا دیہ کی جان پہ بن آئی۔ ”آہستہ بول“ میری سانس سن لے گی۔ ”اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھینکنے لگی تھیں اور جسم لرزنے لگا۔

”نہیں آہستہ بولا جاتا۔ دیکھ“ میرے دل میں کیسے گڑھے پڑ گئے۔ دیکھ، کیسے دھکے کھائے۔ صرف ایک گناہ کی وجہ سے۔ ”وہ دیوانوں کی طرح چیخنے لگی تھی۔“ ”ہاں۔۔۔ یہ گناہ کم تھا۔ تجھے اکسانے کا۔ تجھے گناہ کی طرف مائل کرنے کا۔ تیسرے ساتھ گرہوں میں پھونکیں مارنے کا۔“ ”ناجو۔ کوئی بھوت سوار ہو گیا تھا۔ آج وہ سارے راز اگلنے کے لیے آگئی تھی۔ آج وہ آگ لگانے کے لیے آگئی تھی۔

”روبا کی زندگی میں آگ لگائی تھی تو سکون کیسے مل جاتا؟ نہ میں تجھے اماں دیوانی کے آستانے تک لے کر جاتی اور نہ جادو ٹونے کی آڑ میں روبا کی زندگی میں عذاب آتے۔“ ناجو سر پہ ہاتھ مار مار کے اور نسوے بہانے لگی اور باہر موجود روبا کی ماں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ ان کے سر میں دھماکے ہونے لگے۔ کمرے کی چھت اڑی جاتی تھی اور ان کے سر پہ گری جاتی تھی۔

انہوں نے دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا تھا۔

”جادو ٹونا۔۔۔ سفلی عمل۔۔۔ انا دیہ“ ناجو۔ اماں دیوانی۔“ لفظ انگارے تھے۔ لفظ شعلے تھے۔ جو انہیں جھلسائے دے رہے تھے۔ جلائے دے رہے تھے۔

”انا دیہ نے کیا۔ روبا پہ جادو؟ دیانے“ ان کی بہو نے۔ کاشف کی بیوی نے۔ ”آہستہ یقین نہیں آ رہا تھا اور ان کے دل پہ آ رہے چل رہے تھے۔

”تو نے جو کچھ قبر میں دفن کیا تھا“ اسے نکالا کیا؟“ ”ناجو کیا کہہ رہی تھی۔ کیا پوچھ رہی تھی؟ ان سے کچھ سنا نہیں جا رہا تھا۔ ان کا دل بند ہوا جا رہا تھا۔ انہیں اپنی روبا کی بے رنگ پریشانی اور آفتوں میں گھری زندگی کے

وہ دن یاد آ رہے تھے۔ جب وہ اور اس کا پورا گھر کسی آسیب کے زیر اثر تھا۔

آسیب جو چلا گیا تھا۔ ان کی زندگیوں سے نکل گیا تھا۔ پھر بھی آسیب موجود تھا۔ ان کی زندگیوں میں ہی موجود تھا۔

ہاں موجود تھا۔ اس خوب صورت ”بلا“ کی صورت میں۔ آسیب کہاں گیا تھا؟ آسیب تو ان کی زندگیوں سے چمٹا ہوا تھا۔

اس منحوس بلا کی وجہ سے۔۔۔ یہ ان کی بیٹی کے لیے ایک وبال تھی۔ روبا کی خوشیوں اور سکون کی قاتل۔ اور اس کے لیے کوئی معافی نہیں تھی۔ اس کے لیے کوئی درگزر نہیں تھی۔ ان کے اندر جوار بھٹا اٹھنے لگا۔ کرب ابلنے لگا۔ غیض پھرنے لگا۔

رات کو شوہر اور بیٹا گھر آئے تو وہ بے تحاشا روتے ہوئے ایک ایک بات بتا رہی تھیں۔ وہ سب جو ناجو نے کہا تھا۔ اور جن سے روبا گزری تھی۔ ان باتوں میں بہت مماثلت تھی۔ جو ناجو کہہ رہی تھی۔ وہ سب روبا کے ساتھ ہو چکا تھا۔ اور اس کی نحوست اتنے سال بعد بھی باقی تھی۔ اس جادو کا اثر ابھی تک روبا کی زندگی پہ تھا۔ وہ اس ”سحر آفت“ کے حصار سے ابھی تک نہیں نکلی تھی۔

اس کا چین و سکون غارت ہو چکا تھا۔ اس کی عائلی زندگی خدشات میں گھری رہتی تھی۔ اس کے شوہر کی دلچسپی گھر میں کم ہو گئی تھی اور سب سے بڑھ کر جان بچھاؤ کرنے والی سانس جان کی دشمن بن چکی تھیں۔ اور یہ سب دیا کے پھونکنے گئے دھاگوں تعویذوں اور سفلی عملیات کا اثر تھا۔

انہوں نے رورو کر شوہر اور بیٹے کو ایک ایک اذیت، روبا پہ ٹوٹ جانے والے قبر کی کہانی سنائی تھی۔ ان کا شوہر خاموش تھا اور بیٹا گم صم۔ شوہر کے چہرے پہ ان گنت سوچوں کی لکیریں تھیں جبکہ بیٹے کے چہرے پہ بے انت ناگواری کی پرچھائیاں۔

اس نے ماں کی ساری رام کہانی آرام سے سنی تھی۔ باہر دروازے سے لگی انا دیہ نے بھی ایک ایک

ہے۔ تمہیں کیا نظر آئے گا بیٹا! میں نے تو تم سے تب بھی کہا تھا۔ اس کا خیال دل سے نکال دو۔ یہ تمہاری بہن کی دشمن ہے۔ اس نے روپا کو سیڑھیوں سے گرایا تھا۔ اس کی جان بھی لیتی چاہی۔" اماں اسے بھولی ہوئی باتیں یاد دلا رہی تھیں۔ جنہیں تب بھی کاشف نے نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ اب بھی ان کی کسی بات کو اہمیت نہیں دے رہا تھا۔

"ایک غیر مصدقہ بات اور اتفاقی حادثے کو دیا کے ساتھ منسوب کرونا بڑی زیادتی کی بات ہے اماں!" کاشف شدید صدمے کے زیر اثر بولا تھا۔ وہ دیا کے سامنے ڈھال بن گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کی غلطیوں کے سامنے ڈھال بن جاتا تھا۔

"تمہاری بہن کی زندگی میں ہونے والے حادثے اتفاقی نہیں تھے۔ دیا نے سفلی عملیات سے روپا پہ جنت مسلط کر رکھے تھے۔" اماں پھپک پھپک کر رو پڑیں۔ اپنے بیٹے کو یقین دلاتے ہوئے وضاحتیں دیتے ہوئے وہ خود کو کم تر اور جھوٹا تصور کرنے لگیں۔ کیا وہ واقعی غلط بیانی سے کام لے رہی تھیں؟ دیا پہ بہتان لگا رہی تھیں۔

"بس کر دیں اماں!" کاشف چیخنے لگا اور اس کی خوفناک حد تک اوپچی آواز نے باہر کھڑی دیا کو بھی دہلا دیا۔ اس نے کاشف کا یہ لہجہ اور یہ آواز بھی نہیں سنی تھی۔ بلکہ اماں کے دونوں بچے بہت دھیسے مزاج اور نرم گفتگو کے عادی تھے۔ اس وقت کاشف کا چلانا خاموش ماحول میں بڑا خوفناک تاثر دے رہا تھا۔

"آپ میری بیوی پہ بہتان لگا رہی ہیں۔ اس پہ جھوٹا الزام لگا رہی ہیں۔ ہے کوئی آپ کے پاس ثبوت؟ وہ پھر کر اٹھا تو کب سے خاموش بیٹھے ابانے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے واپس اپنے ساتھ بٹھانا چاہا۔ وہ تنک کر کھڑا رہا۔ اس نے ابابا کا ہاتھ بھی جھٹک دیا۔ وہ اس بد تمیزی پہ اس کو بس دیکھ کر رہ گئے تھے۔

"بہتان وہ نہیں تھا۔ بہتان تو یہ ہے کہ دیا اپنے چچا زاد بھائی کی الفت میں گرفتار تھی۔ جب ادھر بات نہیں بنی تو اس طرح انتقام پہ اتر آئی۔ آگ لگی ہوئی

لفظ کو غور سے سنا تھا۔ اور اس کا دل وہیں کھڑے کھڑے ہی پاتال میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ کسی کھائی میں گرنا جا رہا تھا۔ اسے لگا جو گناہ وہ کر چکی تھی۔ اس کی سزا معمولی نہیں ہوگی۔ اس جرم میں اس کا محبوب شوہر اسے دھکے مار مار کر کھرے نکال دے گا۔ اور صرف گھر سے نہیں نکالے گا۔ اپنے دل سے بھی نکال دے گا۔ اپنی زندگی سے بھی نکال دے گا۔ پھر وہ کہاں جائے گی؟ اس کا ٹھکانا کیا ہوگا؟ اس کا گھر کون سا ہوگا؟

اس کا تو کوئی میٹھکہ بھی نہیں تھا۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ بھائی نے اپنی الگ دنیا بسالی تھی۔ اتنے گم شدہ رشتوں میں باقی بچنے والا ایک افرایم ہی تھا۔ اور وہ اسے کیوں منہ لگاتا۔ "وہ اسے کیوں ٹھکانا مہیا کرتا؟ وہ اس کی لگتی کیا تھی؟ گھر تو اس کا تباہ ہو رہا تھا۔ اپنے ہاتھوں اس نے اپنے آشیانے کو آگ لگا دی تھی۔ اس جرم کے بدلے میں کوئی معافی نہیں تھی۔ قریب تھا کہ وہ صدمے کی انتہا پہ پہنچ کر گر جاتی۔ زمین بوس ہو جاتی کہ ایک روح پھونکتی آواز نے دیا کے بجھتے دیے میں تل ڈال دیا تھا۔

یہ آواز کس کی تھی؟ اس کے شوہر کی کاشف کی۔ وہ اپنی ماں سے کیا کہہ رہا تھا؟ دیا نے دھڑکتے دل کو قابو میں لاتے ہوئے کان لگا کر سنا تھا۔ کاشف اپنی ماں سے مخاطب تھا اور اس کے لہجے میں پھرے طوفانوں کی طغیانی صاف نظر آرہی تھی۔

"آپ دیا پہ الزام لگا رہی ہیں۔ وہ آپ کو شروع سے پسند نہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ اتنی بڑی بات دیا کے متعلق کہیں گی اور اس پہ ڈٹ بھی جائیں گی۔"

"یہ الزام نہیں حقیقت ہے۔ تمہاری بیوی جادو ٹونے کرواتی ہے۔ میری بیٹی کا گھر اجاڑنا چاہتی ہے۔" اماں نے روتے ہوئے بیٹے کو یقین دلانا چاہا۔ "وہ ایسا کیوں چاہے گی۔" آپ تو ہمت میں بڑ گئی ہیں اماں! الزامات کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" کاشف چیخ پڑا تھا۔

"تمہاری آنکھوں پہ دیا کے حسن کی پٹی بندھی

خالی ہو رہا تھا۔ ان کا کاشف گھر چھوڑنے کی بات کر رہا تھا۔ ان کا بیٹا گھر چھوڑ کر جا رہا تھا۔ ان کا اکلوتا نور نظر۔ آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کا قرار۔ اکلوتا راج دلارا۔

کیا بیٹے اپنی بوڑھی ماؤں کو چھوڑ جاتے ہیں؟ کیا بیٹے اپنے والدین کے گھر اور دل کو ویران کر جاتے ہیں؟ کیا بیٹے اپنے ماں باپ کو خالی ہاتھ کر جاتے ہیں؟ ان کی آنکھوں میں ریت بھر جاتے ہیں۔ ان کو تنہا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں؟ اگر ایسا ہی تھا تو پھر بیٹے ہوتے کیوں ہیں؟

اماں کی گدلی آنکھوں میں نمکین پانیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اور وہ اپنے ملل کے دوپٹے سے آنکھوں کو رگڑتی تھیں اور لمحہ بہ لمحہ دور جاتے بیٹے کو دیکھتی جاتی تھیں۔

کاشف اس جادو گرنی کا ہاتھ پکڑ کر اس گھر سے رستہ دور لے جا رہا تھا۔ اس نے ماں کی بات مان لی تھی۔ اس نے اس گھر سے اپنی بیوی کو نکال دیا تھا اور خود بھی ان کا گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اور ان کا دل بھی اور سائبان بھی اور دعاؤں کا حصار بھی۔ تو جب اتنے حصار ٹوٹ جائیں تو محافظ کمزور پڑ جاتے ہیں۔ دربان شکست خور ہو جاتے ہیں اور حملہ آوروں کو میدان خالی مل جاتا ہے۔ اور حملہ آور پھر غلبہ پالیتے ہیں۔



”کاشف چلا گیا۔“ انہیں اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی یقین نہ آتا تھا۔ وہ آتی جاتی ہواؤں سے پوچھتی تھیں۔ دیواروں سے باتیں کرتی تھیں، کچھ اور نہ ملتا تو تصویریں کھول کھول کر دیکھتی۔

انہیں کاشف کا بچپن یاد آتا۔ اس کا لڑکھن یاد آتا۔ وہ ان کے پاس سوتا تھا۔ رو با باپ کے پاس۔ وہ ماں سے قریب تھا۔ رو با باپ سے قریب تھی۔ رو با گلی میں چھت کے اوپر کھیلنے کے لیے چلتی تھی۔ لیکن کاشف ان کا پلو تھا۔ کہیں نہ جاتا۔ وہ گھر کے کام نمٹاتے ہوئے جہاں بھی جاتیں۔

ہے اس کے اندر حسد کی۔ ”اماں نے اپنا سارا زہرا گل دیا تھا اور کاشف کے ضبط اور تحمل کے بھی سارے بند ٹوٹ گئے تھے۔ وہ ہاتھ اٹھا کر غراتا ہوا ان کا کاشف نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بس دیا کاشو ہر لگ رہا تھا۔ جو اس کی سنتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ اور اس کے کہے یقین رکھتا تھا۔

”آپ کی دلیا سے نفرت کا واضح ثبوت ہے۔ اس سے نیچے آپ اور کتنی جائیں گی اماں! مجھے آپ کی سوچ سے وحشت ہو رہی ہے۔ آپ دیا پہ بہتان باندھتے ہوئے یہ بھول چکی ہیں کہ وہ میری بیوی ہے۔ آپ کی بہو ہے۔ اس گھر کی عزت ہے۔“ وہ زخمی لہجے میں پھنکارنا کوئی دیوانہ لگ رہا تھا۔ انگارہ ہوتی آنکھیں وحشت زدہ چرو۔ اور پھرتے حواس۔

”میرا اس کے ساتھ آج کے بعد کوئی رشتہ نہیں۔ انسانیت کا بھی نہیں۔ وہ میرے گھر میں ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رہے گی۔“

اماں نے صدمے سے ٹوٹ پڑتے لہجے میں ہاتھ اٹھا کر فیصلہ کر دیا تھا۔ کاشف انہیں خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کے اندر گرد و غبار کے جھکڑ چل رہے تھے۔ ہر طرف دھول مٹی تھی۔ جو اڑ رہی تھی۔ کوئی منظرو واضح نہیں تھا۔ سب کچھ دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ گرد آلود تھا۔

”آپ اسے کیا نکالیں گی میں خود اسے یہاں ایک سانس بھی مزید نہ لینے دوں گا۔ جب رشتوں میں دراڑیں پڑ جائیں تو کدور تمیں اپنی جگہ بنا لیتی ہیں۔ اور یہ کدور تمیں بالآخر نفرت و بیگانگی میں بدل جاتی ہیں اور تجھے صاف دکھائی دے رہا ہے کہ دیا کے لیے آپ کے اندر کوئی نرمی باقی نہیں بھرتی ہے میں اسے یہاں سے لے کر چلا جاؤں۔“

کاشف نے اماں کا فیصلہ تسلیم کر لیا تھا اور اماں ہکا بکا سی بیٹے کو دیکھنے لگیں۔ وہ اس بد بخت کو گھر سے نکالنے کے بجائے خود۔ گھر چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اماں کے دل پہ آ رہے چل گئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں پکڑی سیج کر گئی تھی۔ ان کے ہاتھ خالی ہو رہے تھے۔ ان کا دل

کاشف ان کے پیچھے پیچھے رہتا۔ وہ مکمل میں کہیں بھی فوٹنگ، خوشی، غمی نہ جانیں کاشف ان کے ساتھ ہی جاتا۔ ماں کے بغیر کھانا نہ کھاتا تھا۔ رات کو کہانی سننے بغیر سوتا ہی نہیں تھا۔

پھر کچھ بڑا ہوا تو کتابوں، دوستوں اور کھیلوں کی سمجھ بوجھ آگئی۔ اب اس کے پاس مصروفیت بھی تھی اور ماں کو سنانے کے لیے بہت سی کہانیاں۔ اب وہ کہانی سننے کی نہیں، سنانے کی عمر میں آگیا تھا۔

وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ اس کی ہر بات کو غور سے سنتی تھیں۔ ماں کی دلچسپی محسوس کر کے وہ اور بھی جوش و خروش سے قصے سناتا تھا۔ پھر وہ کچھ اور بڑا ہوا۔ بچپن چھوٹ گیا۔ لڑکھن بھی دامن چھڑا گیا۔

کاشف کی مصروفیات بھی زیادہ ہو چکی تھیں۔ مشکل پر بھائی، غیر معمولی ورزشیں، اسپورٹس کلبز کچھ اس میں سنجیدگی اور مسرت بھی آگئی تھی۔ ان کا لاڈلا خوبو بیٹا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اپنے باپ کے قد سے بھی اونچا ہو گیا تھا۔

کلج سے یونیورسٹی پھر من پسند نوکری۔ اور زندگی کا نیا سفر۔ ایک نیا جہان۔

ساری ماؤں کی طرح ان کے دل میں بھی چاند سی ہو لانے کا ارمان تھا۔ ایسے ہی روپا نے ایک دن کلج کی سہیلیوں کا گروپ فوٹو دکھایا تو انہیں ایک لڑکی اپنی نیلی آنکھوں اور چونکا دینے والی خوب صورتی کی وجہ سے بھاگنی تھی۔ بیٹی سے کچھ تفصیل معلوم کی اور اس لڑکی کے گھر اپنے لاڈلے بیٹے کا رشتہ لے گئیں۔ وہاں ان کی غیر معمولی آؤ بھگت ہوئی۔ لڑکی کی سوتیلی ماں بھلی عورت تھی۔ باپ انتہائی شریف، ٹمل کلاس گھرانہ۔ انہیں پیسے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ یوں رشتہ دیا تو بات بنتی معلوم ہوئی تھی۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ۔۔۔ دوسری طرف گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ نہ لڑکی والوں نے ”ہاں“ میں جواب دیا نہ ”نہیں“ میں۔ وہ متفکر تو تھیں تاہم مطمئن بھی۔ کیا خبر وہ اپنی طرف سے چھان بین کروا رہے ہوں۔

روپا نے خوشی خوشی بھائی کو سہیلی کے سارے

کوائف اذہر کروا دیے تھے۔ سنری ہل نیلی آنکھیں، گورا رنگ۔ اس کی پوری شخصیت میں ان خوبیوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اور یہ خوبیاں بھی قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ تھیں۔ اس میں انادبہ کا کوئی کمال نہ تھا۔ پھر بھی وہ اتنا اتراتی تھی کہ حد نہیں۔

یوں ہی کچھ وقت گزرا تو کاشف کے بجائے غیر متوقع روپا کا رشتہ طے پا گیا۔ انادبہ کے چچا کا گھرانہ۔۔۔ مختصر کتبہ، ایک ماں ایک بیٹا۔ اور لڑکا بھی ایسا کہ چراغ ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے۔ انہوں نے بسم اللہ کی اور رشتہ طے کر دیا۔

اور اس کے فوراً بعد ہی کاشف کا بے طرح اصرار، ضد اور تکرار۔ وہ بار بار انادبہ کا پوچھتا۔ اس کے گھر والوں کا جواب؟ وہ بھلا کیا بتائیں؟ دوسری طرف تو خاموشی تھی۔ پھر کاشف نے انہیں دوبارہ زیرِ دستی وہاں بھیجا تھا۔ سو بیٹے کی بے قراری پہ حیران پریشان تھیں۔ تاہم دوسری طرف اب خاموشی نہیں تھی۔ رشتہ طے پا گیا اور کاشف کو سکون آگیا۔

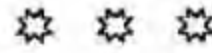
انہیں تب نہیں، انہیں اب لگتا تھا کہ ہونہ ہو، انادبہ نے کاشف کا دل ”پھیرنے“ کے لیے بھی ضرور کوئی دھماکہ کروایا ہو گا۔ ہونہ ہو کاشف کی اس ”بے قراری“ کے پیچھے کچھ نہ کچھ تو ضرور تھا۔ اور انادبہ نے روپا کا رشتہ افراہیم سے طے ہو جانے کے بعد یہ ”چکر“ چلایا ہو گا کہ چلو، افراہیم نہ سسی کاشف ہی سسی۔ بھلا کاشف کسی سے کم تھا کیا؟ اوپر سے اس کے لیے خالص محبت کا پیکر۔

پھر روپا کی شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد اس کی زندگی میں ہونے والے تغیر؟ پریشانیاں، مصیبتیں؟ ان کا موجب کیا تھا؟ ان میں سے کوئی بھی اس شرم ناک حقیقت سے واقف نہیں تھا۔ جو حقیقت ان پہ اب آشکار ہوئی تھی۔

اسی دوران وہ انادبہ کو کاشف کے من مندر میں سجانے والی مورت بنا کر گھر لے آئی تھیں۔ وہ انادبہ جو ان کے بیٹے کی ”دیا“ تھی۔ جسے ان سب نے بھی اپنی ”دیا“ بنا لیا تھا۔ سب کو بھول گیا۔ کبھی وہ انادبہ بھی

تھی۔ ہر کوئی اسے ”دیا“ کے نام سے پکارتا تھا۔ ساس، سر، نند اس کے بچے اور انا بیہ بھی۔ اور دیا نے سچ سچ خود کو دیا ہی سمجھ لیا۔

وہ ایک دیا تھی۔ مثل جلتا ہوا چراغ۔ جو جلتا بھی ہے اور جلتا بھی ہے۔ جلا جلا کے راکھ بھی کر دیتا ہے۔ فنا بھی کر دیتا ہے۔ جلے تو روشنی ہی دے۔ جلائے تو آگ آگ کر دے۔ ہنستوں ہنستوں کو برباد کر دے۔ کئی گھروں کو راکھ کر دے۔ کیونکہ وہ ایک ”دیا“ تھی۔ آگ کا دیا۔ جلے تو سرپا روشنی۔ جلائے تو سرپا آگ۔



محبت کا جذبہ نہایت مضبوط ہوتا ہے لیکن نفرت کا جذبہ زیادہ ٹھوس، مستحکم اور دیرپا ہوتا ہے۔ محبت میں دل اپنے تغیر و تبدیلیوں کے ساتھ مصروف عمل ہوتا ہے۔ جبکہ نفرت میں جسم اور روح کا ریشہ ریشہ۔ نفرت، محبت سے بڑھ کر طاقتور ثابت ہوتی ہے۔ یہ کسی قلعے کی طرح ناقابلِ تسخیر ہوتی ہے۔ اسے دھانا ناممکن ہوتا ہے۔ یہ بوڑھے برگد کی طرح چار سو جسم کے کونے کونے میں پھیلی ہوتی ہے۔ گھنی گھری عیسق جڑوں کی مانند۔ جسے اکھاڑنا ممکن ترین ہوتا ہے۔ نفرت کا یہ تعلق اس کی زندگی کے ساتھ ازل سے جڑا ہوا تھا۔

پیدائش کے بعد مر جان و مرنج ماں دیکھی جو ساس کے سامنے ایک کینر کے روپ میں تھی۔ اگلے دس سال تک اس نے ماں کو کینر کے روپ میں ہی دیکھا تھا۔ ایک غلام، ہاتھ باندھے ہوئے اور دادی ایسی ظالم کہ ماں کو دونوں بھوکا رکھتی۔ باورچی خانے کو تالا۔ آٹے گھی کا کنستراستور میں بند۔ دودھ اپنی چارپائی تلے کھانے کو سوکھے رس اور رات کی پنکھی چھی پاپڑیاں ملتی تھیں۔ ابا مظلوم ترین مرد۔ گھر سے لاپرواہ۔ دو اور چار کے حساب میں کم۔ ماں دادی کے سامنے غلامی کی زندگی جینے میں مگن اور خوش۔

نفرت کا یہ سلسلہ اس کی دادی سے جاملتا تھا۔ بلکہ

دادی سے بھی پہلے ماں تھی جس سے انا بیہ کو پہلی مرتبہ نفرت محسوس ہوئی تھی۔ ماں ایسی ہوتی ہیں؟ سارا دن پاگلوں کی طرح کبھی ایک کام کے پیچھے بھاگتی، کبھی دوسرے کام کے پیچھے بھاگتی اور جسے اپنے پیدا کئے دو بچوں کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ پلوں کی طرح کبھی کسی کٹوری میں منہ ماریں۔ کبھی کسی خالی کٹوری میں منہ ماریں۔ بھوکے، نمیدے، پیٹ پکڑے۔

اور ماں ساس کی جی حضوری میں مگن۔ اچھا کھانا تو پہلے دادی کے لیے۔ اچھا پھل ہے تو پہلے دادی کے لیے۔ اچھا کپڑا ہے تو پہلے دادی کے لیے۔ اور اچھا زہر ہو تو پہلے دادی کے لیے کیوں نہیں؟

اس کا دس سالہ دل غ رات بھر جاگ جاگ کر منصوبے بناتا تھا۔

وہ ماں اور دادی کے لیے بیک وقت ایک جیسی نفرت محسوس کرتی تھی۔ ایک ظالم تھی۔ اور دوسری مظلوم۔ لیکن انا بیہ کے لیے دونوں برابر تھیں۔ ایک انج کے فرق کو آگے پیچھے کے بنا۔ دونوں خانوں میں فٹ آتی ہوئی۔ ظلم سے نہ ٹکرانا، اپنے حق کے لیے آواز نہ اٹھانا بھی ظلم ہے۔ خود پہ بھی۔ خود سے وابستہ رشتوں پہ بھی۔ اور ماں دونوں جرائم میں شریک تھی۔ نہ حق کے لیے آواز اٹھاتی تھی۔ نہ ظلم کو روکنے کے لیے سدباب کرتی تھی۔

سو سب سے پہلے قابلِ نفرت ہستی ماں تھی اور اس کے بعد دادی۔ جسے اپنے پیٹ، اپنی ضرورت اور اپنے آرام سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہ تھا۔ وہ ایک خود غرض عورت تھی۔ اور اس کے ساتھ قریبی خونی، مورتی تعلق ہونے کی وجہ سے انا بیہ، دادی سے بڑھ کر خود غرض واقع ہوئی تھی۔

اور اسے بڑی کم عمری میں ہی سارے داؤ پیچ لڑانے آچکے تھے۔ اسے چوری کی عادت بھی پڑی اور سینہ زوری کی بھی یعنی دھشائی سے مکر جانا۔

اس نے سب سے پہلے دادی کے بٹوے میں سے پیسے چرانے شروع کیے تھے۔ کبھی دو آنے، کبھی پانچ روپے تو کبھی دس روپے باہر قلفی والے سے قلفی لے

بیچھے بیچھے

”کھنی! کھاگئی سارا چوری کا مال۔ زندہ نہیں چھوڑوں گی تجھے۔ بھون کر کھا ڈالوں گی تیرا کلیجہ۔ حرام خور نکال میرے نوٹ۔“

”وہ ہرپ۔ اب کہاں سے ملیں گے۔ ٹھیلے والے لے اڑے۔“ افرایم نے منڈیر پہ کھڑے کھڑے داوی کو سمجھانا چاہا تھا۔

”میں نے چوری نہیں کیے۔ افرایم جھوٹا ہے۔ ماں سے پوچھو۔ یہ جمع کرتی ہے نالی کو دینے کے لیے۔“ انادیہ نے نہایت مکاری کے ساتھ سارا مطلب ماں پر گرا دیا تھا۔ اور اپنی ہڈیوں سے اٹھتے درد پہ آنسو بہاتی ماں صدمے سے ششدر رہ گئی تھی۔ داوی کا سارا اعتبار ایک مرتبہ پھر ماں پہ نازل ہو رہا تھا۔

”بچی جھوٹ تو نہیں بولتی۔ اسی حرام خور نے میکے والوں کو دینے کے لیے چھپا رکھے ہیں۔ میں اس سے نکلوا کر ہی دم لوں گی۔“ داوی کا ڈنڈا ایک مرتبہ پھر ماں کے جسم پر برس رہا تھا۔ اور انادیہ داوی کے تکیے سے نمکو بسکٹ اور سیب کا مربہ اڑا کر بھاگ نکلی۔

پھر یوں ہوا کہ داوی کو انادیہ کی تخریب کاریوں کی بھنک بڑھ گئی تھی۔ وہ بڑی صفائی کے ساتھ کھانے والی چیزوں کے ساتھ بٹوے سے پیسے بھی اڑا لیتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے گھر کی باقی چیزیں بھی اٹھا کر باہر فروخت کرنا شروع کر دی تھیں۔ جیسے سرف کا پیکٹ، ویسی، انگریزی صابن، گندم، چاول وغیرہ۔

اسے جب بھی موقع ملتا۔ وہ شاہر بھرتی اور ٹاجو کی ماں کے ہاتھ سے داموں فروخت کر آتی۔ یوں قلفی، چھولوں اور چاٹ کا جسدہ پورا ہو جاتا تھا۔

ماں کے بعد داوی سے نفرت کا یہ بیج تب اپنی شاخیں نکالنے لگا تھا جب داوی کا ڈنڈا اس کے جسم پہ بھی برسنے لگا۔ وہ اب اکی بے پناہ لاڈلی تھی۔ رات کو اب آتے تو اس کے لیے بہت کچھ لاتے۔ جو داوی کے ہتھ چڑھتا تو اسے کچھ بھی نہ ملتا۔ اب اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اور اسے بس اب ہی اچھے لگتے تھے۔ جب سے اسے داوی نے ڈنڈے کے ساتھ دھنکنا شروع کیا

کر چائنا۔ چھولے والے سے چھولے خریدنا اور غبارے والے سے غبارے لے کر کھیلنا اس کا پسندیدہ مشغلہ بن چکا تھا۔ داوی گھر میں چیختی چلاتی، واویلا کرتی حتیٰ کہ ماں کو جوتی کے ساتھ دھنک کر رکھ دیتی۔

”کھنی! بتا کیوں چرائے میرے نوٹ۔ میکے والوں کے دونخ بھرے کی حرام خور۔ میرا آنہ آنہ چرا کر۔“ داوی کی چیخوں غراہٹوں اور دھاڑنے کی گلی کے دور دور کونوں تک جاتی تھی۔ اکثر محلے والے ماں کو پٹے دیکھنے کا تماشا ملاحظہ کرنے اپنے گھروں کی چھتوں سے لٹک جاتے تھے۔ کچھ لوگ داوی کے چنگل سے ماں کو آزاد کروانے کے بہانے زیادہ قریب سے فلم دیکھنے کا لطف اٹھاتے۔ ماں کا داوی کے ہاتھوں پٹنا ایک معمول کا حصہ تھا۔ وہ باہر تھڑے پہ بیٹھ کر قلفی چاٹتی مگر سی ہنستی رہتی۔

اور اس دن داوی کا ”ڈنڈا“ خوب ہی چلا۔ ماں کے سارے انجر پنجر مل کر رہ گئے تھے۔ پر داوی کا غصہ کم نہ ہوتا تھا۔ معا” ساتھ والی منڈیر سے قوی کٹ بالوں والا سران کے صحن میں جھانکتا ششدر رہ گیا۔ نالی کو داوی جوتی اور سونے کے ساتھ دھنک رہی تھی اور نالی لب سے ایک آہ بھی منہ سے نکالے بنا پٹے جا رہی تھی۔ شمد بھری آنکھوں میں ڈھیر سارا خوف اور ہمدردی کا نمکین سمندر چھلک پڑا۔ وہ بے ساختہ آدھے دھڑکے ساتھ منڈیر سے لٹکتا چل رہا تھا۔

”داوی! نالی کو مت مارو۔ نالی نے بٹوے سے پیسے نہیں چرائے۔ یہ موٹی سنہری باندری نے پیسے چرائے ہیں۔ یہ روزانہ پیسے چراتی ہے اور ٹھیلے والوں سے گند بلا لے کر کھاتی ہے۔“ افرایم کے چلانے پہ داوی کا ڈنڈا لمحہ بھر کے لیے رکا تھا اور پھر توپوں کا سرخ گندے چپ چپ منہ والی انادیہ کی طرف ہو گیا۔

اب انادیہ آگے آگے تھی۔ داوی اس کے پیچھے۔ اور داوی کے منہ سے گالیوں کا ٹکٹا طوفان۔ انادیہ کو بھاگنے دوڑنے اور ”پکڑن پکڑائی“ کے اس مشغل میں بڑا مزہ آرہا تھا۔

وہ چیخیں مارتی آگے آگے تھی۔ داوی آگ بگولا

ہاتھ گھسایا۔ ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ داوی کا ہاتھ
بکھی اڑانے والے انداز میں اٹھا اور پھر ڈھلک گیا۔
نیند کا غلبہ بے پناہ تھا۔

انادیہ نے تسلی سے چالی اٹھائی اور ٹرنک کا تالا کھول
کر کپڑے کا تھان نکال لیا۔ خوب صورت، نفیس ملائم
سا کپڑا۔ وہ اپنا ہاتھ کپڑے پہ پھیرتی رہی۔ پھر اس نے
اپنے پٹے پرانے کپڑوں کو تنقیدی نظر سے دیکھا۔ اور
تھان کھول کر ساڑھی کے انداز میں جسم پہ لپیٹنے لگی۔
وہ اس کھیل میں مگن تھی۔ بے فکر سی۔ جیسے داوی
کے اٹھنے کی پروا نہ ہو۔

بست دیر تک وہ ساڑھی لپیٹے بیگم صاحبہ بنی گھومتی
رہی۔ چونکی تو تب جب داوی آستینیں چڑھائے اس

کے ننھے وجود کو دبوچے دھموکوں سے دھنک رہی
تھیں۔ داوی کے گھٹنوں تلے وہی انادیہ چینی رہی۔

”بچاؤ۔ ماں بچاؤ۔ داوی سے بچاؤ۔“

لیکن ماں نے اس کی کوئی فریاد نہ سنی۔ وہ مگن سی
کپڑے دھوتی رہی۔ ماں ایسی ہی ”بے حس“ ہو چکی
تھی۔ دنیا میں کوئی بھی واقعہ رونما ہو جاتا۔ ماں کو ہوش
نہ تھا۔ وہ ایسے چوبک کر دیکھنے لگتی جیسے نیند سے جاگی
ہو۔ ادھ کچی ادھ کچی نیند۔ اور اس وقت انادیہ کی
بھیا تک چیخوں پہ بھی وہ مگن سی کام میں لگی رہی۔ اور
انادیہ داوی کے ہاتھوں پتی رہی۔

”منحوس“ پھر پھاڑنگہ (نگاہ) والی۔ کپڑے کو نظر
لگاتی تھی۔ داوی ہاتھ ملتی تھان کو لپیٹتی رہی۔ انادیہ سر
جھکا کر گھٹنوں میں دیے سے کاریاں بھرتی رہی۔

داوی نے تھان سمیٹا اور درزن کو پیغام دے کر بلایا۔
وہ آج ہی کٹائی اور سلائی کا کام مکمل کروانا چاہتی
تھیں۔ انہیں انادیہ کی پھر پھاڑنگاہ سے پورا یقین تھا کہ
اس کپڑے کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہو گا۔ سوٹ سل
بھی گیا تو پہننا نصیب نہیں ہو گا۔ مگر حیرت انگیز طور پر
داوی کا سوٹ اسی دن سل گیا۔ داوی دیکھ دیکھ کر نہال
ہوتی تھیں۔ ساتھ لگا لگا کر خوش ہوتی تھیں۔ درزن
اپنی سلائی لے کر نکل گئی، اسی وقت دودھ والا پہنچ گیا۔

تھا۔ تب سے ہی داوی اسے زہر لگتی تھیں۔ اور وہ دل
ہی دل میں داوی سے جان چھڑانے کے منصوبے بناتی
رہتی۔

پھر یوں ہوا کہ داوی سے انتقام لینے کا اس نے ایک
عجیب طریقہ سوچا۔ گو کہ اس وقت اسے انتقام کے
منصوم کا بھی نہیں پتا تھا۔ تاہم اتنی۔ سمجھ بوجھ تھی
کہ جو تکلیف دے اسے برابر کی تکلیف دینے سے
اپنی تکلیف ختم نہ بھی ہو تو قدرے کم ضرور ہو جاتی
ہے۔ داوی نے جو ان کی بنیادی ضروریات کا استحصال
کر رکھا تھا۔ اسے چھیننا ناممکن تھا مگر داوی کو تکلیف
دینا ناممکن نہیں تھا۔

ایک دن داوی کپڑے کا تھان لائیں۔ اپنے لیے
اور اپنی ایک بہن اور بھانجی کے لیے۔ ایک تھان سے
کئی سوٹ بنے۔ ان کپڑوں میں نہ ماں کا کوئی حصہ تھا نہ
انادیہ کا۔ کپڑا بڑا اچھا تھا۔ نفیس سا۔ داوی کو بھانجی کی
شادی میں پہن کر جانا تھا۔ اور اسی سلسلے میں چپکے چپکے
داوی تیاریاں بھی کر رہی تھیں۔

انہوں نے درزن کو بلوا کر حساب لگوا لیا۔ اور پھر کپڑا
اپنے ٹرنک میں چھپا دیا۔ ایک دو دن تک لیس، مولی
منگوانے کے بعد سلوانے کا ارادہ تھا۔

انادیہ پاس ہی تخت پہ بیٹھی گڑیا سے کھیل رہی
تھی۔ کبھی اسے کنگھی کرتی۔ کبھی مونڈھے سے لگا کر
تھپکنے لگتی۔ جیسے سلائی ہو۔ اس کا انداز مگن سا تھا۔
داوی نے ایک گونہ اطمینان محسوس کیا۔ ”صد شکر
ندیدی کی نظر نہیں پڑی۔“ ٹرنک کو تالا لگا کر داوی نے
چالی تکیے تلے دیالی اور خود بھی چاریائی پہ دراز ہو گئیں۔
اور جانے کیسے انادیہ پہ کڑی نگاہ رکھتے رکھتے اونگھ سی آ
گئی تھی۔ انہوں نے مکمل کے دوپٹے کو منہ پہ رکھا اور
لمحوں میں غافل ہو گئیں۔

آہ یہ بڑھا پے کی نیند۔

انادیہ نے گڑیا اٹھا کر تخت پہ پٹی اور تیزی سے اٹھ
کر ماں کو دیکھنے صحن میں گئی۔ ماں کپڑوں کو رکڑنے میں
مگن تھی۔ اس نے چپکے سے آکر داوی کے تکیے تلے

مگر وہ آلودہ۔ نیچے وادی کی گالیاں اور کونے۔ اوپر انادوہ کے اونچے اونچے قلعے۔

”بد بخت، تو کبھی چین نہ پائے۔ ساری عمر تڑپتی رہے۔ رذیل بوڑھی وادی کو خوار کرتی ہے۔“

”اور وادی! اللہ تجھے بھی کٹرے ڈالے۔ اور تو جلدی مرے۔ قبر میں تجھے لمبے لمبے سانپ کاٹیں۔ اور ہمارا جو خون چوس کے تو کھاٹی پیتی ہے۔ کٹرے تیرا خون چوسیں۔“ انادوہ کو ڈنگے کی چوٹ پہ منہ بھر بھر کے جواب دینا آگیا تھا۔ وہ اب وادی سے ڈرتی نہیں تھی۔ سینہ تن کر مقابلہ کرتی تھی۔

”ستارہ ہو جائے تو۔ بد بخت! ایک بل بھی چین نہ پائے تو۔“ وادی جھولی اٹھا اٹھا کر بد دعائیں دیتی۔ اور اس کی کاموں میں مگن سی ماں اس لمحے دہل جاتی تھی۔ اور خونی نگاہوں سے وادی کو دیکھنے لگتی تھی۔ مگر وادی

کو روکنے یا ٹوکنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ ہاں اس کی آنکھوں سے آنسو ضرور گرتے تھے۔ جنہیں کوئی بھی چھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔

سرا کے ان دنوں میں ماں کو تپ چڑھ گیا۔ جیٹھ کی گرمی والا تپ۔ بخار ایسا چڑھا کہ اترنے کا نام ہی نہ لیا۔ مگر کا نظام ابتر تھا۔ برابر سے مائی آتی اور تھوڑا بہت کام کر کے چلی جاتیں کیونکہ مائی کو دیکھ کر وادی پہ جھون چڑھ جاتا تھا۔ وہ ماں سے بھی زیادہ وادی کی ناپسندیدہ ہو گئیں۔

وادی کو اگر کسی سے پیار تھا تو وہ افرامیم تھا۔ جو انادوہ کو زہر لگتا۔ صرف اس لیے کہ وہ وادی کو پیار تھا اور جو شخص وادی کو پیار ہوتا اس سے انادوہ کا علی الاعلان پیر تھا۔

وہ اسے اکثر سمجھاتا۔

”وادی سے بد تمیزی نہ کیا کرو۔ وہ ہماری بڑی ہیں۔ زبان کی تلخ ہیں تو کیا ہوا۔ ان کی عزت کیا کرو۔“

”اس چینی کی بوری کو اٹھا کر اپنے گھر لے جاؤ۔ پھر میں پوچھوں گی زبان کی میٹھی ہیں یا تلخ۔“ وہ لال ٹماٹر چروٹے چھت پہ چڑھ جاتی۔ افرامیم اپنی منڈیر پہ بیٹھا

سینے کی پہلی تاریخ بھی۔ دودھ والے کو حساب کے بعد روپے دینے تھے۔ وادی اس کام میں لگ گئیں۔

اور بچن کے چوکھٹے میں بیٹھی انادوہ ریختی ہوئی برآمدے کے فرش پہ گھسیٹی چارپائی تک آگئی۔ پھر اس نے وادی کے خوب صورت سوٹ پر ہاتھ پھیرا تھا۔ اور دوسرے ہی بل مشین کے ڈبے سے قینچی اٹھائی اور وہ وادی کی کینس کو کاٹنے لگی۔ اگلے ہی بل چارپائی کے اوپر بھی منی کتروں کا ڈھیر بڑا ہوا تھا۔ اور انادوہ ریختی ہوئی واپس باورچی خانے کے چوکھٹے میں چو کڑی مار کر آم کی پھانک چوسنے لگی تھی اور وادی واپس آکر ڈھیر کو اٹھائی اپنا سینہ پیٹ رہی تھیں۔ سرا کے دنوں میں وادی لحافوں میں ڈورے ڈلواتی تھیں اور لال سے مرے اور چٹنیاں بنوا کر اپنے چمکے کے لیے محفوظ کر لیتیں۔ ان مریوں پہ ناصر اور انادوہ کا کوئی حق نہیں تھا۔ ہاں گلاب کو ضرور حصہ مل جاتا۔ اور ابابکھی گھر میں ہوتے تو انادوہ کو سوکھی روٹی بنا سالن کے کھاتے دیکھ کر چمکے سے اپنی کٹوری فرش پہ انادوہ کی طرف کھسکا دیتے۔

اکثر خشک میوے جب میں بھر کر لے آتے اور انادوہ کے تیلے تلے رکھ کر نکل جاتے۔ گھر آتے تو مونگ پھلی اور ریوڑیاں ضرور لاتے۔

گھر میں جمعرات کے دن گوشت پکاتا تھا۔ وادی ماں کے سر پہ کھڑی ہو جاتیں۔ اور ایک ایک بونی گرن کر ہانڈی میں ڈلواتیں اور اپنے لیے بھنا ہوا سالن الگ سے نکھال لیتیں۔ باقی سالن میں پانی کا جگ انڈیل دیا جاتا تھا۔ وادی تھوڑے سے شور بے کو تین وقت کے لیے بہت لمبا کرنا جانتی تھیں۔

اس دن بھی وادی نے اپنی کٹوری بھر کے الگ کر لی تھی۔ پھر ماں سے تازہ پھل لے بنوائے۔ اسٹیل کالسی سے بھرا گلاس لے کر وہ اپنی چارپائی کی طرف بڑھ رہی تھیں جب منڈیر سے لٹکتی انادوہ نے بھری ہوئی راکھ کی بالٹی وادی کے سر پہ الٹ دی تھی۔ وادی کے ہاتھ سے چٹیر گر پڑی۔ سالن، روٹی اور لسی بھی راکھ سے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار جہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

رہتا تھا۔ کتاب سامنے رکھے۔ وہ بہت پرہیزگار بچہ تھا۔
”ہمارے گھر نہیں آئیں وہ۔“ وہ حسرت سے کہتا تھا۔

”تمہاری ماں میری ماں کی طرح مار نہیں کھاتی نا۔“
اس کا انداز بہت تلخ ہوتا تھا۔ اتنی سی عمر میں وہ بہت تلخ اور ترش ہو چکی تھی۔

”جانے داوی اتنی ظالم کیوں ہیں۔“ افرایم افسردہ ہو جاتا۔

”داوی کے اندر بدروح ہے اس لیے۔“ انادیہ نے اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا تھا۔

”اور جانے چچی داوی سے پتی کیوں ہیں؟ ان کا ہاتھ کیوں نہیں روکتیں؟“ وہ اپنا ٹیسٹ بھول کر چچی کے غم میں آدھا ہونے لگتا تھا۔

”ان کا ہاتھ ماں نہیں۔ میں روکوں گی۔“ انادیہ نے اپنے خطرناک عزائم کا اعلان کیا تھا۔

”تم کیا کرو گی؟“ افرایم نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔
”میں داوی کو مزہ چکھاؤں گی۔ جیسی تکلیف ماں کو دیتی ہیں۔ ویسی تکلیف دوں گی۔“ انادیہ کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ افرایم کام نہ کھل گیا۔
”تم کچھ غلط نہیں کرو گی؟“

”اول ہوں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ ”میں کچھ نہیں بہت کچھ غلط کروں گی۔“ اس کے ارادے اچھے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ یہ ماں کے تپ چڑھے دنوں کی بات تھی۔ بخار میں ماں کا جسم تنور بنا تپ رہا تھا۔ اور داوی کو حریرہ کھانے کا جنون سر پہ سوار ہو گیا۔
”اری میں کہتی ہوں۔ کب تک بہانا بنا کر بستر توڑے گی! نامراد! اٹھ بھی جا۔ کیا میں حریرہ کھائے بغیر دنیا سے چلی جاؤں گی؟“ داوی کی زبان کا چسکہ ماں کے لیے وبال بنتا جا رہا تھا۔ آخر کار ماں بے چاری بخار سے ٹوٹتے بدن کے ساتھ باورچی خانے میں گھس گئی تھی۔

ادھر انادیہ کا مارے غصے کے حشر ہو گیا۔ لیکن زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی۔ وہ اندر ہی اندر تلملاتی

تھی۔
”داوی! تو نہیں مرتی۔ ہماری بوٹیاں نوچ کر ہی مرے گی۔“

”اے ندیدی! تو کیا بڑبڑاتی ہے۔“ داوی جان بوجھ کر اسے چھیڑتیں۔ وہ بولتی تو نہیں تھی۔ تاہم خونی نظروں سے دیکھتی ضرور تھی۔

”تیرے مرنے کی دعا کرتی ہوں داوی! تاکہ ماں کی تجھ جیسے عذاب سے جان چھوٹ جائے۔“ وہ خلاؤں میں دیکھتی عجب بے بسی کا شکار نظر آتی تھی۔

پھر اس دن ماں نے حریرہ کو بتایا مگرول سے نہ بنایا۔ بخار میں تپتے ہوئے بنایا تھا تو کسے دل سے بننا۔ داوی کو چکھتے ہی ابکاٹی آگئی۔ ڈالنے۔ تو کوئی سمجھوتہ نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ کسی بھی چیز پر سمجھوتہ کرنا ان کے لیے گناہ تھا۔ انہیں حریرہ پسند نہ آیا۔ سوئے اتفاق کو تندی ڈینڈا ان کے قریب ہی رکھا تھا۔ انہوں نے ڈینڈا اٹھا کر ماں کو دے مارا۔ کچن میں جاتی ماں وہیں فرش کے اوپر ڈھیر ہو

گئی تھی۔ جانے ماں کو چوٹ کہاں آئی؟ سر پہ، جسم پہ یا روح؟ یا پھر کہیں بھی نہیں۔

ماں درد سے ہلپلائی تڑپتی رہی۔ ساتھ والے گھر سے افرایم اور تائی بھاگتے ہوئے آئے اور ماں کو اٹھا کر حکیم جی کے پاس لے گئے۔ اور وہاں سے بڑی چوڑکے پاس۔ ماں کا ننھہ اتر گیا تھا۔ اور ٹانگ سوچ گئی تھی۔

ماں گھر آئی تو پہلے سے زیادہ زرد اور ویران تھی۔ درد اس کی آنکھوں میں جم گیا تھا۔ اور وہ پوری رات کراہتی رہی تھی۔ ابا بے چینی سے اٹھتے ماں کو ہلاتے، کبھی گھٹنا دباتے یا باورچی خانے سے صاف اٹھا کر گرم کرتے اور ماں کے جسم کے دکھتے حصوں کو ٹکڑی جاتی ابا کو کبھی پتا ہی نہیں چلا تھا کہ ماں کو یہ چوٹیں کہاں سے آتی ہیں؟

وہ رات کی تاریکی میں ابا کی ہلکی سی آواز سنتی تھی۔
”دھیان سے چلا کرو۔ آئے دن کبھی گھٹنا اترتا ہوتا ہے اور کبھی ننھہ۔“ ابا کی دھیمی آواز اور ماں کی جواباً خاموشی۔ عجیب عورت تھی۔ کبھی بتا ہی نہ سکی کہ یہ

ٹانگیں ٹوٹتی ہیں گھر کے اندر بیٹھتے ہوئے۔ باہر نکلتی تو جان نکال دوں گی۔“

”ماں کو۔۔۔ پانی۔“ انادیہ کا حلق سوکھ گیا۔ اور باقی الفاظ منہ میں گھٹ کر رہ گئے تھے۔ اسے ماں کی مرنی ہوئی آنکھوں میں پیاس نظر آتی تھی۔ اور سوکھے نیلے بڑتے ہونٹ۔ اس کی جان نکلنے لگی۔ ہاتھ سے کٹوری چھوٹنے لگی۔ وہ دادی کا ہاتھ چھڑا کر بھاگنے لگی۔

”کمینی رک۔“ دادی نے اپنی پسندیدہ گالی کے ساتھ جوتی اٹار کر انادیہ کی طرف پھینکی۔ انادیہ نے جھک کر خود کو جوتی کے نشانے سے بچایا تو دادی کو اس کا کامیابیہ تاؤ چڑھ گیا تھا۔

”باہر ختم بٹھا رکھا ہے جس کے لیے بھاگ بھاگ کر جاتی ہے۔ تیرا باپ آٹو لے۔ اسے بتاتی ہوں۔“ دادی کفر بکنے لگی۔

”کس کے ساتھ آنکھیں منکا رکھی ہیں۔ رذیل بتاتی تو جا۔“ دادی نے گملا اٹھا کر اسے دے مارا تھا۔ مٹی کا گملا ٹوٹ کر کئی حصوں میں بٹ گیا۔ اور ایک نوکیلا ٹکڑا انادیہ کے پیروہ جا لگا۔ لحوں میں اس کا پیر خون آلود ہو چکا تھا۔

وہ بھل بھل نکلنے خون کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بھاگی بھاگی چچی کے گھر پہنچی۔ گیٹ بند تھا۔ کھلنے میں بھی وقت لگا۔ اوپر سے اس کی چپل خون میں بھیگ رہی تھی۔ پاؤں کے ٹکڑے۔ چچی ہاٹ اور رطوبت سی محسوس ہوتی، یوں لگتا جیسے ابکائی آجائے گی۔ افرامیم نے خون دیکھا تو چیخ بڑا۔

”رکو، ندی میں تمہیں پٹی لگا دوں۔ اتنا خون۔“ وہ افرامیم کی پکار کو نظر انداز کرتی پانی لے کر گھر پہنچی تو دادی سامنے کہیں نہیں تھی۔

انادیہ بھاگ کر ماں کے کمرے میں پہنچی۔ ماں اپنے کمرے میں بستر کے اوپر موجود تھی۔ ماں کا چہرہ دروازے کی سمت تھا۔ اور آنکھیں ناڑ سے کھلی تھیں۔ ماں انادیہ کا انتظار کر رہی تھی۔

سر دھتھری آنکھوں میں کہیں پیاس موجود تھی۔ وہ

چوٹیں کرنے اور فرش پر پھسلنے سے نہیں آتیں۔ کیا پتا لیا ”باخبر“ بھی ہوں مگر جان کر نظر انداز کر دیتے ہوں۔

انادیہ کے من میں کچھ دھیرے دھیرے سلگتا تھا۔ ایک اٹکر، ایک انگاری۔ دل چاہتا۔ پکھے کے سامنے لیٹی، چین کی نیند میں گم اس بڑھیا کی گردن پہ اپنا پنجہ جما آئے۔ اس کا گلا گھونٹ آئے۔

پھر ماں کی بیماری کا دورانیہ طویل ہو گیا۔ ناصرنے اسکول جانے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ سارا دن آوارہ لوگوں کے ساتھ گلی ڈنڈے میں گمن رہتا یا پتلیں اڑاتا۔ البتہ انادیہ اسکول جاتی تھی۔ اور افرامیم کے ساتھ ہی اسکول جاتی اور آتی۔

اس دن وہ اسکول سے واپس آئی تو دادی باورچی خانے میں برتن بیچ کر گالیاں بک رہی تھی۔ ”اس عمر میں سیارے گلے بڑ گئے۔ ارے تو مرنی کیوں نہیں؟ مر جا تاکہ تیرا منحوس جسم مٹی تلے دبا آئیں۔ اس گھر کے لیے کوئی اور لے آئیں۔“

انادیہ نے بستہ چارپائی پہ پھینکا اور ماں کے قریب آ گئی۔ دادی کی بکواس پہ ماں کی آنکھوں سے سیل رواں جاری تھا۔ بچی جھکتی دادی تو اندھی تھی اندھی۔ اسے ماں کی آنکھوں میں زندگی مرنی دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔ انادیہ کی نیلی آنکھیں پہلی مرتبہ آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ وہ تیزی سے ماں کی طرف بڑھی اور اس سے لپٹ گئی۔ ”دیا۔ پانی۔“ ماں نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں پانی مانگا تو وہ بھاگتی ہوئی پانی لینے کے لیے گئی۔ لیکن دیکھا تو بیٹھے پانی کا گھڑا خالی تھا۔ ان دنوں موٹریں عام نہیں تھیں۔ شاذ ہی کسی کے گھر موٹر ہوتی۔ پانی فلکوں سے بھر کے لایا جاتا تھا۔ کیونکہ انادیہ کے گھر کا پانی زمین میں خرابی کی وجہ سے کھارا ہو چکا تھا۔

وہ کٹورا اٹھا کر افرامیم کے گھر پانی لینے کے لیے بھاگی تو دادی چیل کی طرح اس پہ جھپٹ پڑیں۔ ”منحوس! سارا دن آوارہ گردی کرتی رہتی ہے۔“

بھاگتی ہوئی ماں کے قریب آئی۔ اس نے ماں کی گردن میں بانو ڈال کر ماں کو اٹھایا۔ اس کے لبوں سے پانی کی کٹوری لگائی۔

”اب کھولنا منس۔ پانی پی لو ماں۔“ وہ پکارتی رہی۔ جھنجھوڑتی رہی۔ ماں کو جگائی رہی۔

”کوئی کھلی آنکھوں سے بھی سوتا ہے ماں۔ اٹھ بھی جاؤ۔ پانی تو پیو۔“ وہ پیر سے نکتے خون کی پرواہ کیے بغیر چیختی رہی۔ روتی رہی۔ ماں کو جھنجھوڑتی رہی اور وہ بڑھیا کسی بدروح کی طرح انادیبہ کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ ساکت معیران اور ششدر۔

”یہ تو مر چکی ہے۔“ دادی کی آواز میں پہلی مرتبہ سنناٹا بھری تھی۔ ایک خوف، ایک وحشت سی آس پاس چکرانے لگی۔ دادی خوفزدہ سی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ انادیبہ نے ماں کی پتھر آنکھوں پہ ہاتھ رکھا اور بھری ہوئی کٹوری کو خونی نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے آؤدیکھانہ تاؤ مٹی کی وہ کٹوری اٹھا کر دادی کے سر پہ دے ماری۔ اس وقت اس کے سر پر خون سوار تھا۔

اس کی خونی آنکھوں میں وحشت بھری ہوئی تھی۔ وہ وحشت اس کی پوری زندگی پہ محیط ہو گئی تھی۔ ماں مر گئی مگر اپنے پیچھے اس کے لیے پیاس چھوڑ گئی۔ نفرت کی پیاس۔

اس پیاس نے انادیبہ کو بڑے گہرے اور گھاؤ دینے والے اسباق کے مفہوم سمجھائے تھے۔ اسے نفرت کو سیکھنا، پڑھنا اور سمجھنا آ گیا تھا۔ اسے نفرت کو برتنا، پہننا اور اوڑھنا آ گیا تھا۔

اسے دادی سے شدید نفرت تھی۔ یہ نفرت دن بدن بڑھتی رہی۔ اس کا نہ کوئی انت تھا نہ کوئی شکار۔ ماں کے جنازے پہ دادی اپنا پھنسا ہوا سر سب کو دکھاتی اور اپنے لیے ہمدردی بھرتی تھی۔ اور انادیبہ سب آنکھوں سے سب کے چہروں کو پڑھتی۔ وہاں پہ اس کے لیے کوئی اچھے تاثرات نہیں تھے۔

ہر کوئی اسے برا سمجھتا۔ کیونکہ دادی اسے برا ثابت کرنے نہ تلی ہوئی تھی۔

وہ ہر کسی کو انادیبہ کی بدزبانی، بد تمیزی، تلخی اور زبان درازی کا پتائی تھیں۔ وہ بری تھی۔ دادی نے اسے برا ترین بنانے کا کام کیا۔ اس کے اندر سے بچی کچی اچھائی کو بھی اکھاڑ کر رکھ دیا تھا۔

وہ ماں کے سارے بدلے دادی کو تکلیف دے کر لیتی تھی۔ اسے اپنے دشمنوں کو تکلیف دے کر ایک فرحت انگیز لذت کا احساس ہوتا تھا۔ یہ ایک سرور بخش سی کیفیت، جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ حالانکہ اس کیفیت کا ایک نام ضرور تھا۔ جس سے انادیبہ قطعی طور پر نا آشنا تھی۔

ماں کے بعد دادی کے جلد ہی سارے کس بل نکل گئے تھے۔

ایک دن سیڑھیوں سے گری اور چارپائی کی ہو کر رہ گئی۔ ٹانگ تین جگہ سے ٹوٹ گئی تھی۔ سارا دن بستر پہ پڑی چلاتی رہتی تھی۔ انادیبہ کاموڈ ہوتا تو بات سنتی ورنہ ریڈیو لگا کر گلے انجوائے کرتی رہتی۔

بھوکی پیاسی دادی کی آپہں برابر والے گھر تک بھی پہنچتی تھیں۔ اور وہاں سے ایک چہرہ فوراً ہی نمودار ہوتا۔ ہاتھ میں ٹرے پکڑے۔ وہ دیوار بھاند کر آتا تھا۔ دادی کو روٹی کھلاتا۔ دودھ میں بھگو بھگو کر۔ انہیں چائے پلاتا اور دوائی بھی دیتا۔ پھر ان کی ٹانگوں میں مالش کرتا۔ ان کے پیر دیا تا اور اچانک انادیبہ کے سامنے تیور بگاڑے کھڑا ہو جاتا۔

”دادی کو بھوکا کیوں رکھتی ہو؟ انہیں روٹی نہیں دیتیں۔ صرف دودھ، چائے یا گلوکوز۔ کیوں؟“ اس کی برہمی پہ انادیبہ ناک چڑھا لیتی تھی۔ پھر غصے میں پھنکار کر کہتی۔

”ٹھوس غذا نہیں دے سکتی۔ دادی کی غلاظت کو کون سینے گا پھر۔“

”انادیبہ۔ تم۔“ وہ خون کے گھونٹ بھر کے رہ جاتا تھا۔ ”تم اس وجہ سے دادی کو بھوکا رکھتی ہو؟“ ”ہاں۔“ انادیبہ تسلیم کر لیتی تھی۔ اور افرامیم ساکت رہ جاتا۔

پھر دادی کو ایک دن فالج کا انٹیک ہوا تو وہی سہی کسر

بھی نکل گئی تھی۔ لبا حتی المقدور داوی کا علاج کروا رہے تھے۔ لیکن طبیعت میں کوئی افاقہ نہیں تھا۔ افرایم حکیم جی سے معجونی بنوالا تا اور ماش کے لیے طرح طرح کے تیل بھی۔ وہ ہر ٹوکا داوی پہ آزماتا چاہتا تھا تاکہ داوی اپنے پیروں پہ چل سکے۔ لیکن داوی کے اعمال کا ”بار“ اتنا زیادہ تھا جو کہ جسم اٹھانے کی سکت برداشت نہ کر سکتا۔ داوی تو چل نہ سکی تاہم افرایم ضرور تھک گیا۔

”مجھے نہیں لگتا داوی اب ٹھیک ہو سکیں گی۔“
”تمہیں اب پتا چلا۔ میں تو اول روز سے جان گئی تھی۔“ وہ کچی گاجر کترتی مزے سے بولی تھی۔ افرایم اسے سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔
”تم ایسی کیوں ہو؟“
”کیسی؟“ وہ حیران ہوئی۔

”اتنی سخت دل۔“ افرایم نے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔ انا دیہ بننے لگی۔ پھر صحن میں چارپائی پہ دھوپ سیٹکتی نیم غنودہ داوی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”اس عورت کی وجہ سے۔“ اس کے لہجے میں بے انتہا نفرت تھی۔ ”میرا بس چلے تو اس عورت کو اپنے ہاتھ سے مار ڈالوں۔“
”انا دیہ۔“ افرایم تھرا گیا تھا۔ پھر نفی میں سر ہلاتا پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے چہرے پہ خوف سا پھیل رہا تھا اور اسے انا دیہ کی نیلی آنکھوں میں اتری وحشت سے وحشت ہونے لگی تھی۔ پھر وہ کچھ کہے بغیر اپنے گھر چلا گیا۔

اس رات آسمان سے سوا کا مینہ برستا رہا۔ ٹوٹ ٹوٹ کر پھر پھر کر۔

باہر بارش کا ایک طوفان تھا۔ پانی ہی پانی۔ اور اندر داوی کے لب پاس سے تھے سوکھے بے جان کھلی آنکھیں۔ باہر تو نکلی پیاسی زبان۔ اور لبوں سے ادا ہوئے ٹوٹے پھوٹے الفاظ۔ ”پا۔ ن۔ ی“ وہ زبان باہر نکالتی اور اندر کرنے کی طاقت نہ رکھتی۔ پوری رات وہ پانی کے لیے تڑپتی رہی۔ باہر پانی برس برس کا دیوانہ ہو رہا تھا۔ اندر انا دیہ آرام سے

لحاف میں منہ دیے سوئی رہی۔
صبح اٹھی تو ٹوٹے گملوں، اکھڑے پودوں اور ٹوٹے پانی کے گھڑے کی طرف لپکتی داوی آدمی پٹنگ سے نیچے اس حال میں لٹک رہی تھی کہ ان کا پورا وجود ٹھنڈ سے برف بن کر اکڑا ہوا تھا۔ داوی کا جسم ”بے جان“ بڑا ہوا تھا۔

وقت کی چال اور زندگی کی کتاب میں ان گنت آنسوؤں کے مٹے نشان اسے بار بار یادوں کے صحرا میں لے جاتے تھے۔ یادیں جو کبھی ساتھ نہیں چھوڑتیں۔ یادیں جو ہمارے اعمال کی طرح ہمیشہ ساتھ رہتی ہیں۔ یادیں گناہوں کی طرح پیچھا کرتی ہیں۔ انسان ساتھ چھوڑ بھی جائے تو یادیں کبھی تنہا نہیں چھوڑتیں۔

وہ اپنے سرکاری بیگلے کے وسیع و عریض لان میں گمن نوکروں کو دیکھتی۔ کبھی مالی کو بدایت کرتی اور کبھی گارڈ کو چوکنا رہنے کی تلقین کرتی۔ کبھی ڈرائیور کو سمجھاتی، بچوں کو وقت پہ اسکول سے لیا کرے اور کبھی اندرون خانہ ملازم عورتوں کو کام کے حوالے سے ہدایات دیتی۔

اس کے آس پاس بڑی مصروفیات بکھری تھیں اور وہ ”بیگم صاحبہ“ بن کر پورا دن بھی نوکروں کو کاموں کی ہدایت کرتی تب بھی نہ جھٹکتی۔ یہ مصروفیت ان صحرا صحرا کر دینے والی یادوں سے بہت اچھی تھی۔ لیکن پھر رات کا ایک پہر آتا۔ اور یادوں کا ایک بندرستہ بھل جاتا۔ ایک جاوہی رستہ جو اسے ماضی کی بھول بھلیوں میں لے جاتا۔ اور ماضی بعید تو نہیں تھا۔ ماضی تو قریب ہی تھا۔ جیسے ابھی کل ہی کی بات ہو۔

وہ سرخ زرتار آچل تلے ان گنت خوابوں کی تھلیل پکڑے افرایم کے ہمراہ اس کی محبت کے حصار میں اس گھر کی چھاؤں میں آئی تھی۔ جو افرایم کے ابو کا گھر تھا۔ انہوں نے افرایم کے لیے بڑی ہی محبت سے بنوایا تھا۔ وہ خود بھی سرکاری افسر تھے۔ انہوں نے اپنی ساری جمع پونجی اس گھر میں لگا دی تھی۔ جس میں بے عرصے تک رہنا انہیں نصیب نہیں ہوا تھا۔ افرایم کی بے تحاشا محبت، توجہ اور پیار کے ساتھ اپنے تین بچوں

کی جنت میں روبہ کسی ملکہ کی طرح شان کے ساتھ
جیون بتاتی تھی۔

اس گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ وہاں ہر چیز کی
فراوانی تھی۔ محبت، بہار، توجہ اور وقت بھی۔

اور پھر روبہ کی جنت کو کسی ”بد نظر“ کی نظر لگ گئی۔
افراہیم کی ماں کہتی تھیں ”یہ ساتھ والی کی نظر بڑی
خطرناک ہے۔ میری ساس کو اپنی اس پوتی کی نظر سے
بڑا خوف آتا تھا۔ وہ کہا کرتی تھیں۔ ”اس کی نظر پتھر
پڑے تو پتھر بھاڑ دے۔“

بہت سال تک وہ اپنی ساس کے اس فرمان کو نظر
انداز کرتی رہی۔ جھٹلاتی رہی۔ وہ کسی وہم میں نہیں
پڑنا چاہتی تھی۔ وہ کسی شیطانی دوسوے کی زد میں کیوں
آئی۔

اسے لگتا یہ تو ہم پرستی ہے اور کچھ نہیں۔

ورنہ انادوہ کی نظر ایسی تو نہیں تھی۔ شاید یہ خیال
اسی طرح قائم رہا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ روبہ کو

احساس ہونے لگا تھا کہ انادوہ کی ”نگاہ“ کا زہر کیسا تھا؟
جس طرف نگاہ کرتی۔ زہر زہر کر دیتی اور جس پہ جم
جاتی۔ اسے سانپ کی طرح جڑس لگتی۔

شادی کے کچھ ہی عرصہ کے بعد جب روبہ نے انادوہ
سے ملنے اور پچھلے روابط کو قائم رکھنے کی خواہش کا
اظہار کیا تو افراہیم نے اسے بڑی نرمی اور محبت کے
ساتھ منع کر دیا تھا۔

”پچھلا دوستانہ بھول جاؤ جان! اب نئے دوستوں
سے دوستی نبھاؤ۔“ افراہیم کے نرم لہجے میں ایک واضح
تنبیہ تھی۔ وہ اسے انادوہ سے ملنے نہیں دینا چاہتا
تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ انادوہ گھر اس کی بغل میں
تھا اور وہ نہ صرف روبہ کی پرانی سہیلی تھی بلکہ ہونے
والی بھابھی بھی۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ روبہ انادوہ
سے دور رہ سکتی۔

”وہ میری ہونے والی بھابھی ہے۔ ملوں گی نہیں تو
تعلقات کیسے بنیں گے؟ کل کو رشتہ داری کیسے نبھے
گی؟“ روبہ کی سادہ سی آنکھوں میں نظر بھر جاتا تھا۔
تب افراہیم ملامت سے اسے سمجھاتا۔

”رشتے بھی ٹوٹتے نہیں۔ ملیں یا نہ ملیں۔ رشتہ
وہیں رہے گا۔ مجھے پسند نہیں کہ تم انادوہ سے ملو۔
ہماری اس کے ساتھ ٹیمسٹری نہیں ملتی، بس یہی سمجھ
لو۔“

”مگر وہ میری بھابھی ہے۔ کل کو مجھے بھائی کے گھر
میں گھسنے بھی نہ دے گی۔“ روبہ کو آنے والے
”خداشات“ میں گھرا دیکھ کر افراہیم بے ساختہ ہنس پڑا
تھا۔

”تو نہ گھسنے دے۔ آپ ہمارے گھر میں رہیں اور
ہمارے دل میں رہیں۔ یہاں سے نکلیں گی تو کہیں اور
جائیں گی۔“ افراہیم کا مخمور لہجہ اور بے پناہ چاہت۔
اسے مزید سکھارے کو سوں دور لے جاتی تھی۔ وہ بے
بس ہو جاتی۔ چپ کر جاتی۔ مگر اپنے دماغ میں گھسنے
والے سوالوں کو گیسے روک جاتی؟

”افراہیم اور اماں انادوہ کو کیوں پسند نہیں کرتے؟
ان کا آنا جانا بھی برائے نام ہے؟ آخر کیوں؟“ اور سب

سے بڑا سوال؟ افراہیم نے ایسی قیامت کزن کے
ہوتے ہوئے روبہ سے شادی کیوں کی تھی؟

پھر ایک دن روبہ نے افراہیم سے باتوں باتوں میں یہ
سوال پوچھ لیا تھا۔

”مجھے تو حیرانی ہے۔ آپ کے پڑوس میں ایسا نایاب
حسن اور آپ پھر بھی نئی دریافت میں سرگرداں
رہے۔ کیا گھر میں موجود روپہلی چاندنی کی قدر نہیں
تھی؟“ روبہ کا سوال اور گہرا لہجہ۔ افراہیم صاف سمجھ گیا
تھا۔ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔

اس نے گہرا سانس بھرا اور آنگن میں پھیلی ٹھنڈی
چاندنی سے لطف لینے لگا۔ وہ اس وقت رات کے
دوسرے پہر، صحن میں بیٹھے تھے۔ آنگن میں اتری
پورے چاند کی رات سے لطف اٹھانے کے لیے۔
چند راہ کی رات تھی۔ ٹھنڈی، روشن اور دھلی دھلائی۔

”سمجھ لو عقل یہ پتھر بڑھ گئے تھے۔“ افراہیم کا انداز
غیر سنجیدہ تھا۔ روبہ حواس ہو گئی تھی۔ پھر اس نے اپنا سر
افراہیم کے کندھے سے ٹکا دیا تھا۔ افراہیم نے خود
سپردگی کے اس خوب صورت احساس کو سمیٹتے ہوئے

اور حقی راتیں۔

افراہیم کہتا تھا۔

”اس کے بغیر وہ ادھر رہتا تھا۔ نامکمل‘ رویا اس کے وجود کی تکمیل تھی۔“

رویا اس کی زندگی کا ”اٹھائیس“ تھی پھر وہ اپنے اتنے قیمتی اٹھائیس کو کیسے بھول گیا تھا؟

رویا کو آج بھی وہ دن یاد تھے۔ جب افراہیم اس کی تکلیف پہ تڑپ اٹھتا تھا۔ اس نے رویا کو پرانے گھر میں کسی ناویدہ آسیب کی وجہ سے خوف زدہ دیکھا اور مسلسل دیکھا تو وہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ اس گھر کو تالا لگ گیا تھا۔ یہ لوگ سرکاری بینکے میں شفٹ ہو گئے۔ یہ بڑا خوب صورت سرسبز بنگلہ تھا۔ سہولتوں سے پر۔ یہاں یہ رویا کو مل کر پانی بھی نہیں پینا پڑتا تھا۔ پھر بھی وہ خوش نہیں تھی۔ اس لیے کہ وہ اپنے ساتھ پرانے گھر سے دونوں ہاتھ بھر کر کے ناخوشی اٹھاتی تھی۔ لائی تھی۔ بینکے میں آکر اس کی زندگی سے وہ بے نام سا خوف مٹا نہیں تھا۔ لیکن کم ضرور ہو گیا تھا۔ البتہ اہل کی حالت وہی تھی۔ وہ ابھی ابھی رویا کو دیکھ کر چیخنے لگتی تھیں۔ اور اگر رویا نہ بھی ہوتی تب بھی چلاتی رہتی تھیں۔

”افراہیم! مجھے اس سے بچالو۔ تمہاری بیوی مجھے مار ڈالے گی۔“

اہل کے ذہن میں انجانا سایہ خوف بیٹھ گیا تھا۔ پھر افراہیم نے بڑے ہی سائیکائرسٹ بدلے مگر اہل کا یہ خوف مٹ نہ سکا۔ اور اگر افراہیم کو کوئی چیز پریشان کرتی تھی تو وہ اہل کی تکلیف تھی۔ اگر افراہیم کو کوئی چیز توڑ سکتی تھی تو وہ اہل کی آنکھ کے آنسو تھے۔ نہ وہ انہیں تکلیف میں دیکھ سکتا تھا نہ وہ اپنی ماں کے آنسو دیکھ سکتا تھا۔ پھر ایک دن اہل کو وہی پرانا دورہ پڑا تو افراہیم نے نوکروں کی موجودگی میں ہی رویا کو ٹوک دیا تھا۔ ”جب تم جانتی ہو۔ اہل کو تمہیں دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے تو سامنے کیوں آتی ہو؟“

افراہیم کے یہ الفاظ نہیں تھے بلکہ چابک تھے۔ جو رویا کے جسم پہ نہیں‘ روح پہ لگے تھے۔ نوکروں کے سامنے وہ احساس توہین سے چلی پڑ گئی تھی۔

(باقی آئندہ)

رویا کو اپنے بازو کے کھیرے میں لے لیا۔

”یوں سمجھ لو۔ انا دیہ کے لیے ایسی کبھی فیلنگز محسوس نہیں ہوئیں۔ اس کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ نہ اس نے کبھی ایسا کوئی موقع فراہم کیا۔“

”تو گویا اگر وہ موقع فراہم کرتی تو آپ سرکوانے کے لیے تیار تھے۔“ رویا کی خفگی بھری آواز پہ افراہیم نے بڑا ہی مزہ لیا تھا۔ یعنی رویا‘ انا دیہ سے جھلس رہی تھی۔

”اب ایسا فالٹو سر بھی نہیں تھا۔ جو کوانے کے لیے پیش کر دیتا۔“ اس نے رویا کو انا دیہ سے جھلسی کے اس حصار میں سے نکال لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا۔ رویا جھلس ہو کر بھی انا دیہ کو سوچے یا اسے اپنے حواسوں پہ سوار کر لے۔

”تو پھر؟“ وہ آنکھوں میں ڈھیر ساری خفگی سمو کر پوچھ رہی تھی۔

”تو پھر یہ کہ۔ تم آئی تھیں کاشف کا رشتہ لے کر برابر والے گھر میں۔ آئی فرزانہ نے اہل کو بھی بلالیا تھا۔ تب تم اہل کو بہت اچھی لگی تھیں۔ اور میں نے یہاں چھت سے تمہیں دیکھا تھا۔ تو تم مجھے بھی بہت اچھی لگیں۔ جب میں گیٹ پہ تمہاری اہل سے ملنے آیا تو تم اپنی اہل کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ مجھے تمہاری وہ ادا بہت اچھی لگی۔ اور پھر۔“ افراہیم بہت محبت سے کہتے ہوئے کہیں کھوسا گیا تھا۔ جیسے وہی لمحہ آنکھوں میں آن بسا ہو۔

”اور۔۔۔؟“ رویا نے بے چینی کے عالم میں اس کا کندھا ہلایا۔ افراہیم نے چونک کر اسے دیکھا۔ اور اس کی بے چینی دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔

”پھر جب تمہیں‘ تمہارے کلج کے باہر دیکھا۔ میں انا دیہ کو کلج سے لینے گیا تھا۔ تمہیں دیکھنے کے بہانے تم تب اپنی دوست کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔“ افراہیم کے بتانے پر وہ بے ساختہ چونکی تھی۔

”آپ کو وہ چھپنا بھی یاد ہے؟“

”تمہارے حوالے سے مجھے کچھ بھی نہیں بھولتا۔“ افراہیم کی وہ یقین دہانیاں اور اس کی وہ بادل کی طرح برستی چائیں‘ وہ محبت لٹاتے دن اور الفت

قصہ کی

رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔

ولید نادرا کے سامنے والے صوفے پہ گم صم اور ساکت سا بیٹھا اور اسے سنی ہوئی داستان پر یقین کرنے اور نہ کرنے کے بیچ ڈول رہا تھا۔

کیوں کہ جو کچھ وہ بتا چکی تھی وہ قابل فراموش تو نہیں تھا۔

رضا حیدر۔ علی مرتضیٰ کے قاتل تھے۔ عافیہ بیگم اور ماورا مرتضیٰ کے مجرم تھے اور قاتل اور مقتول کی اولادیں محبت میں گرفتار تھیں۔

معاملہ کہاں سے شروع ہوا تھا اور کہاں پہنچا تھا اور آگے کیا ہونے والا تھا سب عقل اور سمجھ سے باہر کی باتیں تھیں۔ ولید کی پرسوج آنکھیں پنیپنار ہی تھیں۔

بتاؤ ولید میرا ساتھ دو گے؟ مجھے تیمور حیدر واپس چاہیے۔ سہرا ل میں۔ "ماورا التجا بھی کر رہی تھی تو ایک ضد ایک ہش و ہری کے ساتھ۔

پینتیسویں قسط

اسپتال کی طویل راہ داری — میں اشتیاق یزدانی اور آفاق یزدانی بے حد پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں ٹھل رہے تھے۔ قریب ہی صوفے پہ ٹینہ یزدانی بندھال سی پڑی تھیں۔ ان پہ آج صدمے کا پہاڑ ٹوٹا تھا اور وہ ابھی اس پہاڑ جیسے صدمے سے نکل بھی نہیں پائی تھیں کہ فارہ کی طرف سے ملنے والی خبر سے ان کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM

اس لیے تو وہ اب اٹھ نہیں پا رہی تھیں، ان کی تمام ہمتیں جواب دے گئی تھیں۔
 ”ایکسکیوزی سر!“ اچانک آئی سی یو کا دروازہ کھول کر ڈاکٹر یاہر آئی تھیں۔
 ”یس۔“ آفاق ڈاکٹر کی آواز سنتے ہی ایک دم چوکنا ہو گیا تھا۔

”ایم سوری سر۔“ ان کا بی پی کنٹرول نہیں ہو رہا۔ مجبوراً ہمیں آپریشن کرنا پڑے گا۔ ورنہ بچے کی زندگی کو خطرہ ہے۔“ ڈاکٹر نے آفاق سے صاف بات کی تھی اور آفاق نے حیرت سے دیکھا تھا۔
 ”لیکن ابھی تو سات مہینے کی پریگننسی ہے اور۔“

”ڈونٹ وری سر! ہمارے پاس ایسے ہزاروں کیس آتے ہیں جن کی ساتویں مہینے ہی ڈیلیوری عمل میں آجاتی ہے، دعا کریں کہ بچہ بالکل نارمل صحت مند اور ٹھیک ہو ورنہ کچھ دن اسے نرسری میں رکھا جائے گا۔“ ڈاکٹر نے آفاق کی تسلی کروائی تھی اور مجبوراً اشتیاق یزدانی کے ہمت دلانے پر اس نے کاغذات پر دستخط کر دیے تھے اور خود جیسے دھڑکتے دل اور لرزتے جسم کے ساتھ تھک ہار کے تینہ یزدانی کے برابر آ بیٹھا تھا۔ آپریشن تھیٹر کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔



”مبارک ہو سر! اللہ نے آپ کو بیٹے سے نوازا ہے۔“ آدھے گھنٹے بعد نرس آپریشن تھیٹر سے خوش خبری لے کے نمودار ہوئی تھی اور آفاق کے ساتھ ساتھ باقی سب کے چہروں پر بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔
 ”فارہ کیسی ہے؟“ آفاق نے تو بچے کے لیے خیر مبارک بھی نہیں کہا تھا، بلکہ سب سے پہلے فارہ کا پوچھا تھا۔
 ”ان کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ان کی حالت ابھی خطرے سے خالی نہیں۔ آپ لوگ ان کے لیے دعا کریں۔“ نرس ایک طرف ان کو خوش خبری اور دوسری طرف فکر میں مبتلا کرنے کے بعد واپس جانے کے لیے پلٹی اور پھر اچانک رک بھی گئی تھی۔

”اور ہاں۔ جلد سے جلد بچے کے لیے کپڑے اور اس کی ضروری اشیاء بیچ کریں۔ ضرورت ہے فوراً۔“
 نرس کہہ کر دوبارہ سے آپریشن تھیٹر کے دروازے کے اندر غائب ہو چکی تھی۔

”اف۔ اب کیا ہو گا؟“ آفاق دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر وہیں صوفیہ بیٹھ گیا تھا۔
 ”دیکھیں آفاق بھائی۔ آپ ٹنشن نہ لیں۔ فارہ کو کچھ نہیں ہو گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور والا بہت رحیم و کریم ہے، کسی کے دل سے نگلی دعا رو نہیں کرتا۔ آپ بھی فارہ کے لیے دعا کریں۔ ان شاء اللہ ضرور قبول ہوگی۔“ ساشا نے سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے آگے بڑھ کے آفاق کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی، تاکہ وہ کوئی ذہنی ٹرین نہ لے ورنہ اسے نقصان بھی ہو سکتا تھا۔

”انکل پلینز۔ آپ لوگ بھی پریشان نہ ہوں۔ میں احمد کے ساتھ جا کر مارکیٹ سے کچھ لے آتی ہوں۔ بچے کو کپڑوں کی ضرورت ہے۔“

ساشا ان سب کو تسلی دیتی اور ان کی ہمت بندھاتی ہوئی اپنے چھوٹے بھائی احمد کو ساتھ لے کر قریبی مارکیٹ چلی گئی تھی۔



وہ اس کے ماتھے پر پٹیاں بھگو کر رکھ رہی تھی، جب بے حد آہستہ سے اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تھا۔
 پہلی نظر اور ایسے ہی بڑی تھی، لیکن ذہن اور حواس ٹھکانے پر نہیں تھے۔

اس لیے پہلی نظر کے بعد دوسری اور پھر تیسری نظر بھی اٹھی تھی، لیکن تب بھی وہ یوں ہی بے حس و حرکت اسے دیکھ رہا تھا۔

اور ماورا اس کی یہ بے حس کی کیفیت دیکھی نہیں گئی تھی اس نے بے اختیار اس کے گال پہ ہاتھ رکھا تھا۔

”تیور۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا۔“ اس نے تیمور کا گال تھپکا تھا۔

اور وہ جیسے غنودگی سے جاگ گیا تھا۔

”تت تم۔۔۔ تم پھر یہاں۔۔۔؟“ وہ حواسوں میں لوٹ چکا تھا۔

”تو میں گئی کہاں تھی۔ میں تو آپ کے پاس ہی ہوں۔ بس آپ ہی مجھے چھوڑ کے بھاگ رہے ہیں۔“ ماورائے بڑے سکون سے جواب دیا تھا۔

”پلیز۔۔۔ چلی جاؤ یہاں سے۔“ تیمور نے اس کا ہاتھ اپنے ماتھے سے ہٹا دیا تھا۔

”تیور! ریلیکس۔۔۔ یہ کوئی ہسپتال نہیں کہ آپ یہاں وہی تماشا کری ایٹ کریں۔۔۔ یہ ڈاکٹر شاہ نواز کا گھر ہے۔ اور یہ ان کی سرانی ہے کہ وہ بغیر کسی جان پہچان کے بھی اتنی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔“ ماورا ذرا سختی سے بولی تھی۔

”مجھے کہاں کیا کرنا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔۔۔ تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جاسکتی ہو یہاں سے۔“ وہ اپنے سابقہ متفرانداز۔ میں بول رہا تھا۔

”آپ کو کہاں کیا کرنا ہے، یہی تو آپ نہیں جانتے۔“ ماورا آہری سانس خارج کرتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

اور تیمور اسے زہر آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کو تو خبر ہی نہیں کہ دنیا میں کیا کیا ہو رہا ہے؟“ کس کس کو آپ کی ضرورت ہے؟ اور کس کس کی آپ کو ضرورت ہے؟ آپ تو بستر سے لگ کر آزاد ہو گئے۔ کاش ایسی بیمار میں بھی ہو جاتی۔ دنیا سے غافل ٹینشن فری۔“

ماورا ایسٹ روم کی کھڑکی میں کھڑی یا ہر پھیلی سورج کی کرنوں کو دیکھتی تیمور حیدر کو کسی اور ہی طرح کے نشتر چھو رہی تھی۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ تیمور کا لہجہ تیکھا ہو گیا تھا۔

”میرے کہنے کو آپ سمجھتے ہی کب ہیں؟“ اس نے طنزیہ انداز سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

”میرا دماغ خراب مت کرو۔ چلی جاؤ یہاں سے۔“ تیمور غصہ ضبط کرتے ہوئے دبے لہجے میں بولا تھا۔

شائع ہو گئے ہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے، بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت مردانہ
نوبصورت چسپائی
مضبوط جلد
آفٹ پیپر

☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 250 روپے
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے
☆ محبت بیاں نہیں لبنی جدون قیمت: 250 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

253 2016

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور اس کی یہ بات سن کر اورا کا اپنا داغ خراب ہو گیا تھا وہ تو جیسے پھٹ ہی پڑی تھی۔
 ”کہاں چلی جاؤں۔ کیسے چلی جاؤں اور کیوں چلی جاؤں؟ میں آپ کی بیوی ہوں۔ آپ کی ملازمہ نہیں کہ آنے جانے کے لیے ڈرتی رہوں۔ میں جب چاہے آؤں گی۔ جب چاہے جاؤں گی۔ میری اپنی مرضی ہے۔ مجھے آپ کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ دھوکا ہمارے ساتھ ہوا تھا۔ فراڈ ہمارے ساتھ ہوا تھا۔ باپ میرا قتل ہوا تھا۔ ماں میری بدنام ہوئی تھی۔ گھر سے بے گھر ہو کر زندگی ہم نے گزاری۔ غصہ ہم کو ہونا چاہیے تھا۔ ناراض ہم کو ہونا چاہیے تھا۔ لیکن نہیں! الٹا غصہ بھی آپ کو ہے اور ناراض بھی آپ ہی ہیں۔ وافر۔ عجیب دیدی دلیری ہے۔ آپ تو رضا حیدر سے بھی چار ہاتھ آگے نکلے۔ میرا سہارا بننے کے بجائے مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ بے سائبان کر دیا۔ پلٹ کر

دیکھا تک نہیں۔ پوچھا تک نہیں۔ کہاں گئی محبت۔ ہونہ۔ جھوٹی محبت، دو سال محبت کے دعوے کرتے رہے۔ محبت کا دم بھرتے رہے اور جب محبت پہ آزمائش آئی تو ہمت ہی جواب دے گئی۔ کیا اس کو محبت کہتے ہیں؟ کیا یہ ہے محبت؟ ایسی ہوتی ہے محبت؟

نہیں مسٹر تیمور حیدر! محبت تو مجھے ہے۔ آپ سے۔ رضا حیدر کے بیٹے سے۔ جبکہ میں جانتی بھی ہوں کہ آپ میرے باپ کے قاتل کی اولاد ہیں۔ پھر بھی آپ سے محبت کر رہی ہوں، مجبور ہوں، خود کو روک نہیں سکتی۔ آپ کے بغیر رہ نہیں سکتی، کیونکہ محبت رہنے ہی نہیں دیتی، محبت ایسی ہی ہوتی ہے، منہ زور، اور من مانی کرنے والی۔ آپ جیسی نہیں ہوتی کہ جب کسی کی اصلیت کا پتا چلے تو محبت ختم ہو جائے۔ مجھے دیکھو، مجھے تو پہلے روز سے آپ کی اصلیت کا پتا تھا، پھر بھی خود کو روک نہیں پائی۔ کیونکہ میری محبت سچی ہے، مضبوط ہے، بالکل میرے جیسی، رضا حیدر سے نفرت تھی تو اس نفرت پہ آج بھی قائم ہوں۔ آپ سے محبت ہوئی ہے تو مرتے دم تک اسی محبت پہ قائم رہوں گی۔ آپ بے شک مجھے پاؤں کی ٹھوکروں سے پیچھے ہٹائیں۔

ماورا بولنے پہ آئی تو پھر بولتی چلی گئی تھی اور تیمور حیدر شدید سا بیٹھا سنتا رہ گیا تھا۔
 ماورا نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے آگے بڑھ کے ٹیبل پہ رکھا اپنا بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور دوبارہ تیمور کی طرف دیکھا۔

”میں اب چلتی ہوں۔ لی کل اور امی گھر پہ اکیلی ہیں۔ ان فیکٹ ان کو اب بھی خطرہ ہے۔ کیونکہ آپ کے والد محترم ان کی کڈنپنگ کے پروگرام اب بھی ترتیب دے رہے ہیں۔ اس لیے مجبوراً میں نے انہیں اپنے گھر شفٹ کر لیا ہے۔ ماکہ زندگی میں مجھے کوئی اور نقصان نہ اٹھانا پڑے۔“

اس نے جلنے سے پہلے تیمور کو یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھا تھا اور تیمور پہ اک نیا انکشاف ہوا تھا۔ یعنی رضا حیدر اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آرہے تھے۔

”اور ہاں۔۔۔ سب کی ضرورتوں سے ہٹ کے۔۔۔ سب سے زیادہ آپ کی بہن کو آپ کی ضرورت ہے۔ جو باپ اور بھائی کے ہوتے ہوئے بھی خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہے۔ باقی آپ خود سمجھ دار ہیں، میرے سمجھانے کی ضرورت نہیں! اللہ حافظ۔“

وہ جاتے جاتے اک گہری نظر اس پہ ڈال کر گیٹ روم سے باہر نکل گئی تھی اور تیمور دیکھتا رہ گیا تھا۔



فیصل آباد سے منہ زور حیم اور ان کی فیملی پہلی فلائٹ سے ہی پہنچ چکی تھی۔
 وہ سب فارہ کے لیے بے حد پریشان تھے۔ لیکن اللہ کا کرم تھا کہ فارہ کی جان بچ گئی تھی۔

”ڈونشوری سہ! آپ کی بیوی اور بچہ اب بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ ان سے مل سکتے ہیں۔“
 لیڈی ڈاکٹر فارہ کو کمرے میں منتقل کرنے کے بعد مسکراتے ہوئے آکر آفاق کے پاس رک گئی تھیں اور آفاق ان کے منہ سے ایسی خوشی کی خبر سن کر بے اختیار آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سمیت اسپتال کے فرش پہ ہی خدا کے حضور سجدے میں گر گیا تھا اور اس کا ایسا سجدہ شکر و کھ کے سب کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔
 ”مبارک ہو۔ بہت بہت مبارک ہو۔“ سب نے اشتیاق یزدانی اور ثمنہ یزدانی کو مبارکباد دی تھی۔
 ”آفاق بھائی۔ آپ کا سپوت۔“ ساشا نے آفاق کے سر اٹھاتے ہی اسے بچے کی طرف متوجہ کیا تھا۔
 اور آفاق نے انتہائی محبت سے اسے بانہوں میں اٹھا کر انتہائی نرمی سے اس کے ماتھے پہ بوسا دیا تھا اور ثمنہ یزدانی کی طرف دیکھا تھا جن کی آنکھیں اتنی خوشی کے باوجود بھی اداس لگ رہی تھیں۔

کیونکہ ان کے دل میں آفاق کی بیماری کا غم سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔
 ”ممی! یہ دیکھیں یہ ہے آپ کا انیق اللہ نے ہم کو دوبارہ سے انیق سے نوازا دیا ہے۔“
 آفاق نے کہتے ہوئے آگے بڑھ کے بچہ ثمنہ یزدانی کی گود میں ڈال دیا تھا اور بچے کے معصوم سے چہرے پہ نظر پڑتے ہی ثمنہ یزدانی کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔
 ”ہم اس کا نام انیق ہی رکھیں گے۔“ آفاق نے ماں کا غم دور کرنے کے لیے ان کی دلجوئی کرنے کی کوشش کی تھی۔
 ”نہیں! ہم اس کا کوئی اور نام رکھیں گے۔ جو اس کا اپنا نام ہوگا۔ اپنی قسمت کی طرح۔ کسی دوسرے کا نہیں۔“

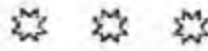
ثمنہ یزدانی نے انیق کا نام رکھنے سے انکار کر دیا تھا، کیوں کر وہ اب بہت وہمی ہو چکی تھیں، وہ گزری ہوئی باتوں کو گزرے ہوئے واقعات کو اور گزرے ہوئے ناموں کو دہرانا نہیں چاہتی تھیں۔
 ”لیکن ممی!“ آفاق نے کچھ کہنا چاہا تھا۔
 ”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ گزرے ہوئے رشتوں کے نام دہرانے سے وہ واپس نہیں آجاتے۔“ ثمنہ یزدانی کی اپنی ہی سوچ تھی اور وہ لوگ بھلا کیا کہہ سکتے تھے؟
 ”ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔ آپ خوش تو ہم خوش۔“ آفاق نے کندھے اچکائے تھے اور سب مسکرا دیے تھے۔

”اس کا نام ہوگا، انس۔ انس یزدانی۔“ ان لوگوں کے قریب ہی ماورا کی آواز ابھری تھی، ان سب نے بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔
 وہ تیمور کے پاس سے سیدھی یہاں آئی تھی، کیونکہ فارہ کے بارے میں آفاق نے ہی اسے فون پہ اطلاع دی تھی۔

”ارے واہ۔ نام تو بہت پیارا ہے۔“ اشتیاق یزدانی نے بے اختیار سراہا تھا۔
 ”کیا خیال ہے پھر۔؟“ ماورا نے آفاق کے ساتھ ساتھ باقی سب کو بھی سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔
 ”ارے خیال کس بات کا۔ بسم اللہ کرتے ہیں، نام یہی اچھا ہے۔“ بچے کے دادا کو یہ نام حقیقتاً ”بہت اچھا لگا تھا۔“

”تو پھر مبارک ہو آپ سب کو۔ اور انس کی والدہ محترمہ کہاں ہیں؟“ ماورا نے کہتے ہوئے فارہ کا ہاتھ چھوا تھا۔
 اور پھر جھک کر ثمنہ یزدانی کی گود سے بچے کو بھی اٹھا لیا تھا اور اسے پیار کرتے ہوئے دوبارہ آفاق کی طرف پلٹی

”فارہ سے مل سکتی ہوں کیا؟“ وہ اجازت طلب کر رہی تھی۔
 ”ارے کیوں نہیں۔ لیکن وہ ابھی مکمل ہوش میں نہیں ہے۔ آپ خود دیکھ لیں۔“
 آفاق اسے ساتھ لے کر فارہ کے پاس کمرے میں آگیا تھا۔



”تو گویا وہ لڑکی آپ سے بھی چار ہاتھ آگے نکلی۔“ مونس مرزا نے حفا اٹھانے والے انداز میں کہتے ہوئے رضا حیدر کو بغور دیکھا تھا، وہ یوں نیلے پیلے ہو رہے تھے جیسے انہیں کسی بہت زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہو۔
 ”لیکن اسے ہمارے پلان کی خبر ہوئی کیسے؟ آخر اس نے ان دونوں عورتوں کو راتوں رات اپنے پاس کیوں شقت کر لیا، وہ بھی اچانک۔“ رضا حیدر سوچ سوچ کر پاگل ہو رہے تھے۔
 ”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ وہ آپ سے بھی چار ہاتھ آگے نکلی۔“ مونس مرزا جان بوجھ کر رضا حیدر کا دل جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔
 ”مجھ سے چار ہاتھ آگے اس کا باپ نہیں ہو سکا تو وہ کیسے ہوگی؟“ رضا حیدر دبے لہجے میں کہتے ہوئے پھٹکارے

تھے۔
 ”آپ سے چار ہاتھ آگے تو وہ ہے ہی۔ آپ نے اس کے باپ سے سب کچھ ہتھ لیا اور وہ آپ سے سب کچھ ہتھ لے کر لے گئی۔ یعنی وہ آپ کی بھی باپ نکلی، ہا ہا ہا۔“
 مونس مرزا نے کہتے ہوئے ایک فلک شکاف قہقہہ لگایا تھا اور رضا حیدر کا دماغ جیسے پھٹنے کے قریب تھا، وہ بہ مشکل ضبط کر رہے تھے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ایک میں
اور ایک تم



تنزیلہ ریاض
قیمت - 350/- روپے

اُجالوں کی بستی



فاخرہ جبین
قیمت - 400/- روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میمونہ خورشید علی
قیمت - 350/- روپے

میرے خواب
لوٹا دو



نگہت عبداللہ
قیمت - 400/- روپے

فون نمبر:
32735021

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

منعمانہ
کا پتہ

مولس مرزا کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ اس کا سر ہی پھاڑ دیتے۔
 ”اے اپنی چالاکی کا اب اور زیادہ خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ وہ پچھتائے گی کہ اس نے فکر کس سے لی تھی؟“
 دانت پیس کر بولے تھے۔
 ”اچھا۔ تو اب کیا پلاننگ ہے؟“ اس نے دلچسپی سے پوچھا۔
 ”نہیں۔ ابھی نہیں۔ ابھی شکار کو دم لے لینے دو۔ اب جو بھی ہو گا، پورے سکون سے ہو گا۔“ رضا حیدر جیسے
 کچھ سوچ کر خباثت سے مسکرائے تھے اور مولس مرزا ان کے ذہن میں چلنے والے منصوبے سے بے خبر الجھن میں
 پڑ گیا تھا۔



دو ماہ اور دس دن بعد۔
 زندگی بے حد منتشر تھی۔ لیکن پھر بھی ایک معمول پہ چل رہی تھی۔
 ماورا اپنا کاروبار پوری طرح سے سنبھال چکی تھی۔ جبکہ تیمور بھی اپنا الگ سے کاروبار سیٹ کرنے کی کوشش
 میں تھا۔
 دونوں الگ الگ ڈگر پہ چل رہے تھے، لیکن دونوں کے دل و دماغ ایک ہی ڈوری سے بندھے ہوئے تھے اور
 دونوں ایک ہی طرح کی سوچوں کے دائرے میں چکراتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں کے دماغ پر ہمہ وقت
 عجیب طرح کا بوجھ رہتا تھا۔
 ماورا صبح آفس کے لیے گھر سے نکلتی تھی اور رات گئے تک آفس کے کاموں میں ہی الجھی رہتی تھی۔ آج بھی
 صبح سویرے ایسا ہی ہوا تھا، وہ آفس کے لیے لیٹ ہو رہی تھی، کیونکہ آج اس کی ایک اہم میٹنگ تھی، اس لیے وہ
 بڑی عجلت میں تیار ہو کر سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ جب اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا تھا اور
 بڑے زور سے چکر آیا تھا۔
 ”ارے بیٹا سنبھل کے۔“ نیچے کھڑی بی گل اس کو لڑکھڑاتے دیکھ کر گھبرا گئی تھیں۔
 ماورا نے بے ساختہ سیڑھیوں کی ریلنگ کا سہارا لیا تھا۔
 ”کیا ہوا ہے؟ تم ٹھیک تو ہو؟“ بی گل جیسے تیسے سیڑھیاں طے کرتی اوپر آگئی تھیں۔
 ”جی میں ٹھیک ہوں۔ بس جلدی میں چلتے ہوئے چکر آگیا۔“ ماورا ذرا سنبھلتے ہی دوبارہ سے سیڑھیاں اترنے
 لگی تھی۔

”ارے جا کہاں رہی ہو؟ ناشتا تو کر لو۔“ بی گل نے اسے کوریڈور کی طرف بڑھتے دیکھ کر پیچھے سے آواز دی
 تھی۔
 ”نہیں بی گل۔ ناشتے کے لیے ٹائم نہیں ہے۔ لیٹ ہو چکی ہوں۔ دس بجے میٹنگ ہے۔ میٹنگ کے بعد کچھ
 کھالوں گی، ڈونٹ ڈری۔“ وہ کہہ کر عجلت سے مرکزی دروازہ عبور کر گئی تھی اور بی گل وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی
 تھیں۔
 ”کیا ہوا۔ آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟ کیا سوچ رہی ہیں؟“ عافیہ بیگم ڈائنگ روم سے نکل کر ان کے پاس آ
 رہی تھیں۔
 ”سوچ رہی ہوں کہ ہماری ماورا کی شادی کو کتنے دن ہوئے ہیں؟“ بی گل پر سوچ سے لہجے میں کہتے ہوئے

ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی تھیں۔

”ارے بی گل۔ اس کی شادی کو دن نہیں، بلکہ تین مہینے ہوئے کو ہیں۔“ عافیہ بیگم لاہروائی سے بولی تھیں۔
”اور تم نے ایک ماں ہو کر بھی یہ غور نہیں کیا کہ بیٹی کی طبیعت بدل رہی ہے۔ چلتے چلتے چکرار ہی ہے۔“ بی گل نے ایک مبہم سا اشارہ دیا تھا اور عافیہ بیگم ٹھٹھک گئی تھیں۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”مطلب کو چھوڑو۔ وہ گھر آتی ہے تو اسے چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔ سب خود ہی پتا چل جائے گا۔“ بی گل کے اشاروں نے عافیہ بیگم کے دماغ میں بھی گھنٹی بجادی تھی۔
”ارے سچ۔“ ان کو خوشی ہوئی تھی۔

”ان شاء اللہ امید تو یہ ہی ہے۔“ بی گل نے دل کی گہرائیوں سے کہا تھا اور دونوں مسکرائی تھیں۔



بہت دن ہوئے تھے تیمور نے ایک گھر لیا تھا اور وہ رضا حیدر، رابعہ بیگم اور عزت کو اپنے پاس لے آیا تھا اور عزت اس قید خانے سے نکل کر خوش بھی تھی اور آزاد بھی۔ لیکن ولید کی طرف سے ٹینشن میں بھی تھی وہ اتنا عرصہ بات نہ ہونے نہ ناراض تھا۔ نہ فون ریسو کر رہا تھا نہ ایس ایم ایس کا جواب دے رہا تھا۔

اس لیے آج صبح عزت تیمور کے پاس جا پہنچی تھی۔

”خیریت؟ کہیں جانا ہے کیا؟“ وہ آفس کے لیے نکل رہا تھا عزت کو دیکھ کر رک گیا۔

”جی! وہ ولید کی امی کی طبیعت نہیں ٹھیک۔ مجھے ملنے کا کہہ رہی تھیں۔ اس لیے سوچا کہ ان سے مل آؤں۔“ عزت نے ولید کے گھر جانے کے لیے بڑے دھڑلے سے بہانا گھڑا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں ڈراپ کر دیتا ہوں، آجاؤ، لیٹ ہو رہا ہوں۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا تھا اور عزت بڑی شرارت سے مسکرائی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔

”بھابھی سے ملاقات ہوئی؟ گاڑی سڑک پہ آئی؟ عزت نے چھیڑنے کے سے انداز میں سوال کیا تھا۔
”کس کی بھابھی۔“ وہ انجان بنتے ہوئے بولا۔

”ارے بھئی ظاہر ہے میری بھابھی۔ ایک ہی تو بھائی ہے میرا۔ اور ایک ہی بھابھی ہے۔ اور کس کی بات ہوگی بھلا؟“ عزت بے حد خفگی سے بولی تھی۔

”مجھے کسی کی خبر نہیں۔ کون کیسا ہے؟ کہاں ہے؟ میری بلا سے۔ آئی ڈونٹ کیئر۔“ اس نے کندھے اچکائے تھے۔

”آئی ڈونٹ کیئر کہہ دینے سے تعلق اور احساس ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اندر بہت کچھ ہے جو آپ چھپا رہے ہیں۔“ عزت نے اسے خاصا گہرا جواب دیا تھا۔

اور تیمور نے سر جھٹکتے ہوئے گاڑی کو بریک لگا دیا تھا۔ عزت کا مطلوبہ اسٹاپ آچکا تھا۔

”اتنے بے زار کیوں ہو رہے ہیں؟“ عزت نے اسے پھر سے چھیڑا تھا۔

”عزت۔“ تیمور نے اسے خفگی سے گھورا۔

”ہا ہا ہا! مجھے لگتا ہے آج آپ بھابھی کو زیادہ مس کر رہے ہیں اور آج آپ کی بھابھی سے ملاقات بھی ضرور ہوگی، دیکھ لیجیے گا۔“ وہ کھلکھلاتی ہوئی کہہ کر گاڑی سے اتر گئی تھی اور تیمور خراب موڈ کے ساتھ گاڑی آگے بڑھالے گیا تھا۔

وحید کالج اور کٹوا سکول کے لیے جا چکے تھے۔

زبیرہ خاتون محلے میں کسی کی عیادت کے لیے جا رہی تھیں، جب دروازے میں ہی عزت سے سامنا ہو گیا تھا۔
 ”اے بیٹا، یہاں صبح صبح؟“ وہ اسے گلے لگا کر ملتے ہوئے بولیں۔
 ”جی۔ لیکن آپ تو شاید کہیں جا رہی ہیں اور ولید بھی گھر نہیں؟“
 عزت ان کے ہاتھ میں پکڑا تالا اور چابیوں کا پتھار دیکھ چکی تھی۔

”اے بیٹا! پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔ میں یہاں قریب میں ہی جا رہی ہوں، آجاتی ہوں تھوڑی دیر میں۔ تم یہ چابیاں اور تالا پکڑو اور اندر جاؤ۔ ولید اندر ہی ہے۔ صبح چار بجے آیا ہے کام سے۔ سو رہا ہے جگالو جا کر۔“

انہوں نے مسکراتے ہوئے کہہ کر چابیاں اور تالا عزت کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا اور خود گلی کے بائیں طرف مڑ گئی تھیں اور عزت گلی میں کھڑی کبھی تالے کو اور کبھی دروازے کو دیکھ رہی تھی اور بالآخر ولید کی موجودگی کا خیال آتے ہی وہ دروازہ دھکیل کر اندر آ گئی تھی۔

دونوں کمروں کے دروازے بند تھے۔ کچن بھی بند تھا جس کی وجہ سے پورا گھر خالی خالی لگ رہا تھا۔ عزت کو عجیب تو لگا، لیکن پھر ایک خیال اس کے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا تھا۔
 (یہ گھر اجنبی اور پرانا نہیں۔ بلکہ یہ گھر میرا اپنا ہے۔ میں اسے ہی گھر سے گھبرا رہی ہوں؟)
 یہ خیال اس کی گھبراہٹ اڑالے گیا تھا اور اس کی چال میں آگ استحقاق سا بھر گیا تھا اور وہ اسی استحقاق سے چلتی ولید کے کمرے کا دروازہ کھول کے اندر آ گئی تھی۔

ولید اتنی ٹھنڈ کے باوجود ————— بنیان پنے بستر پہ اوندھا لیٹا بے سدھ سو رہا تھا۔

”اے! وہ تو موصوف نے ابھی ناشتا کرنا ہے، تیار ہونا ہے اور کام پہ بھی جانا ہے؟“ وہ دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”تو تب تک میں کیا کروں؟“ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ذہن میں اک شرارت آن سمائی تھی۔ اس نے بڑی سہولت سے اپنے بیگ سے سیل فون نکالا اور کیمرو آن کر لیا تھا۔

جتنا بے ترتیب وہ خود ہو رہا تھا اتنا ہی بے ترتیب اس کا بستر بھی تھا۔ کبل آدھا اس کی پشت پہ تھا اور آدھا بستر سے نیچے پاؤں کبل سے باہر تھے۔ عزت اس کی نیند میں اس کا حلیہ دیکھ کر دبے دبے انداز میں مسکرا رہی تھی اور ساتھ ساتھ اس کی ویڈیو بھی بنا رہی تھی۔

پھر ویڈیو کے بعد اس نے تصویریں بنائیں اور کمرے کی آواز سے ولید کی نیند میں خلل پڑا تھا۔ ایک کے بعد ایک۔ ایک دم ولید کی آنکھ کھل گئی تھی اس نے فوراً ”ہڑ پڑا کرو۔“ کھاتھا۔
 ”عزت!؟ وہ تو جیسے حق دق رہ گیا تھا اور عزت کی ایک دم ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ وہ ہنستے ہنستے بھی اس کی تصویریں بناتے جا رہی تھی۔

”بند کرو اسے۔“ وہ اونچی آواز سے چیخا۔
 ”نہیں۔“ وہ نہیں مانی۔

”چھوڑو گا نہیں۔ خیر منالوانی۔“ بالآخر وہ کبل پرے ہٹا کر چھلانگ لگا کر نیچے اترا اور کمرے سمیت عزت کو اپنے حصار میں لے لیا تھا، لیکن وہ پھر بھی کھلکھلائے جا رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

اس رائیگانی میں،

سو وہ آنسو ہمارے آخری آنسو تھے
جو ہم نے گلے مل کر بہائے تھے
نہ جانے وقت ان آنکھوں سے پھر کس طوف
پیش آیا

مگر میری فریبِ وقت کی بہکی ہوئی آنکھوں نے
اُس کے بعد بھی
آنسو بہائے ہیں
مرے دل نے بہت سے دکھ چھپائے

ہیں
مگر یوں ہے کہ ماہ و سال کی اس
رائیگانی میں
میری آنکھیں

گلے ملتے ہوئے رشتوں کی فرقت کے وہ آنسو
پھر نہ رو پائیں

جون ایلیا

حدیثِ کامل و رخسار ہم بھی رکھتے ہیں
کوئی سنے تو غم یار ہم بھی رکھتے ہیں
ہمیں بھی شہر نگاراں میں لے جاو یارو
کسی کے عشق کا آزار ہم بھی رکھتے ہیں

غم جہاں کے تقاضے شدید ہیں ورنہ
جنون کو چہ دل وار ہم بھی رکھتے ہیں
جنونِ عشق ہی راحت طلب نہیں ورنہ
جلو میں سایہ دیوار ہم بھی رکھتے ہیں

یہ اور بات کہ تقدیر سو گئی قابل
وگرہ دیدہ بیدار ہم بھی رکھتے ہیں
قابلِ اجیری

اپنے احساس سے چھو کر مجھے صندل کر دو
میں کہ صدیوں سے ادھورا ہوں مکمل کر دو

ایسے تنہا گھر میں کیوں کر جائیے
اپنے سائے سے جہاں ڈر جائیے

نہ تمہیں ہوش رہے اور نہ مجھے ہوش رہے
اس قدر ٹوٹ کر چاہو مجھے پاگل کر دو

وہ نہیں تو کون دیکھے گا ہمیں
شہر میں کیوں بن سنور کر جائیے

تم ہتھیلی کو میرے پیار کی مہندی سے رنگو
اپنی آنکھوں میں میرے نام کا کاجل کر دو

ڈھونڈ ہی لیں گی ہمیں ویرانیاں
شہر میں رہیے کہ اب گھر جائیے

اس کے سائے میں میرے خواب دہک اٹھیں گے
میرے چہرے پہ چمکتا ہوا آنچل کر دو

دل کی خاطر زندہ رہے کب تک
دل ہی کہتا ہے کہ اب مرنے جائیے

دھوپ ہی دھوپ ہوں میں ٹوٹ کر برسوں مجھ پر
اس قدر برسوں میری روح میں جل تھل کر دو

کل ہم ہی، میرے تھے سارے شہر میں
اب ہم ہی ٹھہرے ہیں پتھر بن جائیے

جیسے صحراؤں میں ہر شام ہوا چلتی ہے
اس طرح مجھ میں چلو اور مجھے تھل کر دو

سب وفا نا آشنا دل کے بغیر
ملنے سب کی کہ دل پر جائیے

مجھ پر چھا جاؤ کسی آگ کی صورت جاناں
اور میری ذات کو سوکھا ہوا جنگل کر دو
وہی شاہ

محسن نقوی

سنگ کی سنگساری

ادب

کہ اس کے سنگ کیوں نہیں ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ گائے نہیں گھوڑا ہے۔

ساجدہ افتخار، کراچی

بے چارگی

ایک شخص نے اپنے بیٹے کو اتنا پیٹا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ دوست کو معلوم ہوا تو سرزنش کرنے پہنچا اور بیٹے کو پینے کی وجہ پوچھی ”وہ نشے میں تھا“ اس نے کہا۔

دوست نے کہا ”اگر وہ نشے میں تھا تو اسے ذرا سی سزا دیتے ایسے اندھا دھند کیوں پیٹا؟“ ”میں بھی نشے میں تھا۔“ اس شخص نے بے چارگی سے جواب دیا۔

عائشہ رباب، کراچی

ستم ظریفی

دو ساتی نوجوان نے کچھ پیسے کمالیے تو پاپ کو گھمانے شہر بلایا۔ دن بھر خوب سیر کرانے کے بعد پاپ کو مزید متاثر کرنے کے لیے کرائے کے اپنے چھوٹے اور معمولی کمرے میں ٹھہرانے کے بجائے ایک شاندار ہوٹل میں ٹھہرانے کا بندوبست کیا۔ ہوٹل کے ہر کمرے کے ساتھ ایک عمدہ المیچ باتھ بھی تھا۔

صبح بیٹا پاپ سے ملنے ہوٹل پہنچا تو داد و طلب لہجے میں بولا ”کرا کیسا ہے اباجی! رات تو آرام سے گزری نا۔“

”کرا تو بہت اچھا ہے پر خوردار! بستر بھی اچھا ہے۔ لیکن ایک بڑی مشکل تھی۔ غسل خانے کا راستہ میرے کمرے سے ہو کر گزرتا تھا۔ میں بس اس خیال سے ساری رات جاگتا رہا کہ کہیں دوسرے مسافر کو

بچے ہمارے دور کے

ماں نے بیٹے سے پوچھا ”ٹیپو سلطان کون ہے؟“ ”پتا نہیں۔“ بیٹے نے جواب دیا۔

ماں غصے سے بولی ”پر دھائی پر دھیان دو۔“

پھر بیٹے نے پوچھا۔ ”ماما؟ یہ نوٹسین آئی کون ہیں؟“

”پتا نہیں“ ماں نے جواب دیا۔

بیٹے نے کہا ”ماما! پاپا پر دھیان دوں“

عظمیٰ شفیق۔ جڑانوالہ

دوسری گولی

ایک آدمی پر بیوی کو گولی مارنے کے جرم میں مقدمہ چلا۔ جج نے پوچھا۔ ”تم نے اپنی بیوی کو گولی کیوں ماری؟“

شوہر نے کہا۔ ”جی! میں نشانہ کہیں اور لگا رہا تھا کہ بیوی خود میرے سامنے آگئی۔“

جج نے کہا۔ ”چلو مانا کہ وہ خود تمہارے پستول کے سامنے آگئی، لیکن تم نے دوسری گولی کیوں چلائی۔“ ”اس لیے کہ وہ پہلی گولی سے مری نہیں تھی۔“ جواب ملا۔

وجہ

ایک سیاح کسی گاؤں میں گیا۔ وہاں اس نے ایک کسان سے پوچھا ”یہ سامنے جو گائے نظر آ رہی ہے اس کے سنگ کیوں نہیں ہیں؟“

کسان نے جواب دیا ”سنگ نہ ہونے کے کئی اسباب ہیں۔ بعض کے سنگ ہوتے ہی نہیں ہیں، بعض کے لڑنے بھڑنے میں ٹوٹ جاتے ہیں، بعض کے ہم خود کٹ دیتے ہیں۔ رہی بات سامنے والی گائے کی

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار جہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

”دراصل ضمیر صاحب کی بیگم ایک ماہ سے میکے گئی ہوئی تھیں اور ضمیر صاحب نے دو چار دن پہلے انہیں فون پر بتایا تھا کہ وہ روز رات کو کتابیں پڑھ کر وقت گزار رہے ہیں۔“ پڑوسی نے جواب دیا۔
(نور احمد شیخ۔ کراچی)

ڈراما

کسی جگہ کشتی ہو رہی تھی۔ دونوں پہلوان بہت تھکے ہوئے تھے یا لوگوں کو دھوکا دے رہے تھے۔ ان کی کشتی سے اکتا کر ایک صاحب نے بہت زیادہ بوریٹ محسوس کی۔ وہ چیخ کر کہنے لگے۔ ”بتیاں بچاؤ“ بجلی فضول خرچ ہو رہی ہے، یہ دونوں پہلوان ڈراما کر رہے ہیں۔“
دوسرے کونے سے آواز آئی۔ ”نہیں، نہیں! ابھی بتیاں مت بچھانا، میرا ٹول ابھی ختم نہیں ہوا۔“
ناہید امید علی۔ کراچی

قتل

حوالدار نے تھانیدار کو فون کیا۔ ”جناب عالی! ادھر ہمارے علاقے میں قتل کا جرم ہوا ہے۔ ایک عورت نے اپنے خاوند کو ”سیلن“ مار کر قتل کر دیا ہے۔“
تھانیدار ”کیوں کیا وجہ تھی؟“
حوالدار ”جناب عالی، ملزمہ نے فرش کو تانہ تانہ صاف کیا تھا اور فرش ابھی گیلیا تھا کہ اس کا خاوند جوتوں سمیت کچن کے اندر آ گیا۔“
تھانیدار ”مجرمہ کو گرفتار کر لیا ہے؟“
حوالدار ”نہیں، جناب وہ ابھی تک کچن میں ہے، ابھی ہم نے اس کو گرفتار نہیں کیا۔“
تھانیدار ”وہ کیوں؟“
حوالدار ”جناب ہم انتظار کر رہے ہیں کہ پہلے کچن کا فرش خشک ہو جائے۔“
(اربابہ سیف۔ لطیف آباد)

حاجت ہو یا اس کا نہانے کا ارادہ ہو تو وہ آکر میرے کمرے کا دروازہ بجا دے گا۔“
مرسلہ عائشہ شزاوی۔ بھاولنگر
کنجوس

ایک آدمی نے اپنے کنجوس دوست سے کہا۔
”تمہاری کار جو چوری ہو گئی میں نے فلاں گیراج میں دیکھی ہے۔“
”وہ تو میں نے بھی دیکھی ہے۔“
”تو پھر پولیس کو بتایا کیوں نہیں؟“
”میں چاہتا تھا کہ اس کا جو ٹائرناکارہ ہے۔“
”وہ تبدیل کر دیا جائے تب پولیس کو اطلاع دوں گا۔“

انسر عباسی، تحصیل ہری پور

پسند کی شادی

بیٹا! ”امی کیا پسند کی شادی کرنے سے گھر والے ناراض ہوتے ہیں؟“
”تو یقیناً“ کسی چیز کے چکر میں ہو گا اور یہ سب تجھے اسی ڈائن نے کہا ہو گا ایسی لڑکیاں تو بس لڑکوں کو پھنسانے میں لگی رہتی ہیں بیٹا! ایسی لڑکیوں سے بچ کر رہنا یہ بہت مکار گھنٹی اور محسنی ہوتی ہیں اور ان کا خاندان بھی۔“
بیٹا ”امی! بس کریں ایسا کچھ نہیں ہے، وہ تو مجھے ابو بتا رہے تھے کہ آپ دونوں کی پسند کی شادی تھی۔“

جواز

”کیا ضمیر صاحب کی طبیعت ٹھیک ہے؟“
ایک شخص نے تشویش زدہ لہجے میں اپنے پڑوسی سے پوچھا۔ ”ان کے گھر کی لائٹیں آج کل دن میں بھی جلی رہتی ہیں۔“
”دراصل وہ کوشش کر رہے ہیں کہ ان کا اس ماہ کا بجلی کا بل زیادہ آئے۔“ پڑوسی نے بتایا۔
”وہ کیوں؟“ ان صاحب نے حیرت سے پوچھا۔



شکستہ جہ اولیٰ حضرت علی

اس نے جواب دیا: مجھے نہیں معلوم۔
یہ جواب سن کر حضرت آدمؑ نے ارشاد فرمایا۔
”جس خطہ زمین نے ہابیل کا خون پیسا ہے، حق تعالیٰ
اس پر لعنت فرمائے۔“
چنانچہ اسی وقت سے زمین نے خون پینا چھوڑ دیا۔

اس کے بعد حضرت آدمؑ سو سال تک حیات رہے
مگر مرتے دم تک سسک لے رہے تھے۔
مقابل کا بیان ہے کہ اس خون دہریزی سے پہلے
پرندے اور وحشی جانور بھی آدمؑ سے بہت مالتوس
تھے مگر جب قاذیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تو پرندے
اور وحشی سب انسانوں کے پاس سے بھاگ گئے۔
درختوں پر کانٹے آگئے۔ بہت سے پھل اور میوے
کھٹے ہو گئے اور سمندروں کا پانی کھاری ہو گیا اور زمین
گرد آلود ہو گئی۔

مسلمان اور یہودی،

ایک شہر میں دو آدمی بستر مرگ پر تھے اور
مرنے کے قریب تھے۔ ایک مسلمان تھا اور دوسرا
یہودی۔ اس یہودی کے دل میں پھلی کھانے کی خواہش
پیدا ہوئی تو حق تعالیٰ نے دو فرشتوں کو بلا دیا۔
ایک فرشتے سے کہا کہ یہودی کے لیے پھلی کا انتظام
کرو۔

دوسرے فرشتے سے کہا: ”مسلمان کو روغن کھانے
کی خواہش ہے اور روغن اس کی الماری میں موجود ہے۔
اس کو ضائع کر دو۔“

اچانک ان فرشتوں کی آپس میں ملاقات ہو گئی
اور اپنے امدادوں کے اظہار میں ان کو یہ متضاد حکم
سننے پر حیرت ہوئی لیکن اللہ کا حکم تھا۔ انہوں نے
پورا کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے۔
”اگر تم لوگوں کے عیبوں کو تلاش کرو گے تو ان کو بگاڑ
دو گے۔“
(ابوداؤد)

فائدہ:-

مطلب:- ہے لوگوں میں عیبوں کو تلاش کرنے
سے ان میں نفرت، بغض اور بہت سی برائیاں پیدا
ہوں گی اور ممکن ہے کہ لوگوں کے عیوب تلاش کرنے
اور انہیں پھیلانے سے وہ لوگ ضد میں گنا ہوں پر
جرات کرنے لگیں گے۔ یہ ساری باتیں ان میں مزید بگاڑ
کا سبب ہوں گی۔

قتل ناحق کی نحوست،

علامہ دیرریؒ فرماتے ہیں:-

”جب حضرت آدمؑ علیہ السلام کے بیٹے قاذیل
نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا تو حق تعالیٰ نے اس
کے پاس ایک کونے کو بھیجا تاکہ اس کو اپنے بھائی کی
تدفین کا طریقہ سکھائے۔“

قاذیل کاشت کاری کرتا تھا۔ اس نے قربانی میں
ایسی چیز پیش کی جو اس کے یہاں کم قیمت کی تھی۔ ہابیل
کے یہاں بھیر اور بکریاں تھیں۔ اس نے ان میں سے
ایک نہایت عمدہ جانور جھانٹ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ
میں پیش کیا۔ چونکہ ہابیل کی نیت اچھی تھی اس لیے
اس کی قربانی بارگاہ الہی میں مقبول ہوئی۔

حضرت آدمؑ علیہ السلام کی اولاد میں قاذیل بڑا
تھا۔ جب حضرت آدمؑ حج کرنے گئے تو قاذیل کو اپنے
لڑکوں پر نگران بنائے تھے۔ جب حج سے واپس آئے
تو آپ نے قاذیل سے پوچھا کہ ہابیل کہاں ہے؟

قد غلے پہنچ گئے اور اس ضعیف اور ناقص انسان سے پوچھا۔

”اس قدر کمزوری اور نفاہت کے باوجود تم نے سپاہیوں کے تشدد پر کس طرح صبر کیا؟“
 بوڑھے شخص نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
 ”میرا تعلق جسمانی طاقت سے نہیں، انسانی ہمت و شجاعت سے ہے۔“

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کو اس شخص کے جواب پر حیرت ہوئی، پھر آپ نے دوسرا سوال کیا۔
 ”تمہارے نزدیک صبر کا کیا مفہوم ہے؟“
 ضعیف و ناقص شخص نے کہا: ”آفات و مصائب کو اسی طرح خوشی کے ساتھ برداشت کرنا چاہیے جس

طرح لوگ مصائب سے نجات پا کر مسرور و مطمئن ہوتے ہیں۔“

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ آپ کو حیران پا کر بوڑھے نے کہا۔
 ”آگ کے سات سمندر یاد کرتے کے بعد انسان کو معرفت حاصل ہوتی ہے اور جب حاصل ہو جاتی ہے تو پھر اسے اقل و آخر کا علم بھی حاصل ہو جاتا ہے۔“
 بے شک اس کے چاہنے والے عجیب عجیب حالات میں رہتے ہیں کہ انہیں کوئی نہیں پہچان سکتا۔“
 حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے بوڑھے شخص کا شکریہ ادا کیا اور قید خانے سے چلے گئے۔

دن بدلنے میں دیر نہیں لگتی،

امام ابن جوزی علیہ الرحمۃ نے اپنی مشہور تصنیف ”کتاب العبر“ میں ایک نہایت ہی سبق آموز واقعہ بیان کیا ہے۔

”اصفہان کا ایک بہت بڑا رئیس اپنی بیگم کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا ہوا تھا۔ دسترخوان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک نقیر نے یہ صدا گائی کہ اللہ کے نام پر کچھ کھانے کے لیے دے دو۔ اس شخص نے اپنی بیوی کو حکم دیا کہ سالار دسترخوان اس نقیر کی بھولی میں ڈال دو۔ عورت نے حکم کی تعمیل کی۔ جس وقت اس نے نقیر کا چہرہ دیکھا تو وہ حائل میں

جب واپس آئے تو دونوں نے خدائے تعالیٰ سے وجہ دریافت کی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا۔
 ”یہودی نے ایک نیک کام کیا تھا۔ ہم نے دنیا میں ہی اس کا بدلہ اس کو دے دیا جبکہ مسلمان کا ایک گناہ تھا جس کو ہم ختم کرنا چاہ رہے تھے اس وجہ سے اس کی خواہش پوری نہ کی۔“
 نمرہ، اقرار۔ کراچی

علم،

نئی بنیادیں، وہی لوگ بھر سکتے ہیں جو اس راز سے واقف ہوں کہ پرانی بنیادیں کیوں بیٹھ گئی ہیں۔
 خلیل جبران

صبر،

ایک بار حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ راستے سے گزر رہے تھے کہ آپ نے چند سپاہیوں کو دیکھا جو ایک ضعیف و ناقص انسان کو زد و کوب کرتے ہوئے لے جا رہے تھے مگر وہ بوڑھا شخص انتہائی صبر و ضبط کے ساتھ سپاہیوں کی مار کھا رہا تھا اور میرے آف تک نہیں کرتا تھا۔ حضرت شیخ نوریؒ کو اس شخص کی قوت برداشت پر حیرت ہوئی، آخر آپ نے سپاہیوں سے پوچھا۔

”تم اس شخص کو کہاں لے جا رہے ہو؟“
 ”ہم اسے زندان کے حوالے کرتے جا رہے ہیں۔“
 سپاہیوں نے کہا اور دوبارہ اس بوڑھے شخص کو بیٹنا شروع کر دیا۔

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ خاموشی سے یہ تکلیف دہ مناظر دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ ضعیف انسان اور سپاہی نظروں سے اڑ چلے۔ پھر آگے بڑھ کر آپ نے آخر تک اس ضعیف انسان کے منہ سے کوئی چیخ یا شکایت نہیں سنی۔

وہ رات شیخ ابوالحسن نوریؒ نے بڑے اضطراب کے عالم میں گزاری۔ بار بار آپ کو سپاہیوں کے تشدد اور اس بوڑھے شخص کی خاموشی کا خیال آتا تھا۔ آخر حضرت شیخ نوریؒ سے برداشت نہ ہو سکا تو آپ

تب حقیقت میں تم نہ دیکھتے ہو اور نہ ہی سنتے ہو۔
(خلیل جبران)
آمنہ نوید

اخلاقی جواب پارے،

- ۱۔ وقت، ہو اور دولت ہمیشہ بدلے رہتے ہیں۔
- ۲۔ جو لوگ کچھ کام نہیں کرتے، وہ سب سے زیادہ مصروف ہوتے ہیں۔
- ۳۔ جو حقوڑا جانتا ہے وہ جلد کہہ دیتا ہے۔
- ۴۔ زندگی کا ہر دن تمہاری تاریخ کا ورق ہے۔
نادید، بخمدہ۔ گلستان جوہر

مطلب،

پوپ کے سامنے ایک پریشان حال فریاد لے کر پہنچا اور فریاد اسی بات لکھا پھر اگر بہت دیر تک بیان کرتا رہا۔ پوپ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے زیادہ بولنے سے روکتے ہوئے کہا۔
وہ بول نہیں اختیار ہے جتنا چاہو بولو، لیکن یہ نکتہ ضرور یاد رکھو کہ الفاظ بولنے کی طرح ہوتے ہیں جہاں ان کی کثرت ہوگی ان کے نیچے مگر مطلب اٹھنے ہی کم ہوتا ہے۔
صائمہ جمی۔ کراچی

مصیبت زدگان،

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے موسیٰ بن میران کو ان کے انتقال کے بعد خواب میں دیکھا اور ان سے اللہ تعالیٰ کے سلوک کے بارے میں سوال کیا۔ انہوں نے جواب دیا۔
”جب سے مرا ہوں، امراد کی ضیافتوں کا حساب ملے رہا ہوں اور ایک سوئی کے بدلے قید ہوں جو میں نے مستعار لی تھی اور واپس نہیں کی تھی۔“

پھر میں نے دریافت کیا۔

”کون سی قبروں میں زیادہ روشنی ہے؟“
آپ نے فرمایا: ”دنیا میں مصیبت زدگان کی قبروں میں اتنی روشنی ہے۔“
اسیہ جاوید۔ (بارہ دی) علی پور چھٹ

مادہ کر دینے لگی۔ اس کے شوہر نے اس سے پوچھا۔
”جی بیگم! آپ کو ہوا کیا؟“

اس نے بتایا: ”جو شخص فقیہ بن کر ہمارے گھر پر دستک دے رہا تھا، وہ چند سال پہلے اس شہر کا سب سے مال دار، ہماری اس کوٹھی کا مالک اور میرا سابقہ شوہر تھا۔ چند سال پہلے کی بات ہے کہ ہم دونوں دسترخوان پر ایسے ہی بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔ جیسا کہ آج کھا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک فقیہ نے صدا لگائی کہ میں دو دن کا بھوکا ہوں۔ اللہ کے نام پر کھانا دے دو۔ یہ شخص دسترخوان سے اٹھا اور اس فقیہ کی اتنی بیانی کی کہ اسے ہوا لہان کر دیا۔ نہ جلنے اس فقیہ نے کیا بددعا دی کہ اس کے حالات دگرگوں

ہو گئے، کاروبار ٹھپ ہو گیا اور وہ شخص فقیہ و قلاش ہو گیا۔ اس نے مجھے بھی طلاق دے دی۔ اس کے چند سال گزرنے کے بعد میں آپ کی زوجیت میں آئی تھی۔“

شوہر بیوی کی باتیں سن کر کہنے لگا۔
”بیگم! کیا میں آپ کو اس سے زیادہ تعجب خیز بات نہ بتاؤں؟“

اس نے کہا: ”ضرور بتائیں۔“
کہنے لگا: ”جس فقیہ کی آپ کے سابق شوہر نے بیانی کی تھی وہ کوئی دوسرا نہیں، بلکہ میں ہی تھا۔“
(کتاب العصر)

گردش زمانہ کا ایک عجیب نظارہ یہ تھا کہ حق تعالیٰ نے اس بدست مالدار کی ہر چیز مال، کوٹھی حتیٰ کہ بیوی بھی چین کر اس شخص کو دے دی جو فقیہ بن کر اس کے گھر آیا تھا اور چند سال بعد پھر رب تعالیٰ اس شخص کو فقیہ بنا کر اسی کے در پر لے آیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ تاریخ ایسے عبرت آموز واقعات سے بھری پڑی ہے۔ شرط یہ ہے کہ انسان اس سے جہت پکڑے۔

غزوہ اقل۔ کراچی

پس پردہ،

اگر تم محض وہی کچھ دیکھ سکو جو کچھ روشنی ظاہر کرتی ہے اور محض وہی کچھ سن سکو جس کا اعلان آواز کرتی ہے

خواتین اور وہ شہزادوں کیلئے اپنی طرز کا پہلا نامہ

خواتین ڈائجسٹ

دسمبر 2016ء
کے شمارے کی ایک جھلک



- "آب حیات" عمیرہ احمد کے ناول کی آخری قسط، ● نجم سیٹھی کی دختر نیک اختر "میرا سٹھی" سے باتیں،
- "محبت، خواب، جزیرہ" عمیرہ سید کے ناول ● سچی وی کے ہنر "ارسلان کھوکھر" سے ملاقات،
- "حرف سادہ کو عنایت ہوا اعجاز کا رنگ" ● کی دوسری اور آخری قسط،
- فاطمہ عسکری اور صائمہ شاہد کے ناول، ● "کرن کرن روشنی" احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- عندلیب ذہرا، شازیہ الطاف ہاشمی، شائندہ العباد، ● نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے اور دیگر
- قرۃ العین سکندر اور عبرین اعجاز کے افسانے، ● مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا دسمبر 2016 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM 269 دسمبر 2016

خالد خالص کی سیرت کا مطالعہ

ذو بار یہ خالد
سفر زیست میں چلتے چلتے کہیں کہیں یوں بھی ہوتا ہے
بے کھاشا پہنے والے بے وجہ چھوڑ جاتے ہیں
فائزہ بھی

وہ ختم قید کی میعاد بھی نہیں کرتا
اور میں زحمت فریاد بھی نہیں کرتا
بعض دفعہ وہ مجھے اتنا یاد آتا ہے خواجہ
میں ضد میں آکر اسے یاد بھی نہیں کرتا

گر یا شاہ
ہم بھی ہیں ایک اجڑے ہوئے شہر کی مثال
آنکھیں بتا رہی ہیں کہ دیران تم بھی ہو
سیدہ نسبت زہرا

مسکراتی ہوئی آنکھوں والے
لوٹ پٹے ہیں خزانے دل کے
ہم نے کب اسے نہ چاہا محسن
ہم نے کب قول نہ مانے دل کے
مدف عمران

ہم نے چپ چاپ ہار مانی تھی
تم نے تو شور مچا دیا لوگو
ہم نے اک روز ٹوٹ آنا تھا
کوئی تو راہ دیکھتا لوگو

آمنہ نوید
فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہونگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے
بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے ناامیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

گیلائی سسرز
میں بتاؤں فرق واضح جو ہے مجھ میں اور تجھ میں
مری زندگی تلاطم، تیسری زندگی کنار
کوئی اے شکیل! اُدیکھے جنوں نہیں تو کیا ہے
کہ اسی کے ہو گئے ہم جو نہ ہو سکا ہمارا

نسیم کوثر
وہ دنیا تھی جہاں تم روک لیتے تھے زباں میری
یہ محشر ہے یہاں سنا بٹھے گی داستاں میری
عاصمہ، غم و جہد

یہ لوگ نہ گھرے کرتے ہیں اپنے لوگوں سے
میں کیسے بات کروں اور کہاں سے لاؤں اسے

عبدالناصر
آج کل کے سبب اُداس ہے جی
عقل ہوتا تو کوئی مات بھی تھی

سیدہ نسبت زہرا
جہنم زندگی کا شور تھا انہیں بے زدی نے بجھا دیا
جو گراں تھے سیدہ خاک پر تو ہی بن کے بیٹھے ہیں معتبر

سیدہ نسبت زہرا
صدائیں ڈوب جاتی ہیں ہوا کے شور میں اور میں
گلی کوچوں میں تنہا بیچتا رہتا ہوں بارش میں
نہ سونا مرے بس میں ہے نہ شب بھر جاگنا خالد
میں آنکھیں کھولتا اور میچتا رہتا ہوں بارش میں

ناہید شہیرانا
ابھی تو پاؤں کے نیچے زمین معلوم ہوتی ہے
جہاں پہ ختم ہوگی، وہیں پر گھر بنالیں گے
بہی ہے ناں تمہیں ہم سے پھر جانے کی جلدی ہے
کبھی ملنا تمہارے مسئلے کا حل نکالیں گے

شائستہ اکبر
کون تھا جس کی آہوں کے غم میں ہوا سر دھتی شہر کی
کس کی دیران آنکھوں کا لے کر لاڑ، چاند خاموش تھا

گدو کالونی

تمینہ رؤف۔ بنوں

کمرے کے بعد پھر ادھر ادھر کے کام ہوتے ہیں۔ اور ہاں اس کے ساتھ ساتھ شعلے پڑھنا نہیں بھولتی نیا اور پرانا دونوں دوپہر کا کھانا دن ساڑھے بارہ اور ایک بجے تک ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر لکھنے بیٹھ جاتی ہوں۔ مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے، ہم چونکہ جوائنٹ فیملی سسٹم سے ہیں۔ تو رات تک باقی بچاؤں کے گھر آنا جانا لگا رہتا ہے۔ (گھر سب کے الگ ہیں ساتھ دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہے) ہمارے خاندان میں شادیاں بہت مزے کی ہوتی ہے۔ جب اتنی ساری شادی شدہ بہنوں اور کزن کا جم غفیر اکٹھا ہوتا ہے تو پھر شادی کا مزہ دوباہا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نو دس کزنز اتنی پھپھویاں اور خالائیں ان کے جوان بچے جو کے سب آپس میں دوست ہے ”صرف لڑکیاں“ ایک خوشی کا سماں بن جاتا ہے۔ امتحان چونکہ پرائیوٹ دے رہی ہوں۔ اس لیے سارا دن گھر میں اماں اور جب بہنیں سسرال سے آتی ہیں تو ان کے کان کھاتی رہتی ہوں۔ رات سونے سے پہلے ٹی وی دیکھتی ہوں اور اگر بڑھنے کو کوئی کتاب ہو تو وہ ضرور پڑھتی ہوں۔

3۔ عجیب لڑکی ہوں روز کسی نہ کسی طرح سے بدلتی رہتی ہوں۔ اس لیے خود کو روز گزرے کل سے مختلف پاتی ہوں۔ ساتھ رضا کے ناول (اب کر میری رفوگری) کی تاہاں مجاہد میں مجھے اپنی جھلک نظر آئی صرف عاداتوں، میزاج اور باتوں کی حد تک حساس بہت ہوں۔ پسندیدہ تحریریں ساتھ رضا کی ”اب کر میری رفوگری“ ”نمو احمد کا“ ”جنت کے“ ”تگت سیما کا“ ”زمین کے آنسو“ ”فائزہ افتخار“ ”کچی سنڈریلا“ اور سمیرا حمید کی ہر تحریر۔ آل ٹائم مائی فیورٹ سمو بخاری کا ”ہم سے ہے زمانہ“ شبلی اور جوادی نظر نہ آنے والے بالکل زندہ کردار جو محسوس ہوتا ہے کہ کبھی آپس پاس ہی موجود ہیں۔ پسندیدہ رائٹرز ساتھ رضا، شہ

1۔ 9th میں تھی جب پہلی دفعہ شعلے پڑھا تھا۔ تب کچھ سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ بس صرف بڑھنے کی دھن ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھی کلاس فیلوز سے منگوا کر پڑھتی تھی۔ گھر میں چونکہ بڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ مگر باوجود اس کے چھپ کے پڑھتی رہی، پھر آہستہ آہستہ شعور کی پہلی سیڑھی پہ قدم رکھا۔ تو جو الفاظ اور فقرے پہلے بڑھے تھے اس کے معنی الگ سے لکھنے لگے۔ اس کے مطلب واضح ہوتے چلے گئے پھر۔ جس ناول نے مجھے خواتین اور شعلے کا مستقل قاری بنایا۔ وہ ”نمو احمد کا ناول“ ”جنت کے“ تھا۔ بس پھر تو شعلے کا ہاتھ پکڑ کے زندگی کے ان تلخ اور پر پیچ راستوں پہ چلتے گئے۔ اور اس طرح ہمارا اور شعلے کا ساتھ برقرار ہے۔ اب تو زندگی کے اس موڑ پہ ہوں کہ جہاں کبھی انسان ڈگمگا جاتا ہے۔ اور کبھی سنبھل جاتا ہے۔ لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ شعلے نے ہمیں کبھی لڑکھڑانے نہیں دیا۔

2۔ صبح کا آغاز نارمل ہوتا ہے۔ پانچ بجے تک لیکن جب کوئی اٹھاتا ہے۔ تو دل چاہتا ہے کہ دوبارہ سو جاؤں۔ ناشتا چونکہ اماں بناتی ہیں اور چائے بابا بناتے ہیں۔ ہمارے بابا بہت اچھے ہیں۔ ہماری بہت مدد کرتے ہیں۔ ایک مزے کی بات بتاؤں میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ عید کے دن والے چاول بابا کو پھاٹتے دیکھا ہے۔ وہ اماں سے لڑتے ہیں کہ تم نے پوری زندگی گزار دی مگر آج تک اچھے چاول نہیں بنائے۔ تو اس بات پر ہر عید والے روز دونوں کی تھوڑی سی نوک جھونک جاری رہتی ہے۔ لو بات کہاں سے شروع کی تھی اور کہاں چلی گئی۔ پھر ناشتا کرتی ہوں۔ اس کے بعد میرا ریڈیو ٹائم شروع ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کمرہ بھی سمیٹتی جاتی ہوں۔

بخاری، عنہ ذہید، گہمت، سیماء، قانزہ، افتخار، مہوش، افتخار
 'ام ثمامہ'، 'ام مریم'، 'آسیہ رزاقی'، 'نبیلہ عزیز'، 'آمنہ
 ریاض'۔

4 - خوبیاں اور خامیاں اللہ کیسا سوال پوچھ لیا گھر
 والوں میں چھوٹے بھائی سے پوچھا، غصہ بہت آتا ہے
 پھر جب خوبی پوچھی تو حیرت سے دیکھنے لگا "کیا واقعی
 کوئی خوبی بھی ہے تم میں؟" الٹا مجھ سے پوچھنے لگا (بابا)
 بھائی سے مایوس ہونے کے بعد کسی اور سے نہیں
 پوچھا "کیونکہ جواب ایک جیسا ملتا۔ بقول میرے
 سب سے بڑی خامی غصہ بہت جلد آتا ہے۔ منہ پھٹ
 ہوں صاف گوئی کی حد تک ایک کزن دوست نما گہمت
 ہے جب بولتی ہو تو بغیر سوچے سمجھے بولتی ہو "خوشامد
 نہیں ہوتی مجھ سے۔" اور یہ بات لوگوں کی نظر میں
 کھٹکتی ہے۔ اس لیے مغرور کا خطاب بھی اسکول کے
 زمانے سے مل چکا ہے۔ گانے کی شوقین ہوں، سننے
 اور گانے دونوں کی۔ میوزک بہت اونچا سنتی ہوں،
 اور یہی حرکت میری اک بہن کو بہت ناگوار گزرتی
 ہے۔ ناامید کبھی نہیں ہوتی اور یہی میری ذات کی سب
 سے بڑی خوبی بھی ہے۔ ہمیشہ خوش رہتی ہوں۔ کبھی
 کسی کے معاملے میں داخل انداز نہیں کرتی۔ گھریلو
 سیاست کا کبھی حصہ نہیں رہی۔ مجھے شروع سے ہی
 سیاسی باتوں سے چڑ ہے۔

ہر حال میں خوش رہتی ہوں۔ زندگی گزارنے کا کوئی
 معیار نہیں ہے جو جب اور جیسے ملا صبر کرتی ہوں۔
 "جیسا دلیس ویسا بھیس" والی مثال ہے میری۔ "ہلا گلا"
 بھی پسند ہے اور تہائی پسند بھی ہوں، دھوپ چھاؤں،
 والا مزاج ہے میرا۔ پکانے کی شوقین ہوں۔ ہر قسم کی
 پاکستانی ڈش بنا سکتی ہوں۔ کرپے گوشت، اچار گوشت
 اور فرائڈ سیملہ بہت مزے کا بناتی ہوں۔
 ۵ - بارش: نام سنتے ہی دل میں عجیب جلترنک سی
 بجنی شروع ہو گئی ہے۔

بیٹھ کے کھڑکی کے اس پار کچے صحن میں پڑنے والی
 بارش کی بوندوں کو جب دیکھتی ہوں تو دل چاہتا ہے کہ

کاش یہ وقت تھوڑی دیر کے لیے ہی پر ٹھہر جائے،
 لیکن نہ وقت کبھی ٹھہرا ہے، وقت تو ہمیشہ بھاگتا رہتا
 ہے، اڑتا رہتا ہے آزاد چھٹی کی طرح۔

6 شعر ہمیشہ سے پسند نہیں رہے اور اگر کبھی پسند آ
 بھی جاتے ہیں تو یاد نہیں رہتے۔

کتاب: کی رسیا ہوں۔ ہر قسم اور ہر ٹاپک کی
 کتاب پڑھنے کی دلدادہ ہوں۔

7 اقتباس کا تو پتا نہیں۔ لیکن ساتھ رضا کے قلم
 سے نکلا ہوا ہر لفظ مجھے بہت پسند ہے۔ اور آخر میں اپنی
 ایک چھوٹی سی نظم اگر قابل اشاعت ہوئی۔

زندگی تمام لو مجھے
 کہ سانس ابھی باقی ہے
 چلتی رہے گی یہ
 جب تک جاں باقی ہے
 آؤ کے لوٹ چلیں
 منتظر ہیں راہیں
 کہ مسافتیں ابھی باقی ہے
 زندگی تمام لو مجھے
 کہ سانس ابھی باقی ہیں

مریم عابد۔۔۔ صادق آباد

1۔ شعاع سے وابستگی بہت پرانی ہے، کتنی یہ بھی اب
 یاد نہیں۔ سوچو تو لگتا ہے، جب سے پڑھنا شروع کیا
 ہے اسے ہی پڑھ رہی ہوں۔ جب میں نے پڑھنا
 شروع کیا یہ گھر میں موجود تھا۔ امی اور باجی یعنی اسے
 پڑھتی تھیں۔ یہ یاد ہے جو پہلی کہانی پڑھی وہ سمجھ میں
 نہیں آئی تھی۔ میں نے گرمیوں میں پینتہ پینتہ
 ہوتے اور سردیوں میں کانٹے ہوئے رضائی میں یا
 رضائی سے باہر چھپ چھپ کر بھی پڑھا ہے کیونکہ
 ہوتا یہ تھا کہ اسے ہاتھ میں لے کر میں سب کچھ بھول
 جاتی تھی اب بھی یہی حال ہے۔ تو امی سے ڈانٹ اور
 مار بھی پڑی کہ پہلے اسکول کا اور ضروری کام کر لو اب
 امی نے سمجھو نا کر لیا ہے، ویسے میرے پڑھنے کی رفتار
 بھی تیز ہو گئی ہے۔ صرف چار پانچ گھنٹے کافی ہوتے

ہو۔ لیکن تم بعض اوقات بے مروت بن جاتی ہو اور حیران کر دیتی ہے غصہ دلاتی ہو۔
 افسی یوں نے کہا تھا تم کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ کیا ایسی ٹیوڈ ہے؟ پتا نہیں مجھے خود سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ تعریف ہے یا۔۔۔ رو اور رباب طارق کا کہنا ہے کہ تم معصوم نظر آتی ہو پر ہو نہیں (مجھے تو لگتا ہے میں نظر نہیں آتی معصوم) بقول آمنہ صفدر تم فرینڈلی ہو بس میں نے اپنی تمام دوستوں کے نظریات لکھ لیے ہیں۔

5۔ بارش مجھے اب اچھی نہیں لگتی۔ ایک بارش میں نے اقراء پوسٹ گریجویٹ کالج صادق آباد کی بند عمارت میں گزاری تھی وہ بہت خوفناک تجربہ تھا۔ کیونکہ وہاں بارش ایک ڈراونی قلم کا منظر پیش کر رہی تھی۔ پہلے والی بارشیں بہت انجوائے کی تھیں۔ اب تو بارش موت کی یاد دلاتی ہے۔

6۔ اقتباس

تیری جنت میں آئیں گے سے اقتباس
 ”دیکھو ذرا آ کے یہ شہادت ہے شہید یوں ہوتے ہیں۔ شہید ہونا ہے تو اس شان سے ہو کہ زمانے کے دل میں شہید ہونے کا ارمان جاگے۔ شہید ہونے کا دعو کرنا ہے تو فاطمہ کے پرسکون وجود کو سفید کفن میں دیکھو کیسے جگمگا رہا ہے۔“

اقراء ملک۔۔۔ بہاولپور

1۔ ”شعاع سے میری وابستگی“ آنکھ کھلی تو گھر میں خواتین و شعاع کو موجود پایا۔ یوں تو میرا اور شعاع کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پہلے امی اور پھر اب باجی کو پڑھتے دیکھا۔ امی اب بھی پڑھتی ہیں مگر تھوڑا کم کر دیا ہے۔ پہلے تو اتنا حیران ہوتی تھی کہ میں کہ صائمہ آپلی کو جب دیکھو گری ہے یا سردی بہار ہو یا خزاں اور تو اور پیپرز میں بھی ان کے ہاتھ میں شعاع اور خواتین کو دیکھا اور جب دیکھو مسکرا رہی ہیں یا کھکھلا کر ہنس رہی ہیں آخر اس ڈائجسٹ میں ایسا ہے کیا؟ وہ تو اب سمجھ میں آیا۔ تو جناب مجھے اس ڈائجسٹ کو پڑھنے

ہیں۔
 2۔ دو ٹین آج کل بہت بری طرح الٹ پلٹ ہو چکی ہے۔ کالج سے فری ہیں۔ کل پریکٹیکل ہے تو بس سارا دن گھر میں رہتی ہوں مگر دیکھتی ہوں (مطلب صفائی کرتی ہو) سلائی کرتی ہوں، کمپیوٹر پر اور بس۔

3۔ غمروں میں جھوٹ نہیں ہوتا۔ لیکن جب رو مینس دکھایا جاتا ہے یا جو حادثات ہوتے ہیں تو اکثر وہ تو جھوٹ لگتا ہے جب کافی ساری اتفاقات اکٹھے ہوں ویسے اس کے گردار تو مجھے اپنے ارد گرد نظر آتے ہیں۔ یہ اتفاقات بھی بہت کچھ سکھاتے ہیں تقدیر پر یقین اور حقیقت پسندی کہ ہوتا وہی ہے جو رب کی چاہ ہے۔ میرے ساتھ ایک بد قسمتی ہے کہ میں بھول جاتی ہوں اور بہت جلد بھول جاتی ہوں۔ تو اس وقت مجھے بہت سی ایسی تحریریں بھی یاد نہیں آرہیں جو مجھے بہت پسند آتی تھیں۔ ”دل من مسافر من“ ”جنت کے ہے“ ”بہت متاثر کیا۔“ ”زرد موسم“ ”دیوار شب“ ”تیرے نام کی شہرت“ ”اک نئی سندھ بدلا“ ”ہم سے ہے زمانہ“ یادگار تحریریں ہیں۔

4۔ خوبیوں کی طرح خامیوں کی بھی لسٹ ہوگی۔ ہوگی ضرور کیونکہ مجھے تو پتا نہیں۔

میرے بھائی نے کہا ”تم خود غرض بن جاتی ہو۔“ (دھیان سے بن جاتی ہو کہا ہے۔)

اور باجی نے کہا ”بالکل صحیح“ امی نے غصہ میں کہا تھا ”تم بد تمیز ہو“ اور خوشگوار موڈ میں کہا ”میری بھولی بیٹی“ بقول ماریہ (میری بہن) تمہیں غصہ نہیں آتا۔ جبکہ میری دوستوں کا خیال ہے مجھے غصہ بہت آتا ہے میں غیر مستقل مزاج ہوں۔ پل میں تولہ اور پل میں ماشہ والا حساب ہے۔ میں بعض اوقات وہ رد عمل دیتی ہو جس کی مجھے خود سے بھی امید نہیں ہوتی۔ میں اپنے لیے ہی ان اسپیکنگ ہوتی ہوں تو دوسروں کو کیا پتا ہوگا۔

ثناء صفدر نے کہا مجھے تم میں خامی نظر نہیں آتی اور دوستی کرنا میں نے تم سے سیکھا۔

صافقت (میری دوست) نے کہا تم حاسد نہیں، مغرور نہیں، اسلامی اشعار اور پاکستان سے محبت کرتی

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

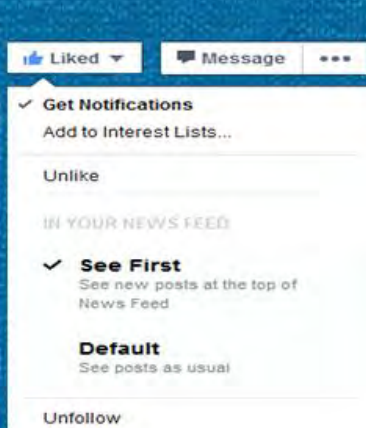
بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done



کے لیے خریدنے میں مجھے اتنی مشکل پیش نہیں آئی۔
8th، 9th کلاس میں آپنی کے شعلع وغیرہ پڑھ لیتی
تھی مگر باقاعدگی سے ”جنت کے پتے“ آنے کے بعد
رہنا شروع کیا یوں میری باقاعدہ وابستگی شعلع سے
تین سال پہلے ہوئی۔

نہیں سکتی اور یہی بات زیادہ غصہ دلاتی ہے۔ کڑھتی
رہتی ہوں دل میں۔ منہ پر کوئی بے عزتی کر دے تو
جواب نہیں دے سکتی کہ گستاخی کے زمرے میں آتا
ہے اور خوبیاں تو میرے ساتھ رہنے والے ہتاسکتے ہیں
جبکہ جہاں تک میرا خیال ہے مجھ میں کوئی خوبی نہیں
ہے۔ جس کام میں ذکر کروں۔

5۔ شعلع کی بعض تحریریں ایسی دلنشین ہوتی ہیں کہ
ہم بدلتوں ان کے سحر میں جکڑے رہتے ہیں۔ اور شعلع
کی تحریریں بھلائے نہیں بھلا سکتی۔ فرحت اشتیاق
کے ناول ”دل سے نکلے ہیں جو لفظ“ متاع جان، عمودہ
احمد کی شہزاد اور پیر کامل، نمبر احمد کا ”صحف“ اور
”جنت کے پتے“ فائزہ افتخار کی ”اک نئی سندھیلہ“ اور
بہت سی رائٹرز جو نوجوان نسل کے لیے مشعل راہ ہیں
بہت بہت خوب صورت تحریریں لکھ رہی ہیں۔ اللہ
تعالیٰ ان سب رائٹرز کو مزید ترقی عطا کرے (آمین)
صائمہ اکرم کا ”دیمک زوہ محبت“ اور — امیہ خان
کا ”بت شکن“ بہت زبردست ناول ہے۔ اس کے
علاوہ نمبر بخاری، تنزیلہ ریاض، آمنہ ریاض، عفت سحر
باشا، مریم عزیز، آسیہ رزاقی اور سائرہ رضا اور بھی تمام
لکھنے والی رائٹرز بھی بہت عمدہ لکھ رہی ہیں۔

6۔ سلون مجھے بہت پسند ہے اور بارش میں نہانا اس
سے زیادہ پسند۔ سلون کے حوالے سے کوئی واقعہ
میرے ذہن میں نہیں۔

7۔ پسندیدہ کتاب تو قرآن مجید ہے۔ اور پسندیدہ
شعر:

وہ خواب تھا بکھر گیا، خیال تھا ملا نہیں
مگر دل کو کیا ہوا، یہ کیوں بجھا پتا نہیں
پسندیدہ اقتباس یوں تو بہت سارے ہیں لیکن ابھی
صرف ایک لکھ رہی ہوں ”جنت کے پتے“ سے

”حیا! لوگ کہتے ہیں کہ زندگی میں یہ ضروری ہے
اور وہ ضروری ہے۔ میں تمہیں بتاؤں، زندگی میں کچھ
بھی ضروری نہیں ہوتا، نہ مال، نہ اولاد، نہ رتبہ، نہ
لوگوں کی محبت۔ بس آپ ہونے چاہئیں، اور آپ کا
اللہ سے ایک ہر بل بڑھتا تعلق ہونا چاہیے۔“

2۔ دن کا آغاز فجر کی اذان سن کر ہوتا ہے، پہلی اذان
پر آنکھ کھل جاتی ہے۔ نماز اور تلاوت قرآن کے بعد
میں سو جاتی ہوں۔ آٹھ بجے اٹھتی ہوں، ٹیوشن کے
لیے نچے آتے ہیں۔ دس بجے بچوں کو بھیجنے کے بعد
ناشتہ کرتی ہوں اور پھر صفائی ستھرائی، ہم دو تہنیں اور دو
بھائی ہیں اور میں سب سے چھوٹی ہوں، تو گھر کے زیادہ
کام نہیں کرتی۔ بس صفائی ستھرائی میرے ذمے ہے۔
بارہ بجے صفائی سے فارغ ہو کر ایک بجے تک میٹ یوز
کرتی ہوں۔ پھر دوپہر کا کھانا کھا کر ظہر کی نماز ادا کر کے
شعلع لے کر بیٹھ جاتی ہوں۔ ویسے ”شعلع“ کے لیے
کوئی مخصوص ٹائم نہیں ہے۔

پھر شام میں چھ بجے سے آٹھ بجے تک چیزیں بناتی
ہوں۔ مطلب مجھے ہینڈ میڈ چیزیں بنانے کا بہت شوق
ہے اور اب تک پیپر کی بہت ساری چیزیں بنا چکی
ہوں۔ مثلاً ”ونڈ چائیم“ کٹانڈ کے خوب صورت پھول
اور مختلف ڈیکوریشن۔ اس کے بعد عشاء پڑھ کر سو
جاتی ہوں دس بجے تک۔ ڈرامے تو آج کل اچھے
اچھے آرہے ہیں مگر لائٹ نہیں ہوتی آٹھ سے دس تو
جلدی کھانا کھا کر عشاء پڑھ کے سو گئے سب۔ تو میں
بھی سو جاتی ہوں۔

3۔ یہ سچ ہے کہ افسانوں میں جھوٹ نہیں ہوتا۔
پہلے کا تو پتا نہیں، مگر آج کل جو حالات ہیں تو افسانے
ٹھیک ہیں سچ پر مبنی ہوتے ہیں۔

4۔ میری ذات میں خوبیاں کم اور خامیاں زیادہ ہیں۔
میری پہلی خامی یہ کہ میں سوچتی بہت ہوں، دوسری
خامی یہ کہ حد سے زیادہ بے وقوف ہوں، اگر کوئی
جھوٹ بول کے بھی مجھ سے کام نکلوالے تو مجھے پتا
نہیں لگے گا۔ غصے کی تیز ہوں مگر اپنا غصہ کسی پر نکال

عمر سعید کے نام

نوال افضل گھمن

سب ابھی گئے۔
گلے ملے۔ خوب روئے بھی، چپ بھی کروایا۔
بہن بھائی سے بچھڑی۔ ماں بیٹے سے۔
بچے باپ سے۔ بیوی ہم سفر سے۔
بھائی بھائی سے۔ بیٹا باپ سے۔ باپ بیٹے سے۔

دوست۔ بلی یار سے۔
پھولوں کی چادر۔
سفید کفن میں۔ لٹھے کے کپڑے سے زیادہ چٹا
چہرہ۔
بند آنکھوں پر گہری پلکیں۔
کشاہ پیشانی۔
ستواں ناک۔

رونا۔ پھر رونا۔ دیکھو۔ نا۔ اٹھو وہ لے کر
جار ہے ہیں چارپائی۔ مسجد کے اسپیکر میں گونجتا
اعلان حقیقت سے بھرا ہوا اعلان۔ نماز جنازہ تیار
ہے۔ میت اٹھا رہے ہیں گھر سے۔ میرا ضبط ٹوٹ
کر چور اچور۔

وہ لے جا رہے ہیں میرا بھائی۔ میرا عمر!
عمر۔ عمر۔ میرے رب کہہ۔ صبر۔ صبر۔
رونا۔ پھر رونا۔

میں نے جو اپنے دل پر سہا۔ وہ لکھ دیا۔ لکھنے
سے پہلے رو لیا۔ لکھتے ہوئے رو لیا۔ لکھ کر رو لیا۔
پڑھ لیں، آپ پڑھتے ہوئے رو لیں۔ پڑھ کر
رو لیں۔ دوبارہ پڑھیں اور پھر رو کر صبر کر لیں۔
ہمیں تلقین ہی صبر کی ہے۔ اور آخر صبر ہی علاج
ہے غم کا جدائی کا۔ درود درود ہے الٹا لکھیں یا سیدھا
درود۔

اے گل چین اجل کیا خوب تھی تیری پسند
پھول وہ توڑ آ کہ ویران کر دیا سارا چین

دل کی نوحہ کرمی پہ اشکوں نے یاد کو خراج حسین
بخشا تو آنکھوں سے سیال بہہ نکلا۔ کچھ رشتوں کی
مضبوطی کی ڈور، سانسوں کی مالا کی شکل میں کمزور ترین
ثابت ہوتی ہے۔ مضبوط ترین رشتہ، سانس کی کمزوری
کے آگے سجدہ ریز ہے۔ آہ نے لب کو چھوا اور کرب،
سیال کی صورت آنکھوں سے بہہ نکلا۔ اپنوں کی یاد
میں آنکھیں نہیں دل روتا ہے۔ اپنوں کی جدائی جان
لیوا ہوتی ہے۔ یہ جدائیاں پکارتی ہیں۔

اسپتال کا کوریڈور آتے جاتے لوگ اور پیرا
میڈیکل اسٹاف کی پھرتیاں میں اور میرے عزیز
واقارب کا ہجوم مگر دل کو عجیب قسم کا اکیلا پن ڈوبتی
ابھرتی دھڑکنیں اور دھڑکنوں پر چھایا انجانا سا خوف
ڈرو کرتے لب تم ہوتی آنکھیں۔ ابھی سورۃ یس کا
درمیانہ صفحہ پلٹا میرے خدایا۔ یس اور حوری، آدمی
رہ گئی اور دروازے کے پار زندگی مکمل۔ میرے
اللہ۔ میرے رب کہہ۔ نہیں۔
نہیں۔ نہیں۔ کہنے سے جو ہاں ہو چکا، وہ تو پلٹنے
سے رہا۔ کاش مجھے علم ہو ماکہ اسپتال کی فضا میں کسی
کو نے میں چھپی یہ حقیقت میرا سامنا کرے گی تو میں
پلٹ جاتی۔ مڑ جاتی اور موت اور زیست کے درمیان
اپنی دعا میں رکھ دیتی مگر حکم خداوندی پر میرا دل و
دماغ لبیک کہہ رہا ہے۔ مشیت الہی۔ چھپا ہے
راز۔ راز کے اندر ایک اور راز۔ عہد الست۔
موت کا زانق۔

فون پر بجتی گھنٹی نے چونکایا۔ جی عمر چلا گیا۔
عمر چلا گیا۔ اپنی عمر کی نقدی تمام کر کے۔
کتنی جلدی دن گزر رہا ہے۔ رونا پھر رونا۔ بار
بار رونا۔ چپ ہو کے دوبارہ سے رونا۔
کیا پھر یہ چہرہ دوبارہ نہیں مسکرائے گا۔ کیا یہ
آنکھیں اب روز جزا کھلیں گی۔ چپ کرو پلینز چپ
کرو۔ کسی بہت اپنے کا دلاسل۔ منت سماجت کرنی
التجا۔ سنبھالو پلینز خود کو سنبھالو۔ رحم دلی کے
جملے۔ کب سوچا ایسا۔ کب گمان گزرا۔ کبھی بھی
نہیں مگر حقیقت غالب ٹھہری۔

سب کو اطلاع کر دی۔



پروین اسلم جڑانوالہ

س۔ 1 "شادی کب ہوئی؟"

ج۔ "میری شادی 7 اکتوبر 1982ء کو ہوئی۔"

س۔ 2 "شادی سے پہلے کے مشاغل؟"

ج۔ "شادی سے پہلے کے مشاغل صرف اتنے کہ گھر والوں نے کبھی کوئی کام کاج کی ذمہ داری نہیں ڈالی۔ آٹھویں تک تعلیم حاصل کی۔ اسکول جایا کرتی تھی، اس لیے کبھی امی یا بڑی بہن نے کام کرنے کا کہا ہی نہیں۔ پسندیدہ مشغلہ صرف اپنی سہیلی عذرا کے ساتھ وقت بتانا۔ (جو کہ اب اس دنیا میں نہیں، خدا اس کی مغفرت فرمائے، آمین) زیادہ وقت تو میں اپنی سوچوں میں ہی غرق رہتی تھی، تب بھی اور اب بھی۔"

س۔ 3 "رشتے میں مرضی؟"

ج۔ "میری امی نے پوچھا تھا کہ میں راضی ہوں کہ نہیں، میں نے مرضی بھی ان ہی پر چھوڑ دی تھی کہ کرنی ہے تو

کریں۔ پھر خالہ کے گھر رخصت ہو کر جانا پڑا، میری امی اور خالہ دونوں کے روزمرہ جھگڑوں کے باوجود آخر رشتہ طے پا گیا، روز کے جھگڑوں میں سو بار یہ رشتہ تو ٹٹا تھا اور میرا شوہر (محمد اسلم) بس یہ کہتا کہ اگر لکھا ہوا ہے قسمت میں تو ہو کر ہی رہے گا۔ رشتے میں آخری قدم نسرن (میری نند) کا تھا جو ڈھول لے کر بیٹھ گئی کہ منگنی کر کے ہی جائیں گے۔ (پورے خاندان کے ساتھ) میری نند تھی تو چھوٹی پرست سیانی ہے۔" (اب یہ باتیں یاد کر کے میں بہت ہنستی ہوں۔)

س۔ 4 "جیون ساتھی کے حوالے سے تصور؟"

ج۔ "میں نے کچھ خاص نہیں سوچا، بس جیسا مل گیا وہ ہی ہر تصور میں آگیا۔ میرے شوہر دل کے صاف تھے۔" (وہ اب اس دنیا میں نہیں، خدا مغفرت کرے۔ آمین) انہوں نے ساری زندگی اپنی ماں کی ہر بات مانی۔ ماں نے کہا کھڑے ہو جاؤ تو کھڑے ہو گئے۔ کہا بیٹھ جاؤ تو بیٹھ گئے۔ مجھے تو ان کا ہر انداز ہی اچھا لگا۔

س۔ 5 "منگنی کتنا عرصہ رہی؟"

ج۔ "پانچ سال تک منگنی رہی، باقاعدہ کوئی خاص رسم

نہیں کی گئی۔ میری خالہ کی طرف سے۔ پھر 7 اکتوبر کو میری اور 8 اکتوبر کو میرے دیور کی شادی ہوئی۔ (کوڑ خالہ سے) جن سے آپ بخوبی واقف ہیں۔"

س۔ 6 "شادی کے لیے قربانی؟"

ج۔ "قربان تو کچھ نہیں کیا، مگر زندگی کی بہت سی الجھنیں خرید لیں۔"

س۔ 7 "رسموں کے لین دین میں کوئی جھگڑا ہوا؟"

ج۔ "امی اور خالہ دونوں کا گھریا لکل ساتھ ساتھ تھا۔ والد غریب تھے۔ مگر جب سے بڑے بھائی نے کام کرنا شروع کیا تھا۔ تو حالات بے حد بہتر تھے۔ وہ میری شادی پر بہت سامان دینا چاہتے تھے۔ مگر خالہ (ساس) نے منع کر دیا کہ یہ گھر ذرا چھوٹا ہے۔ میری خالہ (ساس) کے گھر کے ساتھ

مشہور مزاح نگار اور شاعر انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش

~~~~~

قیمت

کتاب کا نام

|       |                          |                        |
|-------|--------------------------|------------------------|
| 450/- | سفر نامہ                 | آوارہ گرد کی ڈائری     |
| 450/- | سفر نامہ                 | دنیا گول ہے            |
| 450/- | سفر نامہ                 | ابن بطوطہ کے تقاب میں  |
| 275/- | سفر نامہ                 | چلتے ہو تو چین کو چلیے |
| 225/- | سفر نامہ                 | گمری گمری پھر اسافر    |
| 225/- | طرح و مزاح               | خمار گندم              |
| 225/- | طرح و مزاح               | اردو کی آخری کتاب      |
| 300/- | مجموعہ کلام              | اس ہستی کے کوپے میں    |
| 225/- | مجموعہ کلام              | چاند نگر               |
| 225/- | مجموعہ کلام              | دل وحشی                |
| 200/- | ایڈ گرائلن پو ابین انشاء | اندھا کنواں            |
| 120/- | اوپنری ابین انشاء        | لاکھوں کا شہر          |
| 400/- | طرح و مزاح               | باتیں انشاء جی کی      |
| 400/- | طرح و مزاح               | آپ سے کیا پردہ         |

مکتبہ عمران ڈائجسٹ  
37، اردو بازار، کراچی

ان کا دل بھی بے حد چھوٹا ثابت ہوا۔ جب بھی کوئی مہمان آتے (ساتھ) ان کو ہمیشہ میری امی نے ہی کھلایا، اگر کبھی چائے پلائی پڑ جاتی تو کہتی دودھ ہی نہیں ہے۔ سو چائے سے کھانے تک کے خرچے میری امی نے ہی اٹھائے۔ شادی کے بعد جب بھی میرے والد میرے گھر آئے۔ میں کبھی شربت پلاتی تو خالہ لڑ پڑتی، اس لیے اس کے بعد میں نے سادہ پانی دینا شروع کر دیا۔ (یہ باتیں آج بھی دل دکھاتی ہیں) مگر خالہ (ساس) کو ہر بات کے لیے معاف کر چکی ہوں، خدا کرے کہ انہوں نے بھی مجھے معاف کیا ہو، اگر میں نے بھی کوئی غلطی کی ہے تو آمین۔“

س۔ 8 ”شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟“

ج۔ ”نام سے تو پہلے ہی واقف تھے، سو سیدھا سا۔ وال ”کیسی ہیں آپ؟“ اور ویسا ہی جواب ”ٹھیک ہوں۔“

س۔ 9 ”شادی کے بعد خاص تبدیلی؟“

ج۔ ”شادی کے کچھ عرصے بعد ہی شوہر سعودی عرب چلا گیا اور اس کے بعد میں زیادہ تر اپنی امی کے گھر ہی رہی یا پھر یوں کہیں کہ کبھی کبھی سسرال کا منہ دیکھا۔ ٹیلی فون تو تھا نہیں، بس ہم خط کا انتظار کرتے تھے کہ کبھی تو انتظار ختم ہو گا۔“

س۔ 10 ”کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟“

ج۔ ”شاید پندرہ دن بعد۔ سب مل کر ہی کام کرتے تھے، دیو رانی صفائی بہت اچھی کرتی تھی، آج بھی کرتی ہے۔ (کوثر خالد۔ دیو رانی) میں سالن اچھا پکاتی تھی۔ اس لیے وہ یہی کام کراتے تھے۔“

س۔ 11 ”میکے اور سسرال کے ذائقے میں فرق؟“

ج۔ ”نہیں، مجھے کوئی فرق نہیں لگا، کھانا پینا میرے گھر کی طرح ہی اچھا تھا۔“

س۔ 12 ”سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی، تنقید؟“

ج۔ ”میرے سر نے میری چائے کی تعریف کی اور سب نے میٹھے چاولوں اور ہنڈیا کی۔“

س۔ 13 ”سسرال سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟“



ج۔ 16 ”میکے اور سرال میں فرق؟“

ج۔ ”کچھ خاص نہیں کیونکہ دونوں بہنیں تھیں، ہاں البتہ میرے ابا خاموش اور نیک فطرت تھے۔“

ج۔ 17 ”جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ؟“

ج۔ ”پہلے جوائنٹ رہیں، پھر علیحدہ ہو جائیں۔ میرا خیال ہے اس میں دونوں کا فائدہ ہے۔“

ج۔ 18 ”شوہر سے تعلقات؟“

ج۔ ”نہ صرف میرا بلکہ ان کے سارے بیٹے ہی بیویوں کے ساتھ بہت اچھے تھے اور اسلم تو میرے ساتھ کام بھی کروا دیتا۔ ہانڈی بھی پکالیتا۔ جب ہم ماموں کے سرگودھا گئے تو تب عذرا بھی وہاں تھی۔

ملوا کر لایا۔ اور تصویریں بہت کھینچتے تھے یہ۔ کیونکہ باہر گیا ہی شوق پورے کرنے کے لیے تھا اور سب بچوں سے بہت پیار کرنے والا تھا اور بات انصاف کی کرتا۔ اپنا بچہ غلط ہے تو اس پر ہی غصے ہوتا۔ ایک دفعہ بہت مارا۔ میرے خوابوں میں آتا ہے، بلکہ وہ سچ سچ بھی میرے علاوہ نظر دو سروں کو بھی آیا۔ اللہ انہیں جنت الفردوس عطا کرے۔“



ج۔ ”نہیں، کچھ خاص نہیں، میں چاہتی تھی کہ خالہ کے ساتھ اور باقی سب کے ساتھ اچھا سلوک رہے، مگر وہی کچھ ہماری کمزوری، کچھ ان کی۔ مگر میں اپنی خالہ (ساس) کی ہمیشہ تعریف کرتی ہوں کہ چار بہوؤں دیکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔“

ج۔ 14 ”پہلے بچے کی پیدائش؟“

ج۔ ”ماں کے گھر ہوئی، میری بہنوں نے میرا بیٹا سنبھالا۔

دوسرا بچہ ادھر ہوا تو ماں نے کہا اب سراسر والے بچے سنبھالیں۔ سوا ماہ۔ پیدائش ہوئی تو گھر میں دائی بلوائی اور ساس نے اس وقت چارو ناچار سنبھالا۔ اس کی اپنی بھی معذور بیٹی تھی۔ بس گھر کے برتن خوب مانجھا کرتی تھی۔

جھگڑے کے بعد طے ہوا کہ ایک ماہ کام والی رکھ لی جائے۔ کوثر نے نواپنے سارے کام خود ہی کیے۔ (کوثر خالد میری دیو دانی ہیں) اس کے بعد ساس کسی بہو کی مدد نہ کر سکی۔ ہاں برتن پھر بھی دھوتی تھی۔“

ج۔ 15 ”سسرال میں مقام؟“

ج۔ ”میرا بڑا بیٹا بہت ضدی تھا اور شرارتی بھی۔ اس نے سب کو تنگ کیا اور مار کھائی۔ اسی کی وجہ سے مجھے علیحدہ کیا گیا۔ سسر نے مرتے وقت مجھے بلا کر معافی مانگی اور میں نے بھی ان کی قبر کی بہت حفاظت کی۔ کیونکہ کچھ عرصہ بعد میاں بھی دل کی بیماری، بلڈ پریشر، شوگر سے فوت ہو گئے تو میں دن رات رویا کرتی۔ اب کہیں جا کے صبر آیا۔“

شان ہو گئے ہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت سرورق  
خوبصورت پمپانی  
مشہور جلد  
آفٹ اپ

☆ تئلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 250 روپے  
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے  
☆ محبت بیاں نہیں لینی جدون قیمت: 250 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

اپنے شعلے دسمبر 2016 278

WWW.PAKSOCIETY.COM



گدو۔ پ۔ رحیم یار خان

س۔ 1 "شادی کب ہوئی؟"

ج۔ "شادی 2008ء میں ہوئی اور بروز جمعہ ہوئی۔"

س۔ 2 "شادی سے پہلے کیا مشاغل تھے۔ شادی کے بعد تبدیلی آئی؟"

ج۔ "شادی سے پہلے بہت خوش رہتی تھی۔ گھر کے کام کاج کرتی تھی اور رسالے پڑھتی رہتی تھی، سہلیاں وغیرہ نہیں ہیں، بس کتابوں سے دوستی رہی اور دل لگا کر پڑھا اور پڑھائی میں بہترین رہی۔"

س۔ 3 "کیا رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی؟"

ج۔ "رشتے میں والدین کی مرضی تھی اور میں نے والدین کی پسند کو اپنی پسند بنایا۔"

س۔ 4 "مہیون سا تھی کے حوالے سے تصور؟"

ج۔ "مہیون سا تھی کے حوالے سے یہی سوچا تھا کہ اسے شکی بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ دوستوں یا رول کی محفلیں گھر میں نہ سجاتا ہو اور دل کی باتیں دل میں نہ رکھتا ہو۔ مخلص ہو۔ کہنے گھرے مردوں سے نفرت تھی اور اس کی آنکھیں خوب صورت ہونا چاہئیں۔ (اور وہ ہیں بھی ماشاء اللہ) مرد کو اندر سے خوب صورت ہونا چاہیے، باہر سے نہ ہو اور کانوں کے کچے مرد اچھے نہیں لگتے تھے اور ہاں ایک اور بات، 'دو قسم کا نہ ہو' بلکہ غلط بات پر مجھے ٹوک سکے، سختی کرنے مجھے روک سکے، لیکن درست بات پر میرے لیے اسٹینڈ لے سکے۔"

س۔ 5 "مگنی کتنا عرصہ رہی؟"

ج۔ "مگنی بچپن کی تھی، وہ ہمارے گھر آتے تھے، میں ان سے بات بھی کر لیتی تھی، مگر حدود میں رہ کر اور ابو انہیں ہمارے گھر زیادہ نکلنے بھی نہیں دیتے تھے، بس ایک دن صبح سے شام یا شاید اس سے بھی کم وقت کے لیے وہ

ہمارے ہاں آتے تھے، فون پر بات وغیرہ یا کوئی اور قصہ نہیں تھا۔ بس مجھے ان سے محبت تھی اور وہ میرے مگنیتر تھے۔ سسرال والوں کے لیے ہزار خدشے تھے کیونکہ دونوں طرف شدید اختلافات کی ہوا چل پڑی تھی۔ میں جانتی تھی کہ دونوں گھروں کے آپس میں بہت سے ان دیکھے گلے شکوے ہیں، مگر رشتہ پھر بھی طے کر لیا گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں سب کو منالوں گی، محبت سے پیش آؤں گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کے کام کروں گی تو سارے گلے شکوے مٹ جائیں گے مگر افسوس کہ میری محبت اور خلوص کو چالپوسی اور کمزوری سمجھا گیا۔"

س۔ 6 "شادی کے لیے کوئی قربانی دینا پڑی؟"

ج۔ "شادی کے لیے کوئی قربانی نہیں دی، بلکہ تعلیم مکمل کر چکی تھی آگے پڑھنے کا ارادہ بھی نہیں تھا، ابو نے شادی کر دی اور میں یہاں آ گئی۔"

س۔ 7 "شادی کی دھموں کے دوران لین دین پر کوئی جھگڑا؟"

ج۔ "شادی خیریت سے ہی ہو گئی، مگر ایک تیسرے گھر نے ان اختلافات کو شدید ہوا دی اور آگ لگانے کی کوشش کی، اس رشتے کو ختم کرنے کے لیے ایڑیوں سے لے کر ناخنوں تک کے زور سے توڑنا چاہا، مگر ناکام رہا۔ رسمیں ہماری جو بھی ہوئیں ان میں لین دین کا کوئی مسئلہ نہیں ہوا، بلکہ سب خیریت سے ہوا، جہاں ابو کو لگا کہ یہاں کچھ بد مزگی ہو سکتی ہے۔ وہاں وہ خود پیسے دیتے رہے۔"

س۔ 8 "شادی کے بعد شوہر نے پہلی بار دیکھا تو کیا کہا؟"

ج۔ "شادی کے بعد شوہر نے پہلی بار دیکھا ہی نہیں، کیونکہ کمرہ گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور لائین کی روشنی میں السلام علیکم کہا اور مجھے تحفے میں پرفیوم ملا اور بہت ساری نصیحتیں۔"

س۔ 9 "شادی کے بعد سسرال والوں کا رویہ کیسا تھا؟"



ج - ”شادی کے بعد زندگی سر سے لے کر پاؤں تک بدل گئی ہے۔ آرام، سکون سب خواب ہوا۔ سسرال والوں کے چہروں سے، قریبی رشتے داروں کے چہرے اس طرح بے نقاب ہوئے ہیں، میں ڈر گئی تھی۔ جیسا ”سب اچھا“ میں سوچ رہی تھی ویسا کچھ بھی نہیں تھا، مگر میرے شوہر کو محبت تھی اور آج بھی ہے۔“

س-10 ”شادی کے کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟“

ج - ”شادی کے دوسرے دن ہی گھر کے کاموں میں لگ گئی تھی خود ہی، کیونکہ میں سب کے دل جیت لینا چاہتی تھی اور وہ اپنے بیٹے کی جیب جیتنا چاہتے تھے۔“

س-11 ”سسرال اور میکے کے کھانوں میں کیا فرق تھا؟“

ج - ”میکے اور سسرال کے کھانے ایک ہی جیسے تھے، بس یہاں سب کچھ ایک ہی بندے کی پلیٹ میں جاتا تھا اور باقی سارے بچے کھجے پر بس یہی فرق تھا۔“

س-12 ”میکے اور سسرال کے ماحول میں کوئی فرق محسوس ہوا؟“

ج - ”میکے اور سسرال کے ماحول میں صرف گندگی کا فرق تھا۔ یہاں سب بست میلے تھے، صفائی ستھرائی کے قریب بھی نہیں پہنکتے تھے، گھر میں گندگی اس قدر کہ میں اٹیچوں کی مریض ہو کر رہ گئی۔ گندے پر تنوں کے ڈھیر، کپڑوں کے ڈھیر اور کاٹھ کباڑ سے اٹا گھر۔ اور نذر اچھے کے اتنے تیز کہ بات کرو تو ہم کی طرح پھٹ پڑتے تھے۔ ان سب کے خیالات اور جذبات خود کش حملہ آوروں جیسے تھے اور بے حد گہرے کینہ پرور لوگ تھے۔“

س-13 ”سسرال میں کس بات پر تعریف ہوئی، کس پر تنقید؟“

ج - ”سسرال میں کسی بات پر تعریف نہیں ہوئی، میری محبت کو میری کمزوری اور خاموشی کو غور سے عبارت کیا گیا۔ بہر حال گھر کو صاف ستھرا رکھنے اور سلیقہ مندی کے لیے سب کہنے کی غلطی تو نہیں کر سکتے تھے، البتہ ان کے

چہروں سے لگتا تھا کہ سراہ رہے ہیں۔“

س-14 ”کیا سسرال میں آکے وہ مقام ملا جس کی مستحق تھیں؟“

ج - ”سسرال والوں نے مجھے کوئی مقام نہیں دیا، بلکہ وہ مجھے گھر سے نکال دینا چاہتے تھے، میں تھوڑی دیر کے لیے گھر سے کسی کام کے لیے باہر نکلتی تو وہ پیچھے سے یوں دروازہ بند کر لیتے تھے کہ جیسے میں نے واپس ہی نہیں آنا، میری بڑی جیٹھانی اب بھی اسی امید پر دروازہ بند رکھتی ہے، مگر میں واپس آنے کے لیے جاتی تھی اور آ بھی جاتی تھی اور میری ساس اور جیٹھانی، جیٹھ مجھے افسرہ نگاہوں سے گھورتے رہتے تھے، خاندانی معاملات کی مجھے خبر ہوتی تھی۔ کوئی مشورہ وغیرہ نہیں لیتے تھے نہ میں دیتی تھی۔“

س-15 ”سسرال سے وابستہ توقعات پوری ہوئیں؟“

ج - ”سسرال والوں سے وابستہ توقعات پوری نہیں ہوئیں، میں محبت سے سب جیت لینا چاہتی تھی اور وہ نفرت سے، میرے میاں کی جیب سے مجھے دور رکھنا چاہتے تھے، وہ بیٹے کی کمائی پر ناز کرتے تھے اور قابض رہنا چاہتے تھے۔ میری محبت اور خلوص کو میری چال سمجھا گیا، مجھے ہر طرح سے ڈی گریڈ کیا گیا، ہر طرف سے مایوس کیا گیا، بیٹے کو اکسایا گیا، مگر میں نے ہمت نہیں ہاری، روٹی ضرور ہوں میں، ٹوٹی نہیں سسرال والوں سے اب کوئی توقع نہیں۔“

س-16 ”پہلے بچے کی پیدائش پر سسرال والوں کا رویہ کیسا تھا؟“

ج - ”پہلے بچے کی دفعہ نادان تھی، ظاہر ہے پتا نہیں ہوتا کیا کرنا ہے، کیا نہیں کرنا، میری جیٹھانی نے پہلے پہل تو خوب کام کروائے پھر مجھے ایک اونچے درخت پر سوہانچنا اتارنے چڑھا دیا، مگر اللہ نے مجھے خیریت سے نیچے اتار لیا، اس وقت پہلا مہینہ چل رہا تھا، پھر ایک دفعہ قے کرنے کے بعد مجھے ایک میلی سی شیشی میں موجود ایک مخلول پلایا تھا۔ اللہ جانے وہ کیا تھا، میں نے زور سے قے کی تھی اور ایک بار پھر بچ گئی تھی۔ میری ساس اور جیٹھانی نے پہلے تو



ہوا ہے 'سب نماز پڑھتے ہیں اور مجھے دکھانے کو پڑھتے ہیں۔ جیٹھانی صاحبہ صبح صبح ہمارے کمرے کے سامنے جانماز بچھا کر نماز پڑھتی ہیں اور پھر سازشیں کرتی ہیں اور میرے دوسرے رشتہ دار 'مندیں' ناموں سب اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور ناکام ہیں 'کیونکہ میرا اپنے اللہ سے رشتہ بہت مضبوط ہے اور میں سمجھ بوجھ رکھتی ہوں' اب کہ کیا کرنا ہے۔ کیا نہیں 'ہوتا سب کے ساتھ تو سسرال میں ایک ساسلوک ہے 'مگر اسے برداشت کرنے والے کامیاب رہتے ہیں اور ٹوٹ جانے والے ہار جاتے ہیں۔ میری تمام پڑھنے والی بہنوں سے گزارش ہے کہ اللہ سے لو لگائیں 'سب آپ کا ہے۔ شوہر' بچے سب آپ سے محبت کریں گے 'جب آپ ان سب کے خالق سے محبت کریں گی۔ میرا سروے زیادہ دکھی اور ظلم سے بھرا تو نہیں 'مگر لگ جائے تو مجھے خوشی ہوگی اور میرا نام پورا لکھنا چاہیں تو بھی آپ کی مرضی ہے اور اگر نہ لکھیں تو بھی آپ کی خواہش 'مگر اسے چھپنا ضرور چاہیے۔'



ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف  
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

مصحف

عمرہ احمد

قیمت -/350 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر:

32735021

37، اردو بازار، کراچی

غور سے مجھے دیکھا، کچھ دیر انتظار کیا، پھر قے کے بعد مایوس ہو کر اندر چلی گئیں۔ مگر میں پھر بھی نہیں سمجھی 'ان کی تمام ہدایات پر عمل کرتی رہی۔ بچوں کی پیدائش کے حوالے سے کسی نے میری کوئی مدد نہیں کی 'خود ناشتہ بنا کر میاں کو کھلا کر پھر کپڑے وغیرہ سمیٹ کر اسپتال جاتی تھی' البتہ میرے لیے رونے دھونے والوں کی کمی نہیں تھی۔ رورو کر ڈھونگ بہت کیا گیا البتہ مدد کسی نے نکلے کی نہیں کی۔ بہت پریشان کیا گیا 'ہر اسال کیا گیا' ڈرایا گیا 'میری بڑی جیٹھانی جن کا قد ماشاء اللہ چھوٹا ہے اور انہوں نے خود کو سرباقتن ثابت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ تمہاری بیٹی کا سربلہا ہے۔ وہ بد صورت ہے اور سر صاحب نے فرمایا تھا کہ بچی یا گل ہے اور میرا رورو کر برا حال ہو گیا تھا۔ تمام رات جاگی تھی اور اگلے دن اسپتال بوتل لگی تھی۔ اس کے بعد اور بھی بہت سے فال نامے اور پامسٹری کی کتابوں سے مدد لے کر اپنی پوتی کو منحوس ثابت کیا گیا۔ اس کے نین نقش اور رنگت کے حوالے سے بہت تنگ کیا گیا تھا۔ میری پیاری بیٹی ماشاء اللہ سے بے حد ذہین اور قابل بچی ہے جو آج پورے ہوش و حواس میں ٹوکلاس کی ہونمار طالبہ ہے اور جو ملتا ہے تعریف کرتا ہے ماشاء اللہ۔ اور خوب صورتی میں بھی اپنی نمکین رنگت اور پیارے نقوش کے ساتھ سب سے ممتاز دکھائی دیتی ہے 'مگر سسرال والے سسرال والے ہی ہوتے ہیں۔'

س۔ 17 "کیا آپ جوائنٹ فیملی سسٹم کی قائل ہیں؟"

ج۔ "جوائنٹ فیملی سسٹم اگر ہو تو باہمی عزت و احترام اور محبت کرنے والوں کا ہونا چاہیے 'سب ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہوں' کام آتے ہوں' دکھ سکھ میں ساتھ نبھائیں مگر ایسا ہوتا نہیں ہے آج کل۔ اس لیے دل سے علیحدہ رہنے کی قائل ہوں 'شادی کرنے سے پہلے بیٹی والوں کو پوچھ لینا چاہیے کہ علیحدہ رکھیں گے یا اکٹھا۔ سسرال میں ماحول اس قدر نفرت انگیز ہے کہ یہاں محبت کی کرن داخل ہونے سے پہلے مرجاتی ہے۔ سب منہ سے آگ نکالتے پھرتے ہیں 'کوئی کامیابی نہیں ملی' بلکہ اور بگاڑ پیدا





تک اپنا ٹارگٹ سیٹ نہیں کریں گے، انہیں کامیابی نہیں ملے گی۔ (حمائمہ آپ مزید ڈراموں میں کام کیوں نہیں کر رہی ہیں ڈرتی ہیں کیا کہہ؟)

### پذیرائی

بھارت کا جنگی جنون اس کے فنکاروں میں بھی پایا جاتا ہے۔ کاجول، اچے دیوگند (ارے بھی دیوگن) اور انکسے کمار نے تو مموی کی پاکستان مخالف پالیسیوں کے حق میں بیان بھی دے دیا ہے۔

جبکہ پاکستان کے فنکاروں نے ثقافتی سرحدوں کی حفاظت کا راگ الاپتے ہوئے بھارت کو معاف کر دینے کی پالیسی اپنائی ہے (ان کو امید ہے تاکہ وہ پھر جا کے انڈین فلموں میں کام کر لیں گے) لیکن کچھ فنکار ایسے بھی ہیں جو مموی سمیت بھارتیوں کے جنگی جنون کی کھل کر مذمت کر رہے ہیں ان ہی فنکاروں میں سے ایک علی گل پیر ہیں (ارے وہی سائیں تو سائیں



### ٹارگٹ

حمائمہ ملک کئی ٹی وی ڈراموں میں اداکاری کے ساتھ ساتھ فلم "بول" کے ذریعے اپنی ایک شناخت بنا چکی ہیں۔ حمائمہ کا کہنا ہے کہ وہ زیادہ فلمیں یا ڈرامے کرنے کے بجائے معیاری اور ایسے کام کو ترجیح دینا چاہتی ہیں جسے لوگ ہمیشہ یاد رکھیں۔ (یہ انتظار لا حاصل ہے) حمائمہ مزید کہتی ہیں کہ کم وسائل کے باوجود ہمارا اٹلنٹ دنیا بھر میں پہچانا جاتا ہے۔ خصوصاً ہمارے موسیقار اور اداکاروں نے بھی نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ (جی ان ہی شعبوں میں کامیابی حاصل کی ہے)۔ حمائمہ ملک نے بتایا کہ انہیں بولی ووڈ میں مسالا ایوارڈ سے نوازا گیا تو بطور پاکستانی میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ (بس! ہمارا اسرائیلی ہی باتوں پر فخر سے بلند ہوتا ہے)

انہوں نے نئے آنے والوں کو مشورہ دیا کہ وہ جب







سامیں کا۔۔۔ علی گل پیر نے اپنے مزاحیہ گیت میں مودی کی خوب کھنچائی کی ہے۔ اس گلے کو خود علی پیر نے لکھا ہے۔ (بھئی اپنے خیالات آپ خود ہی تو لکھ سکتے ہیں) ماڈل بھی وہ خود ہی ہیں۔ (آہم۔۔۔!) اور کمپوزیشن بھی علی پیر گل کی ہی ہے۔ (کیوں کیا کسی اور پر بھروسہ نہیں تھا یا کریڈٹ۔۔۔؟)

اب ہوا یوں کہ گیت تو تیار ہو گیا لیکن اگر علی پیر اس کام میں کسی اور کو بھی شریک کر لیتے (مطلب بھروسہ کر لیتے تو یہ ان کے حق میں بہتر تھا) تو یہ گانا جس میں کشمیر میں بھارتی مظالم، گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام اور کبوتروں کو پاکستانی جاسوس قرار دیے جانے جیسے مودی سرکار کے رویوں کو نشانہ بنایا گیا ہے ایک بہتر کاوش ہو سکتی تھی لیکن پھر بھی علی گل پیر کے جذبہ حب الوطنی سے لبریز اس گلے کو کافی پذیرائی مل رہی ہے۔

### کردار

سمیچہ ممتاز ایک معروف اداکارہ ہیں۔ جونی وی اور فلم دونوں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھا رہی ہیں۔ ان کو ملنے والے بیشتر کردار مظلوم اور روتے دھوتے ہوتے ہیں۔ اس بارے میں سیمیچہ کہتی ہیں کہ۔ ہمارے ڈراموں میں عورت کو یا تو مرد اور معاشرے کے ہاتھوں دبی ہوئی دکھایا جاتا ہے یا پھر اسے ایک انتہائی بری عورت کے طور پر دکھایا جاتا ہے۔ اگر ٹی وی جیسے مشہور میڈیم پر ایسے کرداروں میں عورت کو دکھایا جاتا رہا تو ہمارے معاشرے کی عورتیں واقعتاً ایسی ہی ہو کر رہ جائیں گی کیوں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا معاشرہ مرد کا معاشرہ ہے۔ (سمیچہ! ہیلری کی ہار سے امریکہ کے معاشرے کی پول بھی کھل گئی ہے۔) سیمیچہ نے مزید کہا کہ دراصل عام پاکستانی عورت ایسی نہیں ہوتی۔ ایسی خواتین صرف ہمارے ٹی وی ڈراموں کے اسکرپٹ میں ہی دیکھی جاتی ہیں۔ (سمیچہ! کیا آپ اخبار نہیں پڑھتی ہیں جس میں آج بھی ہسٹوری جینز نہ لانے پر جلادی جاتی ہیں یا تیزاب

گر دی کا شکار ہوتی ہیں یا۔۔۔؟) جبکہ ہماری عام عورت خود پسندی کا شکار نہیں ہوتی وہ سازشی اور چغل خور بھی نہیں ہے۔

ہمارے ڈرامے ملک سے باہر بھی دیکھے جاتے ہیں جس سے پاکستانی عورت کا تاثر غلط جاتا ہے۔ (بالکل ٹھیک کہا آپ نے سیمیچہ! کیوں کہ ہماری عورت بہت مضبوط ہے۔ وہ زندگی کے ہر مقام پر بہت بہادری اور استقلال سے اپنے حالات کا مقابلہ کر رہی ہے۔ ہم مثبت پہلو بتا نہیں گے دکھائیں گے جب کہ زیادہ تر ٹی وی ڈرامے لکھنے والی عورتیں ہی ہیں۔)

### خوشی

گزشتہ دنوں بھارت کے ایک مشہور فیشن میگزین نے دنیا کی سو پرکشش حسیناؤں کی تصاویر شائع کیں جن میں میثا شتیج کو بھی شامل کیا گیا۔ (کیا۔۔۔ ہیں؟) میثا اس پر بہت خوش ہیں (اب ناقابل یقین باتوں پر تو خوش ہونا بنتا ہے نا۔۔۔) اور کہتی ہیں کہ بھارت کے مقبول ترین میگزین میں مجھے پورے کپڑوں کے ساتھ دنیا کی سو پرکشش خواتین کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ (بہت خوب شامل کرنے کی اصل وجہ کہیں کپڑوں کی خوب صورتی ہی تو نہیں ہے) کہاں اگر آواز کی خوب





یا سرنواز اپنی فلم ”رانگ نمبر“ کی کامیابی سے بہت خوش ہیں (ہیں ”رانگ نمبر“ کامیاب ہوئی تھی۔؟) اور اب وہ اپنی دوسری فلم ”مہر النساء لب یو“ بنا رہے ہیں جس کے مرکزی کردار کے لیے انہوں نے اداکارہ شہناز جاوید کو لیا ہے۔ شہناز اس سے پہلے ”رنگ ریزا“ سائن کی تھی مگر ”نامعلوم“ (جو سب کو معلوم ہے) وجوہات کی بنا پر انہوں نے یہ فلم چھوڑی دی تھی۔ لیکن اب وہ سرنواز کی فلم میں مہر النساء کا کردار نبھاتی نظر آئیں گی۔ فلم میں شہناز کے ہیرو دانش تیمور ہیں جو رانگ نمبر کے بھی ہیرو تھے۔

### کچھ ادھر ادھر سے

☆ احمقانہ موقف اختیار کر کے آپ لاکھوں افراد کی حمایت حاصل کر سکتے ہیں۔ سمجھ داری کی بات کرنے سے دوست بھی دشمن ہو سکتے ہیں۔

(مہشر علی زیدی)

☆ ایک فقرے میں امریکہ کے صدارتی انتخابات پر تبصرو کیا جائے تو کہا جائے گا۔ ”صدارتی انتخابات میں امریکہ کا ”باطن“ جیت گیا اور امریکہ کے ”ظاہر“ کو شکست ہو گئی۔“ اقبال نے کہا تھا۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام چہرہ روشن ‘ اندروں چنگیز سے تاریک تر (شاہنواز فاروقی۔ فراتی ڈے اسٹیشن)

☆ سیاسی جلسوں، مذہبی محافل، تعلیمی اداروں اور لائبریریوں میں بیٹھنے والے اگر تجزیہ کرنے کی اہلیت سے محروم ہیں اور سنائی یا پڑھائی گئی ہر بات کو سچ سمجھ لیتے ہیں تو ان میں اور کاٹھ کے الو میں کوئی فرق نہیں۔ (مہشر علی زیدی)

بس اتنے ہی جری تھی حریفان آفتاب چمکی ذرا سی دھوپ تو کمروں میں آگئے (خواجہ سعد رفیق کاٹوٹ)

صورتی اور فن گائیکی کی بنیاد پر انتخاب ہو تو بے شک دس حسیناؤں میں بھی شامل کر سکتے ہیں۔

### امید

شعیب منصور کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ انہوں نے ٹی وی ڈراموں سے فلم تک کے سفر میں کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ فلم ”بول“ اور ”خدا کے لیے“ کے ذریعے جدید فلم کی بنیاد رکھی۔ شعیب منصور نے اب اپنی نئی فلم ”ورنہ“ کے نام سے بنانے کا اعلان کیا ہے۔ جس کے رائٹر اور ڈائریکٹر وہ خود ہیں۔ اس فلم میں مردوں کو پیغام دیا گیا ہے کہ وہ عورتوں کو اہمیت دیں ان کی سنیں۔ سمجھیں (شعیب! آپ پاکستان میں نہیں رہتے کیا جو۔؟) شعیب منصور نے اس فلم میں مرکزی کردار کے لیے اپنی پسندیدہ اداکارہ کو لیا ہے (بھئی ایمان علی نہیں ہم نے اداکارہ کہا ہے جب کہ ایمان اور اداکاری۔) مہرہ خان اس فلم میں مرکزی کردار ادا کر رہی ہیں۔ شعیب منصور کی بول اور خدا کے لیے کی طرح اس فلم میں بھی عوام کے لیے کوئی پیغام ہی ہو گا۔

(شعیب منصور! آپ بہت جینٹلمن ڈائریکٹر ہیں، خدا اس فلم میں مذہب کو نشانہ نہ بنائے گا)



# طاہر محمد کوثر

## حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملک شام کی طرف ہجرت

انہوں نے جب اپنی قوم کی ہٹ دھرمی، انکار اور کفر پر اصرار دیکھا تو ناامید ہو کر ہجرت کا ارادہ فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی رضا کے لیے اپنی قوم سے جدائی اختیار کر لی اور ان کے ملک سے ہجرت فرمائی۔ آپ کی زوجہ محترمہ کے اولاد نہیں ہوئی تھی، اس لیے آپ کے ساتھ کوئی اولاد نہیں تھی۔ بلکہ آپ کے ساتھ آپ کے بیٹے حضرت لوط بن ہاران بن آذر تھے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی نیک اولاد عطا فرمائی اور نبوت و کتاب آپ کی نسل میں مقرر فرمادی۔ یعنی آپ کے بعد مبعوث ہونے والا ہر نبی آپ ہی کی اولاد سے تھا اور آپ کے بعد نازل ہونے والی ہر کتاب آپ کی نسل کے کسی فرد ہی پر نازل ہوئی۔ یہ آپ کو اللہ کی طرف سے انعام ملا کیونکہ آپ نے اس کی رضا کے لیے اپنے وطن، خاندان اور قبیلے کو چھوڑ دیا تھا اور ہجرت کر کے اس مقام پر تشریف لے گئے تھے، جہاں آپ اپنے رب کی عبادت کر سکتے تھے اور لوگوں کو اس کی طرف بلا سکتے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ہجرت کر کے جس علاقے میں گئے وہ شام کا ملک تھا۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

”اس زمین کی طرف نکلا۔ جس میں ہم نے جہان والوں کے لیے برکت رکھی ہے۔“

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ابو العالیہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات نے یہی فرمایا ہے۔ جبکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ برکت والی زمین سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔

## ظالم بادشاہ کے شہر میں

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک شہر (مصر) میں داخل ہوئے، جہاں ایک ظالم بادشاہ (حکمران) تھا۔ اسے بتایا گیا کہ آج رات ابراہیم (علیہ السلام) ایک خاتون کے ساتھ آئے ہیں جو حسین ترین افراد میں سے ایک ہے۔ بادشاہ نے بلا بھیجا اور کہا۔

”تمہارے ساتھ یہ عورت کون ہے؟“

انہوں نے فرمایا ”میری بہن ہے۔“

اس نے کہا۔ ”اسے (میرے پاس) بھیج دو۔“

آپ علیہ السلام نے انہیں بھیج دیا اور فرمایا۔

”میری بات کی تکذ نہ کرنا۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ تم میری بہن ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ زمین پر ہم دونوں کے سوا کوئی مومن موجود نہیں۔“

جب سارہ علیہ السلام بادشاہ کے پاس پہنچیں تو وہ آپ کی طرف بڑھا۔ آپ نے وضو کر کے نماز پڑھی اور (دعا کرتے ہوئے) کہا۔

”یا اللہ! تجھے معلوم ہے کہ میں تجھ پر اور تیرے رسول پر ایمان لائی ہوں اور اپنے جسم کو اپنے خاوند کے سوا ہر ایک سے محفوظ رکھا ہے۔ اب اس کافر کو مجھ پر مسلط نہ فرماتا۔“

بادشاہ کی سانس بند ہو گئی حتیٰ کہ وہ پاؤں مارنے لگا۔ حضرت سارہ علیہ السلام نے فرمایا۔ ”یا اللہ! اگر یہ مر گیا تو لوگ کہیں گے اس نے اسے قتل کر دیا ہے۔“

تب وہ (اس عذاب سے) چھوٹ گیا۔ (اس کے بعد) وہ دوبارہ آپ کی طرف بڑھا۔ آپ نے پھر وضو کر کے نماز پڑھی اور کہا۔

”یا اللہ! تجھے معلوم ہے کہ میں تجھ پر اور تیرے رسول پر ایمان لائی ہوں اور اپنے جسم کو اپنے خاوند



چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سارہ علیہ السلام کے شرف کو بھی محفوظ رکھا اور اپنے بندے اپنے رسولؐ اپنے پیارے اور اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کے شرف کی بھی حفاظت فرمائی۔

### ارض مقدس کی طرف واپسی

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام مصر سے دوبارہ برکت والی سرزمین یعنی ارض مقدس کی طرف لوٹ آئے۔ اس وقت آپ کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام اور بہت سا مال تھا اور حضرت ہاجرہ قبطنہ مصریہ علیہ السلام آپ کے ہمراہ تھیں۔

پھر حضرت لوط علیہ السلام اپنے کثیر اموال سمیت ”غور“ کے علاقے کی طرف ہجرت کر گئے کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کا انہیں یہی حکم تھا۔ وہاں آپ ”سدوم“ کے شہر میں اقامت پذیر ہو گئے جو اس دور میں اس علاقے کا مرکزی شہر تھا۔ یہاں کے باشندے کافر بدکار اور شریر تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی تو آپ نے اللہ کے حکم سے نظر اٹھا کر شمال جنوب مشرق اور مغرب کی طرف دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بشارت دیتے ہوئے فرمایا۔

”میں یہ سرزمین تجھے اور تیری اولاد کو قیامت تک کے لیے دوں گا اور تیری اولاد کو بڑھاؤں گا حتیٰ کہ وہ ریت کے ذروں کے برابر ہو جائیں گے۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی اس بشارت میں امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی شامل ہے بلکہ اسی امت میں پیشین گوئی کامل ترین اور عظیم ترین انداز سے پوری ہوئی ہے۔

علمائے کرام بیان فرماتے ہیں کہ اس کے بعد کچھ بد معاشوں نے حضرت لوط علیہ السلام پر قابو پا کر انہیں قید کر لیا، ان کا مال چھین لیا اور موشیوں کو ہانک کر لے گئے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خبر ملی تو آپ تین سو اٹھارہ افراد کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ آپ نے لوط علیہ السلام کو بھی چھڑا لیا، ان کا مال و متاع بھی

کے سوا ہر ایک سے محفوظ رکھا ہے۔ اس کافر کو مجھ پر مسلط نہ فرماتا۔“  
بادشاہ کی سانس بند ہو گئی حتیٰ کہ وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

سارہ علیہ السلام نے فرمایا۔ ”یا اللہ! اگر یہ مر گیا تو لوگ کہیں گے کہ اس نے اسے قتل کر دیا ہے۔“  
تب وہ چھوٹ گیا۔ تیسری یا چوتھی بار اس نے دربان سے کہا۔

”تم نے میرے پاس کوئی شیطان (جن) بھیج دیا ہے۔ اسے واپس ابراہیم کے پاس پہنچا دو اور اسے ہاجرہ علیہ السلام دے دو!“

سارہ علیہ السلام واپس آگئیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا۔ ”اللہ نے کافروں کی تدبیر کو ناکام بنادیا اور خدمت کے لیے ایک لڑکی دے دی۔“

حدیث میں جو فرمایا گیا ہے ”وہ میری بہن ہے۔“ اس سے مراد دین کے لحاظ سے بہن ہے اور ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔

”روئے زمین پر میرے اور تیرے سوا کوئی مومن موجود نہیں۔“ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مومن میاں بیوی موجود نہیں۔ اس عبارت کا یہی مطلب لینا ضروری ہے کیونکہ لوط علیہ السلام بھی ان کے ساتھ تھے اور وہ نبی تھے۔

جب سارہ علیہ السلام کو بادشاہ کے پاس لے جایا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی وقت اٹھ کر نماز پڑھنے لگے اور اللہ سے دعائیں کرنے لگے کہ وہ آپ کی اہلیہ کو محفوظ رکھے اور جس شخص نے آپ کی اہلیہ کے بارے میں بری نیت کی ہے اس کے شر سے بچالے۔ یہی کام حضرت سارہ علیہ السلام نے کیا۔ جب اللہ کے دشمن نے ان کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا تو انہوں نے فوراً ”اٹھ کرو وضو کیا اور نماز پڑھ کر مذکورہ بالا دعا مانگی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ فرمایا ہے۔

”صبر اور نماز کے ذریعے سے اللہ کی مدد حاصل کرو۔“



حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے مکہ مکرمہ کی گرمی کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی نازل فرمائی۔

”آپ جس جگہ دفن ہوں گے، میں وہاں سے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دوں گا اور آپ کو قیامت تک جنت کی ہوا آتی رہے گی۔“

حجاز کے تمام عرب قبائل حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دو بیٹوں ثابت اور قیدار کی اولاد سے ہیں۔

### فرعون

لفظ فرعون کے معنی ہیں ”سورج دیوتا کی اولاد“ قدیم اہل مصر سورج کو جو ان کا مہادیو یا رب اعلا تھا۔ سورج کہتے تھے اور فرعون اسی کی طرف منسوب تھا۔ اہل مصر کے اعتقاد کی رو سے کسی فرماں روا کی حاکمیت کے لیے اس کے سوا کوئی بنیاد نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ سورج کا جسمانی مظہر اور اس کا راضی نمائندہ ہو اسی لیے ہر شاہی خاندان جو مصر میں برسر اقتدار آتا تھا، اپنے آپ کو سورج بنی بنا کر پیش کرتا اور فرماں روا جو تخت نشین ہوتا ”فرعون“ کا لقب اختیار کر کے باشندگان ملک کو یقین دلاتا کہ تمہارا رب اعلا یا مہادیو میں ہوں۔ فرعون موسیٰ دو ہیں، ایک فرعون رعمسيس ثانی جس کے گھر میں موسیٰ علیہ السلام نے پرورش پائی اور دوسرا اس کا بیٹا منفتح تھا جو غرق ہوا۔

رعمسيس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے بیٹے منفتح کو شریک حکومت کر لیا تھا۔ رعمسيس کی ڈیڑھ سو اولادوں میں سے یہ تیرہواں لڑکا تھا۔ لہذا منفتح ہی وہ فرعون ہے جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام نے دعوت دی اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کیا اور یہ ہی غرق دریا ہوا۔ منفتح کی لاش مصری عجائب خانہ (قاہرہ) میں آج بھی محفوظ ہے۔ اس کی نعش کی ناک کا سامنے کا حصہ نثار ہے، جسے کسی حیوان نے کھالیا ہو۔ غالباً کسی سمندری مچھلی نے اس پر منہ مارا تھا، پھر اس کی لاش الوہی فیصلے کے مطابق کنارے پر پھینک دی گئی، تاکہ دنیا کے لیے باعث عبرت ہو۔

واپس لے لیا اور اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں کی بہت سی تعداد کو تہ تیغ کر دیا، انہیں شکست دی اور ان کا تعاقب کیا حتیٰ کہ دمشق کے شہر تک پہنچ گئے۔ وہاں ”برزہ“ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ میرے خیال میں اس جگہ کو مقام ابراہیم اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہاں ابراہیم علیہ السلام کے لشکر نے پڑاؤ ڈالا تھا۔

پھر آپ فاتحانہ طور پر اپنے علاقے میں واپس تشریف لائے۔ بیت المقدس کے بادشاہوں نے بڑے احترام کے ساتھ آپ کا استقبال کیا اور آپ کی اطاعت قبول کی اور آپ اپنے وطن میں اقامت پذیر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی اور اولاد

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے جوان ہونے پر عمالیق کی ایک عورت سے شادی کی جسے بعد میں اپنے والد کے حکم پر طلاق دے دی۔ اس کا نام عمارۃ بنت سعد بن اسامہ بن اکیل عمالیقی تھا۔ اس کے بعد ایک اور خاتون سے نکاح کیا جن کے بارے میں ان کے والد نے حکم دیا کہ ان سے جدائی اختیار نہ کریں۔ چنانچہ وہ آپ کے نکاح میں رہیں ان کا نام سیدہ بنت مصاض بن عمرو جریہی تھا۔

بعض مورخین نے انہیں آپ کی تیسری زوجہ محترمہ قرار دیا ہے۔ ان سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے پیدا ہوئے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام اس علاقے اور قرب و جوار کے قبائل کی طرف مبعوث ہوئے تھے جن میں جرہم اور عمالیق کے قبائل اور یمن کے باشندے شامل ہیں۔ جب آپ کی وفات کا وقت آیا تو آپ نے اپنے بھائی حضرت اسحاق علیہ السلام کو اپنا قائم مقام مقرر کیا اور اپنی بیٹی نسیم کی شادی اپنے چھٹے عیص بن اسحاق علیہ السلام سے کر دی۔ اس سے عیص کا بیٹا ”روح“ پیدا ہوا۔ عیص کے بیٹے بنی اصفر کہلاتے ہیں کیونکہ عیص زرد رو تھا۔

اللہ کے نبی حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنی والدہ حضرت ہاجرہ علیہ السلام کے قریب ”حجر“ میں دفن کیے گئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ایک سو ستتیس برس تھی۔



## خالد جیلانی

بند کر دیں اور انڈے ڈال کر مکس کریں۔ بڑے گہرے پالے میں نکال کر ابلے ہوئے انڈوں کے ساتھ پیش کریں۔

### چکن، ایک سوپ

ضروری اشیاء :

|                         |                     |
|-------------------------|---------------------|
| ایک پاؤ                 | چکن (ہڈی والی)      |
| ایک عدد                 | انڈا (پھینٹ لیں)    |
| پانچ کپ                 | پانی                |
| ایک چائے کا چمچ         | چینی                |
| ایک اچ کا ٹکڑا          | ادریک               |
| ایک عدد                 | گاجر (موٹی کاٹ لیں) |
| ایک کھانے کا چمچ        | چکن پاؤڈر           |
| تین سے چار کھانے کے چمچ | کارن فلور           |
| آدھا کپ                 | ٹھنڈا پانی          |
| حسب پسند                | انڈے (ابلے ہوئے)    |
| حسب ذائقہ               | نمک                 |

ترکیب :

ایک دیکھی میں چکن، پانی، ادرک اور گاجر ڈال کر درمیانی آگ پر پکا میں۔ گوشت گل جائے تو چکن سوپ کو چھان لیں، ادرک اور گاجر نکال کر ضائع کر دیں۔ گوشت کو ہڈیوں سے ریشہ کر کے علیحدہ کر لیں، ہڈیاں ضائع کر دیں۔

چینی کو دوبارہ ہلکی آگ پر رکھیں۔ اس میں چکن کے ریشے ڈالیں ساتھ ہی نمک، چینی، چکن پاؤڈر اور کارن فلور ٹھنڈے پانی میں گھول کر ڈالیں، چمچ چلاتی رہیں کہ گٹھلیاں نہ بنیں۔

سوپ گاڑھا ہو جائے تو ایک انڈا پھینٹ کر اس میں شامل کر دیں اور ایک دو منٹ پکا کر چولہے سے اتار لیں۔ ڈش میں نکال کر ابلے ہوئے انڈوں سے

گزرے زنانوں میں بخنی کو کمزور معدے کے حامل اور بچوں کے لیے بے حد مفید سمجھا جاتا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ سوپ ہر عمر کے افراد کے لیے اپنی افادیت ثابت کر چکا ہے۔ سرد موسم کے آغاز کے ساتھ ہی سوپ، خشک میوہ جات اور انڈوں کا استعمال بڑھ جاتا ہے۔

موسم کی مناسبت سے ہم نے بھی آپ کے لیے چند مختلف اور منفرد، توانائی سے بھرپور سوپ کی ترکیب کا انتخاب کیا ہے۔

### چکن، کارن سوپ

ضروری اشیاء :

|                  |                      |
|------------------|----------------------|
| چھ کپ            | چکن کی ہڈیوں کی بخنی |
| ایک پاؤ          | چکن (بون لیں)        |
| تین چمچ          | کارن فلور (ارارڈ)    |
| دو کھانے کے چمچ  | سویا سوس             |
| ایک کپ           | پانی                 |
| دو عدد           | انڈے (پھینٹ لیں)     |
| آدھا کپ          | بھٹے کے دانے         |
| حسب ذائقہ        | نمک                  |
| آدھا چائے کا چمچ | چائیز نمک            |
| آدھا چائے کا چمچ | سفید مرچ پاؤڈر       |

ترکیب :

چکن کی ہڈیوں کی بخنی بنا کر چھان لیں۔ بخنی میں چکن کی پتلی لمبی بوٹیاں کاٹ کر ڈالیں اور پانچ منٹ پکا میں۔ اس کے بعد اس میں بھٹے کے ابلے ہوئے دانے، سویا سوس، نمک، چائیز نمک اور سفید مرچ پاؤڈر ڈالیں اور اچھی طرح پکا میں۔

کارن فلور پانی میں گھول کر کے اس میں شامل کر دیں اور مسلسل چمچ چلاتی رہیں۔ گاڑھا ہونے پر چولہا



سجا کر پیش کریں۔

## چکن ہاٹ اینڈ ساور سوپ

ضروری اشیاء :

چکن (بغیر ہڈی کا)

ایک پاؤ  
(لسبائی میں کاٹ لیں)

بند گو بھی (لسبائی میں کٹی ہوئی) ایک کپ

گاجر (لسبائی میں کٹی ہوئی) آدھا کپ

ہری پیاز (چوپ کی ہوئی) آدھا کپ

شملہ مرچ (لسبائی میں کٹی ہوئی) آدھا کپ

اورک  
آدھا چائے کا چمچ

(باریک کٹی ہوئی)

آدھا کپ

حسب ذائقہ

آدھا چائے کا چمچ

دو کھانے کے چمچے

دو کھانے کے چمچے

ایک کھانے کا چمچ

دودھ

تین چمچے کھانے کے

حسب ضرورت

پانی

ترکیب :

پانی میں چکن، نمک، سفید مرچ پاؤڈر، چلی سوس

سرکہ اور سویا سوس ڈالیں۔ ایک اہل آجائے تو بند

گو بھی ہماجر، ہری پیاز، شملہ مرچ اور اورک ڈال کر

چکن اور سبزیاں گل جانے تک پکا میں۔ جب چکن

اور سبزیاں گل جائیں تو کھچپ ڈال کر اچھی طرح

مکس کریں اور کارن فلور پانی میں گھول کر ڈالیں۔

گاڑھا ہونے پر انڈے ڈال کر اچھی طرح مکس

کریں۔ ڈھکن ڈھک کے دو منٹ کے لیے چھوڑ دیں

ڈش میں نکال کر گرم گرم پیش کریں۔

ٹماٹو اینڈ بریڈ سوپ

ضروری اشیاء :

ٹماٹو (اہل کر میں لیں)

دو عدد (کیوبز میں کاٹ لیں)

آدھا کپ

ایک عدد

دو عدد

حسب ذائقہ

آدھا چائے کا چمچ

چھ کھانے کے چمچے

سجانے کے لیے

پین میں تیل گرم کر کے اس میں ڈبل روٹی کے

ٹکڑے گولڈن براؤن ہونے تک فرائی کر لیں اور نکال

لیں۔ اسی تیل میں پیاز اور لسن ڈال کر سوتے کر لیں۔

اور اس میں پیسے ہوئے نمک اور سیاہ

مرچ پاؤڈر ڈال کر پکائیں اور گاڑھا ہونے دیں۔ اس

کے بعد اس میں ڈبل روٹی کا چور ڈال کر پکائیں۔

ڈش میں سوپ نکال کر اورینگانوں اور نمک سے

گارنش کریں اور بریڈ سلائس کے ساتھ گرم گرم پیش

کریں۔

کشمیری چائے

دو کپ

دو کپ

ایک کھانے کا چمچ

چار عدد

سجانے کے لیے

دودھ

پانی

کشمیری چائے

چھوٹی الائچی

پتے بادام

ترکیب :

ایک دیکھی میں پانی، کشمیری چائے اور اناجی ڈال کر

ہلکی آنچ پر پکائیں۔ پانی ایک کپ رہ جائے تو ایک کپ

دودھ ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر پکائیں۔

نیچے ہوئے ایک کپ دودھ کو اہل کر چولہے سے

اتار لیں۔ چائے کا چولہا بھی بند کر دیں۔ ابے ہونے

دودھ کو چائے میں شامل کر لیں اور پالوں میں چھان کر

نکال لیں۔ بادام اور پتے چھڑک کر پیش کریں۔



## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-







بہت سی جگہ پار لڑکی سہولت نہیں ہوتی اور پھر پار لڑ میں بال سیدھے کرنے کے لیے کچھ ایسی پروڈکٹ استعمال کی جاتی ہیں جو بالوں کے لیے مضر ثابت ہو سکتی ہیں کیونکہ ان پروڈکٹ میں کیمیکلز شامل ہوتے ہیں جو بالوں کی صحت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

آپ گھر بیٹھے اپنے بالوں کو اسٹریٹ کر سکتی ہیں۔ قدرتی چیزوں کے باقاعدہ استعمال سے آپ کے بال رفتہ رفتہ سیدھے چمک دار اور نرم و ملائم ہو جائیں گے اور آپ کیمیکل کے مضر اثرات سے بھی محفوظ رہیں گی۔

### دودھ اور شہد

تھوڑا سا دودھ لے کر اس میں شہد ملائیں اور اچھی طرح مکس کر کے پیسٹ بنالیں۔ اس آمیزے کو زیادہ موثر بنانے کے لیے اس میں کیلا کچل کر ملا لیں۔ اسے بالوں میں لگائیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ تک لگا رہنے دیں پھر بالوں کو دھو لیں۔

### انڈا اور زیتون کا تیل

ایک انڈے کو پھیٹ کر اس میں دو چمچے زیتون کا تیل میں ملائیں اور بالوں کی جڑوں میں اچھی طرح لگائیں۔ ایک گھنٹہ تک لگا رہنے دیں پھر بالوں کو دھو لیں۔ یہ عمل ہفتہ میں دوبار کریں۔

### قدرتی کنڈیشننگ

شیمپو کرنے کے بعد کنڈیشنر کے باقاعدہ استعمال سے بال نرم رہتے ہیں اور انہیں آسانی سے سلجھایا جاسکتا ہے۔ آپ کے پاس کنڈیشنر نہیں ہے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ چائے کا پانی جسے تمہارے گما جاتا ہے، وہ بالوں میں لگائیں۔ آپ کے بال گھٹنہ پالے ہیں تو کافی حد تک سیدھے ہو جائیں گے۔

بالوں کو سیدھا کرنے کے لیے دودھ بہترین ہے۔ دودھ بالوں میں اچھی طرح لگائیں اگر گھر میں اسپرے بوتل ہے تو اس بوتل میں دودھ بھر کر سارے بالوں پر اچھی طرح اسپرے کر لیں۔ اس کے بعد آدھے گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں تاکہ دودھ بالوں میں اچھی طرح جذب ہو جائے پھر کسی اچھے شیمپو سے بال دھو لیں۔ آپ اپنے بالوں کو دیکھ کر خود بھی حیران رہ جائیں گی۔ بال نرم ملائم اور سیدھے ہو جائیں گے۔



خوبصورتی کے لیے منگنی اور قیمتی کریمیں ضروری نہیں، آپ کے کچن میں وہ تمام اشیاء موجود ہیں جن سے آپ اپنے بالوں کو چمک دار، لمبا گھٹا اور جلد کو دلکش بنا سکتی ہیں۔

### چہرے کا رنگ نکھارنے کے لیے

چار چمچ بیسن میں چار چمچ کھیرے کا رس شامل کر لیں اس کو اچھی طرح مکس کر کے پیسٹ بنالیں۔ اسے اپنے چہرے، گردن اور بازو پر ہلکے ہاتھ سے رگڑیں۔ جلد صاف، شفاف ہو جائے گی اور رنگ بھی نکھر جائے گا۔

### جھریاں دور کرنے کے لیے

|              |                  |
|--------------|------------------|
| کھیرے کا رس  | ایک چائے کا چمچ  |
| پودینے کا رس | آدھا چائے کا چمچ |
| شہد          | آدھا چائے کا چمچ |
| دہی          | ایک کھانے کا چمچ |

ان تمام اشیاء کو ایک پیالے میں ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں اور اسے چہرے پر کچھ دیر لگا رہنے دیں۔ یہ مکسچر جھریوں کو دور کرنے کے لیے بہترین ہے۔

### جلد کو چمک دار بنانے کے لیے

روزانہ چہرے پر دہی لگانے سے جلد کی چمک بحال ہوتی ہے۔ دہی میں شامل زنک تمام قسم کے جراثیم چہرے سے صاف کر کے اسے خوب صورت بناتا ہے۔

بیسن میں عرق گلاب ملا کر پتلا سا پیسٹ بنالیں اور روزانہ دس منٹ لگائیں چہرے پر نکھار پیدا ہوگا۔

چہرے کی جلد کے لیے کچا دودھ سب سے بہترین ٹانک ہے۔ اس کو چند منٹ چہرے پر لگائیں۔ اس کے بعد منہ دھو لیں۔ اس سے جلد صاف ستھری اور دلکش نظر آتی ہے۔

### بال سیدھے کرنے کے لیے

لبے سیدھے اور چمک دار بال سب کو اچھے لگتے ہیں۔ اکثر خواتین بال سیدھے کرانے کے لیے یار لڑ جاتی ہیں۔